جنوری 2020
پاکیزہ
www.pklibrary.com

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ — 15

سلسلے وار ناول

میرا سارا رنگ اتار دو — افشاں آفریدی — 20

میں عشق ہوں — نایاب جیلانی — 108

مکمل ناول

محبت، اعتبار، اعتماد اور عشق — عقیلہ حق — 158

وہ تو — نگہت سیما — 224

ناولٹ

آخری ہجرت — پروین زبیر — 60

عاشق نامراد — رفاقت جاوید — 133

انمول رشتے — افشین نعیم — 186

افسانے

ٹھوکر — شمیم فضلِ خالق — 53

جاگے پالک کے دکھ — نگہت اعظمی — 101

کون جانے رب کے نوازے — عنبرین ابدال — 129

بابا زمان — آسیہ عامر — 151

حاصلِ زندگی — خدیجہ میر — 179

تریا چلتر — سعدیہ ہما شیخ — 211

مسبب الاسباب — کنیز زہرا — 215

خصوصی مضامین

بیادِ معراج رسولؐ — ادارہ — 18

شمع ہدایت — اختر شجاعت — 254

وہ آئے بزم میں — نزہت اصغر — 260

سروے — شائستہ زریں — 271

مستقل عنوانات

دین کی باتیں	ادارہ	16	منتخب غزلیں	ادارہ	294
گوشۂ ظرافت	ادارہ	276	خوش ذائقہ	شگفتہ یاسمین	295
بہنوں کی محفل	مدیرہ	278	بزمِ پاکیزہ	پاکیزہ بہنیں	297
پاکیزہ ڈائری	عظمیٰ آفاق سعید	287	روحانی مشورے	ادارہ	299
میں اکثر گنگناتی ہوں	صغریٰ زیدی	292	حسن نکھار یے	مہ جبیں	301

ہومیو کلینک 302

زندگی کبھی‘ کبھی انسان کو ایسے کربناک حادثے سے دوچار کر دیتی ہے کہ اس کا اپنی ذات اور ارد گرد کے لوگوں پر سے اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کی وجہ بعض اوقات اس کی اپنی توقعات بھی ہوتی ہیں جو وہ کسی بے نام تعلق سے وابستہ کر لیتا ہے۔ وہ جذبے جو رشتوں کے توسط سے دل میں بسیرا کریں ان کی پزیرائی تو مذہب اور معاشرہ دونوں کرتے ہیں، ان کی حق تلفی پر جواب طلبی بھی کی جا سکتی ہے مگر وہ دلی تعلق جنہیں رشتوں کی سند نہ حاصل ہو، انہیں کسی عدالت سے بھی سزا نہیں سنائی جا سکتی، سوائے ضمیر کی عدالت کے۔ جبکہ وہ رشتے جنہیں تعلق کا نام بھی دے دیا جائے کبھی کبھی وہ اپنے جائز حق سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اور ان کی جوابدہی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دنیا دارالعمل ہے جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا... مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔

زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے
حادثوں میں گزری ہے راس بس تباہی ہے

عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے
خواب اب نہیں میرے، نیند تک پرائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

میرا سارا زنگ اتار دو

افشاں آفریدی

سلسلے وار ناول

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیرازی ولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس میں یو ایس اے سے تین سال بعد واپس آ کر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے۔ عکرمہ آئی کیپ میں لیکچرر شپ اور icmap میں ایوننگ کلاسز لینے لگتا ہے۔ دُرِ مکنون، سائرہ چچی کی بھانجی تھی جس کی ذمے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھالی تھی۔ عکرمہ دادی سے کہتا ہے کہ چچا جان کو دُرِ مکنون کی تعلیم شروع کرا دینی چاہیے۔ مظفر، عکرمہ سے درمکنون کو پڑھانے کا کہتے ہیں۔ ایک رات درمکنون کی طبیعت خراب ہونے پر دادی اسے سکون آور دوا دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتاتی ہیں۔ عکرمہ، زوہا، ردا اور درمکنون کو شاپنگ پر لے کر جاتا ہے تو زوہا بتاتی ہے کہ زارا (مظفر صاحب کی دوسرے نمبر کی بیٹی) کے ساتھ اس کی نند خولہ آ رہی ہے اور شاید وہ دادی کو پسند ہے۔ درمکنون سوچتی ہے کہ کیا واقعی وہ اپنے آنسوؤں سے اپنے محسنوں کی خوشی کو دھندلا رہی ہے۔ مظفر صاحب، درمکنون سے پوچھتے ہیں کہ اسے عکرمہ کے پڑھانے میں کوئی مسئلہ تو نہیں اور اسے اوپر اماں کے کمرے میں شفٹ ہونے کا کہتے ہیں۔ سائرہ بیگم کی دوست افروز جہاں کھانے پر آتی ہیں اور دُرِ مکنون کو سائرہ کی بیٹی سمجھتی ہیں اور اس کے حسن سے بہت متاثر ہوتی ہیں۔ سائرہ بیگم، مظفر صاحب سے درمکنون کو اہمیت دینے پر نالاں ہوتی ہیں تو وہ ان کو بتاتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی معصوم، شیر خوار بیٹی کو خود اپنی حرکتوں سے مارا تھا۔ سائرہ بیگم، درمکنون کو کہتی ہیں کہ جو کچھ بھی ہوا اسے بھول کر آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ اب ردا کے بعد وہ اس کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔ وہ ان کی بات سن کر پریشان ہو جاتی ہے۔ یہ بات وہ مظفر صاحب کو بھی بتا دیتی ہیں۔ درمکنون، سائرہ بیگم کی باتوں سے بہت الجھ جاتی ہے تو عکرمہ کہتا ہے کہ وہ جس منزل کی طرف بڑھنا چاہتی ہے اس راستے کی نشاندہی کتابیں کرتی ہیں۔ زارا سب کا تعارف خولہ سے کرواتی ہے تو زارا کی بیٹی ایمن، دُرِ مکنون کے بارے میں پوچھتی ہے۔ زارا، خولہ سے اس کا تعارف کروانا چاہتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ لاہور میں وہ آغا جان کی پڑوسی تھی اور عینی کی بیسٹ فرینڈ..... زوہا، عکرمہ کو خولہ کے حوالے سے چھیڑتی ہے۔ عکرمہ، دُرِ مکنون کو گیسٹ (خولہ) کو کمپنی دینے کا کہتا ہے تو زوہا کہتی ہے کہ دیکھیں دادی گیسٹ کی کس قدر فکر ہے۔ عکرمہ، درمکنون کو سمجھاتا ہے کہ اگر وہ خولہ سے پرانے تعلق کو نظر انداز کر کے کچھ اس طرح ملے کہ اس کی سوچ ان پر واضح ہو جائے۔ دُرِ مکنون کو عکرمہ کی بات سے ڈھارس ہوتی ہے۔ اسٹڈی میں درمکنون کو دیکھ کر آنسو بہاتے مظفر شیرازی، عکرمہ کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ مظفر صاحب نے اپنی نئی دل بنوائی تھی وہ لے کر عکرمہ نکلتا ہے تو زاویار کا شہری کے ساتھ رویہ دیکھ کر سوچتا ہے کہ کوئی عورتوں کے ساتھ اس طرح بھی برتاؤ کرتا ہے۔ خولہ، عکرمہ کا لیپ ٹاپ لینے جاتی ہے تو درمکنون کو اس کی باتوں سے اپنے بدصورت رویے کا احساس ہوتا ہے۔ خولہ، درمکنون سے عکرمہ کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اگر آپ اس گھر میں بہو بن کر آئیں تو بہت خوش رہیں گی، اس جملے کو سن کر عکرمہ ایک انجانے سے احساس سے دوچار ہوا تھا۔ سائرہ بیگم، درمکنون کو لوگوں میں گھلنے ملنے کا پھر کہتی ہیں کہ درمکنون کے متعلق جان کر سائرہ بیگم کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ ان کی بات پر مظفر صاحب غصہ کرتے ہیں تو ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے، عکرمہ ان کو اسپتال لے کر جاتا ہے۔ سائرہ بیگم، عکرمہ سے کہتی ہیں کہ وہ مظفر صاحب کو سمجھائے کہ وہ درمکنون کی وجہ سے ٹینشن نہ لیں۔ مظفر صاحب، عکرمہ کو اسپتال میں ہی بتاتے ہیں کہ انہوں نے درمکنون کا گھر بیچ کر رقم ایک جگہ انویسٹ کر دی ہے اور شیرازی ولا کا اوپر کا پورشن عکرمہ کے پاس رہے گا جبکہ نیچے کا پورشن درمکنون کے نام کر دیا ہے۔ عکرمہ، مظفر صاحب کے اس فیصلے پر سائرہ بیگم اور گھر والوں کی طرف سے متوقع مزاحمت کا سوچ کر پریشان تھا۔ زارا، سائرہ بیگم کو بتاتی ہے کہ اس نے خولہ کو منع کیا ہے کہ وہ ابھی خاندان میں کسی کو درمکنون کے بارے میں نہ بتائے کیونکہ وہ شاک میں ہے۔ سائرہ بیگم، درمکنون کو کہتی ہیں کہ وہ خوش رہے گی تو مظفر ٹھیک ہو پائیں گے تو درمکنون انہیں اپنی طرف سے مطمئن کرتی ہے۔ وہ ان کے اتنے آرام سے بات کرنے پر حیران ہوتی ہے اور جب مظفر صاحب واپس آتے ہیں تو ان سے ہلکی پھلکی گفتگو بھی کرتی ہے۔ سائرہ بیگم، درمکنون کو زارا کے شوہر اظہار کے آنے کا بتاتی ہیں تو وہ ایک اور ''اجنبی'' کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگتی ہے۔ اظہار بھائی سے ملنے پر درمکنون کو ان کی نظروں سے گھبراہٹ محسوس ہوئی تھی۔ رات کو درمکنون کی طبیعت اچانک خراب ہو جاتی ہے تو دادی عکرمہ کو جگاتی ہیں۔ عکرمہ، دُرِ مکنون کی دوا لا کر دیتا ہے تو دادی اسے کھلاتی ہیں جس سے اس کی طبیعت بہتر ہو جاتی ہے۔ صبح درمکنون اٹھی تو رات کی بات یاد کر کے تاسف اس پر حاوی ہونے لگا دادی نیچے تھیں ابھی وہ ناشتا ہی کرنے لگی تھی کہ اظہار بھائی آ گئے ان کو عکرمہ کا لیپ ٹاپ چاہیے تھا درمکنون جلدی سے دادی کے پاس آ جاتی ہے سائرہ بیگم اس کی طبیعت کا پوچھتی ہیں اور اسے کہتی ہیں کہ ان کے کچھ گیسٹ آنے

والے ہیں تو وہ ان کو اٹینڈ کرے۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کو بھی شام کو گھر پر رہنے کا کہتی ہیں۔ عکرمہ کو زاویار سے مل کر یاد آجاتا ہے کہ اس نے صفدر صاحب کے آفس کے باہر اسے دیکھا تھا اور لڑکی سے اس کا خراب برتاؤ بھی یاد آجاتا ہے۔ زاویار کو دیکھ کر درمکنون.... بے ہوش، وجاتی ہے۔ مظفر صاحب، سائرہ بیگم سے کہتے ہیں کہ وہ درمکنون کو کمرے میں لے جائیں۔ درمکنون کے بے ہوش ہونے پر مظفر صاحب چراغ پا ہو جاتے ہیں اور سائرہ بیگم بھی یہ عہد کر لیتی ہیں کہ کم از کم ردا کی شادی تک وہ اس معاملے کو نہیں چھیڑیں گی۔ درمکنون سوچ رہی تھی کہ زاویار بنا کسی احساسِ جرم کے کس اطمینان سے نئی زندگی شروع کرنے جا رہا ہے۔ مظفر صاحب، درمکنون سے معافی مانگتے ہیں تو وہ کہتی ہے کہ وہ اس کے باپ کی جگہ ہیں ایسا نہ کریں وہ یہاں خوش ہے۔ درمکنون، خولہ کو منع کرتی ہے کہ وہ شاپنگ پر نہیں جائے گی تو وہ اس کو سمجھاتی ہے کہ لوگوں میں رہنے کی عادت ڈالے لیکن سائرہ بیگم اس کے نہ جانے پر غصہ ہوتی ہیں۔ خولہ لوگوں کے واپس آنے پر اظہار بھائی کو دیکھ کر درمکنون کے گھبرانے سے عکرمہ کو درمکنون کا مسئلہ سمجھ آتا ہے۔ سائرہ بیگم، درمکنون کو اپنے ساتھ کلب لے جاتی ہیں اور وہاں زاویار کے ساتھ اس کو لان میں چھوڑ کر خود اندر چلی جاتی ہیں۔ زاویار، درمکنون سے کہتا ہے کہ وہ پروپوزل کو ریجیکٹ نہ کرے کیونکہ اس نے اسے برباد کیا تو اب وہ ہی اسے آباد کرنا چاہتا ہے..... لیکن درمکنون اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ زاویار کہتا ہے کہ پروپوزل سے وہ انکار کر دے گا تاکہ اس پر کوئی بات نہ آئے۔ عکرمہ، درمکنون کو اطمینان دلاتا ہے کہ مظفر صاحب اس کے ہر فیصلے کا احترام کریں گے وہ پریشان نہ ہو۔ درمکنون، عکرمہ سے کہتی ہے کہ اسے خولہ سے شادی کر لینی چاہیے کیونکہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ خولہ، درمکنون سے کہتی ہے کہ اسے شادی میں بھرپور حصہ لینا چاہیے کیونکہ ننھیال کی طرف سے... صرف وہ ہی ایک کزن ہے ردا کی۔ زاویار جب بھی کراچی سے باہر جانے کا کہتا ہے انہیں لگتا ہے وہ لاہور واپس چلا جائے گا۔ شہرین، میمونہ بیگم کو زاویار کے متعلق بتاتی ہے تو وہ سوچتی ہیں کہ آغا جان اور شہریار سے بھی اس کا دل صاف ہو جائے گا۔ جلال انصاری، شہریار کو کہتے ہیں کہ وہ زاویار کو کال کر لیں۔ عاصمہ، زاویار کے باپ شہریار سے طلاق لے چکی تھیں۔ وہ شہرین کو اپنے دوسرے شوہر عثمان کے انتقال اور مومنہ کی شادی کا بتاتی ہیں اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں۔ شہرین، عاصمہ سے ملنے آتی ہے تو وہ بہت اچھے سے ملتی ہیں اور شہرین کو بتاتی ہیں کہ وہ ایک اسکول چلا رہی ہیں۔ شہرین، عاصمہ کو بتاتی ہے صنوبر خالہ کے شوہر نے بچے نہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کر لی تو وہ انصاری ہاؤس واپس آ گئیں اور جب زاویار لاہور سے کراچی آ گیا تو وہ پنڈی چلی گئیں۔ یہ سن کر وہ بہت دکھی ہوتی ہیں۔ زاویار کئی سالوں سے ایک ہی خواب ہفتے میں کئی بار دیکھتا تھا اور چیخ مار کر اٹھنے کے بعد وہ اپنی کیفیت پر آج تک قابو نہیں کر پایا تھا۔ زاویار، شہرین سے اس لیے خفا ہوتا ہے کہ اس نے زاویار کا نمبر لاہور میں دیا۔ شہرین لاہور پہنچتی ہے تو اسے سب کا دیا جانے والا پروٹوکول ہضم نہیں ہوتا جس پر صنوبر اسے کہتی ہیں کہ اس نے کام بھی تو ایسا کیا ہے یعنی زاویار کو ڈھونڈ کر اس کا انصاری ہاؤس سے رابطہ بحال کرنا لیکن وہ شہرین کی زبانی زاویار کے بارے میں سن کر کچھ ناامید ضرور ہو جاتی ہیں۔ زاویار کے حوصلہ شکن رویے کے باوجود شہرین نے اسے کال کرنا نہ چھوڑا جس کی وجہ سے ان کے درمیان کھڑی برف کی دیوار پگھلنے لگی تھی۔ مومنہ، ماں سے کہتی ہے کہ وہ زاویار کی شادی کر دیں۔ عاصمہ سوچتی ہیں کہ وہ کیسے اتنا بڑا فیصلہ کر سکتی ہیں۔ ندیم کو کافی گہرا زخم لگا تھا، کافی ٹانکے لگے تھے۔ سرفراز کے ساتھ کام کرتے اسے دو سال ہو گئے تھے مگر آج پہلی دفعہ کوئی اس کی گولی سے زخمی ہوا تھا اور چاہ کر بھی وہ اس منظر سے فرار حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ شہرین، زاویار کو خولہ کے کراچی آنے کے بارے میں بتاتی ہے۔ نازیہ، عاصمہ کو زاویار کے لیے درمکنون کی تصویر دکھاتی ہیں تو انہیں وہ بہت پسند آتی ہے۔ آج صبح مسجد کی طرف جاتے لوگوں کو دیکھ کر زاویار کا دل بھی چاہا کہ وہ بھی رب کے حضور جائے۔ وہ جاگنگ سے واپس آتا ہے تو عاصمہ اسے لڑکی دیکھنے پر راضی کر لیتی ہیں۔ اور اپنی بہن نازیہ کو بھی بتا دیتی ہیں۔ خولہ اور شہرین شاپنگ کے لیے جاتی ہیں تو مال کے ریسٹورنٹ میں شہرین، زاویار کو ایک دیہاتی سے شخص کے ساتھ دیکھ کر حیران ہوتی ہے۔ رات دس بجے زاویار گھر آیا تو عاصمہ نے اس کے انتظار میں ڈنر نہیں کیا تھا۔ وہ زاویار کو بتاتی ہیں کہ آغا جان کا فون آیا تھا اور وہ بہت غصے میں تھے۔ اس بات پر زاویار کہتا ہے کہ آئندہ ان کا فون آئے تو کہہ دیں کہ مجھ سے کوئی امید نہ رکھیں۔ عاصمہ بیگم اس کی بات سن کر دل ہی دل میں اس کے لیے دعائیں مانگنے لگتی ہیں۔ شہریار انصاری، زاویار کو فون کرتے ہیں اور زاویار کے بدتمیزی سے جواب دینے پر فون بند کر دیتے ہیں۔ عاصمہ کے ساتھ تھوڑا وقت گزار کر شیری، زاویار کے کمرے میں آئی تو وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ وہ شیری سے کہتا ہے کہ وہ اپنے کزن برہان کو اپنے لیے چن لے اس کی بات پر شیری بہت حیران ہوتی ہے۔ نازیہ بیگم کا فون عاصمہ کے پاس کرتا ہے تو وہ زاویار سے درمکنون کے گھر جانے کی بات کرتی ہیں۔ زاویار سوچتا ہے کہ وہ کتنی ہرٹ ہوں گی جب وہ انکار کرے گا۔ شہرین، زاویار کو اپنی

طرف بلاتی ہے کہ وہ اظہار بھائی سے مل لے تو وہ کہتا ہے کہ وہ خود آ کر اس سے مل لیں اور شہرین آغا جان سے کہہ دے کہ وہ ماما کو فون کر کے کوئی ڈکٹیشن نہ دیں۔ میمونہ بیگم، شہرین کو بتاتی ہیں کہ آغا جان چاہتے ہیں کہ خولہ کی یا شہرین کی شادی زاویار سے ہو جائے۔ مومنہ، عاصمہ سے کہتی ہے کہ جو انہوں نے کیا وہ درست فیصلہ تھا اس لیے وہ پچھتاوا نہ کریں......اور تیار ہو جائیں درمکنون کے گھر جانے کے لیے......زاویار، مومنہ کی باتیں سن کر ٹھٹک جاتا ہے۔ شہرین، خولہ کو بتاتی ہے کہ آغا جان کیا سوچ رہے ہیں۔ خولہ، شہرین کو بتاتی ہے کہ اس نے عکرمہ کو اوکے کر دیا ہے۔ زاویار، درمکنون کو زندہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ شہرین پکنک سے واپس آ کر زوی سے ملنے جاتی ہے لیکن وہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ عاصمہ سے لڑکی کی تصویر دکھانے کو کہتی ہے اور تصویر دیکھ کر درمکنون کا نام لیتی ہے تو عاصمہ پوچھتی ہیں کہ تم جانتی ہو تو وہ بتاتی ہے کہ زاویار بھی اسے جانتا ہے، وہ اس کے کراچی میں ہونے پر حیران ہوتی ہے تو عاصمہ اسے درمکنون کے والدین کی ڈیتھ کا بتاتی ہیں۔ عاصمہ، شہرین کو بتاتی ہے کہ وہ عثمان کی بہن کے گھر شادی میں کوئٹہ جا رہی ہیں۔ شہرین واپس آتی ہے تو اسے بھی پتا چلتا ہے کہ آغا جان نے خولہ کے لیے زاویار یا طارق میں سے کسی ایک کو چننے پر زور دیا ہے۔ خولہ کو بھی آغا جان کا یوں حکم دینا پسند نہیں آیا تھا۔ زاویار رات کو دیر سے گھر آتا ہے تو عاصمہ کو اپنے انتظار میں دیکھ کر شرمندہ ہو جاتا ہے، عاصمہ اس سے پوچھتی ہیں کہ وہ درمکنون کو جانتا ہے تو وہ پوچھتا ہے کہ آپ سے کس نے کہا شہرین کا نام لینے پر وہ اور غصہ ہوتا ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ آپ کوئٹہ جائیں آپ کی واپسی تک کسی نہ کسی نتیجے پر ضرور پہنچ جاؤں گا......زاویار تین سال پہلے کے اس منظر سے کسی طرح نکل نہیں پا رہا تھا۔ زاویار، نازیہ سے کہتا ہے کہ وہ درمکنون سے ملنا چاہتا ہے تو نازیہ ہامی بھر لیتی ہیں۔ عاصمہ، شہرین کو فون کرتی ہیں کہ زاویار کل سے فون ریسیو نہیں کر رہا تو وہ جا کر اس سے مل لے......میمونہ بیگم، شہرین کو کھانے کے ساتھ زاویار کے گھر بھیجتی ہیں اور دعا کرتی ہیں کہ وہ خیریت سے ہو۔

اب آگے پڑھیے..

قسط نمبر 13

''اچھا بابا آتی ہوں میں تمہاری طرف بھی۔ ویسے اس ارادے سے نکلی نہیں تھی میں۔'' عاصمہ لاج کے دروازے پر پہنچ کر اس نے کار کو بریک لگاتے ہی کان سے لگے سیل کے ذریعے خولہ کو جواب دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اسے ٹھیک ٹھاک سننے کو ملی تھیں۔ غلطی اسی کی تھی کہ وہ ردا کی طرف جانے والی کمٹمنٹ بالکل بھول گئی تھی۔ اس لیے چپ چاپ اس کی جھاڑ سنتی رہی۔

''اوکے بھئی، کہا تو ہے کہ آ رہی ہوں۔ تم بس مما کو فون کر کے بتا دو کہ میں یہاں سے سیدھی تمہاری طرف آؤں گی۔ مگر کچھ ٹائم لگ جائے گا مجھے۔'' بالآخر اس نے ہی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا تو کہیں جا کے خولہ کا پارہ نیچے آیا۔

''پتا ہے مجھے، پہلے اس کریلے کو مزید نیم چڑھاؤ گی تب کہیں جا کر فرصت ملے گی۔ بہر حال میں تمہیں صرف ڈیڑھ گھنٹا دے رہی ہوں۔ آئی سمجھ۔ ایک منٹ آگے نہ پیچھے۔'' خولہ نے چڑ کر کہا۔

''اچھا بابا اچھا، اب بند بھی کرو فون۔ میں گیٹ کے سامنے کھڑی ہوں۔ کھانا زوی کو تھما کر فوراً ہی نکل جاؤں گی۔ ڈونٹ وری۔'' اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہہ کر فون بند کیا اور کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ بیل بجا کر اس نے اچک کر گیٹ کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ زاویار کی گاڑی کھڑی تھی۔ تاہم مہران کی بائیک اسے وہاں سے غائب نظر آئی۔ مامی کی کار بھی اندر ہی پارک تھی۔

اس نے لگا تار کئی بیلیں بجا دیں۔

دس منٹ گزرنے کے بعد کہیں جا کر اندر سے کسی کے باہر آنے کی آواز سنائی تھی تو اس نے سکون کی سانس لی۔

مگر یہ سکون اس وقت یک دم رخصت ہو گیا جب دروازہ کھولنے والا زاویار کے بجائے کرخت چہرے والا اجنبی نکلا۔

''سلام جی۔'' لٹھ مار انداز تھا سلام کا۔

شہرین بدک کر پیچھے ہٹی۔ لہجہ اور چہرہ دونوں سختی لیے ہوئے تھے۔

''کک.....کون ہو تم؟'' وہ ٹھیک ٹھاک دہشت زدہ ہو گئی تھی۔

یہ آدمی کچھ دیکھا ہوا سا لگ رہا تھا۔ جو اپنے حلیے سے کوئی دیہاتی معلوم ہو رہا تھا۔ یک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

اسے یاد آیا کہ اس نے اس شخص کو ایک بار شاپنگ مال کے فوڈ کورٹ میں زاویار کے ساتھ ہی دیکھا تھا اور جس کے بارے میں زوی نے بتایا تھا کہ وہ اس کا کلائنٹ ہے۔

''کلائنٹ اور زوی کے گھر پر.....؟'' اس کا دل کسی خطرے کے منفی خیال سے دھڑک اٹھا۔

''میں جی مولا بخش ہوں۔ زاویار صاحب کے کام سے آیا تھا۔'' کرخت لہجے میں اپنے سوال کا جواب موصول ہوا تھا۔

''ز.....ز.....زوی کہاں ہے۔ آئی مین زاویار۔''

یک بیک اس کی نظر اس شخص کے ہاتھ میں پکڑے زاویار کے اسپورٹ بیگ پر پڑی۔ بیگ غالباً سامان سے بھرا ہوا تھا۔

''اور تم یہ سب سامان لے کر کہاں جا رہے ہو؟'' اب کے اس نے اپنے لرزتے لہجے کو قابو کر کے قدرے رعب سے پوچھا تو مقابل شخص نے خاصے طنز سے اسے دیکھا۔

''زاویار صاحب اسپتال میں پڑا ہے۔ بہت بڑا ایکسیڈنٹ ہوا ہے کل رات اس کا۔ میں یہ سامان اسی واسطے لینے آیا تھا۔ یہ دیکھو چابی اپن کے پاس ہے۔''

اتنی بھیانک خبر وہ کس مزے سے ایک ہی سانس میں سنا گیا تھا۔ شہرین کو ایک لمحے کے لیے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''زوی اور اسپتال میں۔ مائی گاڈ مگر اس نے ہمیں کال کیوں نہیں کی۔''

''اس کا موبائل اور بائیک سب ختم ہو گیا۔ بس زندگی بچ گئی ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرو۔'' مولا بخش کا حلیہ ہی نہیں اس کی زبان بھی اسے غیر مقامی آدمی ثابت کر رہی تھی۔

شہرین کے ہاتھوں سے گویا طوطے اڑ گئے تھے۔ بہ مشکل گم ہوتے حواس کو قابو کر کے چند ضروری سوالات اس شخص سے پوچھنے کے بعد وہ چار و ناچار اس کی جیپ کے تعاقب میں کار دوڑانے لگی۔

دل ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں یہ غنڈا موالی اسے دھوکا نہ دے رہا ہو۔ مگر جب جیپ ایک پرائیویٹ اسپتال کے دروازے پر آ کر رکی تو وہ دھڑکتے دل سے کار پارک کر کے اندر چلی آئی۔

''زوی ٹھیک تو ہے ناں؟ اسے زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟ خون تو نہیں بہا۔'' اس اجنبی کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے کئی سوال پوچھ ڈالے تھے۔

''یہ سب آپ خود دیکھ لو جا کر۔'' اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس کی تقلید میں ICU تک چلی آئی۔ آئی سی یو دیکھ کر اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔

اور جس وقت وہ ICU میں داخل ہوئی۔ اس کے قدم جیسے دہلیز پر ہی جم گئے۔ سامنے ہی بیڈ پر زاویار مختلف پٹیوں میں جکڑا پڑا تھا۔ اس کا ہاتھ فریکچر تھا اور اس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔

''یا اللہ!'' وہ بہت کم ہمت تھی۔

خون اور زخم دیکھنے سے تو یوں بھی جان جاتی تھی اس کی۔ زاویار کو اس حال میں دیکھنا بڑا محال ہوا۔

چند سیکنڈز اسے یوں کھڑے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بے اختیار بیڈ کی طرف لپک کر آئی۔
''زوی.....زوی۔اُف یہ کیا ہو گیا تمہیں۔''
یقیناً وہ دواؤں کے زیرِ اثر سو رہا تھا۔
''شش.....شور نہ کرو بی بی۔'' ڈیوٹی پر موجود نرس نے قدرے سختی سے اسے ڈانٹا۔
''مگر اسے ہوا کیا ہے۔ یہ سو کیوں رہا ہے ابھی تک۔'' شہرین کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ دل کسی خوف سے سہا جا رہا تھا۔
''بے ہوش ہیں یہ۔کل رات سے ابھی تک ہوش نہیں آسکا ہے ان کو۔اور اگلے بارہ گھنٹے بہت اہم ہیں ان کے لیے۔''
زاویار کی کلائی تھام کر نبض چیک کرتی نرس پیشہ ورانہ بے مروتی سے بولی تھی۔اور انہیں باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔
''اوہ میرے خدا۔''
باہر آکر وہ یک دم رو پڑی۔ ICU کے آگے کاریڈور خالی پڑا تھا۔
''دیکھیں بی بی رونے کی ضرورت نہیں۔ دعا کریں اللہ سے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔'' مولا بخش خاموشی توڑ کر بولا تو اس نے بے اختیار نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔
''زوی ٹھیک تو ہو جائے گا ناں۔'' اس وقت تو اوسان خطا تھے اس کے۔مولا بخش سے اگر کسی اور وقت سامنا ہوا ہوتا تو شاید وہ اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں۔اس کی خوفناک مونچھوں والے کرخت چہرے سے خوفزدہ ہو گئی ہوتی مگر اس مشکل گھڑی میں وہ اسے مونس وغمگسار محسوس ہو رہا تھا۔اس لیے بے اختیار سوال کر ڈالا۔
''ان شاء اللہ..... مجھے اپنے خدا سے بڑی آس ہے۔ وہ زاویار صاحب کو چنگا کر دے گا۔غریبوں کی دعائیں ہیں ان کے ساتھ۔مظلوموں کا نجات دہندہ ہے اپنا زاویار صاحب۔اس کو کسی نہ کسی کی دعا ضرور لگے گی۔'' مولا بخش انتہائی عقیدت اور یقین سے جواباً کہنے لگا تھا۔
شہرین نے اس کی بات سنی تو حیرت سے اسے بغور دیکھا۔
''کیا مطلب ہے تمہارا۔کن غریبوں اور کن مظلوموں کی بات کر رہے ہو تم۔آخر ان کا زوی سے کیا تعلق؟'' اپنی حیرانی کو الفاظ دیتے ہوئے اس نے گالوں پر بہتے آنسو صاف کیے تھے۔
''تعلق.....ارے یہ تو ہمارا مائی باپ ہے۔پر شاید آپ کو اس نے نہیں بتایا ہوگا۔بڑا نیک انسان ہے۔نیکی کی مشہوری نہیں کرتا۔'' مولا بخش نے اس کے سوال پر جواباً تعجب کا اظہار کرتے ہوئے خود ہی نتیجہ اخذ کر کے توصیفی انداز میں کہا تو شہرین سر ہلا کر رہ گئی۔
''کل رات ہم اس کو ملنے کے واسطے جا رہا تھا کہ اس کے گھر کے پاس والی سڑک پر ہجوم اکٹھا دیکھ کر رکنا پڑا۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ یہ تو اپنا زاویار صاحب ہے۔ہم کیسے بھی کر کے اس کو اسپتال لے کر آیا۔مگر اس کا موبیل (موبائل) خدا معلوم کہاں گرا کہ ملا نہیں۔موٹر سائیکل بھی ٹرک کے نیچے آکر ختم ہوا۔وہ تو خدا نے زندگی بچا دی اس کی۔کوئی نیکی کام آگئی اس کے۔اپن کے پاس جو بھی تھا دے دلا کر اس کو اسپتال میں جمع کرایا ورنہ یہ ظالم لوگ تو ہاتھ لگانے کو تیار نہیں تھا۔اپن ٹھہرا غریب آدمی۔مجبوراً اس کی جیب سے گھر کی چابی لے کر گیا اور یہ سامان لایا۔کوئی چوری نہیں کیا اپن نے۔آپ جا کر خود چیک کر لینا بی بی۔اور یہ چابی پکڑو۔'' تفصیل بتاتے، بتاتے چابی اس کی جانب بڑھائی۔
''اس کو فی الحال رکھو اور مجھے یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر نے کیا بتایا ہے۔کیا ہوا ہے زوی کو۔'' وہ بے تابی سے بولی تھی۔
جواباً مولا بخش نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

اس کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ جس سے کافی خون بہہ گیا تھا۔ سیدھے بازو کی ہڈی فریکچر تھی۔ اور ساتھ ہی جسم پر جگہ جگہ چھوٹی بڑی کئی طرح کی چوٹیں تھیں۔ فریکچر اور چوٹوں کی تو خیر تھی۔ تاہم سر میں لگنے والے زخم اور بہہ جانے والے خون کے باعث اس کی حالت ابھی تک تشویش ناک تھی اور وہ خطرے سے باہر نہیں تھا۔ تفصیل سن کر وہ پھر رو پڑی تھی۔

پھر ہمت کر کے راؤنڈ پر آئے ڈاکٹر کے پاس جا کر کئی سوال کیے اور اس کے تسلی دینے پر دل ہی دل میں گڑگڑا کر دعا کرتی وہ بینچ پر آ بیٹھی تھی۔

ماما کو فون کرنا خطرناک تھا۔ یوں بھی کئی دن سے ان کی شوگر ہائی چل رہی تھی۔ ادھر آغا جان کے پچھلے سال ہوئے بائی پاس کے آپریشن کا خیال کر کے اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ ان لوگوں کو فون کرتی۔ عاصمہ مامی کو بھی وہ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایسے میں سوائے خولہ کے..... کراچی میں اور کون تھا جسے وہ اس سخت وقت میں پکارتی۔

''پلیز خولہ۔ جلدی آ جاؤ۔ میں اسے ایسے زندگی ہارتا نہیں دیکھ سکتی۔'' خولہ کی آواز سنتے ہی وہ بکھر گئی تھی۔

.....☆.....☆.....

''بھابی ہمیں جانا ہے۔ ان فیکٹ زاویار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔''

ڈنر سرو ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ خولہ نے دُرِ مکنون کے ساتھ بیٹھی زارا کے قریب آ کر بتایا تو نوالہ دُرِ مکنون کے ہاتھ سے چھٹ کر پلیٹ میں جا گرا۔

''اوہ نو..... مگر کب ہوا یہ سب اور کیسے؟'' زارا فکرمندی سے بولیں۔

''شہرین بتا رہی ہے کل رات بڑا شدید ایکسیڈنٹ ہوا ہے اس کا۔ بہت ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا وہ کہ کسی ٹرک نے hit کیا ہے اس کی بائیک کو۔''

خولہ پریشان سی عجلت میں تفصیل بتا کر وہاں سے چل دی۔ زارا بھی اس کی تقلید میں باہر نکل گئی تھیں۔

کسی نے ساتھ بیٹھی دُرِ مکنون کی طرف توجہ بھی نہیں دی۔ جس کی سانس جیسے سینے میں اٹک گئی تھی۔

''یا اللہ، میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا۔ میں نے انہیں کوئی بددعا نہیں دی۔ ان کے والدین کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے یہ۔ یا اللہ تو زاویار انصاری کو زندگی دے۔ صحت دے میرے مالک۔''

عینی اور شہریار انکل کی صورتیں اس کے حافظے میں تازہ ہو کر اسے دعا پر مجبور کر گئیں۔ آغا جان کا ضعیف چہرہ اسے دکھی کرنے لگا۔ وہ اٹھ کر اوپر چلی آئی تھی۔ اس وقت ذہن بری طرح اپ سیٹ ہو رہا تھا۔ اسے تنہائی کی ضرورت تھی۔ کمرے میں آ کر اس نے کانوں میں پہنے ہوئے آویزے جو اسے بطورِ خاص زوہا نے پہنائے تھے اور جو اس کا واحد سنگار تھا اتار کر رکھے۔ ساتھ ہی ذہن میں جھما کا سا ہوا.....

''اور مدد چاہو صبر اور نماز سے۔'' وہ وضو کرنے چل دی تھی۔

.....☆.....☆.....

زارا، اظہار بھائی اور خولہ کے ساتھ عکرمہ آیا تھا اسپتال۔

گھر میں مہمان تھے لہٰذا مظفر صاحب اور سائرہ بیگم میں سے تو کوئی آ نہیں سکتا تھا تاہم عکرمہ کو ساتھ کر دیا گیا تھا۔

ان تینوں کو گیٹ پر اتار کر وہ پارکنگ میں کار پارک کر کے جس وقت اندر آیا۔ ریسیپشن کے پاس اسے خولہ کے کندھے سے لگی شہرین نظر آئی۔

اظہار صاحب غالباً ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کی تلاش میں چلے گئے تھے۔

''حوصلہ کرو شیری۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' خولہ کا اپنا دل سہما جا رہا تھا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ

شہرین کس قدر کم حوصلہ ہے۔ اس کی ہمت بندھانے کی خاطر اکثر اسے اپنی طاقت سے بڑھ کر بہادر بننا پڑتا تھا۔
'اور اگر اسے کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا خولہ۔ تم جانتی ہو ناں کہ ہمارے خاندان کے لیے کیا ہے وہ۔''
''کچھ نہیں ہو گا اسے۔ میں کہہ رہی ہوں ناں۔ تم ریلیکس کرو، دیکھو بھابی بھی آئی ہیں۔ ساتھ میں عکرمہ بھی ہیں۔''
اس نے اس کے کان میں تسلی سرگوشی کی تو شہرین نے بدقت تمام اس کے کندھے سے سر اٹھایا۔
وہ دونوں اسی طرف متوجہ تھے۔
اس نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔
عکرمہ نے اسے دیکھا تو ذہن میں جھماکا سا ہوا۔
اس لڑکی کو اس نے کئی دن ہوئے زاویار کے ساتھ ہی دیکھا تھا۔ راستے میں خولہ اور اظہار صاحب کی زبانی زاویار کا نام سن کر اسے کچھ خیال تو آیا تھا۔ مگر ایک نام کے کئی لوگ ہو سکتے ہیں ایسا سوچ کر خاموش رہا۔
مگر اس وقت سامنے کھڑی شہرین مرزا اس کے خدشے کو سچ ثابت کر رہی تھی۔
تو گویا کل رات دُرِ مکنون کے لبوں سے انکار سننے والا شخص زاویار اس وقت آئی سی یو میں زندگی موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔
اور خولہ اس کی کزن تھی۔
اس نے کڑیاں جوڑیں تو یہ سوچ کر حیران ہوا کہ اگر ایسا ہے تو پھر خولہ اور اظہار بھائی زاویار کے پروپوزل کے بارے میں حتیٰ کہ زارا تک اس واقعے سے انجان تھی۔
ابھی وہ چپ چاپ کھڑا ان خواتین کو شہرین کے آنسو پونچھتے اور تسلی دیتے دیکھ رہا تھا کہ اظہار صاحب کاریڈور سے آتے دکھائی دیے۔
''میری بات ہوئی ہے ڈاکٹر سے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔ وہ کہتا ہے کل کے مقابلے میں آج کافی بہتری نظر آ رہی ہے۔ زاویار کی پلس اور بی پی میں۔'' قریب آنے پر انہوں نے مژدہ سنایا تھا۔
''دیکھا تم نے۔ میں نے کہا تھا ناں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' خولہ نے فوراً اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔
''آپ نے پوچھا۔ کب تک ہوش آ جائے گا اسے؟'' زارا فکرمندی سے پوچھنے لگیں۔
''ڈاکٹر کہتا ہے اس بارے میں فی الحال کچھ کہنا مشکل ہے۔ اگلے چند گھنٹے بہت crucial ہیں اس کے لیے۔'' اظہار صاحب قدرے پریشان تھے مگر ظاہر نہیں کر رہے تھے۔
''شیری تم نے عاصمہ آنٹی کو انفارم کیا؟''
''نہیں، وہ کوئٹہ میں ہیں اور بہت فکرمند ہیں۔ تمہیں تو پتا ہے انہیں انجائنا کی تکلیف ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ زوی اپنے کسی دوست کی ویڈنگ کی وجہ سے گھر پر نہیں ہے اور اس کا سیل پانی میں گر گیا ہے۔'' خولہ کے سوال پر اس نے جو جھوٹ گھڑا تھا کہہ سنایا۔
''بالکل ٹھیک کیا۔ ابھی کسی کو اس بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں۔'' اس کی بات پر اظہار صاحب نے گلا صاف کر کے واضح آواز میں کہا تو وہ سب ان کی طرف دیکھنے لگے۔
''ان فیکٹ آغا جان کی صحت اور میمونہ آنٹی کے کمزور دل کے باعث ہمیں فی الحال ان کو بھی اس بری خبر سے دور رکھنا چاہیے۔ ان شاء اللہ کل جب زاویار کو ہوش آ جائے گا تو بتا دیں گے۔'' انہوں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا تو تائید اً سب خاموش ہو گئے۔
''بھابی آپ میمونہ آنٹی کو فون کر کے کہہ دیں کہ شہرین ہمارے ساتھ شیرازی ولا میں ہے اور شادی کے باعث

میں نے اسے روک لیا ہے۔ کیونکہ اسے دیکھ کر تو آنٹی کو یقیناً شک ہو جائے گا کہ کچھ ہوا ہے زاویار کے ساتھ۔"

خولہ نے خیال آنے پر زارا سے کہا تو وہ سر ہلا کر موبائل بیگ سے نکالنے لگیں۔

"کم آن ریلیکس، آؤ میں تمہیں عکرمہ سے ملواؤں۔" پریشان اور گم صم کھڑی شہرین کو دیکھ کر خولہ نے کہا تو وہ متوجہ ہوئی۔

کچھ دنوں پہلے تک تو اسے بڑا ارمان تھا عکرمہ سے ملنے کا۔ مگر جب سے طارق بھیا کا نام خولہ کے ساتھ لیا جانے لگا تھا وہ اپنی اس خواہش کو گویا بھول ہی چکی تھی۔ مگر اس وقت وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ خولہ نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"نائس ٹو میٹ یو۔"

تعارف کے نتیجے میں عکرمہ نے مروت اور شائستگی سے کہا تو شہرین کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھیں۔ اور اس کا مفصل جائزہ لے کر واپس پلٹ آئیں۔

"طارق بھیا کے مقابلے میں کتنا ہینڈسم ہے عکرمہ شیرازی۔ مگر پھر بھی خولہ اجی بھائی کے فیصلے کو دل سے قبول کرنے کو تیار ہے۔"

بے اختیار اس نے اپنے بھائی اور سامنے کھڑے عکرمہ کا تقابل کیا اور اس موازنے کے نتیجے میں ایمانداری سے سوچنے لگی۔

پھر کئی گھنٹے وہ لوگ وہاں رہے اور رات گیارہ بجے والی ڈیوٹی پر آئے سرجن سے مثبت رپورٹ ملنے پر واپس گھر چلے آئے۔

اظہار بھائی وہیں رک گئے تھے۔
مولا بخش نام کا شخص البتہ ان کے ساتھ اسپتال میں تھا۔ سب کے بہت کہنے پر بھی وہ اسپتال کے ماربل سے بنے ٹھنڈے فرش پر بہت سکون سے بیٹھا رہا اور جانے کو تیار نہیں ہوا تھا۔
گھر پہنچ کر عکرمہ ان تینوں خواتین کو نیچے چھوڑ کر اوپر چلا آیا۔ گھر میں آئے مہمان جا چکے تھے۔ صرف ردا کی چند سہیلیاں اس کے کمرے میں ڈیرا جمائے ہوئے تھیں۔
دادی غالباً اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔
وہ کمرے میں داخل ہوا تو بیڈ کے کنارے پیر لٹکائے بیٹھی دُرِ مکنون بے تابی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
''السلام علیکم۔''
''وعلیکم السلام بیٹا۔ کیا خبر لائے کیسا ہے وہ بچہ اب۔'' دادی کی تسبیح کے دانوں کو گردش دیتی انگلیاں تھم گئی تھیں۔
دُرِ مکنون کے چہرے پر ثبت سوال ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
''بہتر ہے پہلے سے مگر خطرے سے باہر نہیں۔ b lood loss) کافی ہوا ہے اور سر پر بھی گہری چوٹ آئی ہے۔''
سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا تو بے چینی سے اس کی جانب دیکھتی دُرِ مکنون ہونٹ کاٹنے لگی۔
''اللہ کرم کرے۔ صحت دے۔'' دادی کے پُرنور چہرے پر خلوص کی روشنی بکھر گئی تھی۔
دُرِ مکنون نے انہیں دیکھا تو متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔
''کتنی شفیق ہیں دادی۔ ہر ایک سے بے غرض محبت کرتی ہیں۔ ہمدردی رکھتی ہیں۔ اور ایک میں ہوں۔ اپنے محسن اور مجرم دونوں کے لیے کسی کام کی نہیں ہوں میں۔'' احساسِ کمتری سے سوچتے ہوئے وہ سست قدموں سے چلتی کمرے سے باہر چلی آئی۔ دل پر منوں بوجھ آ گرا تھا جیسے۔
عکرمہ کی زبانی زاویار کا حال سن کر وہ کچھ اور بھی احساسِ جرم میں گھر گئی تھی۔
گرم، گرم کافی بنا کر جس وقت وہ دادی کے کمرے میں آئی عکرمہ وہاں سے جا چکا تھا۔
''جاؤ بیٹا۔ اس کے کمرے میں دے آؤ۔ وہ ابھی سویا نہیں ہوگا۔'' دادی کمبل میں لیٹتے ہوئے بولیں تو وہ عکرمہ کے کمرے کی جانب چل دی۔
دستک کی آواز پر عکرمہ نے ''یس'' کہا تو وہ اندر چلی آئی۔ وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھا تھا۔
''کافی۔''
''تھینکس۔ اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔''
آئی پیڈ ایک طرف رکھتے ہوئے وہ متوجہ ہوا تھا۔ جواباً وہ چاہنے پر بھی مسکرا نہ سکی تھی۔
''دُرِ مکنون۔'' وہ جانے کو پلٹی تھی کہ عکرمہ کی آواز نے قدم روک لیے۔
پلٹ کر سوالیہ نظریں اس پر تو عکرمہ نے بغور اس کے ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔
اس کی مڑی ہوئی پلکیں بھیگی اور ایک دوسرے سے جڑی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ روتی رہی ہے۔
''کیا آپ مسٹر زاویار کو پہلے سے جانتی ہیں؟'' عکرمہ کا لہجہ قدرے یقین لیے ہوئے تھا۔
دُرِ مکنون کو قطعاً حیرت نہیں ہوئی تھی۔
وہ خولہ کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ اتنا معلوم ہو جانا تو یقینی بات تھی۔ مرے، مرے انداز میں سر ہلا کر اس نے گویا اعتراف کیا۔
''ہوں۔'' گہری سانس بھر کر عکرمہ کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا تھا۔

''اینی وے سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

پتا نہیں اسے دیکھ کر وہ کیا سمجھا تھا کہ تسلی دینے کے سے انداز میں بولا۔ دُرِ مکنون نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف نگاہ اٹھائی۔

''عینی اور اس کے آغا جان کے لیے یہ بہت کڑا وقت ہے۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے محض جملہ ادا نہیں کیا تھا۔ کچھ جتایا تھا۔

عکرمہ نے کافی کا سپ لیتے ہوئے اسے سرسری سا دیکھا اور پھر دوبارہ آئی پیڈ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے معمول کے سے انداز میں یوں بولا جیسے بات ختم کرنا چاہ رہا ہو۔

''اچھی بات ہے۔ آپ کو ہمدردی ہونی بھی چاہیے۔ آخر کو وہ آپ کی بیسٹ فرینڈ کی فیملی ہے۔''

جملہ مکمل کر کے وہ کچھ اس طرح اپنے کام میں منہمک ہوا کہ دُرِ مکنون پُرسکون سی ہو کر کمرے سے باہر چلی آئی۔

''حد ہے دُرِ مکنون۔ بھلا اس طرح بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کون سا کسی نے کوئی دفعہ لگا دی تھی تم پر۔ کسی کو کیا پتا کہ زاویار انصاری کی طرف تمہارا کتنا حساب نکلتا ہے۔ اور جس ذات کو پتا ہے۔ وہ باخبر ہے کہ تم نے اسے یہ بددعا کبھی نہیں دی۔''

ٹیرس پر آج بھی چاندنی اپنا فسوں پھیلا رہی تھی۔ وہ خود کو سمجھاتی ٹیرس پر چلی آئی۔

.....☆.....☆.....

صبح سات بجے اظہار صاحب کا فون آیا تو خولہ، شہرین کے ساتھ اسپتال چلی آئی۔

زاویار کو ہلکا، ہلکا سا ہوش آنے لگا تھا۔ یہ خبر اتنی اچھی تھی کہ ان سے رہا نہیں گیا تھا.... زاویار کو دیکھنے باری باری سب اندر گئے تھے۔

شہرین جس وقت اندر آئی وہ نیم غنودہ تھا۔ ابھی تک اس نے کسی سے بھی بات کی تھی نہ آنکھیں کھولی تھیں۔

''زوی۔ کیسے ہو؟ پلیز آنکھیں کھولو۔'' اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے شہرین بے اختیار رو پڑی۔

ابھی کل ہی تو وہ ماما سے کہہ رہی تھی کہ کتنا مسٹنڈا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اسی کلو سے کم وزن نہیں ہے اس کا۔ اور آج اسے اس حالت میں دیکھ کر وہ اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں رکھ سکی تھی۔ زاویار نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں تو سر کے پچھلے حصے میں شدید درد محسوس ہوا۔ لہٰذا دوبارہ تکلیف کے باعث آنکھیں بند کر لیں۔

تاہم شہرین کے دھندلے نظر آتے چہرے پر لکھا دکھ اور بہتے آنسو اس کی بصارت نے محفوظ کر لیے تھے۔

''زوی یہ کیا کر لیا تم نے۔ کیوں ڈرائیونگ کی ایسی۔ آخر تمہیں یہ یاد کیوں نہیں رہتا کہ بہت سے لوگوں کی آس بندھی ہے تمہاری سانس سے۔ عاصمہ مامی، آغا جان، شہریار ماموں، عینی اور ہم سب محبت کرتے ہیں تم سے۔ تمہیں ٹھیک ہونا پڑے گا۔ ہماری خاطر ہم سب کے لیے۔'' شہرین بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

پچھلے چند گھنٹے بے یقینی اور خدشوں میں کچھ اس طرح گزرے تھے کہ زاویار کا یوں بچ جانا، معجزہ ہو جانا اس کے اعصاب اس خوشی کو سہار نہیں پا رہے تھے۔

''آئی ایم اوکے۔'' اس کے آنسو اپنے ہاتھ پر گرتے محسوس ہوئے تو زاویار نے تمام تر طاقت جمع کر کے بہ مشکل آنکھیں کھولیں اور دھیرے سے کہا۔

''تھینکس گاڈ۔'' بہتے آنسو سمیت یک دم مسکرا دی تھی۔ زوی کم از کم کچھ بولا تو تھا۔

''تمہیں ذرا بھی اندازہ نہیں زوی کہ کل کی رات کیسے کٹی ہے تمہیں کچھ ہو جاتا تو۔ اُف میرے اللہ کتنا بھیانک وقت تھا وہ۔'' شہرین خوشی کے باوجود کل کی رات اور اس کی تاریکی کو بھول نہیں پا رہی تھی۔ جھرجھری لیتے ہوئے

بولی تو زاویار نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔
''میں کہاں ہوں۔''
''جنت میں۔ دیکھ نہیں رہے یہ حور سامنے کھڑی ہے۔'' اسے خود سے بات کرتا پا کر وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ خوشدلی سے بولتے ہوئے اس نے آنکھیں خشک کیں۔
''افوہ، بھئی ظاہر ہے اسپتال میں ہو۔ جو کارنامہ تم نے انجام دیا ہے ناں اس کے بعد ستارۂ جرأت یہیں آ کر ملتا ہے۔ ویسے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم زندگی سے اس قدر عاجز کیوں ہو۔ آخر ضرورت کیا تھی تمہیں مہران کی بائیک چلانے کی۔ ٹین ایج سے آج تک جب بھی تم نے بائیک یوز کی یا تو اس کا نقصان ہوا یا تمہارا۔ تمہیں پتا ہے ناں تمہارا ٹیمپرامنٹ بائیک ڈرائیونگ والا بالکل نہیں ہے۔ مگر پھر بھی تم نے۔'' شوخی سے بولتے، بولتے وہ سنجیدگی سے اسے ڈپٹنے لگی تھی۔ زاویار کے نقاہت زدہ چہرے پر یک دم بیزاری ابھری تو وہ گہری سانس بھر کر چپ ہو گئی۔
زاویار نے اسے خاموش پایا تو جنبش کرنے کی کوشش کی۔
''میرے سر میں شدید درد ہے۔ بلکہ پورے جسم میں۔۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں ٹھیک سے موو نہیں کر پا رہا۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے مجھے۔'' اس کی کمزور آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔
شہرین نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا۔
''کچھ پوچھا ہے میں نے۔'' وہ یقیناً غصے میں آ گیا تھا۔ مگر کمزوری کے باعث بہت زور سے نہیں بول سکا تھا۔
''تمہارا پرسوں رات شدید ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ تم کو کسی ٹرک نے ہٹ کیا تھا۔ بائیک اور تمہارا سیل دونوں ختم ہو گئے اور تمہارا ہاتھ بھی فریکچر ہے۔ سر میں شدید چوٹ آنے کے باعث تمہارا خاصا خون بہہ گیا تھا۔ اور تم پورے چھتیس گھنٹوں کے بعد ہوش میں آئے ہو۔'' اسے بتانا ہی پڑا تھا۔
''اور میرے پیر.....؟''
''وہ ٹھیک ہیں۔ البتہ ٹخنے پر شدید چوٹ آئی ہے جس کی وجہ سے تم اچھا محسوس نہیں کر رہے۔ لیکن تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ آغا جان کی ڈانٹ کھا کر تو اچھے اچھوں کو بیڈ سے اٹھنا پڑ جاتا ہے۔'' وہ نرمی سے بولی تھی۔
''کیا ماما اور آغا جان کو پتا ہے؟'' نقاہت سے سوال کیا۔
''نہیں، ابھی میں نے کسی کو اطلاع نہیں دی سوائے خولہ اور اجی بھائی کے۔۔ کیا کرتی کل تمہیں یہاں اس حالت میں دیکھ کر تو میں سمجھی کہ تم..... کہ تم.....''
''تم نے سمجھا میں مر گیا ہوں۔'' اس نے نقاہت بھری آواز میں اس کا جملہ مکمل کیا تو شہرین نے خفگی سے اسے دیکھا۔
''کتنا آسان ہے ناں تمہارے لیے یہ کہنا۔ اِدھر میری جان نکلی جا رہی تھی۔ کیا جواب دیتی میں مامی کو۔ آغا جان کو اور کیا حالت ہوتی ہے شہریار ماموں کی۔ مگر تمہیں کیا پروا۔ تم بہت کٹھور ہو زوی۔'' افسردگی اور شکایت سے مزین اس کا لہجہ زاویار کو چپ کرا گیا۔
شہرین نے اسے بغور دیکھا تو احساس ہوا کہ زاویار انصاری کے چہرے پر کمزوری اور نقاہت کے علاوہ بھی کچھ تھا۔
شاید گہرا دکھ تھا۔
یا شاید کوئی اضمحلال تھا۔
عجیب طرح کی افسردگی تھی۔
یا پھر.....

کچھ کھو دینے کا شدید ملال۔
کوئی ایسا رنج اور درد جو اس کی آنکھوں کی سطح پر سرخی بن کر چمک رہا تھا۔
''تم ٹھیک تو ہو ناں زوی؟''
کسی غیر معمولی واقعے کے وقوع پزیر ہونے کے احساس نے لاابالی سی شہرین مرزا کے دل کو چھوا تو وہ.... بے اختیار سوال کر بیٹھی۔
''ہوں۔'' مدھم سی ہوں کے ساتھ ہی زاویار نے پلکیں موند لی تھیں۔
ابھی وہ مزید کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ نرس نے اندر آ کر اسے زبردستی باہر بھیجا۔ اس کا مکمل چیک اپ کرنے کے لیے سرجن اور ساتھی ڈاکٹر ICU میں داخل ہوئے تو وہ سب اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔ مگر کچھ تھا جو شہرین کے احساس کو چھو گیا تھا۔

.....☆.....☆.....

صبح ناشتے کی ٹیبل پر اسے پتا چلا کہ کل رات شہرین بھی گھر آئی تھی۔ جو کہ صبح، صبح خولہ کے ساتھ دوبارہ اسپتال چلی گئی ہے۔
اس کا دل جیسے لمحہ بھر کے لیے رک کر دھڑکا تھا۔ کوئی بھاری لمحہ تھا جو اس کے دل پر سے گزرا تھا۔
تاہم اظہار صاحب کی واپسی پر وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی تھی۔ کیونکہ زاویار کے ہوش میں آنے کی خبر وہ ہی لائے تھے۔
اس نے اور زارا نے دل ہی دل میں لاکھ شکر ادا کیا۔
زارا کی لاڈلی چھوٹی بہن کی شادی تھی۔ میکے میں خوشی کا سماں تھا ایسے میں سسرال میں کسی بھی طرح کی ٹینشن وہ فیس کرنے پر قطعاً آمادہ نہ تھیں۔ جبکہ دُرِ مکنون کا دل تو نہ جانے کتنی طرح کے تفکرات کی آماجگاہ تھا۔
لاؤنج میں ہونے والی گفتگو سے ہی اسے پتا چلا کہ زاویار نہ صرف ہوش میں آ چکا ہے بلکہ اب خطرے سے بھی باہر ہے۔
ہاتھ میں معمولی سا فریکچر ہے جو کہ چند دنوں میں بہ آسانی ٹھیک ہو جائے گا اور سر کے زخم بھی مندمل ہو جائیں گے۔
''کاش کہ دل و روح پر لگنے والے زخم بھی اسی آسانی کے ساتھ مندمل ہو سکتے جیسے جسم پر لگے چرکے دواؤں سے ٹھیک ہو جایا کرتے ہیں۔''
ردا کے کمرے کی طرف آتے ہوئے اس نے یاسیت سے سوچا تھا پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ آئی۔
ردا کے سسرال والوں کے لیے پسند کیے گئے گفٹ آ چکے تھے۔ اور اب زوہا اور زارا کے ساتھ ردا کی کچھ سہیلیاں انہیں خوش رنگ، چمکیلے، گفٹ پیپرز میں ملفوف کرنے میں منہمک تھیں۔
میمی کے کہنے پر وہ بھی وہاں چلی آئی تھی۔ کمرے کا ماحول بہت خوشگوار تھا۔ ردا کی سہیلیاں بہت شوخ تھیں۔ ذو معنی مذاق اور چٹکلوں کے درمیان کام بھی تیزی سے کیا جا رہا تھا۔
کچھ دل پر سے ہٹنے والے بوجھ اور کچھ شادی کے گھر کے بہت خوشگوار ماحول نے اس پر خاصا اچھا اثر ڈالا تھا۔ کتنی ہی بار نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہنسی آ گئی تھی۔ زوہا اور ردا نے اسے خوشگوار حیرت سے دیکھا تو جھینپ سی گئی۔
''دیٹس لائیک مائی سسٹر۔ ایسے ہی ہنسا کرو۔ خوش رہا کرو گڑیا۔ سچ اتنی خوشی تو مجھے ردا کی شادی نہیں ہوئی۔ جتنی تمہیں ایسے مسکراتا دیکھ کر محسوس کر رہی ہوں۔'' زوہا نے اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے اسے خود سے لگایا تو وہ متشکری مسکرا دی۔

.....☆.....☆.....

''جو کچھ آپ نے میرے ساتھ کیا اسے میں کبھی معاف نہیں کرسکوں گی۔ آپ قاتل ہیں میرے اور اپنے قاتل کو میں ''محسن'' کا درجہ کبھی نہیں دوں گی۔''

''آپ لحہ، لحہ جلے ہیں ناں دوزخ میں... تو اب یاد رکھیے یہی دوزخ آپ کا مسکن ہے اور آپ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔''

''میں آپ کو ضمیر کی اس خلش سے... اس گلٹ سے کبھی آزاد ہونے نہیں دوں گی۔ جو آپ کو آپ کا ظلم یاد دلاتا رہے گا۔''

''میرے بابا اور میری ماما کے قاتل کو میں بھلا کیسے معاف کرسکتی ہوں۔ سو پلیز لیومی الون۔''

''چلے جائیں، میری اس موت سے بدتر زندگی سے نکل جائیں۔ سانس لینے دیں مجھے بھی۔ پلیز اتنا ظلم نہ کریں کہ میری ہر سانس ایک بددعا بن جائے آپ کے لیے۔'' جملوں کی بازگشت تھی یا اس کے جسم میں دوڑتے خون کو جلاتی بھڑکاتی آگ۔ جو اسے مسلسل اپنی لپیٹ میں لیے جارہی تھی۔

''اُف..... خاموش ہوجاؤ پلیز۔ خاموش۔''

یک دم وہ چلّا اٹھا تھا۔

''کیا ہوا سر؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا آپ سے۔''

میل نرس اس کے زخموں کی پٹی کھولتے کھولتے گھبرا کر بولا تھا۔

زاویار نے بے اختیار آنکھیں کھول کر اسے دیکھا جو پریشانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' اس نے انتہائی تکلیف محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

اسے ہوش میں آئے ایک دن ہوچکا تھا۔ مگر شدید درد کے باعث اسے بار، بار سکون کا انجکشن لگا دیا جاتا تھا۔ جس کا اثر اس کے ذہنی انتشار کے باعث وقت سے پہلے ہی ختم ہوجاتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔

اسے اپنے سینے میں ایک ٹیس اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔

''دُرِ مکنون، مجھے معاف کردو۔''

لبوں نے بے آواز جنبش کی اور آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی جسے اپنے اندر اتارنے کی خاطر اس نے پٹ سے آنکھیں کھول کر کمرے کی چھت پر لگے پنکھے کو دیکھا تھا۔

اس کی زندگی کی طرح وہ بھی بالکل ساکت تھا۔

''چلیے آپ کی ڈریسنگ تو مکمل ہوئی۔ ہوپ فلی۔ آپ جلدی ری کور کریں گے۔'' میل نرس خوش مزاج تھا۔ مسکرا کر بولا۔

زاویار نے کسی گہری سوچ سے نکل کر اسے دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

ایک دو پیشہ ورانہ مشورے دے کر وہ رخصت ہوا تو اس نے اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑائی۔

اسے پرائیویٹ روم میں شفٹ کردیا گیا تھا۔

گھڑی پر نظر ڈالی تو احساس ہوا کہ دن ڈھل رہا ہے۔

''گویا زندگی کے کچھ دن عالم بے ہوشی میں گزر گئے زاویار انصاری۔ کتنا ہی اچھا ہوتا جو یہ بے ہوشی کچھ دیر اور طاری رہتی۔''

''اپنوں'' کی تکلیف کا احساس کیے بغیر جو اس کے حادثے کے سبب وہ اٹھا رہے تھے۔ اس نے قدرے بے حسی سے سوچا۔ ابھی کچھ اور سوچنا چاہتا ہی تھا کہ مولا بخش کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر اس کا ذہن صحیح معنوں میں بیدار ہوا۔

ہاتھوں میں پھلوں کا تھیلا لیے وہ بڑی خوشی اور گرمجوشی سے اس کے پاس چلا آیا تھا۔
''کیسے ہو صاحب؟ خدا کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ کو نئی زندگی دی ہے۔'' مولا بخش عقیدت سے اسے دیکھ رہا تھا۔
''میں ٹھیک ہوں۔ تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے بروقت اسپتال پہنچایا۔'' اس نے مولا بخش سے کہا۔ ''کاش کہ نہ پہنچایا ہوتا۔''
''ارے آپ تو مائی باپ ہو ہمارے۔ ہم تو احسان مند ہیں آپ کے صاحب۔ اس چمڑی کا جوتا بنا کر بھی آپ کو پہنائیں تو بھی آپ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔'' مولا بخش نے ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے کہا۔
''پلیز مولا بخش!'' میں نے کئی بار کہا ہے میرے سامنے اس طرح مت کیا کرو۔ بیٹھ جاؤ۔'' اس نے تھکے، تھکے لہجے میں ٹوکا تو مولا بخش معافی کا خواستگار ہوا۔
کچھ دیر وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ شہرین اور میمونہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔
''ہائے میرا بچہ، یا اللہ کیا ہو گیا اسے۔''
میمونہ بیگم تڑپ کر بھتیجے کی طرف بڑھی تھیں۔
زاویار نے ناراضی سے سائڈ ٹیبل پر ہاٹ پاٹ رکھتی شیری کی طرف دیکھا جسے اس نے میمونہ اور خاص طور پر عاصمہ بیگم کو اس حادثے کی اطلاع دینے سے منع کیا تھا۔
میمونہ بیگم نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیا تھا۔ وہ بہت متاثر ہوا۔
''ٹیک اٹ ایزی مما، یہ ٹھیک ہے اب۔'' شیری نے اس کی سخت نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے ماں سے کہا تو وہ یکدم بھنا گئیں۔
''یہ تمہیں ٹھیک نظر آ رہا ہے شیری۔ حواسوں میں تو ہو تم۔ میرے بچے کا اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔''
میمونہ بیگم تڑپ اٹھی تھیں۔ مولا بخش اس دوران کمرے سے نکل گیا تھا۔
''کم آن مما؛ ایک کرنل کی بیوی اور ایک میجر کی ماں ہوتے آپ کو اس طرح ہاتھ پیر چھوڑ دینا سوٹ نہیں کرتا۔ لہٰذا خود بھی ریلیکس رہیں اور اس اود بلاؤ کو بھی سمجھائیں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر مامی آ رہی ہیں کوئٹہ سے۔ ابھی تو انہیں بھی سنبھالنا ہوگا۔''
جوس کے ڈبے سے گلاس میں جوس انڈیلتے ہوئے وہ بولی تھی۔
''شیری!'' یک دم زاویار نے اسے گھورا تھا۔ ''میں نے منع کیا تھا ناں کہ تم ماما کو فون نہیں کرو گی۔''
''آئی ایم سوری، پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے میں انہیں جھوٹ بول، بول کر مطمئن کر رہی تھی۔ مگر اس سے زیادہ ظلم میں نہیں کر سکتی ان پر۔ تمہیں معلوم ہے وہ کس طرح رو رہی تھیں۔ میرے کسی جھوٹ پر انہیں یقین نہیں آیا تھا۔''
زاویار کے انداز پر اسے بھی طیش آ گیا تھا۔ جھلا کر بولی اور جوس کا گلاس سائڈ ٹیبل پر ہی پٹخ دیا۔
''بیٹا زدی، شیری ٹھیک کہہ رہی ہے۔ عاصمہ ماں ہے۔ ماں کے دل میں تو گویا ٹرانسمیٹر فٹ ہوتا ہے۔ کوئی کہے نہ کہے۔ بتائے نہ بتائے اولاد کی تکلیف پر اس کا دل اسے سگنل دیتا ہے۔ خطرے کا الارم اس کے اندر بجتا ہے۔ اگر اب بھی عاصمہ کو نہ بتایا جاتا۔ تب بھی اس نے واپسی کی ٹکٹ لے لی تھی۔''
میمونہ بیگم نے پیار سے زاویار کی کشادہ پیشانی چوم کر کہا تو وہ چپ سا رہ گیا۔
شیری اطمینان سے اس کے سامنے پڑے صوفے پر جا بیٹھی تھی۔
''بلکہ چند دنوں میں آغا جان اور شہریار ماموں کو بھی فیس کرنے کی تیاری کر لو۔''

''اوہ۔'' اس نے گہری سانس بھر کر دونوں ماں بیٹی کو دیکھا اور سر نفی میں ہلا کر رہ گیا۔
میمونہ بیگم کے سامنے وہ موجود تھا۔ مگر بار بار حادثے کے خیال سے وہ لرز، لرز جاتی تھیں۔ کبھی اس کا ماتھا چومتیں۔ کبھی صدقہ نکالتیں۔ کبھی کچھ پڑھ کر دم کرتیں۔
''بس کریں مما۔ اس پر اتنا کچھ پڑھ کر دم کریں گی تو کہیں یہ جن کا بچہ ایسے غائب نہ ہو جائے جیسے لاحول پڑھنے سے شیطان اڑنچھو ہوتا ہے۔''
پھوپی، بھتیجے کے لاڈ کو اس نے شریر نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو زاویار نے گہری نظر اس پر ڈالی جو اس کے ہوش میں آنے پر کس طرح خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ اور اب بظاہر خود کو فریش ظاہر کرتی چھیڑ چھاڑ کرتی شہرین کی آنکھوں میں اسے تفکر اور گزری بھاری ساعتوں کا سہم صاف دکھائی دے رہا تھا۔
جملہ ہی اس نے ایسا کہا تھا جس پر ماں سے ڈانٹ پڑنا یقینی تھا۔ تاہم وہ چپکے، چپکے ہنستے ہوئے زاویار کے لیے سیب کاٹتی رہی اور ماں کی گھرکیاں بھی سنتی رہی۔
اپنی تکلیف اور درد کے ساتھ، ساتھ زاویار کا ذہن عاصمہ بیگم کے ردِعمل کا سوچ کر اور بھی پریشان ہوا جا رہا تھا۔ اسے اپنے سے زیادہ ان کی فکر ستا رہی تھی۔ اور یہ فکر کچھ بے جا نہیں تھی۔
جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ زاویار پر نظر پڑتے ہی ایک دلخراش چیخ کے ساتھ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر آ رہی تھیں۔
''یا اللہ!'' میمونہ اور شہری تڑپ کر آگے بڑھیں مگر اس وقت تک وہ دہلیز میں ہی گر کر بے ہوش ہو چکی تھیں۔
زاویار شدید کوشش کے باوجود اٹھنے میں ناکام رہا۔ جوڑ، جوڑ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کمر تک خود کو اٹھانے

کے بعد اس کی تمام تر طاقت گویا ختم ہوگئی تھی۔
وہ خود پر کوئی قابو نہ پاتے ہوئے واپس لیٹ گیا تھا۔
شیری اور میمونہ نے عاصمہ بیگم کو اٹھا کر ساتھ رکھے صوفے پر لٹایا اور دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائیں۔
''شاک لگا ہے انہیں۔ ویسے یہ ٹھیک ہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ ہوش میں آجائیں گی۔'' ڈاکٹر چیک کر کے اطمینان دلاتا چلتا بنا۔
''یہی وجہ تھی کہ میں نے منع کیا تھا تمہیں۔ دیکھ رہی ہو کیا حال ہوا ہے ان کا۔'' زاویار تلخی سے شیری پر ہی الٹ پڑا تھا۔
''ان کے حال کی اس قدر پروا ہے تو پھر خود کا خیال رکھنا سیکھو زوی۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ تم اس دنیا میں اکیلے نہیں ہو۔ بہت سے لوگ ہیں جو تم سے محبت کرتے ہیں، تمہاری زندگی سے منسلک ہیں۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔ مگر جس طرح تم اپنی زندگی کو carelessly ٹریٹ کر رہے ہو مجھے نہیں لگتا۔ تمہیں ان لوگوں کی ذرا سی بھی پروا ہے۔''
چند ثانیے اسے سنجیدگی سے دیکھتی شیری نے اس کی توقع کے برعکس کچھ ایسے ٹھہرے ہوئے متانت بھرے لہجے میں کہا کہ وہ چونک سا گیا۔
''کیا مطلب ہے تمہارا؟ تمہیں لگتا ہے کہ یہ ایکسیڈنٹ میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ میں خود کو مارنا چاہتا تھا کیا؟''
وہ جیسے بلبلا اٹھا تھا۔
غیظ و غضب میں اس کو گھورا۔
''اب اس سوال کا جواب تو تمہیں خود ہی پتا ہوگا۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ تم ہمیشہ سے میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں میں سے ہو۔ جب بھی کچھ ان چاہا ہوا تم نے راہ بدلی۔ مگر یہ جینے کا کوئی ڈھنگ نہیں ڈیئر۔ جینا ہے تو زندگی کی آنکھ میں آنکھ میں ڈال کر جیو۔ زندگی کسی ایک موڑ پر آ کر ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ یہ تو لحہ، لحہ قدم بہ قدم منزل بہ ...منزل ساتھ چلتی ہے۔ جینے والوں کے لیے۔''
اُدھر اطمینان کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔
زاویار انصاری نے آنکھیں سکیڑ کر اس نازک سی شریر سی شہرین مرزا کو دیکھا۔ جو اس وقت کس قدر بردبار لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ جسے سمجھنا اس کے بس میں نہ تھا۔
''یہ کون سی نئی فلم کے ڈائیلاگ تھے۔'' طنزیہ لہجہ...شعوری طور پر اپنایا گیا تھا۔
''اس فلم کے جو گزرے دنوں میں ہم نے دیکھی ہے تم نے نہیں۔'' ایک شانِ استغنا سے کہتی... وہ اس کے پاس سے ہٹ آئی تھی۔
عاصمہ بیگم کو ہلکا، ہلکا ہوش آنے لگا تھا۔ دونوں ماں بیٹی لپک کر ان کے پاس آئی تھیں۔
زاویار نے بے بسی سے اپنے زخموں سے چور جسم کو دیکھا۔ ان کے بہتے ہوئے آنسوؤں پر اسے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔
اس کی وجہ سے کتنے لوگ تکلیف میں گھر گئے تھے۔ جہاں اتنی محبتوں نے دل میں خوشگوار سا تاثر چھوڑا۔ وہیں پشیمانی نے بھی اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔
رات تک مومنہ اور مہران بھی دوسری فلائٹ پکڑ کر کراچی چلے آئے تو ان کی محبتوں پر زاویار انصاری کی شرمندگی دُگنی ہوگئی۔

.....☆.....☆.....

عصر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔

دادی، زارا کے پاس سے اٹھ کر گئیں تو زارا ذہن کو ہلکا محسوس کرنے کے باوجود دل میں آئے ملال کو نظر انداز نہ کر سکی۔

''کیا بات ہے۔تم کس سوچ میں ہو زارا؟''

سائرہ بیگم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بیٹی کے چہرے پر سوچ کے گہرے بادل چھائے دیکھے تو لامحالہ قریب چلی آئیں۔

''ہوں۔'' وہ اپنے خیال سے باہر آئی۔ماں کی طرف دیکھا تو مسکرادی۔'' کچھ خاص نہیں۔بس یونہی ابھی دادی سے بات کر رہی تھی۔''

''خولہ کے بارے میں؟'' انہوں نے ساتھ بیٹھتے ہوئے دلچسپی کا اظہار کیا۔

''جی۔''

''تو پھر کیا جواب ملا؟''

ردا کی شادی کی مصروفیت میں ان کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ ساس کے ساتھ بیٹھ کر تسلی سے دو باتیں کر لیتیں۔سو لگے ہاتھوں بیٹی سے ہی پوچھ لیا۔

''بس دادی نے انکار کیا ہے، نہ اقرار۔میں نے ان سے عکرمہ کی رائے معلوم کی تھی۔بقول دادی کے عکرمہ نے گو کہ سب ان پر چھوڑ رکھا ہے مگر انہیں ایسا خدشہ ہے کہ شاید وہ خولہ کو بحیثیت پارٹنر قبول نہیں کر پا رہا ہے۔''

''اس نے ایسا کچھ کہا تھا کیا؟''

سائرہ بیگم کے ماتھے پر شکنیں ابھریں۔

''نہیں مگر اس نے حامی بھی نہیں بھری۔وہ کھل کر اس ٹاپک پر ان سے بات نہیں کر رہا ہے۔اور اس کے اسی رویے سے دادی نے جج کیا ہے کہ شاید عکرمہ کی یہاں مرضی نہیں ہے۔گو کہ اس نے انکار بھی نہیں کیا۔مگر دادی اس کے مزاج کو سمجھتی ہیں۔''

زارا نے قدرے اطمینان سے ساری گفتگو کا حاصل ماں کے سامنے رکھا تو انہوں نے بغور بیٹی کی طرف دیکھا۔

''گویا اماں نے ایک طرح سے انکار کر دیا ہے۔اور تم اس بات پر مطمئن ہو۔اب اظہار کو کیا جواب دو گی تم؟''

بیٹی کا اطمینان ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

جواب میں زارا نے آغا جان کے فیصلے سے ان کو آگاہ کیا تو وہ ناگواری کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکیں۔

''تو اس پروپوزل کا خیال انہیں اس وقت کیوں نہیں آیا جب خولہ ان کے پاس ہی لاہور میں رہا کرتی تھی۔ذرا سوچو اگر ابھی اماں نے ہاں کر دی ہوتی یا عکرمہ نے اپنا انٹرسٹ خولہ میں ڈیولپ کر لیا ہوتا تو کتنی embarassing سچویشن ہو سکتی تھی تمہارے لیے۔''

''وہی تو میں نے بھی اظہار سے یہی کہا تھا مگر ان کا تو آپ کو پتا ہے۔آغا جان کو اپنے والد اور دادا کی جگہ مانتے ہیں وہ۔اوپر سے خولہ بھی بھائی کی حامی ہے۔وہ کسی بھی قسم کی ٹینشن کو فیس نہیں کرنا چاہتی۔اس لیے اس نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا ہے۔اب ایسے میں آج جب دادی نے مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں انکار کیا تو خود کو بہت ریلیکس فیل کر رہی ہوں میں۔''

درحقیقت کئی دنوں سے اس سوچ نے زارا پریشان کر رکھا تھا کہ شیرازی ولا میں اس نئی ڈویلپمنٹ کا ذکر کس طرح کرے۔مگر اللہ نے اس کی مشکل خود آسان کر دی تھی۔

اظہار تو سب کچھ اس کے کندھے پر ڈال کر مطمئن ہو گئے تھے۔مگر فیس تو اس کو ہی کرنا تھا ناں۔تاہم زارا کو بھی خولہ

کے اس طرح طارق کے لیے مان جانے پر حیرت تھی۔ جس نے کچھ دن پہلے ہی تو عکرمہ کے لیے اقرار کیا تھا۔

''ہوں، چلو اچھا ہی ہوا۔ ود آؤٹ ٹینشن ہی یہ پرابلم solve ہوگئی۔'' سائرہ بیگم نے نخوت سے سر جھٹکا اور گہری سانس بھری۔

''بالکل، ویسے بھی آغا جان کراچی آرہے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے ہی تھینک گاڈ سب کچھ سیٹل ہوگیا۔'' زارا خوش تھی۔

''اینی وے اب کس سے رشتہ طے کیا ہے خولہ کا''

''کل جس سے آپ ملی ہیں ناں..... شہرین، اس کے بھائی سے۔ آرمی میں میجر ہے۔ فیملی کا ہے اور سب سے بڑھ کر آغا جان کا حکم ہے۔''

''ہوں۔ اور یہ لڑکی شہرین۔ یہ کیسی ہے۔ ازشی انگیجڈ؟''

''فی الحال تو نہیں ہے مگر آغا جان جلد ہی زاویار اور اس کا رشتہ بھی طے کرنے والے ہیں۔ مگر ابھی اس میں کچھ وقت ہے پہلے زاویار ٹھیک ہو جائے غالباً اس کے بعد۔''

''زاویار.....'' یہ نام سائرہ بیگم کو چونکا گیا۔ انہیں خیال آیا کہ دُرِمکنون سے ملاقات کے بعد نازیہ نے انہیں کانٹیکٹ ہی نہیں کیا۔

''کیا ہوا، آپ کیا سوچنے لگیں'' زارا نے ماں کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں فوراً نوٹ کی تھیں۔

''کچھ نہیں۔'' سائرہ بیگم کسی خیال سے نکل کر مسکرائی تھیں۔

تاہم دل ہی دل میں نازیہ کو فون کرنے کا ارادہ باندھا۔

''پھر بھی بتائیں تو سہی۔''

زارا کو ماں کے چہرے پر دبا، دبا جوش نظر آیا تھا۔ وہ ان کے سر ہوگئیں۔

مگر سائرہ بیگم نے اس وقت اس موضوع کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ ابھی انہیں نازیہ اور زاویار کے جواب کا انتظار تھا۔ اس لیے بیٹی کو ٹالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ زاویار کا پروپوزل، اس کے سامنے دُرِمکنون کا بے ہوش ہو جانا اور اکیلے میں ان دونوں کی ملاقات کا انہوں نے بیٹیوں سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔

''افوہ بھئی، یہ ذرا لمبی کہانی ہے۔ تمہیں فرصت سے سناؤں گی۔ فی الحال تو تم اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔ میری کلب ممبرز کے کارڈ ابھی بانٹنے باقی ہیں۔ اکیلے جانے کا موڈ نہیں۔ میں تمہیں ساتھ لے جانے ہی آئی تھی کہ باتوں میں لگ گئی۔'' ہاتھ پکڑ کر زارا کو اٹھایا اور پھر اس کے اصرار کے باوجود انہوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔

اور اِدھر دروازے کے اس طرف دستک دینے کے انتظار میں کھڑی دُرِمکنون کا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا۔

''شہرین اور زاویار انصاری۔''

''یا میرے اللہ۔'' کیسا انکشاف تھا یہ۔ ساتھ بنی اسٹڈی میں آکر بیٹھتے ہی اس نے اپنا سر ہاتھوں پر گرا لیا تھا۔

''شہری آپی اور زاویار انصاری۔''

اس نے چشمِ تصور سے ان دونوں کو دیکھا اور گہری سانس بھری۔

''تو گویا زاویار انصاری نے فیصلہ بدل لیا۔ وہ بھی اتنی جلد۔''

کسی ملال یا رنج کا شائبہ نہیں تھا دل میں۔ مگر پھر بھی اسے کسی بات سے دھچکا لگا تھا۔ شاید شہرین جیسی پیاری لڑکی کا نصیب زاویار انصاری سے جڑنا اسے دکھ دے گیا تھا۔ یا پھر زاویار کا اسے زندگی بھر کا عذاب دے کر خوب صورت زندگی کے خواب خرید لینا اسے افسردہ کر گیا تھا۔

کچھ بھی تھا۔
بہر حال اسے تکلیف پہنچی تھی۔
''کمال ہے دُرِ مکنون زاہد۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ کم از کم تمہاری تو جان خلاصی ہوئی اس بے حس انسان سے جس پر تمہارا قرض ہے۔'' کوئی اس کے اندر بڑی ایمانداری سے بولا تھا۔
''ہاں میں خوش ہوں اپنے لیے۔ مگر شہری آپی؟ اُف اللہ۔ یہ کیسی خوشخبری ہے جو میرا دل جلائے جا رہی ہے۔''
وہ اپنے آپ سے کہتے، کہتے اپنے رب سے مخاطب ہو گئی تھی۔ اور پھر شہرین کے لیے دل سے دعا کرتے ہوئے اس کی آنکھ سے بہہ نکلنے والا گرم سیال اس کے دوپٹے میں جذب ہوتا چلا گیا۔

.....☆.....☆.....

پورے تین سال بعد آغا جان اس کے سامنے تھے۔ ان کا بارعب وجود کسی سال خوردہ درخت کے مانند کمزور نظر آنے لگا تھا۔ جس لمحے وہ کمرے میں داخل ہوئے وہ ابھی سو کر اٹھا تھا۔ ان کے عقب میں شہریار انصاری تھے اور ساتھ میں عینی۔
پورے ہفتے بھر بعد اس نے میمونہ اور شہرین کو لاہور اطلاع کرنے کی اجازت دی تھی۔
''زوی بھائی۔'' عینی لپک کر اس کی طرف بڑھی تھی۔ ''اُف یہ کیا حال ہو گیا ہے آپ کا بھائی۔'' حسبِ توقع وہ رو پڑی تھی۔
زادیار نے بے چینی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔
شکر ہے عاصمہ اور مہران میں سے اس وقت کوئی بھی اس کے کمرے میں نہ تھا۔ غالباً انصاری فیملی کو آتا دیکھ

کردہ کہیں باہر ہی رک گئے تھے۔
اس کا ہاتھ عینی کے سر پر آرکا۔
''السلام علیکم!''
پہلے والد اور دادا کی طرف نظر اٹھا کر سلام کیا پھر عینی کے سر کو تھپکتے ہوئے وہ پھیکے پن سے مسکرا دیا تھا۔
''میں ٹھیک ہوں عینی۔ پلیز رووٴ مت، تمہیں پتا ہے ناں کہ میں تمہارے آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔'' حقیقتاً اسے عینی کا رونا تکلیف دے رہا تھا۔
''بیٹا عینی بس کرو۔ دیکھو تو اس کی طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں ہے۔''
یہ آغا جان تھے۔ ''اتنی نرمی اور حلاوت؟'' اس نے چونک کر اُن کے چہرے پر نظر جمادی۔
''کیسے ہو زادیار، اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' شہریار انصاری کے لہجے کا دم خم اور طنز جیسے کہیں جا چھپا تھا۔ آغا جان کی طرح وہ بھی کس قدر فکر مند تھے۔
''آئی ایم فیلنگ بیٹر۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔
آغا جان اس کے بیڈ پر اس کے پاس آبیٹھے تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اُن کی طرف متوجہ کیا۔
''یہ سب ہوا کیسے؟''
ان کے استفسار پر اس نے مختصراً سارا واقعہ کہہ سنایا۔ تاہم ''وجہ'' حذف کر گیا۔
''خدا کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ اس نے تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھا۔'' اس کا ہاتھ اپنے بوڑھے ہاتھوں میں لیتے ہوئے آغا جان متشکر سے بولے تو وہ ان کا لمس محسوس کر کے ششدر رہ گیا۔ آنسوؤں نے انہیں اپنی بات مکمل کرنے نہیں دی تھی۔
بہت پرانی بات تو نہیں تھی۔ تین سال پہلے کا سارا منظر جیسے اس کی آنکھوں میں زندہ تھا اور آج وہ ہی آغا جان اور پاپا اس کے سامنے تھے۔
''جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ مائی سن۔ تمہارے بغیر تمہارا گھر بہت اداس ہے۔ اور تمہارا باپ بھی۔''
شہریار انصاری آنکھوں میں نمی اور محبت لیے آگے بڑھے تو وہ اپنے منفی جذبات اور تاثرات کو بہ مشکل چھپا سکا۔
اس وقت جسمانی کمزوری اس کے دل و دماغ پر بھی حاوی ہو چکی تھی۔ وہ گھر جہاں سے اسے نکلنا پڑا۔ آج اسے یاد کر رہا تھا۔
''اونہہ۔'' زہر آلود سوچیں اس کا گھیراؤ کرنے لگیں تو اس نے قصداً آنکھیں موند لیں۔
آغا جان اور شہریار انصاری نے دیکھا۔ اس کے چہرے پر گزرے دنوں کی تلخ یادیں اب بھی گرد کی طرح جمی تھیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے چھپی بیزاری کو وہ دونوں محسوس کر سکتے تھے۔
''کیا ہوا بھائی! کیا بہت درد ہو رہا ہے؟'' عینی اس کے یوں آنکھیں میچ لینے پر متردد سے پوچھنے لگی تو اس نے گہری سانس بھر کر آہستگی سے آنکھیں کھول دیں۔
''ہوں..... یہی سمجھ لو۔''
''ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟''
''کچھ خاص نہیں۔ بس یہی کہ زخم بھرنے میں وقت لگے گا۔ اب دیکھیں کتنا وقت لگتا ہے۔''
''ان شاء اللہ بہت جلد بھر جائیں گے زخم۔ مجھے پتا ہے میرے بھائی کا ول پاور بہت اسٹرانگ ہے۔ یہ چھوٹے موٹے زخم تو آپ کا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتے۔'' عینی تیقن سے کہہ رہی تھی۔

اس کی تفکر بھری نظریں بار، بار زاویار کے زخموں کو چھو کر پلٹ رہی تھیں اور ہر بار اس کی موٹی، موٹی آنکھوں میں آنسو بھرنے شروع ہو جاتے جنہیں وہ بدقت مسکرا کر پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''جسم پر لگنے والے زخم تو واقعی بھر جائیں گے۔ مگر جو روح پر تازیانے پڑے ہیں ان کا کیا؟''

اس نے جلتی ہوئی نظر باپ اور آغا جان پر ڈالی۔

''گزرے دنوں کو بھول جاؤ بچے، زندگی آگے کی طرف سفر کرتی ہے۔ کب تک بیتے وقت کو مٹھی میں جکڑ کر بیٹھے رہو گے۔ ماضی سے باہر آجاؤ۔ دیکھو تو اس باری تعالیٰ نے تمہیں دوبارہ زندگی دی ہے۔ اسے نئے سرے سے شروع کرو۔ اپنے باپ کی طرف دیکھو۔ یہ اب بوڑھا ہو رہا ہے۔ اسے تمہاری ضرورت ہے اور مجھے بھی۔''

آغا جان جیسے اس بار اس کی تیغ صفت نگاہ برداشت نہ کر سکے تھے۔ بے ساختہ اس کی فراخ پیشانی پر اپنا ضعیف ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ان کی گدلائی ہوئی بوڑھی آنکھوں میں التجا تحریر تھی۔

عینی ماحول میں در آتی سنجیدگی محسوس کر کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں زوی۔ تم ٹھیک ہو جاؤ پھر ہم ساتھ چلیں گے لاہور۔ اتنا وقت تمہارے بغیر کس طرح گزرا ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔'' یہ محبت بھرا اندازِ تکلم اور وہ بھی شہریار انصاری کا۔

زاویار کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

''ویری نائس۔ بہت اچھا سین create کر لیتے ہیں آپ لوگ، میں خواہ مخواہ آپ لوگوں کی صلاحیتوں پر ہمیشہ شک کرتا رہا۔'' وہ بولا تو اس کے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی گویا شرارے نکل رہے تھے۔ ماتھے کی رگ پھول گئی تھی۔ طیش کے سبب اس کا تنفس بھی اعتدال پر نہیں رہا تھا۔

''زاویار، یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔'' شہریار صاحب زیادہ تحمل کا مظاہرہ نہ کر سکے تھے۔ یک دم غصے سے بولے تو آغا جان نے انہیں ٹوک دیا۔

''ایک منٹ شہریار، تم خاموش رہو۔ کہنے دو اسے جو یہ کہنا چاہتا ہے۔ سارا غبار نکلنے دو اس کا۔'' ان کے چہرے پر پشیمانی درج تھی تو آنکھوں سے پچھتاوا عیاں تھا۔ زاویار کا غصہ ان کے ٹھنڈے لہجے پر قدرے سرد پڑنے لگا۔

''تم کہو بیٹا، پہلے بھی تمہاری نہ سن کر میں نے تمہیں خود سے دور کر دیا تھا مگر اب نہیں۔ تم خواہ یہاں رہو یا لاہور میں ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں رہو۔ میں دل کی کدورتیں دور کرنا چاہتا ہوں۔ کہہ دو اپنے دادا سے جو کچھ تمہارے دل میں ہے۔'' آغا جان جیسے کرختگی کے خول کو چٹخا کر باہر نکل آئے تھے۔

زاویار اس کایا پلٹ کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے چند ثانیے کچھ بول ہی نہ سکا۔

''کہو بیٹا، تمہارا ہر شکوہ، ہر شکایت سننے اور دور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بس تم اپنا دل صاف کر لو۔ میں ہر نقصان کی تلافی کر دوں گا۔''

اپنائیت اور حلاوت سے کہتے وہ اسے ان آغا جان سے بہت مختلف لگے جنہیں وہ بچپن سے جانتا آیا تھا۔ جن کے کرخت، کھردرے اور سخت گیر مزاج کے باعث لوگ ان سے دور، دور رہا کرتے تھے۔ جنہوں نے گزشتہ سال میں جب بھی ماما کو فون کیا صرف حکم ہی سنائے تھے۔ آج وہ اس کے حکم کے منتظر تھے۔

جنہوں نے گزری آٹھ دہائیاں صرف دوسروں پر حکومت کی، دوسروں سے ''اپنی'' منوائی تھی۔ مگر زاویار کی بات اور تھی وہ ان کے بہت نزدیک تھا۔ لیکن یہ قربت گزرا حادثہ کہیں دفن کر آیا تھا۔

اس نے گہری نظر ان پر ڈالی تو اس کی آنکھوں سے چھلکتی بے اعتباری آغا جان کو اپنی نگاہ کا زاویہ بدلنے پر مجبور کر گئی۔

''جسٹ لیٹ اٹ گو آغا جان۔ اب کچھ بھی کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کچھ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں۔

صرف صحیح وقت ان کا ہرجانہ ہوتا ہے مگر صد افسوس کہ وہ وقت بھی ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ بھلا مُردے میں بھی جان ڈالی جاسکتی ہے۔'' اس کا دل کہہ رہا تھا۔

''مجھے کسی سے کچھ نہیں کہنا۔ the time is up'' مدھم آواز میں کہہ کر اس نے دروازے کے پاس سے گزرتی نرس کو پکار لیا۔

''سسٹر میں کمرے میں گھٹن محسوس کر رہا ہوں۔ کیا میں کچھ دیر کے لیے باہر جاسکتا ہوں؟''

اس نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آف کورس مگر اس کے لیے آپ کو ہیلپ کی ضرورت ہوگی۔ آپ ایک منٹ ٹھہریے میں میل نرس کو بھیجتی ہوں۔'' سسٹر اسے انتظار کرنے کا کہہ کر باہر نکل گئی۔

پیر بستر سے اتارتے ہوئے وہ بہ مشکل بیڈ کے کنارے بیٹھ سکا۔

شہریار اور آغا جان نے ایک دوسرے کو مایوسی سے دیکھا اور کمرے میں پڑے صوفے پر جا بیٹھے۔

ذرا دیر بعد ایک میل نرس کے سہارے وہ بدقت تمام بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آج کئی دن بعد پیروں نے زمین کو چھوا تھا۔ اس دوران تو صرف میل نرس نے اسے تھوڑی بہت فزیوتھراپی کرائی تھی۔

آج اتنے دن بعد پیروں پر وزن ڈالا تو اندازہ ہوا کہ اس کے جسم میں کس قدر درد گردش کر رہا ہے۔ کمزوری بھی کافی تھی۔ تکلیف کی شدت کے باعث اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

آغا جان بے ساختہ اٹھ کر اس کے پاس آئے اور اس کا بایاں ہاتھ تھام لینا چاہا۔

''پلیز آپ زحمت نہ کریں۔ میں کچھ دیر باہر اکیلے گزارنا چاہتا ہوں۔'' باوجود کوشش کے وہ اپنے لہجے کی خشکی اور بیزاری دبا نہیں سکا تھا۔

آغا جان کا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔ انہوں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے کمرے سے باہر جاتا دیکھا اور تھکے، تھکے قدموں سے چلتے شہریار انصاری کے پاس چلے آئے۔

''کہا تھا میں نے کہ وہ نہیں مانے گا۔ خودسر اور ہٹ دھرم ہے وہ۔ باپ ہوں میں اس کا اور اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اپنی ماں کی طرح بڑی اونچی ناک ہے اس کی۔ کٹ جائے گا مگر جھکے گا نہیں۔'' شہریار انصاری غصے سے تلملا رہے تھے۔

آغا جان نے انہیں سنجیدگی سے دیکھا اور جب بولے تو لہجے میں رعب اور مزاج شناسی کا زعم تھا۔

''میں اس کے باپ کا بھی باپ ہوں۔ کچھ عقل میں بھی رکھتا ہوں برخوردار... درحقیقت وہ اخروٹ کی طرح ہے۔ اوپر سے سخت اور اندر سے نرم۔ وہ مان جائے گا۔ مجھے معلوم ہے۔ بس ذرا پیار سے سمجھانا ہوگا۔ ہمارے خاندان کا اکلوتا وارث ہے وہ۔ اس پر زیادہ سختی اچھی نہیں۔ پروردگار کا لاکھ، لاکھ احسان ہے، اس نے اسے نئی زندگی بخشی ہے۔ ہمیں فی الحال اصرار سے پرہیز کرنا چاہیے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ لہجہ گہرا تھا۔

پھر قدرے توقف کے بعد بیٹے کی طرف تیز نظروں سے دیکھا۔

''تم بات، بات میں اس کی ماں کا ذکر مت نکالا کرو۔ یہ تو اسے بھڑکانے والی بات ہے۔ دودھ دینے والے گائے کی دو لاتیں بھی سہی جاتی ہیں۔ اس وقت صرف عاصمہ ہی ہے جو زاویار کو سمجھا سکتی ہے۔ اسے شہرین سے شادی پر آمادہ کرسکتی ہے۔ اس لیے تم خود کو اس معاملے سے دور کرلو یہی بہتر ہے۔ باقی میں خود دیکھ لوں گا۔'' سخت لہجے مگر مدھم آواز میں انہوں نے بیٹے کو تلقین کی تھی۔

شہریار انصاری جھلا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے تھے کہ اندر آتی عاصمہ عثمان کو دیکھ کر لمحے بھر کے لیے ٹھٹکے۔

نہ جانے کتنے سال بعد ایک دوسرے کا سامنا ہوا تھا۔
عاصمہ بے اختیار دروازے کی چوکھٹ تھام گئیں۔

.....☆.....☆.....

شام ڈھلنے کو تھی۔ ڈوبتے سورج کی سرخی افق پر بادلوں کی چادر کے پیچھے سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔ غالباً مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ آسمان پر ہلکی، ہلکی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ سو ہوا میں دلفریب ٹھنڈک موجود تھی۔
لال اینٹوں سے بنی اسپتال کی عمارت کے پرلی جانب بنائی مصنوعی جھیل کے کنارے بیٹھے اس کا ذہن کہیں دور پرواز میں مصروف تھا۔ بینچ کی بیک سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے وہ گزرے دنوں میں رونما ہونے والے حادثے اور واقعات کو از سرِ نو ذہن میں ترتیب دے رہا تھا کہ قریب آتی ایٹرنٹی کی خوشبو نے توجہ کا ارتکاز توڑ دیا۔
بنا آنکھیں کھولے بھی اسے پتا چل گیا تھا کہ شہرین آئی ہے۔
''اُف..... کس قدر پُرسکون جگہ ہے ناں یہ۔'' اپنے پہلو میں آ کر بیٹھتی شہرین کی آواز اسے بالآخر ماضی قریب سے حال میں لے آئی۔
''سکون کا تعلق جگہ سے نہیں دل سے ہوتا ہے۔'' آنکھیں کھولتے ہوئے وہ بلا ارادہ کہہ گیا تھا۔
''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس نثری شاعری کی آمد تم پر اچانک ہی ہوئی ہے یا پھر یہ میرے آنے کا اعجاز ہے۔'' شہرین نے بغور اسے دیکھا۔
خوشگوار انداز، فریش چہرہ، جاذب نظر سراپا..... زاویار نے رخ موڑ کر اسے دیکھا۔
آنکھوں میں شوخی لیے وہ اس کی طرف متوجہ تھی۔
''پھپھو کیسی ہیں۔ آج آئی نہیں؟'' خلافِ عادت اس نے استفسار کیا تھا۔ شہرین سے رہا نہ گیا۔
''زہے نصیب، بڑی بات ہے بھئی آپ کی پھپھو کی کہ مسٹر زاویار انصاری انہیں یاد کر رہے ہیں۔'' ایک ادا سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے وہ بولی... تو زاویار نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔
''تم یہاں میرا سر کھانے آئی ہو کیا؟''
''آف کورس ناٹ، تمہارے لیے کھانا لائی تھی۔ تمہیں کمرے میں نہ پایا تو ڈھونڈتی ہوئی یہاں آ گئی۔'' اب کے شرافت کے جامے میں لوٹتے ہوئے جواب دیا تھا۔
''ہوں۔''
''ویسے یہ شہریار ماموں اور آغا جان کہاں ہیں۔ ملاقات ہوئی ان سے کیا؟'' ایک تجاہلِ عارفانہ تھا جس سے سوال کیا گیا تھا۔
اس نے گردن موڑ کر اسے تپی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ معصومیت کے سارے ریکارڈ توڑتی اس کی طرف متوجہ تھی۔
زاویار کا ہاتھ اگر پلاسٹر میں قید نہ ہوتا تو شاید وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا دیتا۔
''آگ لگا کر تماشا دیکھنے آئی ہو۔''
یک دم وہ غصے کی لپیٹ میں آیا تھا۔
''کمال ہے، تم تو ایسے چراغ پا ہو رہے ہو جیسے سارا قصور میرا ہے۔ ایکسیڈنٹ تم نے کیا۔ ٹرک سے تم ٹکرائے۔ بے ہوش ہو کر لیٹروں خون بہا کر زخمی ہو کر ہاسپٹلائزڈ تم ہوئے اور غصہ مجھ پر ایسے نکال رہے ہو جیسے غلطی ساری میری ہے۔ ارے میں نہ کرتی تب بھی ممانے آغا جان اور ماموں کو انفارم کر دینا تھا۔ تمہیں کیا لگتا ہے کوئی

معمولی حادثہ تھا یہ؟ ارے اسٹوپڈ اگر اس مولا جٹ (مولا بخش) نے تمہیں نہ بچایا ہوتا تو آج مرحوم زاویار انصاری کے نام کا کتبہ بننے دے رہے ہوتے ہم۔'' جواباً وہ بھی پوری کی پوری اس کی طرف رخ کر کے بیٹھتے ہوئے گویا لڑنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔

زاویار کو یہ شہرین اس شہرین مرزا سے بہت مختلف لگی جو ICU میں اسے اپنے سامنے زخمی پا کر کیسے ٹوٹ کر روئی تھی۔

''اینی وے، یہ بتاؤ کیسا فیل کر رہے ہو؟''

کچھ تھا اس کی طنزیہ نظر میں۔ شہرین کے لبوں کو سادہ سی مسکراہٹ نے چھوا تھا۔

''تمہارے آنے سے پہلے بہت اچھا فیل کر رہا تھا۔'' جلا بھنا جواب آیا تھا۔ یقیناً وہ چڑ گیا تھا۔

جواباً وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ہوں... تو گویا دھیرے، دھیرے صحت مند ہو رہے ہو۔ جبھی تو تمہارے اندر کا جنگلی بلا پھر سے پنجے نکالنے لگا ہے۔''

شوخی سے کہتی وہ بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آؤ اندر چلیں۔'' اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔'' زاویار نے بھویں اچکا کر ایک تلخ نظر اس پر ڈالی۔

''ہاں مگر دوسرے تمہارے سہارے کے ضرور منتظر ہیں۔'' شہرین نے بڑھایا ہوا ہاتھ آہستگی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔

زاویار کی پیشانی پر شکنوں کا جال سا بن گیا۔ وہ بہ مشکل اٹھ کر سامنے رکھی وہیل چیئر پر بیٹھ سکا۔

''مطلب؟'' ترش لہجہ استفہامیہ تھا۔

''مطلب یہ مائی ڈیئر فرینڈ کہ پہلے میں سمجھتی تھی تم صرف اپنے خاندان کے ہی نورِ نظر ہو۔ مگر اب جا کے پتا لگا کہ تم نے تو اپنے سوشل ورک سے نہ جانے کتنوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ کیا بات ہے بھئی آپ کی۔ آئی ایم رئیلی پراؤڈ آف یو۔'' زاویار نے آہستہ، آہستہ وہیل چیئر آگے بڑھائی تو وہ بھی ساتھ چلنے لگی۔ انداز توصیفی تھا۔

''تم سے یہ سب کس نے کہا؟''

''اسی مولا جٹ نے۔ جو ہم سب کا محسن ہے۔''

شولڈر بیگ سے چیونگم نکال کر ریپر کھولتی شہرین کا لاابالی پن ہمیشہ کی طرح تھا۔ اب وہ اس کی وہیل چیئر کو دھکیلنے لگی تھی۔ جو ایک ہاتھ سے چلائی نہیں جا رہی تھی اس سے۔

''مولا بخش نام ہے اس کا۔'' اس نے تصحیح کی۔

''whatever۔'' شانے اچکا کر چیونگم منہ میں ڈالی۔

وہ دونوں ساتھ، ساتھ چلتے اب اسپتال کی اندرونی عمارت کے قریب پہنچ چکے تھے۔ تکلیف کے باعث زاویار کافی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

''ویسے تم کسی این جی او کے لیے کام کرتے ہو یا تم نے اپنی کوئی آرگنائزیشن بنا رکھی ہے؟ ہم تو تمہارے دوست ہیں۔ ہمیں تو بتا دو۔''

پرائیویٹ رومز کی طرف آتے ہوئے وہ بے تکلفی سے کہہ رہی تھی۔ زاویار نے بیزاری سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ گویا وہ اکیلی آئی تھی۔

''تم اکیلی ہو آج... خولہ نہیں آئی تمہارے ساتھ۔'' جواب دینے کے بجائے الٹا استفسار کرتے ہوئے اس

نے گویا اس کے سوال کو نظر انداز کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ ذرا سی دیر میں ہی بہت تھکن ہونے لگی تھی اسے۔

''ہوں، اکیلی آئی ہوں۔'' اچک کر بیڈ پر اس کے پیروں کے پاس بیٹھتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

زادیار کو خطرے کا سائرن سنائی دیا۔

''ان فیکٹ، تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کا دل چاہ رہا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہے کتنا کم بولتی ہوں میں۔ آل دا ٹائم ایک silence رہتا ہے میرے گرد۔ سوچا آج اس silence کو توڑوں اور تم سے کچھ گلاں شلاں ہی کرلوں۔ تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔''

''میرے دل کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' بستر پر پھسکڑا مار کر بیٹھی وہ بے فکری سے بولے جا رہی تھی۔ جواباً اس نے خشک لہجے میں ٹوکا۔

''ہاؤ مین یو آر زوی، میں یہاں اجی بھائی کے ان لاز کی اتنی شاندار سی پارٹی چھوڑ کر اس سڑے بوسے اسپتال میں تم جیسے خشک اور فضول انسان کو ملنے آئی ہوں اور تم مجھے یہ کہہ رہے ہو؟'' اس کی شوخ آنکھوں میں غصے کی سرخی اترنے لگی تھی۔ ملامتی نظروں سے اسے گھورا۔

''دیکھو شیری آئی ایم ناٹ فیلنگ ویل۔ تم میرا سر مت کھاؤ اور جاؤ یہاں سے۔''

اس نے بے مروتی سے کہتے ہوئے کمبل پیروں پر ڈالا تو وہ خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر کندھے جھٹک کر خود کو ریلیکس کیا۔

''اوکے، چلی جاؤں گی بس ایک سوال کا جواب دے دو۔ آئی پرامس۔ فوراً چلی جاؤں گی یہاں سے۔'' اس کے تیور دیکھ کر وہ نرمی پر اتر آئی تھی۔

زادیار نے ٹھٹک کر اس کی جانب نگاہ اٹھائی۔ گو کہ آغا جان اور شہریار صاحب جا چکے تھے مگر اس کے ذہن پر بوجھ سا تھا۔ موڈ سخت خراب تھا۔

''کیا پوچھنا ہے۔ جلدی بولو۔'' بظاہر بیزاری اور کوفت سے کہتا وہ دل ہی دل میں ضرور بے چین ہوا تھا۔

شہرین نے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا تو جھنجلاہٹ نے اس کا گھیراؤ کرنے میں ذرا دیر نہ کی۔

''اب بک بھی چکو کیا کہنا ہے تمہیں۔''

''اف، ٹیک اٹ ایزی زوی۔ کیا کان کے پردے پھاڑو گے۔'' کانوں پہ ہاتھ رکھ کر وہ ناگواری سے بولی تو وہ خشمگیں نظریں اس کے چہرے پر جما کر بیٹھ گیا۔ جس کا ادھر قطعاً اثر نہ تھا۔ وہ پھر سے مسکرا دی تھی۔

''مجھے بس اتنا پوچھنا ہے کہ تم دُرِ مکنون کے لیے کب ہاں کرنے والے ہو؟'' سوال اور وہ بھی دُرِ مکنون کے بارے میں۔ جسے بھلانے کی اس کی ہر کوشش رائگاں جا رہی تھی۔

چند ثانیے کے لیے اس کی زبان گویا تالو سے جا لگی۔ یہ نام نہیں چابک تھا جو اس کے وجود پر دن رات ضرب لگا رہا تھا۔ کوڑے کی طرح برس رہا تھا۔

''مامی نے بتایا اس بارے میں بلکہ انہوں نے تو مجھے یہ بھی بتایا کہ تم نے دُرِ مکنون سے ڈیٹ کی فرمائش بھی کی تھی۔ اور کیا اتفاق ہے کہ دُرِ مکنون، زارا بھابی کی کزن ہے اور آج کل ان کے پیرنٹس کے ساتھ یہیں رہتی ہے کراچی میں۔ شیرازی ولا میں ....'' شرارت سے آنکھیں گھماتی وہ کس مزے سے کہہ رہی تھی۔

''دُرِ مکنون اور زارا بھابی کی کزن۔ کیسا بھیانک انکشاف تھا یہ۔''

''مائی گاڈ!'' اس نے بے اختیار انگلی سے پیشانی کو مسلا۔

''تمہیں پتا ہے کل میں اُدھر ہی جا رہی ہوں زارا بھابی نے بہت خلوص سے بلایا تھا مجھے۔ اُف کتنی ایکسائٹڈ

ہو رہی ہوں میں۔ عینی بھی آئی ہوئی ہے میں نے سوچا اسے بھی ساتھ لے جاتی ہوں۔ دُرِ مکنون کو دیکھ کر تو خوشی سے دیوانی ہی ہو جائے گی وہ اور پھر ہم اسے تمہارے نام سے خوب چھیڑیں گے۔'' وہ تو پورا پروگرام بنائے بیٹھی تھی۔

''خبردار۔ جو تم نے کسی سے بھی کچھ کہا۔'' زاویار کا میٹر گھوم گیا۔ یک دم وہ دہاڑا تھا۔

دفعتاً آگے بڑھ کر اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے اس کا کندھا دبوچ کر اسے جھنجوڑا۔

تو شہرین کا چہرہ یکلخت سفید پڑ گیا۔

''سنا تم نے۔'' شدید غیظ و غضب سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ شہرین کو اپنے بازو میں اس کی آہنی انگلیاں کھبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ حقیقتاً وہ اس کے اس طرح پھٹ پڑنے پر سہم گئی تھی۔

''زوی۔ تم اتنا غصہ..... کس لیے؟''

اٹک، اٹک کر کچھ کہنا چاہا مگر اس کے درشت رویے کے باعث جملہ مکمل نہ کر سکی۔

''شٹ اپ، میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ میرے معاملات سے خود کو دور رکھو۔ یہ میری زندگی ہے اس کے بارے میں صرف ''میں'' فیصلہ کروں گا۔ کوئی اور نہیں۔ سمجھ آئی تمہیں۔'' جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے وہ بری طرح گرج رہا تھا۔

شہرین کو اس کی وحشت ذہنی خلجان میں مبتلا کرنے لگی۔ ایک ہاتھ سے اپنا بازو سہلاتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں کی سطح کو گیلا ہوتا محسوس کیا۔ وہ بدک کر بستر سے اتری تھی۔

''تم..... تم نہایت جنگلی اور بے حس انسان ہو۔'' پہلے تو وہ صدمے کی کیفیت میں اسے دیکھتی رہی پھر رفتہ رفتہ اسے غصہ آنے لگا۔

''میرے بارے میں تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہے میں کیا ہوں اور کیسا ہوں۔'' اس کے لہجے کی درشتگی میں یک دم تاسف گھلا تھا۔ جس پر قابو پاتے، پاتے وہ پھر سے گرجا تھا۔

''سو پلیز ڈونٹ ویسٹ مائی ٹائم اینڈ گیٹ لاسٹ۔'' دروازے کی طرف اشارہ کر کے صاف کمرے سے نکلنے کو کہا تو شہرین کے دل پر جیسے سخت ضرب پڑی۔

اس کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے جیسے تاریک پڑ گیا تھا۔

چند ثانیے اسے دکھ اور تحیر سے اسے دیکھتی وہ یک دم ایڑی کے بل پر مڑی اور تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔

''زاویار انصاری کے نام کے ساتھ کسی دُرِ مکنون کا نام کبھی نہیں جڑے گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ سو بی کیئر فل۔ اگر کسی کی ''تمہارے'' رویے سے امید بندھی تو اس کا ذمے دار میں قطعاً نہیں۔ مائنڈ اٹ۔''

دروازے تک پہنچتے، پہنچتے اس کی تپتی سلاخوں ایسی آواز شہرین کی سماعت کو داغ گئی تھی۔ اس نے صاف، صاف جتا دیا تھا۔

''دھڑ۔'' ایک جھٹکے سے باہر نکل کر وہ دروازہ بند کر گئی۔

''اُف۔'' یک دم اسے سینے میں ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔ شدید نقاہت اور آزردگی نے اسے اپنے حصار میں لیا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر تکیے پر دھر دیا۔

وہ جانتا تھا ذرا دیر میں عاصمہ اور نازیہ آنے والی ہوں گی۔ ان کے آنے سے پہلے، پہلے اسے خود کو کمپوز کرنا تھا۔

شہرین جس موڈ میں یہاں سے گئی تھی۔ اس کا ملال بھی ہو رہا تھا۔ مگر وہ کیا کرتا۔ اسے روکنے کا اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ اس کے ذہن میں نہیں آ سکا تھا۔ یوں بھی غصہ اس کی سوچنے کی تمام صلاحیتوں کو جذب کر لیتا تھا۔

(جاری ہے)

ٹھوکر

شمیم فضل خالق

''میں نے کہہ دیا کہ میں مزید تمہارے چچا کی خدمتیں نہیں کرسکتی..... غضب خدا کا..... آج یہ پکاؤ..... آج وہ پکاؤ' باورچن سمجھ لیا ہے مجھے۔'' شدید غصے کے عالم میں انعم نے کمرے کا دروازہ زور سے بند کیا تو عاشر نے تڑپ کر کتاب بند کی اور بولا۔

''انعم..... پلیز..... وہ ہمارے مہمان ہیں۔''

''مہمان ایک یا دو دن کا ہوتا ہے عاشر..... اس سے زیادہ ہو تو بلائے جان بن جاتا ہے۔'' وہ تڑخ کر بولی۔

''دیکھو انعم.....'' عاشر عاجزی سے کہنے لگا۔ ''تم جانتی ہو کہ چچا ہمارے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہیں..... اور پھر ہماری شادی کے بعد پہلی بار رہنے کے لیے آئے ہیں، تم دل بڑا کرو ناں یار.....''

''کب تک دل بڑا کروں عاشر..... اس گرمی میں ان کے لیے فرمائشی کھانے پکاتی ہوں۔ بھئی صحیح طرح شریف مہمان بن کر رہیں..... جو گھر کے باقی افراد کھاتے ہیں..... وہ چپ کر کے کھالیا کریں۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''دراصل وہ خوش خوراک بندے ہیں..... اپنے گھر میں بھی ایسے ہی مہمان بن کر رہتے ہیں لیکن یہاں وہ ساری عمر تھوڑی رہیں گے۔ چند دن کی بات ہے جانم..... کسی طرح برداشت کرلو۔'' آخر میں اس کا لہجہ ملتجی ہوگیا۔

''میں تنگ آگئی ہوں عاشر..... کسی کے گھر میں رہنے سہنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے..... سلیقہ ہوتا ہے جو اُن میں ناپید ہے۔'' اس کی بلند ہوتی آواز پر عاشر نے گھبرا کر بند دروازے کو دیکھا اور بولا۔

''انعم..... آہستگی سے بات کرو..... وہ سن لیں گے۔ یہیں آس پاس ہوں گے۔''

''سنتے ہیں تو سن لیں..... باندی نہیں ہوں میں ان کی.....'' انعم کو ذرا جو پروا ہو۔ اب کے عاشر آواز دبا کر ملتجی لہجے میں بولا۔

''میری خاطر انعم ڈیئر..... جانتی بھی ہو وہ ہمارے لیے کتنے اہم ہیں..... تھوڑی بہت جائداد جو زمینوں کی صورت میں ہے..... اس کی دیکھ ریکھ وہی تو کرتے ہیں اور کتنی ایمانداری سے ہمیں ہمارا حصہ دیتے ہیں..... ابا تو شروع سے ایسے ہیں..... بس گھر میں یا دوستوں میں..... ذرا جو احساسِ ذمے داری ہو ان میں..... چچا نہ ہوتے تو.....''

''اچھا..... اچھا..... سو بار سنا چکے ہو یہ چچا نامہ.....'' انعم بور ہو کر بولی۔ ''چلو باپ میں ذمے داری کا احساس نہیں تھا..... تم بیٹے تھے..... جو ان ہونے پر تم ہی سنبھال لیتے جائداد کو.....'' اس نے کہا۔

''میں پہلے پڑھ رہا تھا۔ اب نوکری کر رہا ہوں، میرے پاس وقت ہوتا تو بات ہی کیا تھی..... تم کیا جانتی نہیں ہو میری روٹین کو..... صبح کا گیا شام کو گھر آتا ہوں..... چچا کی وجہ سے بڑی ڈھارس ہے گھر پیسے بھیج دیتے ہیں۔'' انعم اب کے خاموش رہی تو عاشر اس کے قریب ہو کر ملتجی لہجے میں بولا۔

''برداشت کرلو انعم..... میری جان..... اور ہاں ایک اور بات بھی ہے۔'' انعم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''دراصل چچا اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنا چاہتے تھے۔'' وہ قدرے توقف سے بولا۔

''تو کردیتے..... کیوں منع کیا تم نے۔'' انعم کندھے اچکا کر بے پروائی سے بولی۔

''تم جو پسند آگئی تھیں..... بلکہ تمہیں بھی تو میں پسند آگیا تھا..... کیا غلط کہا میں نے؟'' اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عاشر بولا تو انعم کی نظریں بے اختیار جھک گئیں۔

''اس لیے تو چچا نہ ہماری شادی میں آئے اور نہ بعد میں آئے..... اب تھوڑی ناراضی کم ہوئی ہے تو آگئے ہیں لیکن وہ برملا کہتے ہیں کہ ان کی بیٹی جیسی لڑکی پوری دنیا میں نہیں ہے..... بلکہ ایک طرح سے وہ تمہیں پرکھنے کے لیے ہی یہاں آئے ہیں..... میں چاہتا ہوں کہ تم اُن پر اپنی دھاک بٹھادو اور وہ سمجھ لیں کہ تم ان کی بیٹی سے زیادہ اچھی، سلجھی ہوئی اور سمجھدار ہو، یہ میری خواہش ہے انعم.....'' عاشر اسے ملتجی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ انعم اسے جواب دینے کے بجائے اٹھ کر باہر جانے لگی تو عاشر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کیا ہوا انعم..... کہاں جارہی ہو.....؟'' وہ پریشان ہوگیا تھا۔

''چچا کے لیے کلب سینڈوچ بنانے ہیں، شام کی چائے کے ساتھ..... فرمائش ہے ان کی۔'' وہ تیزی سے دروازہ کھول کر کمرے سے باہر چلی گئی لیکن جاتے ہوئے دروازہ اس زور سے بند کیا کہ عاشر کے کان بج اٹھے۔ وہ بیچارہ اپنے کان مسلتا رہ گیا۔

☆☆☆

عاشر جس کمپنی میں کام کر رہا تھا وہاں انعم بھی کام

کررہی تھی..... دونوں کے بیچ پہلے پسندیدگی اور پھر محبت کا رشتہ استوار ہوا..... پھر محبت، عشق میں تبدیل ہوگئی اور عاشر نے اپنے ماں، باپ سے ضد شروع کی کہ وہ شادی کرے گا تو انعم سے کرے گا جبکہ عاشر کے والدین کی خواہش تھی کہ چچا کی بیٹی صدف ان کی بہو بنے۔ وہ ایک خوبرو اور خاموش سی فرمانبردار لڑکی تھی جسے کسی بات میں نہ کہنا آتا ہی نہیں تھا۔ خود چچا کی بھی عاشر کو داماد بنانے کی خواہش تھی لیکن عاشر اپنی بات پر اڑ گیا۔ عاشر کے ماں، باپ مرنجاں مرنج قسم کے بندے تھے وہ نہ تو بیٹے کے ساتھ زبردستی کرسکتے تھے نہ اسے مجبور کرنے کا فن جانتے تھے سو وہ مان گئے اور انعم کو بہو بنا کر گھر لے آئے..... انعم نے سب سے پہلے تو جاب چھوڑ دی اور گھر داری میں دلچسپی لینی شروع کی..... جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ اس کے ساس سسر بڑے بے ضرر قسم کے لوگ ہیں۔ سسر یا تو گھر میں ہوتے ہیں یا پھر دوستوں کے ساتھ ہوتے..... جو بھی گھر میں پکتا ساس، سسر چپ کر کے کھالیتے۔ ان کی کوئی فرمائش تھی نہ ہی انعم پر ان کا کوئی بوجھ تھا۔ ساس گھر کا کام تو کوئی نہ کرتی لیکن کسی کام میں دخل بھی نہ دیتیں۔ وہ یا تو محلے داروں میں پھرتی رہتیں یا ٹی وی پر ڈرامے دیکھتی رہتیں..... گویا ان دونوں کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ شروع میں انعم کو تھوڑی شکایت ہوئی کہ ساس کام میں ہاتھ نہیں بٹاتیں، اتنی بوڑھی بھی نہیں ہیں، سسر بھی باہر کے کام کرسکتے ہیں لیکن انعم کی ماں نے اسے سمجھایا کہ بیٹی شکر کرو کہ تمہارے کاموں میں وہ مداخلت نہیں کرتے..... ساس اگر تمہارا ہاتھ بٹاتی تو تمہارے کچن کا حشر نشر کردیتی۔ تمہیں کوئی چیز ٹھکانے پر نہ ملتی..... پھر بھی تمہیں شکوہ ہی ہوتا اور رہے سسر..... اگر وہ بازار سے سودا سلف لاتے تو دس چیزیں اپنی پسند کی بھی لاتے کہ یہ پکا دو، وہ پکا دو..... شکر کرو کہ جو کھلاتی ہو تم انہیں وہ صبر شکر کے ساتھ کھالیتے ہیں۔

اپنی ماں کے سمجھانے پر وہ اچھی طرح سمجھ گئی..... پھر کبھی اس نے شکایت نہیں کی۔ سبزی وہ ریڑھے والے سے لے لیتی تھی..... اور ایک ہنڈیا بنا کر صبح شام سارے گھر والے کھالیتے تھے..... عاشر کی عادت بھی اپنے ماں، باپ پر گئی تھی۔ کھانے میں نخرہ تھا نہ ہی وہ کوئی مین میخ نکالتا..... صبر شکر کے ساتھ کھالیتا۔ مصیبت تو تب آن پڑی جب چچا رہنے کے لیے آگئے۔ انعم کے تو چوبیس گھنٹے کچن میں گزرنے لگے۔ جب وہ بہت تھک گئی تو اپنے میکے جانے کا سوچا..... جانے سے پہلے اس نے چچا کی پسند کی ایک دو ڈشز بنا کر ساس کو سمجھایا۔ اور میکے چلی گئی..... صبح، صبح انعم کو دیکھ کر اس کی ماں بھی خوش ہوگئیں۔

''ارے..... میری بچی آئی ہے۔'' وہ اسے گلے لگاتے ہوئے بولیں۔

''تمہارے مہمان چلے گئے کیا.....؟''

''کہاں امی.....؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔ ''میری جان لے کر ہی وہ ٹلیں گے۔''

''ارے..... کیا بد فال منہ سے نکال رہی ہو.....'' ماں دہل کر بولیں۔

''تو کیا کروں امی.....'' وہ اپنا سر ماں کے کندھے پر رکھ کر بیزاری سے بولی۔ ''تنگ آگئی میں ان روز، روز کی مہمانداری سے..... موصوف جانے کا نام بھی تو نہیں لے رہے۔''

''چلے جائیں گے بیٹا..... کتنی دیر ٹھہر سکتا ہے کوئی کسی کے گھر..... اچھا چھوڑو.....'' ماں بات بدلتے ہوئے بولیں۔

''یہ بتاؤ..... دوپہر کے کھانے میں کیا کھاؤ گی؟''

''جو بھی کھلا دیں.....'' وہ ہنوز خود ترسی کی کیفیت میں تھی..... سو بیزاری سے بولی۔

''میں آلو گوشت بنا رہی تھی..... تم جانتی ہو تمہارے ابا شوربے والا سالن پسند کرتے ہیں..... لیکن تمہارا جو دل ہو بتا دو..... وہی بنا دوں گی.....'' امی پیار سے اسے دیکھتے ہوئے بولیں تو انعم نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر دیں۔

''بس..... وہی ٹھیک ہے..... آپ مجھ سے باتیں کریں مجھے اور کچھ نہیں چاہیے..... اور آپ تو جو

بھی بناتی ہیں لاجواب ہی ہوتا ہے..... ویسے بھی میں آپ سے باتیں کرنے آئی ہوں..... مجھ سے باتیں کرنے والا کوئی نہیں....." وہ منہ بسور کر بولی۔

"واہ..... یہ کیا بات ہوئی....." امی نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "بھرا پرا گھر ہے تمہارا..... ساس ہیں، سسر ہیں، عاشر ہے، کیوں بھلا تم سے باتیں کرنے والا کوئی نہیں....."

"چھوڑیں امی..... ساس کو ڈرامے دیکھنے سے فرصت ملے تو مجھ سے باتیں کریں ناں..... سسر کی بھی اپنی ایک الگ دنیا ہے..... اور رہے عاشر..... تو عاشر سے تو بس لڑائیاں ہی ہوتی ہیں..... اچھا چھوڑیں..... یہ بتائیں ابو اور قاصر کب تک آئیں گے..... ان سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"ہاں، ہاں..... دوپہر تک آجائیں گے..... مل کر ہی کھانا کھائیں گے..... میز پر ہی ان سے جی بھر کر باتیں کر لینا..... میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں..... پھر جی بھر کر باتیں کریں گے۔" امی اٹھتے ہوئے بولیں تو تکیے سے ٹیک لگا کر لیٹ گئی اور کسی گہری سوچ میں چلی گئی۔ "میکا بھی عورت کے لیے خدا نے کیا سکون کی جگہ بنائی ہے جہاں کوئی دکھ کوئی ذمے داری نہیں ہوتی۔" دوپہر کو انعم کے ابو اور بھائی بھی آگئے تھے۔ خوشی، خوشی سب نے کھانا کھایا انعم نے ابو اور بھائی سے ڈھیروں باتیں کیں..... امی کے ہاتھ کا کھانا وہ ہمیشہ بہت شوق سے کھاتی تھی آج بھی اس نے پیٹ بھر کر کھایا۔ کھانے کے بعد اس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں تو وہ کمرے میں سونے کے لیے آگئی۔

وہ گہری نیند میں تھی جب موبائل کی رنگ پر جاگ اٹھی۔ کال کرنے والا عاشر تھا..... فون کان سے لگا کر وہ نیند بھرے لہجے میں بولی۔

"عاشر..... کیا بات ہے..... اس وقت کیوں فون کیا؟"

"وہ اس لیے انعم کہ تم جلدی گھر آجاؤ....."

"کیا مطلب.....؟" اس کی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔ "کوئی ایمرجنسی ہے کیا؟" وہ پریشان ہوگئی۔

"نہیں..... ایمرجنسی تو کوئی نہیں..... بس وہ چچا کہہ رہے ہیں کہ رات کے کھانے میں کچے گوشت کی بریانی بنا دو..... وہ لمبا کام ہے تو اس لیے تمہیں جلدی آنے کو کہہ رہا ہوں۔"

انعم کے سر پر لگی تو تلوؤں پر بجھی..... مارے غصے کے پہلے تو اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا..... پھر دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کیا اور بولی۔

"لیکن عاشر..... میرا یہاں آج رات رکنے کا پروگرام ہے..... میں نہیں آنے کی۔"

"کیا غضب کر رہی ہو انعم..... چچا ناراض ہو جائیں گے۔" عاشر گھبرا کر بولا۔

"ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں....." وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

"بس..... اب مجھے بار، بار فون کرنے کی ضرورت نہیں..... میں یہاں آرام کرنے آئی ہوں..... پلیز..... مجھے ڈسٹرب مت کرو....." اس نے عاشر کی مزید بات نہ سنی اور فون بند کر دیا۔ گھنٹے دو گھنٹے تو آرام سے گزر گئے..... دو گھنٹے بعد پھر عاشر کا فون آگیا۔

"عاشر..... میں نے تم کو کہا بھی تھا کہ مجھے بار، بار فون مت کرو..... تمہیں میری کسی بات کی سمجھ ہی نہیں آتی۔" وہ خفگی سے بولی تو وہ جلدی سے بولا۔

"لیکن میں تمہیں آنے کے لیے نہیں کہہ رہا..... تم آرام سے وہاں آج رات رہ لو....."

"تو پھر..... پھر کس لیے فون کیا ہے؟" اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"میں نے اور چچا نے اس بات کا ایک حل نکالا ہے۔"

"کس بات کا حل.....؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

"ارے وہی..... کچے گوشت کی بریانی والی بات۔" اس کی بات پر انعم کے ذہن میں وہی بات آگئی تو وہ اطمینان سے بولی۔

"بڑا ہی مناسب حل ہے عاشر..... تم چچا کو ایک بڑے سے ہوٹل لے جاؤ اور چاہے وہ کچے گوشت کی

بریانی کھانا چاہیں..... یا پکے گوشت کی..... وہ انہیں پیٹ بھر کر کھلا دو.....''

''تمہیں پتا تو ہے انعم..... کہ وہ باہر کے کھانے نہیں کھاتے..... پھر بھی ایسی بات کر رہی ہو۔'' عاشر کی بات پر انعم کا دماغ گھوم گیا۔

''تو پھر..... پھر کیا حل سوجھا ہے تم کو؟'' وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

''وہ دراصل..... میں اور چچا تمہارے گھر آرہے ہیں کچے گوشت کی بریانی کھانے..... اس بہانے چچا تمہارے ابا جان اور بھائی سے بھی مل لیں گے..... تھوڑی سی آؤٹنگ ہو جائے گی چچا کی..... جب سے آئے ہیں زیادہ تر گھر پر ہی ہوتے ہیں..... بس اب تم بریانی بنانے کی تیاری کر لو..... اور ہم تمہارے گھر آنے کی تیاری کرتے ہیں۔'' فون کھٹ سے بند ہو گیا تھا۔ انعم کا مارے غصے کے برا حال تھا۔ دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ عاجز آ کر وہ خود سے کہنے لگی۔

''یا اللہ..... یہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں..... جب مصیبت ہی اٹھانی ہے تو یہاں اپنے ساتھ، ساتھ ان سب کو کیوں مصیبت میں ڈالوں..... میں اکیلی ہی کیوں نہ بھگتوں.....'' اس نے مزید وقت ضائع نہیں کیا اور عاشر کو فون ملا کر بنا کسی تمہید کے کہا۔

''عاشر، تم لوگ آنے کی زحمت نہ کرو..... میں آرہی ہوں، کچے گوشت کی بریانی بنانے کے لیے.....'' آخری جملہ اس نے دانت کچکچا کر کہا اور کھٹ سے فون بند کر لیا۔

اس واقعے کے بعد بھی چچا کچھ دن مزید ٹھہرے اور انعم کے خیال کے مطابق جب فرمائشی ڈشز ختم ہو گئیں تو انہوں نے اپنے جانے کا اعلان کر دیا..... جبکہ اس کے ساس سسر انہیں روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگے۔ اسے بڑا غصہ آیا۔

''ہوں..... دونوں کے پیٹوں میں نت نئی ڈشز جو جاتی تھیں..... چچا سے زیادہ تو ان کے مزے تھے۔'' وہ دل ہی دل میں جیسے ان کو جلی کٹی سنانے لگی جبکہ عاشر

نعت نبیؐ

سجتی ہیں ساری محفلیں صل علی کے نام سے
پاتے ہیں دل قرار بھی تیرے ہی پاک نام سے
مرہم دلوں کا ہے تو ہی تجھ پر فدا ہو جاں مری
صل علی کی ہو صدا صبح سے اور شام سے
چمکی ہے کیسی برق سی پھوٹی فضا میں روشنی
ہر سو نشاط زندگی اس دل نشیں کلام سے
شامیں بھی مشکبار ہوں دن بھی ہوں میرے دلکشا
گل کی طرح مہک اٹھوں صل علی کے نام سے
تو ہی نشاط زندگی تو ہی جمال و سرخوشی
تو ہی سبیل خرمی..... حسن ترے ہی نام سے
رازِ جمال زندگی دنیا پہ اب کھلا نبیؐ
تیری ہی ریت پر چلیں سیکھیں تیرے کلام سے
صل علی کا ورد ہو مخفی..... کو رات دن خدا
دنیا سے کچھ نہ سلسلہ مطلب کسی نہ کام سے

کلام: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

بھی خاصا افسردہ تھا۔

''چچا کے جانے سے ابا بہت اکیلے ہو جائیں گے۔ دونوں بھائی نہیں، دوست بھی ہیں..... وہ بڑے خوش رہتے تھے میں بھی تو انہیں وقت نہیں دے پاتا۔'' عاشر افسردگی سے بول رہا تھا جبکہ انعم کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ہر چیز تہس نہس کر دے اور عاشر کی تو اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

''بے حس کہیں کا..... ذرا بھی بیوی کا خیال نہیں جو چچا کے فرمائشی پروگرام پورے کرتے، کرتے آدھی رہ گئی۔'' بڑی مشکل سے اس نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور دل کو تسلی دی کہ موصوف جا رہے ہیں سو اس آخری وقت میں اسے کوئی گڑبڑ نہیں کرنی چاہیے۔ چچا کو رخصت کرنے کا وقت آیا تو سب صحن میں جمع ہو گئے..... عاشر کی اماں تو باقاعدہ رو رہی تھیں اور بار،

بار چچا سے کہہ رہی تھیں۔

''عامر..... کچھ دن اور رک جاتے..... تمہیں رخصت کرنے کو دل نہیں چاہ رہا..... عادی ہو گئے ہیں تمہارے.....'' چچا نے محبت سے بھابی کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

''بھابی..... اب یہ آنا جانا لگا رہے گا تم اور بھائی صاحب بھی آجاؤ ناں..... ہماری طرف صدف بہت خوش ہوگی۔ سب سے مل کر۔'' پھر وہ انعم سے کہنے لگے۔

''بہو..... مجھے تم سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔''

''جی.....؟'' جہاں سب کو ان کی بات سے حیرانی ہوئی وہاں انعم کو بھی شدید حیرت ہوئی..... سب کو وہیں چھوڑ کر انعم اور چچا صحن کے ایک کونے میں چلے گئے۔

''میں جانتا ہوں بہو کہ تمہیں میری فرمائشوں سے تکلیف ہوتی تھی۔'' چچا نے بات شروع کی۔ ''تم عاشر سے لڑتی رہتی تھیں..... میں سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہتا تھا..... اور مجھے اپنے بھتیجے کے لیے افسوس ہوتا تھا کہ اسے صدف کے بجائے تم جیسی بیوی ملی..... تمہارے ساس، سسر اس صدی کی سب سے زیادہ مظلوم ہستیاں ہیں..... وہ زندہ ہیں لیکن تم نے ان کو مُردوں میں شمار کیا ہوا ہے۔ گھر میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں..... وہ بیچارے اپنے اکلوتے بیٹے کا گھر بسا رکھنے کے لیے چپ ہیں..... تم کیا سمجھتی ہو میں اگر تم سے نت نئے کھانے کی فرمائش کرتا تھا تو کیا اپنے لیے کرتا تھا۔ نہیں..... ہرگز نہیں مجھے اپنے گھر میں سب کچھ میسر ہے۔ یہ تو میں اپنے مظلوم بھائی اور بھابی کے لیے کرتا تھا کہ وہ اچھا کھا پی سکیں..... میرا بھتیجا عاشر بھی کم مظلوم نہیں..... وہ بھی اپنے گھر کو بسائے رکھنے کے لیے تمہاری ساری زیادتیاں برداشت کرتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور دل میں پچھتاتا ہوگا کہ کاش تمہارے بجائے صدف جیسی لڑکی اس کی شریکِ سفر ہوتی..... بہر حال اگر تم میری باتوں پر غور کر لو اور خود کو بدل لو تو بہت بہتر ہوگا کہ وقت ابھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' وہ یہ سب کہہ کر پلٹ کر بھائی، بھاوج کی طرف چلے گئے..... عاشر حیران پریشان کھڑا تھا..... چچا نے مسکرا کر عاشر سے کہا۔

''چلیں..... عاشر.....''

''جی چچا.....'' اس نے چچا کا سامان اٹھایا اور انہیں اسٹیشن چھوڑنے چلا گیا۔ چچا کے جانے کے بعد ساس تو اپنا ڈرامہ دیکھنے اپنے کمرے میں گھس گئیں جبکہ سسر اپنے کسی دوست کے گھر چلے گئے..... انعم گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی..... چچا کی باتیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں..... وہ بے چین سی برآمدے میں بیٹھی خلاؤں میں جانے کیا گھور رہی تھی کہ عاشر، چچا کو چھوڑ کر گھر واپس آ گیا۔ گھر آتے ہی وہ سیدھا اسی کے پاس آیا اور بے چینی سے اس سے پوچھنے لگا۔

''انعم..... چچا تم سے کیا کہہ رہے تھے؟''

''کچھ نہیں.....'' ایک گہری نظر اس پر ڈال کر وہ بولی۔

''میرا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ میں ان کی ہر فرمائش پوری کی ہے۔''

''اچھا.....'' عاشر خوش ہو کر بولا۔ ''میں کہتا تھا ناں تمہیں کہ چچا زیادہ دن نہیں رہیں گے..... چلو اچھا ہوا کہ وہ خوش، خوش ہمارے گھر سے گئے ہیں..... اب تم آرام کرو..... ان چند دنوں میں تم بہت تھک گئی ہو..... میں اب آفس جاؤں گا..... آدھے دن کی چھٹی لے کر آیا تھا۔''

وہ ساری رات جاگتی رہی اور چچا کی باتوں پر سوچتی رہی..... اور پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

اگلے دن ناشتے کے بعد جب اماں اپنے کمرے میں جانے لگیں تو انعم چائے کا کپ لے کر اُن کے پاس بیٹھ گئی اور نرم لہجے میں پوچھنے لگی۔

''اماں..... آج کھانے میں کیا پکائیں؟''

''کک..... کیا.....؟'' اماں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگیں۔ ''میں، میں بتاؤں پتر.....؟'' اماں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سوال اُن سے پوچھا گیا ہے۔

''ہاں، ہاں اماں، دراصل یہ پکانا روز کا مسئلہ ہوتا ہے تو آج میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا پکایا

جائے۔'' وہ معصوم بن کر پوچھنے لگی۔

''جو بھی آسان لگے پتر..... وہ بنالو..... ہم تو سب کچھ کھالیتے ہیں۔''

''نہیں اماں..... آج آپ کی پسند کا کھانا پکے گا..... بتائیں ناں.....'' وہ لاڈ سے بولی۔ ایک بار پھر اماں کو یقین نہیں آیا..... بے یقینی سے اسے دیکھا..... پھر قدرے توقف سے کچھ شرما کر، کچھ ہچکچاہٹ سے بولیں۔

''وہ..... اگر گوبھی گوشت پکالو تو.....'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔ انعم کو یاد آیا ایک بار عاشر نے بھی کہا تھا کہ اماں کو گوبھی گوشت بہت پسند ہے..... لیکن عاشر کی بات انعم نے سنی ان سنی کردی تھی کہ اسے خود گوبھی کی اسمیل پسند نہیں تھی..... اور اس بہشتی عورت نے کبھی خواہش ظاہر نہیں کی بلکہ دونوں میاں، بیوی نے کبھی کچھ بھی کھانے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی..... پہلی بار انعم کو لگا جیسے کسی نے اس کا دل مسوس کر رکھ دیا ہو..... اتنی دیر میں ابا ناشتا کرنے آگئے تو انعم ان سے کہنے لگی۔

''ابا..... آج سے آپ سبزی والے سے سبزی لے آیا کریں اور آج تو گوبھی کی سبزی خصوصی طور پر لایئے گا اماں کی پسند پر آج گوبھی گوشت ہی پکے گا۔''

''مم..... میں..... میں لاؤں گا سبزی.....'' انتہائی حیرت سے ابا اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''ہاں ابا..... مجھے اچھا نہیں لگتا کہ گھر میں مرد موجود ہوں اور میں گوشت سبزی کی دکانیں چھانتی پھروں.....''

''ٹھیک ہے بیٹا..... میں روز سبزی یا جو بھی سودا چاہیے..... لے آیا کروں گا۔'' ابا بڑی خوشدلی سے بولے۔ شاید وہ بھی کوئی مصروفیت چاہتے تھے۔ اس دن انعم نے اماں سے سبزی بھی بنوائی اور کھانا پکاتے ہوئے انہیں ساتھ، ساتھ لگائے رکھا۔ ساتھ میں وہ اماں سے بات چیت بھی کرتی رہی۔

عاشر گھر آیا تو اسے گھر میں الگ سی چہل پہل سی محسوس ہوئی..... اسے حیرت ہوئی کہ گھر میں کون آیا ہے لیکن یہ دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا کہ اماں بڑے مصروف انداز میں میز پر برتن رکھ رہی تھیں جبکہ ابا تھیلوں سے سامان نکال کر میز پر رکھ رہے تھے اور ساتھ، ساتھ انعم کو بھی بتا رہے تھے کہ ''دکاندار کھیرا 60 روپے کلو دے رہا تھا میں نے کہہ دیا 40 روپے لگاؤ گے تو خریدوں گا ورنہ نہیں..... خیر خاصے بحث و مباحثے کے بعد اس نے 50 روپے لگایا۔'' انعم سنک کے پاس کھڑی تھی اس نے وہیں سے جواب دیا۔

''واہ ابا جی..... کمال کردیا آپ نے میں تو کبھی ایک روپیہ تک کم نہیں کروا سکتی تھی سبزی میں..... اس لیے تو کہتی ہوں کہ آج سے گھر کا سارا سودا آپ ہی لائیں گے۔''

''کیوں نہیں پتر.....'' ابا کی آواز میں خوشی کوٹ، کوٹ کر بھری تھی۔ عاشر کے اندر ٹھنڈک سی اترنے لگی۔ اپنے ماں، باپ کو عضوِ معطل کی طرح دیکھ کر وہ بہت کڑھا کرتا تھا۔ لیکن گھر کا ماحول خراب نہ ہو اسی وجہ سے بیوی کو کچھ کہہ نہیں پاتا تھا۔ آج پہلی بار تھا جب چاروں نے مل کر میز پر کھانا کھایا..... ورنہ انعم اماں اور ابا کا کھانا ان کے کمرے میں پہنچا دیا کرتی تھی اور وہ اور عاشر اکٹھے کھاتے تھے۔ میز پر اماں کی پسندیدہ ڈش دیکھ کر عاشر کو اور زیادہ خوشی ہوئی وہ چہچہاتی آواز میں بولا۔

''ارے..... آج تو اماں کی پسندیدہ ڈش بنی ہے۔''

''ہاں.....'' انعم بولی۔ ''اور اب ایک دن اماں کی اور ایک دن ابا کی پسندیدہ ڈش بنے گی.....'' ابا نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

''جیتی رہو بیٹی.....''

انعم کو اپنے رگ و پے میں سکون اور اطمینان کی لہریں اترتی محسوس ہوئیں..... خوشی اور سکون کا کتنا آسان علاج تھا۔ کاش ہم اپنے بزرگوں کو عضوِ معطل نہ بننے دیں اور چھوٹے، چھوٹے بے ضرر قسم کے کاموں میں انہیں شریک کر کے انہیں احساس دلائیں کہ ان کی ذات کتنی فعال ہے..... اور وہ ہمارے لیے اور اس گھر کے لیے کتنے ضروری ہیں۔

ناولٹ

آخری حصہ

آخری ہجرت

پروین زبیر

ہجرت کا سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ وہ انسانوں سے ان کی شناخت چھین لیتی ہے .... برصغیر میں تقسیمِ ہند اور پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا اس خطے کے رہنے والوں کے لیے کچھ ایسی تبدیلیاں لایا کہ چودہ اگست انیس سو سینتالیس سے لے کر سولہ دسمبر انیس سو اکہتر تک کا وقت اہلِ دل پاکستانیوں کے لیے لہو رلانے کا وقفہ بن کر رہ گیا... اگرچہ سب نہیں وہ لاکھوں لوگ جن کی نسلوں کے نصیب میں مہاجرت لکھ دی گئی تھی... جہاں بھی گئے ان کے لیے وہاں کی مٹی سخت اور زمین بنجر ہو گئی۔ نئی زمین میں کہیں ان کی جڑیں اتر نہ سکیں۔ لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اور ان کی نسلیں شناخت کا پودا نہ لگا سکے اور اگر قسمت سے لگ گیا اور تھوڑا بہت پھلنے پھولنے کی کوشش کی تو بادِ مخالف کے ایک ہی جھونکے نے انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ وہ ایک کے بعد دوسری، تیسری، یہاں تک کہ آخری ہجرت پر مجبور ہوتے چلے گئے۔

جدوجہدِ آزادی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی ہجرتوں کے تناظر میں لکھی گئی پروین زبیر کی ایک دل گداز داستان

پھر وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ انہوں نے لاؤنج میں بیٹھ کر اپنے شوہر سے اس کی اس جرأت پر اسے جو ملاحیاں سنائی کہ وہ اندر سے تھر تھر کانپنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے سنانے کے لیے ہی اتنا زور، زور سے چلا رہی تھیں۔ وہ ان کے خاص مہمان تھے اور ان کے سامنے اس طرح آجانے سے وہ ان پر شک کر سکتے تھے یا پھر تہمینہ ان کے بارے میں کسی سے بات کر سکتی تھی۔ وہ ان کے خفیہ معاملات تھے اور وہ کسی صورت نہیں چاہتے تھے کہ اس کی بھنک بھی کسی کو پڑے اور تہمینہ پر تو انہیں بالکل بھی بھروسا نہیں تھا۔ اسے وہ اپنے گھر میں دشمن کا ایجنٹ تصور کرتی تھیں..... غیر بنگالی ہونے کے سبب وہ ان کے نفرت آمیز تعصب کا اندھا شکار بنی ہوئی تھی..... حالانکہ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھیں کہ اس کی پچھی پاکستان یا وہاں کے رہنے والوں سے کسی قسم کی کوئی وابستگی نہیں تھی..... لیکن وہ بھی اس زہرناک نفرت کا شکار ہو کر تہمینہ پر زندگی تنگ کیے ہوئے تھیں۔ اور اس کی وجہ سے اس کا بیٹا بھی بے جا بے رخی کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ پریشان تھی..... اپنی قسمت کا تو اسے معلوم تھا کہ عزت و چین سے زندگی بسر کرنا تو شاید اس کے مقدر میں لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ لیکن اس کا بچہ نہ اس کی بدنصیبی کا شکار ہو جائے۔ اس بارے میں اس نے جب بھی حبیب سے بات کرنے کی کوشش کی اس نے اسے معقول الفاظ میں تسلیاں دیں کہ شکیب اس کا بیٹا ہے، وہ ان تمام چیزوں کا حقدار ہے جو اس کا بیٹا ہونے کے سبب اسے ملیں گی۔ اس لیے وہ اس کے بارے میں پریشان نہ ہو۔

لیکن نہ جانے کیوں تہمینہ کے دل کو تسلی نہیں ہوتی تھی..... اس کا وجدان کہہ رہا تھا کہ وہ کسی بڑی مصیبت کا شکار ہونے والی ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے حبیب کے جیتے رہنے کی دعا کرنے لگی..... کیونکہ آج کل وہ مکتی باہنی کے ان گروہوں کے ساتھ خود باہر نکلتا

تھا جو پاکستانی فوج اور ان کی حمایت کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے نکلتے تھے۔ مسلح ہو کر قتل و غارت گری کر کے واپس آتے..... اور اس وقت وہ حبیب، تہمینہ سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔

چاندنی، شبنم، پھول اور بلبل کی شاعرانہ باتیں کرنے والا حبیب نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ اب تو وحشتوں کے جال میں الجھا، لباس پر خون کے دھبے لیے جلتا، جھلستا، اپنے آپ سے لڑتا ہوا ایک ایسا انسان تھا جس کے اندر نفرتوں کے ڈیرے اور محبتوں کے مدفن نظر آتے تھے۔ اس کے انداز، لب و لہجہ اور اطوار، سب مکمل طور پر بدل گئے تھے۔

شام ڈھلے دیر ہو چکی تھی۔ رات کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی ڈنر سرو ہو گیا تھا۔ حسبِ معمول ان دونوں کا کھانا شوندر بابا ان کے کمرے میں دے گئے تھے۔ لیکن وہ اس قدر خوفزدہ اور سہمی ہوئی تھی کہ ایک لقمہ بھی اس کے حلق سے اترنا مشکل تھا۔ اس نے شکیب کو کھانا کھلایا..... تھوڑی دیر اس کا ہاتھ تھامے وہ کمرے کے طول و عرض میں اسے ٹہلاتی رہی..... پھر صوفے پر بیٹھ کر کوئی کہانی سنانے لگی..... وہ چپ چاپ اس کے سینے پر سر رکھے سنتا رہا..... کافی رات ہو گئی تھی لیکن اسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں ماں، بیٹے — بے دست و پا کسی آنے والی قیامت کا انتظار کر رہے تھے۔

پھر دھڑ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور گھر کا سناٹا وحشت زدہ چیختی ہوئی آوازوں سے تڑخ کر ٹوٹ گیا۔ حبیب اور اس کے ساتھی واپس آئے تھے..... شاید کچھ زخمی بھی تھے کیونکہ کچھ آہ و زاری کی صدائیں بھی ان میں شامل تھیں۔ تہمینہ کی گود میں شکیب اس سے لپٹا سہما ہوا سا بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ نہیں سکتی تھی ورنہ کھڑکی کے پردے میں جھری بنا کر ضرور دیکھ لیتی کہ کیا ہو رہا ہے۔ بہرحال آنے والی آوازوں اور جملوں سے اسے اندازہ ہوا کہ زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد دی جا رہی ہے۔ پھر کوئی آدھے گھنٹے کے بعد کسی گاڑی کے باہر رکنے کی آواز آئی اور آنے والے شاید اس میں بیٹھ کر کہیں چلے گئے..... اب صرف حبیب اور اس کے ماں بابا کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر حسبِ توقع بیپا شا نے کچھ زہر اگلنا شروع کیا ہی تھا کہ باہر بھاری ٹرکوں کے رکنے کی آوازیں آئیں..... تو بیپا شا چلائی۔

"حبیب....."

کچھ بھاگ دوڑ کی سی آواز سنائی دی اور خاموشی چھا گئی۔ باہر کی جانب سے بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی اور پھر داخلی دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ تہمینہ اور شکیب کا دل ایک رفتار سے دھڑکنیں سنانے لگا۔ تیز، تیز تر، تیز ترین..... پھر دروازہ توڑ دیا گیا۔ کئی فوجی ہاتھوں میں گنیں تھامے اندر داخل ہوئے۔ اسی وقت شفیقل انا مدار، بپاشا، تہمینہ اور شکیب اپنے، اپنے کمروں سے باہر آئے۔ خوفزدہ سہمے ہوئے۔

''حبیب اور اس کے ساتھی کدھر ہیں.....؟''

ایک کرخت آواز نے پوچھا۔ لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا..... وہ سب اِدھر اُدھر بکھر کر گھر کا جائزہ لینے لگے..... دو وہیں رکے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر شفیقل کی گردن دبوچی اور سوال دوبارہ دُہرایا۔

''حبیب! حبیب کدھر ہے؟ جواب دو۔''

گردن پر دباؤ ہونے کے سبب وہ کچھ بول تو نہیں سکا لیکن نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں معلوم؟ اپنے بیٹے کا پتا نہیں ہے.....'' ایک گالی دے کر اس نے رائفل کا بٹ اس کے شانے پر مارا تو بپاشا کی چیخ نکل گئی۔ اب وہ بپاشا کی طرف متوجہ ہوا..... جب اس نے بھی کچھ نہیں بتایا تو اس نے شفیقل کو انہی بوٹوں سے مارنا شروع کر دیا..... اب تہمینہ اور بپاشا کی چیخوں سے فضا گونج رہی تھی۔ اور اس میں شفیقل کی دلدوز کراہیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ شکیب بری طرح خوفزدہ ہو کر رو رہا تھا۔ اتنے میں باہر ایک فائر ہوا..... پھر اندر سے بھی جوابی فائر ہوئے۔ کچھ دیر گولیاں چلتی رہیں۔ پھر اندر آنے والے فوجی ان سب کو خونی نظروں سے گھورتے ہوئے واپس باہر چلے گئے۔

''ہم پھر آئیں گے..... تم سب غدار انڈین ایجنٹس ہو..... دیکھ لیں گے، تمہارے بیٹے نے جتنے قتل کیے ہیں تمہارے سامنے اسے اتنی ہی بار پھانسی پر لٹکائیں گے۔ آتے ہیں پھر.....'' اس فوجی افسر نے ان کے سامنے تنبیہاً انگلی لہراتے ہوئے کہا اور وہ چلے گئے۔ اس کا لہجہ اور اس کے الفاظ خون کی بُو میں بسے ہوئے تھے۔ تہمینہ کے حواس سلب ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر شفیقل کی کراہتی ہوئی آواز نے ہوش دلایا۔

''بابا.....!'' وہ ان کی طرف دوڑی..... قریب جا کر دیکھا تو ان کا چہرہ تکلیف سے پسینے، پسینے ہو رہا تھا۔ اور وہ بے سدھ ہوئے جا رہے تھے۔ وہ واپس دوڑی گلاس میں پانی لا کر ان کے ہونٹوں سے لگایا۔ تو وہ پی نہ سکے..... بپاشا بھی سکتے کی کیفیت میں دیوار سے لگی فرش پر بیٹھی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے جیسے تیسے کر کے سسر کو اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھایا اور انہیں پانی کے چھینٹے مارے اور پلایا بھی..... ان کی ٹھوڑی سینے پر ٹکی ہوئی تھی اور وہ بے سدھ تھے۔ اس نے بھی روتے ہوئے شکیب کو اٹھایا اور بازوؤں میں سمیٹ کر وہیں ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''نہ جانے حبیب کہاں بھاگ کر چھپا تھا۔ انہیں ملا یا نہیں..... کہیں وہ اسے ساتھ تو نہیں لے گئے.....'' اس کا دل لگتا تھا کہ حلق میں آ کر دھڑک رہا ہے..... وہ دعائیں مانگ رہی تھی کہ وہ خیریت سے ہو..... رات لمبی ہو گئی تھی۔ اتنی کہ ختم نہیں ہو رہی تھی۔

''یا اللہ! اس رات کی صبح کب ہو گی؟ تو سب کی خیر کرنا..... خیر کرنا مولا!'' وہ دونوں ہاتھ جوڑے اوپر کی طرف سر اٹھائے اللہ سے مدد مانگ رہی تھی۔

اسی وقت رات کا کربناک سناٹا ایک ہلکی سی آہٹ سے ٹوٹا..... اس نے مڑ کر دیکھا تو ٹوٹے ہوئے دروازے سے حبیب اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کی طرف دوڑی۔ اس کا خون کے دھبوں سے آراستہ لباس و جسم، پریشان بال اور سخت گیر وحشت زدہ چہرہ اس کے لیے پریشان کن تو تھا۔ لیکن اس کا اپنے قدموں سے چل کر آ جانا باعثِ اطمینان بھی تھا۔

''حبیب! تم ٹھیک ہو ناں.....؟'' وہ بے ساختہ بولی تو حبیب نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا اور اس کا ہاتھ جھٹک کر ماں، بابا کی طرف بڑھ گیا۔ اسے اپنے سامنے پا کر بپاشا کا سکتہ ٹوٹا..... وہ اٹھی اور چیخ مار کر بیٹے سے لپٹ گئی۔ وہ روتی جاتی تھی اور شوہر کی طرف اشارہ کر کر کے اس پر ہونے والے ظلم کو اس کے سامنے

پیش کر رہی تھی۔ پھر آخر کار اس کے تیروں کا رخ تہمینہ کی طرف آ ہی گیا۔

''یہی ہے..... اسی کی زبان بولنے والے آئے تھے، وہ تو جان سے مارنا چاہتے تھے شکر ہے کہ باہر تمہارے ساتھیوں نے آ کر ہمیں بچالیا..... یہ اپنی زبان میں ان سے بول رہی تھی..... یہی کہہ رہی ہوگی کہ مار دو ان دونوں کو.....'' وہ بنگالی میں اس کے بارے میں یہ سارا جھوٹ بیٹے کے گوش گزار کر رہی تھی..... اور تہمینہ حیران ہو کر سوچ رہی تھی کہ وہ تو ان کو بچانے کے لیے ان کی منتیں کر رہی تھی۔ وہ کیونکہ بنگالی نہیں سمجھ رہے تھے اس لیے اس نے اردو بول کر ان کی جان بخشی کی فریاد کی تھی..... بپاشا نے اسے اسی کا قصور بنا دیا۔

حبیب نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا اور اس کی طرف بڑھا۔ قریب آ کر اس کے دونوں کاندھے پکڑ کر اپنی طرف کیا۔ اس نے زوردار جھٹکا دیا تھا اور اس کی گرفت بھی بہت قہر مانہ تھی۔ وہ اتنی خوف زدہ ہوئی کہ سانس رکنے لگی۔ پھیلی، پھیلی آنکھوں سے اس نے حبیب کی آنکھوں میں لپکتے شعلوں کو دیکھا تو ڈر کر بری طرح چلائی۔

''حبیب، چھوڑو مجھے، چھوڑو.....'' اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی تو اس نے گردن سمیت اس کے دونوں گالوں کو پوری طاقت سے بھینچا..... اس کا منہ کھل گیا..... سانس رک رہی تھی اور زبان باہر نکل آئی تھی۔

''بولا تھا ناں اردو نہیں بولنا..... نہیں بولنا تھا اردو.....'' اس نے دوسرے ہاتھ سے نہ جانے کہاں سے ایک چاقو برآمد کیا اور اس کی باہر نکلنے والی زبان کو کھینچا... چاقو والا ہاتھ بلند کیا اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے تڑپتی پھڑکتی تہمینہ کی زبان پر چاقو کا بھرپور وار کیا..... اس کے منہ سے ایک دل دہلا دینے والی چیخ نکلی..... وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹ کر گری اور ساکت ہوگئی۔

''ماں.....'' شکیب نے یہ بھیانک منظر دیکھا اور چیختا ہوا ماں کی طرف دوڑا..... وہاں کھڑے ہوئے باپ کو ایک دھکا دیا اور ماں سے لپٹ گیا۔ وہ زور، زور سے رو رہا تھا۔ حبیب اپنے بال زور، زور سے نوچ کر بری طرح چلا رہا تھا۔ گھر کے سارے ملازم جمع ہو گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ زور سے چیخا۔

''تار بابا بڑے سیلے داؤ راستے تارنی کیشے.....''

(اسے اٹھا کر باہر پھینک دو..... سڑک پر لے جا کر پھینکو.....) جذبات کی وحشیانہ شدت سے اس کی آواز بری طرح پھٹ گئی تھی۔ وہ ایک غیر انسانی آواز محسوس ہوئی۔ ملازم بھی سہم گئے تھے، انہوں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور ٹوٹے دروازے سے نکل کر باہر چلے گئے۔ شکیب بری طرح روتا اور ماں ماں چلاتا ہوا ان کے پیچھے دوڑتا ہوا نکل گیا۔ اسے بھی کسی نے نہیں روکا۔ شوندر بابا نے رحم آمیز اور ملامت بھری نظروں سے سب کو دیکھا۔ وہ اپنے حواسوں میں نظر نہیں آ رہا تھا اور جانوروں کی طرح چلا رہا تھا۔ دوسری ملامت آمیز نظر انہوں نے بپاشا پر ڈالی جو بے تاثر چہرہ لیے چپ چاپ کھڑی یہ خونی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ پھر تاسف آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے اپنے کوارٹر کی طرف چلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں دونوں ملازمین کی واپسی ہوگئی۔ انہوں نے شوندر بابا کو بتایا کہ مالک کے حکم کے مطابق وہ گھر کی بہو کو بڑی سڑک پر ڈال کر آ گئے تھے۔

''پتا نہیں کیا انجام ہو..... اللہ ہی جانے.....'' شوندر بابا کی بوڑھی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپک کر کہیں کھو گیا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو ذہن بالکل خالی تھا..... وہ ایک پلنگ پر پڑی تھی۔ آس پاس سفید سی دیواریں تھیں، کچھ آوازیں بھی بھنبھناہٹ کی شکل میں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں۔ شاید کچھ لوگ تھے آس پاس..... لیکن اس کے سامنے ایک سفید پردہ کھنچا ہوا تھا۔ ذرا سی گردن موڑی تو لکڑی کی ایک بینچ پر شکیب سو رہا تھا۔ اس کے جگر کا ٹکڑا..... اس کا بیٹا..... بوسیدہ اور میلا لباس..... بال گندے اور الجھے ہوئے۔ اس کے مٹی سے آلودہ چہرے پر بہنے والے آنسوؤں نے لکیریں سی بنا دی تھیں۔ وہ گھٹنے سمیٹے دونوں ہاتھ ان میں گھسائے بنچ پر گٹھری بنا پڑا تھا۔

''شکیب!'' اس نے بیٹے کو آواز دینے کی کوشش کی تو لگا جیسے منہ میں ریت بھری ہوئی ہے اور وہ زبان کو حرکت دینے کے قابل نہیں ہے۔ اس کے منہ سے ایک بے معنی سی آواز نکل کر رہ گئی..... اس نے گھبرا کر دوبارہ بیٹے کو پکارا تو وہی پہلے جیسی کیفیت محسوس ہوئی۔ وہ خاموش ہو کر آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتی اور یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ بہت زور دینے پر دماغ پر چھائی ہوئی غنودگی کا غبار کچھ کم ہوا..... جو غالباً مسکن دواؤں کی وجہ سے تھا تو آہستہ آہستہ اسے سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ ذہن کے پردے پر آخری منظر جو اپنی پوری جزئیات کے ساتھ محفوظ تھا جب یاد آیا تو اس کے جذبات کے طوفان میں وہ شدت آئی کہ وہ تڑپ کر چلا اٹھی..... چلا، چلا کر رونے لگی۔ اس کی آواز سے شکیب بھی گھبرا کر اٹھ گیا اور فوجی لباس میں ایک نرس بھی آ گئی۔

''کیا ہوا.....؟ کچھ تکلیف ہو رہی ہے کیا.....؟'' اس نے بڑے سکون سے پوچھا تو تہمینہ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نفی میں ہاتھ ہلایا۔

''ہاں..... ابھی آپ بول نہیں سکتیں..... کیونکہ آپ کی زبان کافی زخمی ہے..... اسے کاٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن شکر ہے کہ کٹنے والا ٹکڑا الگ نہیں ہوا..... اس کا تھوڑا سا حصہ زبان سے جڑا ہوا تھا۔ ہم نے اسے ٹانکے لگا کر جوڑا ہے، یہ چند دن کی تکلیف ہے، ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ پریشان نہ ہوں..... آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں؟'' نرس نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اشارے سے اس کے بارے میں پوچھا۔

''ہاں میرا نام شہلا ہے اور میں پاکستان آرمی کے میڈیکل کور میں ہوں..... آج کل یہاں میری ڈیوٹی ہے، ہم ریڈ کراس والوں کے ساتھ مل کر یہ چھوٹا سا فیلڈ اسپتال چلا رہے ہیں، آپ کو ہمارا ٹرک سڑک پر سے اٹھا کر لایا تھا۔ آپ بے ہوش تھیں..... آپ کے بیٹے نے بتایا کہ آپ کی زبان کاٹی گئی ہے تو ہم نے فوری طور پر آپ کو طبی امداد دی ہے، آپ اب بہتر ہیں، یہ ڈرپ ختم ہو جائے تو ہم آپ کو ڈسچارج کر دیں گے..... آپ کو زیادہ عرصے رکھا نہیں جا سکتا کیونکہ یہاں بے شمار زخمی آ رہے ہیں اور ہمارے پاس جگہ کم ہے..... اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آپ کا بیٹا آپ سے بہت پیار کرتا ہے، اس نے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑا..... حالانکہ ڈاکٹر احسن نے اسے کئی دفعہ کیمپ جانے کے لیے کہا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ بہت پیارا بچہ ہے، اللہ اس کی بھی قسمت اچھی کرے۔''

اتنی ساری باتیں کر کے ڈاکٹر شہلا نے کافی وقت لگا دیا تھا یہاں، اب انہیں دوسرے مریض بھی دیکھنا تھے۔ اس لیے وہ چلی گئیں۔ شام تک ان دونوں ماں بیٹے کو کیمپ پہنچا دیا گیا۔

کیمپ کیا تھا ایک بڑے سے میدان کو چٹائیوں اور بانسوں سے گھیر کر ایک ٹھکانا بنا دیا گیا تھا۔ کھلے آسمان تلے اس میں بھرے ہوئے سیکڑوں انسان جینے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ بہت سے زخمی اور بیمار بھی تھے۔ کچھ لوگ آتے اور انہیں دو وقت کا کھانا بانٹ کر چلے جاتے تھے۔ پانی کے لیے ان سب نے مل کر ایک کنواں کھود لیا تھا۔ بس اس کسمپرسی میں وقت گزارنے والوں کو معلوم تھا کہ انہیں بچھی پاکستان بھیج دیا جائے گا..... کیونکہ یہاں اس بنگلہ دیش میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے..... وہ سب بہاری ہیں اور یہاں ان کی جانیں اور عزتیں محفوظ نہیں ہیں..... اگر انہیں جینا ہے تو یہ ملک، یہ خطہ چھوڑنا پڑے گا۔

دو دن تو تہمینہ اپنی گزری زندگی اور اپنے نقصان کا ماتم مناتی رہی، شکیب اس کے گھٹنے سے لگا..... ماں کو زیادہ روتے، آنسو بہاتے دیکھتا تو اس کے آنسو پونچھتا..... اپنے ننھے، منے ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اسے پیار کرتا اور رونے سے منع کرتا۔ آخر کار تہمینہ نے بھی ہمت کی..... وہ پہلے بھی ایک مرتبہ ایسے ہی حالات سے گزر چکی تھی..... وہ جانتی تھی کہ آنسو بہاتے رہنے سے یا اپنی تقدیر سے گلہ کرنے سے مسائل حل

نہیں ہو سکتے..... اس کے سامنے اپنے بیٹے کا مستقبل تھا..... آئندہ کیا حالات ہونے والے ہیں اور اب وہ تیسری بار ہجرت کر کے کہاں جانے والی ہے..... اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اسے انہی گہرے اندھیروں کی سرنگ میں نہ جانے کتنا طویل سفر کرنا تھا روشنی کی تلاش میں..... وہ نہیں جانتی تھیں لیکن بہر حال اب وہ اپنے بیٹے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی..... یہ طے تھا۔

تیسرے دن وہ اٹھ کھڑی ہوئی..... اس نے شکیب کا ہاتھ پکڑا اور اسی کیمپ میں پریشان حال لوگوں کی خیر خبر لینے نکل کھڑی ہوئی۔ ایسی، ایسی اندوہناک کہانیاں تھیں جو اس نے ان بچے کھچے پناہ گزینوں سے سنیں..... حسب توفیق انہیں تسلیاں دیتی، بیماروں اور زخمیوں کی حتی المقدور مدد کرتی وہ کیمپ میں ادھر ادھر گھومتی رہتی۔ شکیب بھی اس کے ساتھ، ساتھ ہوتا، ایک دن وہ کچھ آگے نکل گئی۔ یہ حصہ بھی ایسے ہی مجبوروں اور معذوروں کا تھا۔ وہ آہستہ، آہستہ انہیں دیکھتی ہوئی آگے چلتی جا رہی تھی کہ اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔ ایک آدمی چٹائی پر کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا، نہایت کمزور اور نحیف، جسم پر جگہ، جگہ جلنے کے نشانات چہرہ بھی آدھا کچھ جھلسا ہوا تھا کچھ زخمی..... لیکن ایک شباہت سی محسوس ہوئی تہمینہ کو اس میں..... اس شخص کی شباہت جس کے بڑے احسان تھے اس پر..... وہ بے چینی سے آگے بڑھی۔ اس کے منہ سے اس کا نام ایک ٹوٹی پھوٹی شکل میں ادا ہوا۔

''شبن میاں.....'' اس شخص نے بے چین ہو کر آنکھیں کھول دیں اور اٹھ بیٹھا..... اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

''ارے بٹیا! آپ اور یہاں؟ آپ یہاں کیسے؟'' وہ حیرت سے اس کی شکل دیکھے جا رہا تھا جو آنکھوں میں آنسو بھرے اسے دیکھ رہی تھی..... جب وہ کچھ نہ بولی تو اس نے خود ہی کہا۔

''اچھا.....! ہم سمجھ گئے..... آپ اپنی ہمدرد طبیعت کی وجہ سے یہاں آئی ہوں گی..... پریشان حال لوگوں کی مدد کرنے کے خیال سے..... لیکن..... بٹیا! آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا..... آپ کے شوہر اور ساس، سسر کو یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ لیکن آپ..... اور آپ کا یہ بیٹا؟ کس حال میں ہیں آپ دونوں.....؟ ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، بتائیے کچھ سمجھائیے.....؟'' شبن میاں کچھ پریشان ہوئے، ہمدردی کے دو بول سن کر تہمینہ نے اپنے جذبات پر جو بند باندھا ہوا تھا وہ یکلخت ٹوٹ گیا اور وہ اس قدر..... بے قرار ہو، ہو کر روئی کہ شبن میاں کی بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے..... وہ بھی پریشان ہو گئے۔

''بس کریں بٹیا.....! چپ ہو جائیں..... دیکھیں! ہمیں ڈر لگ رہا ہے، کہیں آپ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ویسا تو نہیں ہو گیا..... کیا ہوا ہے، کچھ بتائیں تو سہی..... حبیب میاں کہاں ہیں؟ وہ تو آپ سے بہت، بہت محبت کرتے تھے ناں..... پھر ان کے ہوتے آپ اس حال میں یہاں کیسے آئیں.....؟'' انہوں نے بھیگے، بھیگے لہجے میں حالات سے آگاہی چاہی تو تہمینہ نے منہ کھول کر اپنی زبان نکال کر دکھائی۔

''ارے! آپ کی تو زبان کٹی ہوئی ہے، کس نے کاٹی؟'' وہ گھبرا کر پوچھ رہے تھے۔

''حبیب.....'' تہمینہ کے منہ سے حبیب کا نام اس طرح نکلا کہ اذیت کی شدت کے سبب انتہائی حد تک بگڑا ہوا تھا۔

''کیا.....؟ کیا حبیب نے آپ کی زبان کاٹی..... خدا غارت کرے..... مگر کیوں؟ کیوں؟''

''ار..... د..... و.....'' اس نے اٹک، اٹک کر... بہ مشکل ادا کیا۔

''اردو بولنے کی وجہ سے؟'' تہمینہ نے اثبات میں سر ہلایا تو شبن میاں نے سر پکڑ لیا۔

''اتنا ظالم انسان تھا وہ..... محبت کے نام پر اتنی نفرت..... نہیں..... آپ دیکھیے گا..... اللہ اس کے ساتھ خود انصاف کرے گا..... وہ بھی ایسا کہ دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہو گی..... بیٹے کو بھی چھوڑ دیا..... کیونکہ اس کی ماں بنگالی نہیں تھی۔ لعنت ہے اس پر..... ہزار بار لعنت.....'' وہ نفی میں سر ہلا، ہلا کر ملامت کر رہے تھے۔

''کوئی بات نہیں بٹیا..... جس نے اس آزمائش میں ڈالا ہے، وہی نکالے گا بھی..... چند دن ہیں پریشانی کے..... گزر ہی جائیں گے..... کہاں ٹھہری ہوئی ہو آپ.....؟'' شبن میاں نے پوچھا تو اس نے ہاتھ سے دور کی طرف اشارہ کیا۔

''کوئی بات نہیں..... کچھ سامان ہے کیا آپ کے ساتھ.....؟'' تہمینہ نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے..... تو پھر آپ یہاں رہیں، ہمارے ساتھ، ہمارے پاس دو چٹائیاں ہیں، ایک ہم آپ دونوں ماں بیٹے کو دے دیتے ہیں، آیئے.....'' انہوں نے کھڑے ہو کر اپنی چٹائی اٹھائی تو اس کے نیچے دوسری چٹائی تھی جو انہوں نے تھوڑے فاصلے پر بچھا دی۔

''آجاؤ بٹیا! آؤ شکیب.....! یہ تمہاری ہے، کل میں ایک اور لے آؤں گا تو اسے اوپر تان دوں گا..... کوئی چادر بھی مل ہی جائے گی۔ تھوڑا وقت ہی تو گزارنا ہے، ٹھیک ہے ناں بٹیا!'' تہمینہ کو ایک عجیب سی تقویت سی محسوس ہوئی تھی شبن میاں کے ملنے پر..... تھوڑی ڈھارس بندھ گئی تھی۔ وہ قابلِ اعتبار آدمی تھے۔ چند ہی دن کے بعد ایک صبح انہیں ائرپورٹ لے جایا گیا۔ جہاں کئی گھنٹے انتظار کے بعد جہاز پر بٹھایا گیا۔ اور وہ ڈھائی گھنٹے سفر کرنے کے بعد کراچی کے ائرپورٹ پر اتر گئے۔

اجلے، اجلے چہرے، صاف ستھرا ماحول۔ جہاں نہ جان و مال کا کوئی خطرہ تھا..... نہ نفرت تھی اور نہ ہی حالات کی سختی..... انہوں نے کچھ سکون کی سانس لی اور ائرپورٹ سے باہر آ گئے۔ خالی ہاتھ، بے سروسامانی کے عالم میں کھڑے وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ کہاں جائیں؟ کیا کریں.....؟

اتنے میں کچھ لوگ آس پاس نظر آئے..... وہ آنے والوں سے کچھ پوچھ گچھ رہے تھے۔ دو آدمی ان کے پاس بھی آئے۔

''کہاں سے آئے ہیں آپ لوگ؟'' انہوں نے بہاری انداز کی اردو بولتے ہوئے پوچھا تو شبن میاں نے بتا دیا کہ وہ ڈھاکا کے مہاجر کیمپ سے آئے ہیں۔

''کوئی رشتے دار ہیں یہاں..... کوئی رہنے کا ٹھکانا ہے کیا؟'' ان کے دونوں سوالوں کا انہوں نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے تسلی دی اور اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھا کر چل پڑے۔

وہ ایک طویل و عریض ویرانہ تھا۔ ایک ایسا میدان جہاں جگہ، جگہ جنگلی جھاڑیاں اور کیکر کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ ''دیکھیے..... یہ وہ جگہ ہے جہاں وہ سب لوگ آ کر اپنے، اپنے ٹھکانے بنا رہے ہیں جو مشرقی پاکستان میں اپنے گھر بار، سب کچھ لٹا چکے ہیں..... یہاں فی الحال سہولت کوئی نہیں ہے لیکن جان و مال، عزت و آبرو محفوظ ہے، ہم سب مل کر ان شاء اللہ سب ٹھیک کر لیں گے..... یہاں کوئی مناسب سی جگہ دیکھ کر اپنے لیے کوئی عارضی بندوبست کرنے کی کوشش کر لیجیے..... جتنا ہم سے ہو سکا ہم بھی آپ کی مدد کرنے کی کوشش کریں گے۔'' ہاشم نام کے اس شخص نے انہیں تفصیل بتائی۔

''فی الحال تو ہمیں سر پر کوئی چھپر چاہیے، جہاں ہم رہ سکیں.....'' شبن میاں نے آزردگی سے کہا تو ہاشم نے ان کا کاندھا تھپتھپا کر انہیں تسلی دی۔

''فکر نہ کریں..... ہمارے کچھ لوگ بانس اور چٹائیاں لینے شہر گئے ہوئے ہیں بلکہ وہ دیکھیے سوزوکی آ گئی ہے، آیئے..... ہم آپ کو جھونپڑی بنانے کے لیے کچھ بانس اور چٹائیاں دلوا دیتے ہیں..... اس شہر کے کچھ مخیر لوگ ہم سب کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں..... یہ بھی انہی کے تحفوں میں سے ایک ہے..... آیئے میرے ساتھ۔''

ہاشم میاں نے انہیں ایک جھونپڑی کا سامان دلوا دیا۔ تہمینہ کے مشورے پر انہوں نے اس کچے سے راستے کے نزدیک جگہ کا انتخاب کیا..... جہاں سے گاڑیاں آتی جاتی تھیں..... پہلے انہوں نے ایک اونچے نیچے قطعۂ زمین کو ایک گڑھا کھود کر..... اس میں سے نکلنے والی مٹی اور پتھروں سے بھر کر ہموار کیا..... اس پر پانی چھڑک کر اسے بھاری پتھر سے خوب کوٹ کر اچھا ہموار سا فرش بنا لیا..... پھر بانس اور چٹائیاں لگا کر ایک معقول سی جھونپڑی بنائی۔ جہاں گڑھا کھودا تھا اس

پر بھی ایک چار دیواری سی بنالی جس میں کیکر کی کانٹے دار جھاڑیوں سے شاخیں کاٹ، کاٹ کر لگائیں اور اسے غسل خانے کے طور پر استعمال کے قابل بنالیا..... تہمینہ نے تو جھونپڑی کے باہر بھی ایک معقول سی جگہ کو کوٹوں پر پتھر رکھ کر ڈوریوں سے ایک صحن کا خاکہ ترتیب دیا اور شکیب اور شبن میاں سے کیکر کے خودرو اگنے والے چھوٹے، چھوٹے پودے منگوا کر لگادیے..... مناسب دیکھ بھال سے ان پودوں نے جڑیں پکڑ لیں اور تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئے۔ شبن میاں روزانہ مزدوری کی تلاش میں نکل جاتے، کسی کی جھونپڑی بنانے میں مدد کردی، کبھی سامان لانے کے لیے چلے گئے اس طرح انہیں چند پیسے مل جاتے۔ جس سے وہ اپنی تہمینہ اور شکیب کی کوئی چھوٹی موٹی ضرورت پوری کر لیتے تھے۔ کھانا مخیر حضرات کی طرف سے وافر مقدار میں آجاتا تھا۔ اس لیے کھانے پر کچھ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن تہمینہ جس نے دوسروں کو کھلایا تھا اس کی غیرت یہ مفت کے نوالے حلق سے اترنے نہیں دیتی تھی۔ وہ ہر وقت اس ادھیڑ بُن میں لگی رہتی کہ کس طرح کچھ ایسے روزگار کا بندوبست ہوجائے کہ رزقِ حلال کھا کر اپنی محنت کی کمائی سے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ بھر سکے۔ اکثر وہ جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھی سامنے راستے سے گزرنے والی گاڑیوں اور ان سے اڑنے والے گرد و غبار کے مرغولوں کو دیکھتی رہتی۔ پھر وہ سڑک کے پار ذرا دور نئی تعمیر ہونے والی عمارتوں کو دیکھتی۔ وہاں شاید کچھ آفیسرز وغیرہ تھے۔ شاید کچھ سرکاری دفاتر کی عمارتیں تھیں۔ جہاں صبح شام بابو لوگ آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔

روزانہ اُدھر دیکھتے ہوئے اسے کچھ خیال آیا۔

"شبن میاں.....! یہ سونے کی چوڑی ہے میری..... باریک ہے لیکن بھاری ہے..... آپ یہ لے جائیں..... بازار میں بیچ کر چائے کا سامان خرید کر لے آئیں..... میں اور شکیب مل کر چائے کا اسٹال لگائیں گے، اگر چل پڑا تو اچھی آمدنی اور رزقِ حلال کا ذریعہ ثابت ہوگا..... ہمیں یہ خیرات کا کھانا نہیں کھانا پڑے گا۔" نہ جانے کیسے ایک چوڑی اس کے ہاتھ میں بچی پڑی رہ گئی تھی۔ تہمینہ کو زبان کٹنے سے بولنے میں بہت تکلیف ہوتی تھی، نہ ہی اس کی زبان سے الفاظ صحیح طور پر ادا ہوتے تھے لیکن شکیب اور شبن میاں اب اس کی بات کو کافی حد تک سمجھ لیتے تھے۔ اس کی بات سن کر ہاتھ میں چوڑی تھامے وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کہاں وہ بھوپال کے محل جیسی حویلی میں رہنے والی وہ خوب صورت شہزادی..... اور کہاں تکمل کی پرانی اور گھسی ہوئی ساڑی میں ملبوس..... یہ بد حال عورت..... جو اپنے چند لقموں کے انتظام کی خاطر وہ کام کرنے کا کہہ رہی تھی جس کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے وہ..... وقت کیسے، کیسے لوگوں کو کہاں لے آتا ہے۔

"شکیب..... میرا بیٹا کام کرے گا ناں میرے ساتھ؟" تہمینہ نے بیٹے کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ شبن میاں ان دونوں کو دیکھ کر افسوس میں سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔ پھر ضرورت کا تقریباً سارا سامان آگیا۔ سلور کی بڑی پتیلی، سلور کی ٹرے، چائے کی پیالیاں، چائے دانیاں، چمچے، شکر، پتی رکھنے کی بڑی شیشیاں..... پھر ان تینوں نے مل کر جگہ کا انتخاب کیا..... یہ سڑک کے پاس ان سرکاری دفاتر کی عمارت کے نزدیک کیکر کے دو گھنے درختوں کے نیچے کی جگہ تھی۔ گھنا سایہ تھا، انہوں نے آس پاس سے پتھر جمع کر کے ایک چبوترا سا بنایا۔ اسی میں لکڑیوں سے جلنے والا چولھا بھی بنالیا..... پھر تہمینہ نے مٹی گوندھ کر اس پورے چبوترے کو مٹی سے صفائی سے لیپ دیا۔ اب وہ ایک ایسا کاؤنٹر سا بن گیا تھا جس کے پیچھے کھڑے ہو کر تہمینہ چائے بنا سکتی تھی اور کاؤنٹر پر سارے برتن بہ آسانی رکھے جاسکتے تھے۔ جب وہ بن کر تیار ہوگیا تو تہمینہ نے شبن میاں اور شکیب کو سمجھایا کہ انہیں کس طرح چائے لے کر جانا ہے اور دفتری بابو کو بیچنا ہے۔ اس نے چھ کپ چائے بنا کر سلیقے سے ٹرے میں چائے دانی، کپ اور شکر دان چمچے سمیت رکھ کر شبن میاں کو ٹرے پکڑائی۔ اور شکیب کو سمجھایا کہ وہ بابوؤں کے پاس

ایک، ایک ٹیبل پر جا کر انتہائی تمیز سے چائے کے لیے پوچھے ..... اگر وہ ہاں کہیں تو انہیں چائے پیش کردے..... سب چائے بک جائے تو اور آرڈر لے کر آئے تو وہ اور چائے بنا کر دے گی..... وہ دونوں چلے گئے۔ وہ انہیں عمارت میں داخل ہونے تک دیکھتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے انہیں آتے دیکھا۔ شبن میاں ٹرے ہاتھ میں تھامے تھے اور شکیب ان کے سامنے اچھلتا کودتا ہوا آرہا تھا۔

''بیٹا..... تمہاری چائے تو بابو لوگوں کو بہت پسند آئی۔ پھر اتنے صاف ستھرے برتنوں میں انہیں چائے پینے میں بہت مزہ آیا۔ اب چھ کپ اور چاہیے..... جلدی سے بنا کر دے دو..... ایک افسر صاحب نے بھی کہا ہے چائے کے لیے..... ان کے لیے الگ سے دے دینا..... شاید کوئی مہمان بھی ہیں..... اس لیے دو کپ بنانا.....'' شبن میاں بھی بڑے جوش میں بول رہے تھے۔ اور شکیب بھی اسے بتا رہا تھا کہ بہت سے بابو لوگوں نے اس سے کہا ہے وہ روزانہ ہماری ہی چائے پئیں گے۔ وہ بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا کر اور چائے بنانے میں مصروف ہوگئی۔

پھر یہ سلسلہ چل پڑا..... اللہ نے اس کے کام میں کچھ ایسی برکت ڈالی کہ چائے کے کھوکے سے اتنی آمدنی ہونے لگی کہ اس نے اپنی جھونپڑی کے آنگن میں ایک طرف باورچی خانہ بنالیا..... اور اب اپنی کمائی سے اپنے گھر کا چولھا جلانے لگی۔ وہ اور شکیب مل کر چائے خانہ چلا رہے تھے۔ شبن میاں دوبارہ اپنی مزدوری کے کام پر واپس چلے گئے..... کچھ پیسے ان کے پاس جمع ہوئے تو انہوں نے اس جھونپڑی کے برابر اپنے لیے الگ ایک اور جھونپڑی بنالی۔ اب دونوں کا صحن ایک تھا جو کیکر کے گھنے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہ گھنے درخت تہمینہ کے لگائے ہوئے تھے جو اب انہیں سایہ اور پردہ دونوں دے رہے تھے۔

ایک دن شکیب چائے لے کر بڑے افسر بابو کے کمرے میں گیا تو انہوں نے اس صاف ستھرے اور تمیز دار بچے کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ شکیب سے اس کے بارے میں اکثر پوچھتا رہتا تھا اور جانتا تھا کہ یہ چائے اس کی ماں بناتی ہے لیکن جس سلیقے سے ٹرے میں رکھ بھیجتی ہے، وہ بتاتا ہے کہ اس کا تعلق کسی اچھے گھر سے ہے اور مجبوریِ حالات نے اسے اس کام پر مجبور کیا ہے۔

''یار! یہ بتاؤ کہ تمہارے کھوکے پر کھانے کا کچھ بندوبست نہیں ہوتا کیا..... اگر دوپہر کا کھانا یہاں سے مل جائے تو مزہ آجائے۔''

''جی شاب.....! ماں سے پوچھ کر بتاؤں گا۔'' شکیب نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔ اور جب اس نے یہ بات ماں سے جا کر کہی تو اس کے ذہن میں بھی ایک نئی کھڑکی کھلی..... ٹھیک تو ہے آخر اتنے سارے لوگ دوپہر کو بھی تو کھانا کھاتے ہیں تو اگر میں کھانا بھی بنانا شروع کردوں تو آمدنی میں اور اضافہ ہوجائے گا..... بس..... پھر اس نے یہ بندوبست بھی کر ڈالا۔

پہلے دن شکیب ٹرے میں ایک سفید گتے کا ڈبا لے کر افسر کے پاس پہنچا۔

''سر! آپ نے کھانے کا کہا تھا..... آج ماں نے کھانے کا کام بھی شروع کیا ہے، یہ پہلا آرڈر آپ کے لیے ہے۔'' اس نے ٹرے اس کے سامنے رکھی تو افسر نے مسکرا کر ڈبا اٹھایا اور حیران ہوا کہ ڈبے کے نیچے ایک ٹشو پیپر بھی رکھا ہوا تھا۔ اس وقت ٹشو پیپر کا استعمال بہت شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، شاید صرف بڑے، بڑے ہوٹلوں میں..... پھر ڈبا کھول کر دیکھا تو اس میں بٹر پیپر میں پلاؤ تھا۔ جس میں سے بڑی زبردست خوشبو بھاپ کے ساتھ اٹھ رہی تھی۔ ڈبے کی سائڈ میں ایک ہلکا پھلکا پلاسٹک کا چمچہ بھی موجود تھا۔ پلاؤ کی مقدار بھی اس قدر مناسب تھی کہ ایک بندہ پیٹ بھر کر یہ مزیدار پلاؤ کھا سکتا تھا۔ اس نے چمچہ اٹھا کر نفاست سے اس میں پلاؤ بھرا..... اور منہ میں رکھا تو اس کے ذائقے کا لطف بہت ہی زبردست محسوس ہوا۔

''ہم..... م..... م واہ بھئی! کیا زبردست پلاؤ ہے، میرا آرڈر لکھو..... یہ مستقل ہے، روزانہ لنچ میرے لیے تم ہی لے کر آؤ گے..... ٹھیک ہے؟'' اس نے کہا تو شکیب خوش ہوگیا۔ پھر یہ آرڈر بڑھتے گئے۔

روزانہ چائے کے ساتھ، ساتھ لنچ بھی بابو لوگ اسی سے منگوانے لگے۔ کام بہت بڑھ گیا تھا۔ اور اسی حساب سے آمدنی بھی۔ دونوں ماں بیٹے خوش تھے، شام پانچ بجے آدمیوں کی چھٹی ہو جاتی تھی۔ وہ تین بجے آخری مرتبہ چائے بھجوا کر کام سمیٹ لیتی تھی۔ صفائی ستھرائی اور اگلے دن کی تیاری میں ایک ڈیڑھ گھنٹا اور لگتا تھا پھر وہ دونوں ماں، بیٹے پانچ بجے تک اپنے گھر آجاتے تھے۔ ایک گھنٹا آرام کر کے وہ شکیب کو پڑھاتی تھی۔ اس نے شبن میاں کو کہہ کر یہاں کے سرکاری اسکولوں کا پانچویں جماعت کا کورس منگوالیا تھا۔ اور وہ خود اسے نہ صرف یہ کورس پڑھاتی بلکہ قرآن بھی پڑھا رہی تھی۔ نماز وہ خود بھی پڑھتی تھی اور بیٹے کو بھی پابندی سے مسجد بھیجتی۔ اس کی تعلیم و تربیت سے غافل نہیں تھی وہ..... اتوار کو وہ تینوں چھٹی کرتے تھے..... اور اب جب ہاتھ تھوڑا کھلا ہو گیا تھا تو وہ کبھی، کبھی شکیب کو گھمانے پھرانے کہیں نہ کہیں لے جاتے۔ گاندھی گارڈن، فریئر ہال تو کبھی کلفٹن..... وہ بہت خوش ہوتا تھا، اب ایک بس کا روٹ ان کے گھر کے قریب تک آ گیا تھا وہ آرام سے بس میں بیٹھتے اور چلے جاتے، گھومتے پھرتے، تفریح کرتے اور شام ڈھلے بس میں بیٹھتے اور گھر آجاتے۔

زندگی ایک ڈھب پر آ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے حالات پر صبر کرنا اور زندگی کو سلیقے سے آگے چلانے کا چلن سیکھ لیا تھا۔ جس عیش و آرام کو وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے اسے کبھی کوئی یاد کرنے یا اس کا ذکر کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ لمحہ موجود میں جو کچھ تھا اس میں جی رہے تھے اور خوش تھے کہ اللہ نے ان پر بڑا کرم، احسان کیا کہ ان کی جان و مال اور عزت محفوظ ہے۔ شکر ادا کرتے کہ وہ ایک پُرسکون ماحول میں جی رہے تھے۔ جہاں کوئی خوف نہیں..... محنت سے رزقِ حلال کما رہے ہیں اور بہتوں سے بہت اچھی زندگی جی رہے تھے۔ اپنی چھپر چھاؤں ہے جسے وہ اپنے لیے آہستہ، آہستہ آرام دہ اور محفوظ بنا رہے تھے۔ تھوڑے، تھوڑے پیسے خرچ کر کے وہ دیواریں اور چھتیں بنا رہے تھے، سیمنٹ کے پکے فرش بنا رہے تھے، شبن میاں نہ جانے کہاں سے بیٹری اور اس سے چلنے والے پنکھے لے آئے تھے، سو اب گرمی بھی زیادہ نہ ستاتی تھی۔ زندگی میں بڑی حد تک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔

شبن میاں کو دو تین دن سے بخار تھا، ایک ذرا اترا تو وہ مزدوری پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

''ارے شبن میاں، کہاں جا رہے ہیں صبح، صبح.....؟'' تہمینہ نے انہیں تیاری کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''بس بٹیا..... تین چار دن سے گھر میں پڑا ہوا تھا، اب جا کر کام ڈھونڈوں ورنہ کام کیسے چلے گا؟'' ان کے انداز میں نقاہت تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی..... حالت دیکھیں اپنی..... اٹھا جا نہیں رہا ہے اور جا رہے ہیں کام کرنے..... نہیں بالکل نہیں..... بلکہ میں تو کہتی ہوں شبن میاں..... آپ ایسا کریں کچھ دن آرام کریں جب آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے تو ہاشم بھائی کے ساتھ سبزی منڈی چلے جایئے گا۔ کچھ سبزیاں لا کر وہاں ہمارے چائے خانے کے ساتھ ہی اپنی سبزی کی دکان ڈال لیجیے..... اللہ برکت ڈالے گا..... ویسے بھی اب اتنا بھاری کام کرنے کی عمر نہیں رہی ہے آپ کی..... بہت زیادہ تھک کر بار، بار بیمار ہو جاتے ہیں، اگر خدانخواستہ زیادہ بیمار ہو کر بستر پر لمبے عرصے کے لیے پڑ گئے تو پھر کیا ہو گا؟'' شبن میاں نے سر ہلایا۔

''ہاں بٹیا! کہتی تو ٹھیک ہو..... سچ ہے، ہم اب بہت تھک جاتے ہیں، تھوڑے سے کام سے بھی.....''

''تو بس..... پھر ٹھیک ہے، دو تین دن اور آرام کریں..... ٹھیک ہو جائیں تو سبزی کی دکان لگا لیں..... وہ بہتر ہو گا۔'' چنانچہ چند ہی دنوں میں چائے خانے کے ساتھ تازہ، تازہ سبزیوں کی دکان بھی کھل گئی۔ تہمینہ کو بھی آرام ہو گیا، وہ اپنے دوپہر کے کھانے کے لیے سبزیاں انہی سے خرید لیتی تھی..... اور دوسرے لوگ بھی ان سے خریداری کرنے لگے۔ شام تک عموماً ان کی زیادہ تر سبزیاں بک جاتی تھیں۔ وہ گھر واپس آتے ہوئے گھر کے لیے بھی کچھ لے آتے، اس طرح ان کے رات کے

کھانے کا بندوبست بھی ہو جاتا۔

زندگی رواں دواں ہوگئی تھی۔ وہ شکیب کو انگریزی بھی پڑھاتی تھی کیونکہ وہ خود یہ زبان اچھی طرح جانتی تھی، اس لیے انگریزی لکھنا، پڑھنا اور بولنا شکیب کو بہت اچھی طرح آتا جا رہا تھا۔ وہ دفتروں کے افسروں سے باقاعدہ بڑی اچھی انگریزی میں گفتگو کر لیتا تھا جس سے وہ بہت متاثر ہوتے تھے۔ وہ اکثر کہتے۔

''تم اتنی اچھی انگریزی بولتے ہو، لکھ پڑھ چکو..... ڈگری ملے تو ہمارے پاس آنا..... ہم تمہیں سرکاری نوکری دلوا دیں گے۔''

''جی سر.....! ماں کہتی ہے کہ اچھی طرح پڑھو..... اور تیاری کرو..... تمہیں مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا ہے..... اور ٹاپ ٹین لوگوں کی فہرست میں آنا ہے تاکہ اس معاشرے میں عزت کا مقام حاصل ہو سکے۔''

''اچھا..... تمہارا مطلب ہے، سول سروس کا امتحان.....؟'' وہ حیرت سے پوچھتے۔

''جی سر.....!'' وہ مسکرا کر سر جھکا لیتا۔

''بہت خوب..... تمہاری ماں مجھے لگتا ہے خود ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں، جب ہی وہ تمہیں بہترین راہنمائی فراہم کر رہی ہیں۔''

''جی سر..... میری ماں بہت تعلیم یافتہ ہیں، اور یہ کام وہ اس لیے کر رہی ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ رزقِ حلال کمانا اصل مقصد ہے، کام کوئی بھی چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا..... اور ہم پر جو سخت افتاد پڑی تھی اس سے نکلنے کے لیے انہیں فوری طور پر ایسے کام کی ضرورت تھی جو فوری آمدنی دے سکے.....'' شکیب نے صراحت سے کہا۔

''لیکن یار.....! وہ کوئی اچھی ملازمت بھی کر سکتی تھیں۔ تعلیم یافتہ ہیں، کوئی مسئلہ نہ ہوتا..... مل جاتی آرام سے۔''

''جی سر! لیکن نوکری ملنے اور تنخواہ ملنے میں مہینے بھر سے کہیں زیادہ دن لگ سکتے تھے، ہمارے حالات اتنا انتظار کرنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔''

''چلو ٹھیک ہے..... کام کوئی بھی چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا..... اگر وہ یہ کام شروع نہ کرتیں تو ہم لوگوں کو اتنی مزیدار چائے اور کھانا کہاں مل سکتا تھا۔ اور پھر جس قدر صفائی، سلیقے اور طریقے سے وہ یہ چیزیں بھجواتی ہیں اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ کسی بڑے گھر کی بہت سلیقہ مند خاتون ہیں..... ہمیں یقین ہے کہ ایسی خاتون کا بیٹا بھی ان شاء اللہ زندگی میں وہ کامیابیاں ضرور حاصل کرے گا جس کی وہ خواہشمند ہیں..... جیتے رہو میاں.....!''

اس دفتر میں بیٹھنے والا وہ افسر بہت اچھا آدمی تھا اور اس کے سبھاؤ کو شکیب بھی بہت پسند کرتا تھا، اس کی گفتگو، انداز اور لباس بتاتے تھے کہ وہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، اسی لیے شکیب اس کے پاس رک کر کچھ باتیں بھی کر لیا کرتا تھا، اور وہ بھی شکیب سے اکثر اس کے حالات یا مسئلے مسائل پر باتیں کیا کرتا تھا۔

ایک دن اس نے شکیب کو روکا..... اور چائے دینے گیا تو اس سے پوچھا۔

''دیکھو میرا ایک مسئلہ ہے، مجھے اکثر اپنے افسروں کی دعوتیں کرنا ہوتی ہیں، جو کافی پُرتکلف ہوتی ہیں، فیملی تو میری ہے نہیں..... بچے تھے ہی نہیں..... بیوی بھی کچھ عرصہ پہلے طلاق لے کر چلی گئی۔ اسے کوئی بہت دولت مند اور مشہور آدمی بھا گیا تھا، چنانچہ وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی..... وہ تھی بھی تو مجھے کسی ہوٹل سے ہی کھانا اور ویٹر بھی منگوانے پڑتے تھے، خیر پچھلی ایک دو دعوتوں میں کھانا بہت خراب آیا جو کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ اب مسئلہ یہ ہے میرے باس جو مجھے پروموشن دے سکتے ہیں انہوں نے اچھا سا کھانا کھلانے کی فرمائش کی ہے، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تمہاری والدہ میرے گھر میں ہونے والی اس دعوت کا انتظام کر دیں۔ کل چار پانچ آدمی ہوں گے، انتظام میں کھانے پکانا، سرو کروانا پھر سمیٹنا، یہ سب شامل ہوگا، یہ ایک ٹھیکا سمجھ لو..... اس کا میں ان کو منہ مانگا اعزازیہ دوں گا، جتنے پیسے وہ کہیں گی۔ ان سے پوچھ کر مجھے بتاؤ..... کیا وہ یہ سب تیار کر دیں گی۔ اور ہاں دعوت رات کے کھانے کی ہے..... اگر یہ دعوت سلیقے سے ہوگئی میرے باس خوش ہو گئے تو سمجھ لو میری ترقی کا

راستہ کھل جائے گا اور اس کے بعد میرے ہاں ہونے والی ہر دعوت کا ٹھیکا تم ہی کو ملے گا..... مجھے پتا کر کے آج ہی بتاؤ..... دعوت ہفتے کی رات کو ہے۔'' وہ اس سے بالکل دوستوں کی طرح بات کر رہے تھے۔

ہفتے والے دن تہمینہ نے اپنا اسٹال دوپہر کا کھانا سرو کرنے کے فوراً بعد بند کر دیا تھا۔ شبن میاں کو اطلاع دینے کے بعد وہ دونوں ماں بیٹے گھر گئے، نہا دھو کر کپڑے پہنے اور واپس آئے تو صاحب کا ڈرائیور کار لے کر آ چکا تھا۔ وہ دونوں بیٹھے اور بہت جلد ان کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ بنگلا تو شاندار تھا لیکن صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا، توجہ دینے والا نہیں ہے، بڑا سا لان سوکھی جھاڑیوں، بے ترتیبی سے اگی گھاس اور سوکھے پتوں سے بھر کر اجاڑ ہونے کا تصور دے رہا تھا۔ دروازوں، کھڑکیوں پر جمی دھول مٹی بتا رہی تھی کہ ان پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ تہمینہ یہ سب دیکھتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو اندر بھی ایسی ہی بے ترتیبی اور دھول مٹی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر کھڑی وہ سوچتی رہی کہ کھانا پکائے یا صفائی کرے، اتنے میں ایک عمر رسیدہ شخص اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔

''بی بی..... ! میں رشید ہوں، اس گھر کا خانساماں، یہیں سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہوں۔ میری بیوی بھی یہیں کام کرتی ہے۔ صاحب نے بتایا تھا کہ آج کی دعوت کا ٹھیکا انہوں نے آپ کو دیا ہے، آپ کو جن چیزوں کی ضرورت ہے اس کی فہرست بنا کر دے دیجیے..... میں منگوا دیتا ہوں.....'' اس نے تہمینہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تو تہمینہ نے بھی اس سے سوال کیا۔

''اس گھر میں تم اور تمہاری بیوی کے علاوہ اور کتنے ملازم ہیں؟''

''مالی اور اس کی بیوی ہے، ڈرائیور ہے، ایک آپا جی ہیں، وہ اس گھر کی کیئر ٹیکر ہیں لیکن وہ کبھی، کبھی آتی ہیں۔''

''اچھا، اتنے سارے ملازمین ہونے کے باوجود اس گھر کا حال اتنا برا کیوں ہو رہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ کوئی بھی یہاں ٹھیک سے کام نہیں کر رہا..... آج دعوت کا تو بڑا اہتمام کیا جا رہا ہے لیکن گھر کی صفائی ستھرائی ایسی ہے کہ کسی مہمان کا گھر میں قدم رکھنے کو بھی دل نہ چاہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ سارے ملازمین کو یہاں بلا لیں..... تو میں انہیں کچھ ہدایات دے دوں.....'' تہمینہ نے رشید سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور تھوڑی دیر میں سب کو بلا لیا۔ سوائے آپا جی کے کیونکہ وہ ابھی تک آئی نہیں تھیں۔ اس نے آنے والے سب ملازمین کو صفائی ستھرائی کا مناسب انتظام کرنے کی ہدایات دیں۔

''رضیہ اور اکبری پہلے تو کچن کی اچھی طرح صفائی کر دیں۔ تاکہ میں کھانا پکانا شروع کر سکوں..... رشید بھائی آپ ڈرائنگ، ڈائننگ اور لاؤنج وغیرہ کی صفائی دیکھ لیں۔ کیونکہ آج کچن سے آپ کی چھٹی ہے، یہ دونوں بھی آپ کی مدد کر دیں گی۔ مالی بابا، سارے لان سے سوکھے اور فالتو پتوں اور جھاڑیوں کو صاف کر کے پودوں کی کاٹ چھانٹ کریں اور اچھی طرح پانی اوپر تک ڈال کر انہیں دھو دیں۔ ساتھ میں ڈرائیو وے بھی دھلوا دیں۔ میں سامان کی فہرست بنا کر دے رہی ہوں، ڈرائیور سودا لے آئے تو میں اپنا کام شروع کرتی ہوں..... اور ہاں..... آپ لوگوں کے پاس وقت بہت تھوڑا ہے، مغرب تک سارا کام ختم ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا..... تو چلیں..... شروع کریں کام.....؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا تو ان سب نے اثبات میں سر ہلا کر منظوری دی اور اپنے، اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئے..... وہ کچھ دیر کھڑی انہیں ہدایات دیتی رہی۔ پھر ڈرائیور سامان لے آیا تو اس نے کھانا پکانے کا ڈول ڈال دیا۔

مغرب کے وقت جب منصور علی خان اس گھر کے مالک گھر پہنچے اور گیٹ کھلا تو انہیں لگا کہ کہیں وہ اپنے گھر کے بجائے کسی اور کے گھر میں تو داخل نہیں ہو رہے..... صفائی ستھرائی اور تازگی کا ایک ایسا احساس ہوا جس نے انہیں یہ احساس دلایا کہ یہ گھر ہے، محض شب بسری کا ٹھکانا نہیں..... صاف ستھرا لان جو تازہ پانی سے دھل کر نکھر آیا تھا۔ دروازے کے پاس رکھے انڈور پلانٹس کے پتوں پر رکے ہوئے پانی کے چند قطرے ان کی تازگی کو نکھار رہے تھے۔ اور تو اور لکڑی کا نقشین

دروازہ صاف ہو کر چمک رہا تھا اپنے پیتل کے کنڈوں سمیت..... وہ ایک خوشگوار حیرت لیے اندر داخل ہوئے تو اندر کی دنیا بھی بدلی ہوئی تھی..... سارا فرنیچر رگڑ، رگڑ کر چمکایا گیا تھا۔ بڑی ساری ڈائننگ ٹیبل کی چمکتی ہوئی سطح پر دو چاندنی کے کینڈل اسٹینڈ رکھے گئے تھے جن میں تین، تین کینڈلز لگی ہوئی تھیں۔ بڑی، بڑی کھڑکیوں کے پردے سمیٹے ہوئے تھے اور ان کے شفاف شیشوں سے باہر روشنیوں بھرا لان کا خوب صورت نظارہ نمایاں تھا۔ اور بھی ہر جگہ بڑی صفائی اور خوش ترتیبی نظر آ رہی تھی جو اس سے پہلے اس گھر میں کبھی نظر نہیں آئی تھی۔

وہ حیران، حیران نظروں سے سب کچھ دیکھتے ہوئے کچن میں داخل ہو گئے..... تین چولھے جل رہے تھے اور ان پر مختلف سائز کی پتیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن کی ملی جلی سی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ شکیب پینٹری میں کھڑا ڈنر سیٹ کے برتن گیلے کپڑے سے صاف کر رہا تھا..... انگلینڈ ساختہ مخصوص ہلکے پیلے رنگ کی بڑی چھوٹی پلیٹیں، ڈونگے، پیالیاں اور چاول کی ڈشیں وہ بڑی احتیاط سے صاف کر کر کے رکھ رہا تھا۔ اور اگلے کاؤنٹر پر ہلکے زرد رنگ کی ساڑی میں ملبوس تہمینہ کھڑی کٹنگ بورڈ پر بڑے سلیقے سے سبزیاں کاٹ رہی تھی۔ اس کی لمبی نازک انگلیاں جس طرح اس کام کو کر رہی تھیں، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کی عادی رہی ہیں، کٹنگ بورڈ پر سبزیاں کاٹنا، عام گھروں میں نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح عموماً بڑے گھروں میں ہوتا تھا جہاں کے لوگ انگریزی رہن سہن کو اپنے گھروں میں رواج دے رہے تھے۔

''اس کا مطلب ہے، تہمینہ بی بی نہ صرف پڑھی لکھی بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور کسی بہت بڑے گھر کی بھی ہیں، جہاں کے رہن سہن میں انگریزی اور جدید انداز و اطوار کا عمل دخل رہا ہے، گڈ.....'' وہ مسکرائے اور کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو ان دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سلام کیا۔

''کیوں شکیب میاں! سب کچھ ٹھیک ہے، کوئی مسئلہ تو نہیں.....'' اس کی بات سن کر شکیب مسکرایا اور نفی میں سر ہلایا۔

''آپ کا بے حد شکریہ تہمینہ بی بی..... کہ آپ نے صرف کھانا پکانے کی ہی ذمے داری قبول نہیں کی بلکہ میرے اس اجاڑ گھر کی حالت بھی بالکل بدل دی۔ بہت، بہت شکریہ..... ویسے آج کا مینیو کیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا تو تہمینہ نے فریج کے دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کاغذ پر آج کے مینیو کی تفصیل لکھی ہوئی تھی اور وہ ایک میگنیٹ کیچر کے ذریعے وہاں چسپاں تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر فوراً اس پر نظر ڈالی۔

''ہم م م م..... یخنی پلاؤ، قورمہ، تلی مچھلی، مکس سبزی، سلاد اور رائتہ اور میٹھے میں فروٹ کسٹرڈ۔ واؤ زبردست مینیو ہے بھئی۔ مجھے تو ابھی سے بھوک محسوس ہونے لگی ہے، ویسے میرے مہمان آٹھ بجے یہاں پہنچ جائیں گے۔ امید ہے اس وقت تک کھانا تیار ہو چکا ہوگا.....'' انہوں نے تہمینہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''گڈ.....''! وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

وقتِ مقررہ پر مہمانوں کی آمد ہوئی اور تہمینہ نے شکیب کے ہاتھوں جوس بھجوایا۔ پھر ٹیبل جو پہلے ہی خوب صورتی سے سیٹ کر دی گئی تھی اس پر خوشبودار گرما گرم کھانے سرو کروائے گئے۔ مہمان جب ٹیبل پر آئے تو ایک خوشگوار حیرت ان کی منتظر تھی۔ شکیب ایک بڑی ٹرے ہاتھ میں لے کر آیا جس میں وہ چھوٹے، چھوٹے سفید دودھیا تولیے گرم پانی میں بھیگے اور بڑی خوب صورتی سے بل دے کر رکھے ہوئے تھے اور ایک بڑا چینی کا پیالہ جس میں نیم گرم پانی تھا جس پر گلاب کی پتیاں تیر رہی تھیں اس نے ایک، ایک کر کے مہمانوں کے سامنے پیش کیا جنہوں نے اپنی انگلیاں پیالے کے نیم گرم خوشبودار پانی میں ڈبو کر ایک، ایک بل دے کر رکھا ہوا تولیا رومال اٹھا لیا۔ یہ وہ عمل تھا جو بڑے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں مروج تھا۔

پھر کھانا شروع ہوا۔ ذائقہ اور خوشبو لاجواب تھی۔ مہمانوں نے بہت خوش ہو کر کھایا اور بے حد تعریفیں بھی کیں۔

''یار منصور! یہ کھانا بہت زبردست ہے اور اس سے بھی زبردست اس کا انتظام ہے، کسی بڑے ہوٹل سے کروایا ہے ناں.....؟'' ایک دوست نے پوچھا تو منصور علی خان نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں..... کسی ہوٹل سے نہیں بلکہ ایک خاتون ہیں، وہ یہ کام کرتی ہیں، انہوں نے ہی کیا ہے یہ سارا انتظام.....''

''اچھا..... آ آ آ..... حیرت ہے ایک اکیلی خاتون ..... یہ سب اتنے سلیقے سے کیسے کر لیتی ہیں، یقیناً طویل تجربہ ہوگا.....''

''معلوم نہیں..... لیکن آج کا ڈنر ان کے سلیقے اور تجربے کی مثال ہے، آپ لوگوں نے اندازہ کر ہی لیا ہوگا۔''

''بالکل جناب.....! میں نے تو پکا ارادہ کر لیا ہے، اپنے گھر کی ہر دعوت کا انتظام انہی سے کرواؤں گا۔'' باقی نے بھی سر ہلا کر اسی خواہش کا اظہار کیا تو منصور علی سر جھکا کر مسکرا کر رہ گئے۔

کھانا ختم ہوا..... تو سبز الائچی والی چائے پہنچ گئی..... لیموں اور الائچی کی خوشبو دار یہ چائے کھانے کے بوجھل پن کو دور کر کے ہلکا پھلکا کر گئی..... یہ شاید اس وقت کی ضرورت تھی۔ سب کو ایسا ہی لگا۔

سارے مہمان خصوصاً منصور علی خان کا باس بے حد ... خوش ہو کر گئے تھے اور انہوں نے وعدہ لیا تھا کہ منصور کے پروموشن پر اگر ایسی ہی دعوت کا وعدہ ہو تو پروموشن پکا ہے اور منصور نے بڑی خوشدلی سے ہنستے ہوئے وعدہ کر لیا۔ مہمانوں کو رخصت کر کے وہ واپس آئے تو ٹیبل سمیٹی جا چکی تھی۔ وہ کچن میں آئے تو تہمینہ ایک اونچے اسٹول پر بیٹھی اپنے ہاتھوں پر کوئی کریم مل رہی تھیں۔ برتن دھل چکے تھے، کچن صاف ہو چکا تھا اور ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی جا چکی تھی۔ وہ یہ سب دیکھ کر مسکرائے اور ہلکے سے انداز میں کھانسے۔ تہمینہ نے پلٹ کر انہیں دیکھا تو انہوں نے بھی بغور جائزہ لیا۔ اس قدر خوب صورت، من موہنی صورت..... غربت کے سائے نے اسے دھندلا کر رکھا تھا۔ لیکن اگر ذرا بھی وہ بہتر حالات میں ہوں تو یہ نین نقش اجل کر کسی شہزادی کے چہرے میں ڈھل جائیں..... یہ ان کا تجزیہ تھا، رکھ رکھاؤ تو تھا ہی شاہی انداز کا..... یقیناً یہ کسی تاج میں جڑا ہیرا رہی ہوگی۔ جو افتادِ زمانہ کا شکار ہو کر زمین پر گرا اور غبار آلود ہو گیا ہے۔

''آپ نے آج کی دعوت میں کمال کر دیا ہے، میرے مہمان نہ صرف بے حد خوش بلکہ حیران ہو کر گئے ہیں کہ گھر میں بھی بھلا اس طرح فائیو اسٹار ہوٹل والی دعوت کا اہتمام ممکن ہے، یہ آپ کا بہت بڑا کمال ہے، میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں.....'' منصور علی نے بغور تہمینہ کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی بات کہی تو اس نے خاموشی سے شکر گزاری کے انداز میں سر ہلا دیا پھر وہ دونوں گھر جانے کے لیے گاڑی میں آ کر بیٹھے تو خانساماں ٹفن میں پیک کھانا لے کر آیا۔

''بی بی.....! صاحب نے کہہ دیا تھا کہ یہ کھانا آپ کے ساتھ کر دیا جائے..... دیر ہو گئی ہے، آپ گھر جا کر کھانا کہاں پکائیں گی۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے، میں کھانا پکا کر رکھ کر آئی تھی۔ صاحب کو شکریہ کہنا اور اسے واپس لے جائیں۔'' تہمینہ نے انکار کیا تو خانساماں نے ٹفن کیریئر گاڑی میں رکھ دیا اور بولا۔

''بی بی صاحبہ! رزق سے اس طرح منہ موڑنا کفرانِ نعمت ہے، اللہ کو یہ بات پسند نہیں ہے، لے جائیں.....'' اس نے بات پوری کر کے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور گاڑی چل پڑی۔ شکیب کے چہرے پر پھیلی جانے والی مسکراہٹ نے بتایا کہ وہ اس مزے دار کھانے کا خواہشمند ہے جو آج کی دعوت میں پکے تھے۔ اور تہمینہ نے بھی اس لفافے کو ذرا سا کھول کر دیکھا جو آتے ہوئے منصور علی خان نے اسے دیا تھا تو اس میں بھی خاصی بڑی رقم نظر آئی... اس کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

آج کا دن اچھا تھا..... ایسے ہی دو چار ٹھیکے اسے اور مل جائیں تو وہ اپنے کمروں پر پکی چھت بھی ڈلوا سکیں گے اور چھت کے پنکھے بھی لگوانے کے قابل ہو جائیں گے۔ ''یا اللہ تیرا شکر ہے۔'' تہمینہ نے دل سے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ پھر ایسا ہی ہوا کہ نہ صرف

منصور علی خان کے گھر..... بلکہ ان کے ملنے والے دو چار اور گھروں سے انہیں ایسی ہی بڑی، بڑی دعوتوں کے کئی ٹھیکے بھی ملے..... اور خاصی معقول رقم ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ جو انہوں نے شبن میاں کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''شبن میاں! یہ پکی دیواروں پر کچی چھت بہت پریشان کرتی ہے، کسی ٹھیکدار سے بات کر کے دونوں کمروں پر پکی چھت ڈلوائیں..... بلکہ چھت پر پنکھے بھی لگوائیں..... اور پھر بھی اگر پیسے بچ جائیں تو صحن کی طرف ایک چھوٹا کمرا بھی ڈلوا دیں آئندہ پیسے ملے تو اسے دکان بنا لیں گے، خود نہ بھی بیٹھے تو کسی کو کرایے پر دے دیں گے۔''

شبن میاں نے پندرہ بیس روز کے اندر، اندر مطلوبہ تعمیرات کروالیں بلکہ نیا رنگ روغن بھی کروالیا..... اب وہ ایک چھوٹا، صاف ستھرا اور آرام دہ گھر بن گیا تھا..... کمروں کے سامنے چوڑا دالان بنا اور ایک جانب باورچی خانہ، صحن میں کنواں کھدوا کر ہینڈ پمپ لگوالیا..... سب سہولتوں کے ساتھ وہ سب اب چین سے رہ رہے تھے۔

اس رات برآمدے میں موٹی دری اور چاندنی پر دسترخوان بچھا تھا وہ تینوں کھانا کھا رہے تھے۔ شکیب اٹھ گیا تو شبن میاں نے تہمینہ کو مخاطب کیا۔

''بٹیا.....! وہ ایک بات کرنا تھی تم سے..... آج مجھے افسر صاحب نے بلایا تھا، وہی جن کے گھر دعوت کا انتظام تم کرتی رہتی ہو.....'' انہوں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے بتایا تو تہمینہ نے سر اٹھا کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''انہوں نے مجھ سے تمہارے بارے میں بہت تفصیل پوچھی..... اور قسم دی کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے بتاؤں..... اور انہوں نے بھی قسم کھائی کہ ان کی کوئی غلط نیت نہیں ہے..... بٹیا! وہ تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیا.....؟ شادی؟ شبن میاں یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' وہ کچھ حواس باختہ سی ہوئی۔

''ہاں ہاں، ابھی دو تین دن پہلے انہوں نے مجھ سے بھی یہی بات کہی تھی۔ اور کہا تھا کہ ماں سے پوچھ کر بتاؤ..... پر میں نے انہیں منع کر دیا۔ میں نے کہا کہ ماں مجھے ایسے تھپڑ مارے گی کہ سارے دانت باہر آ جائیں گے۔ نہ بابا نہ مجھے نہیں پٹنا ماں سے..... آپ شبن میاں سے بات کیجیے ماں.. ان کو کچھ نہیں کہے گی۔'' شکیب نے دوسرا دھماکا کیا۔

''شبن میاں! یہ تو بچہ ہے، کچھ نہیں جانتا۔ لیکن آپ کو تو معلوم ہے کہ میں شادی نہیں کر سکتی۔ کیسے سوچ سکتی ہوں میں اس بارے میں.....'' تہمینہ نے ملامت آمیز نظروں سے شبن میاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بٹیا.....! کب تک اس طرح زندگی سے تنہا لڑتی رہو گی..... کوئی سہارا دینے کو ہاتھ بڑھا رہا ہے تو کیا حرج ہے اس میں بھلا..... اور پیسے والا آدمی ہے، آپ کی قدر کرتا ہے، شکیب سے بھی بہت محبت کرتا ہے۔ پھر صاف انکار کیوں کرتی ہو..... سوچو تو سہی ایک بار.....'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''شبن میاں! بس کیجیے، بس کیجیے آپ..... آپ نے یہ سوچا بھی کیسے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ میں ان سے تو کیا..... کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتی..... کیا آپ کو نہیں معلوم کہ میں..... میں ابھی تک حبیب انامدار کے نکاح میں ہوں..... اس نے اپنی طرف سے مجھے مار پیٹ کر پھینک دیا تھا، طلاق تو نہیں دی تھی۔ اب یہ میری بدقسمتی ہے یا ڈھٹائی کہ میں زندہ بچ گئی..... اب تک زندہ ہوں..... اور اس کے نکاح میں ہوں تو..... تو آپ بتائیں کہ میں نکاح پر دوسرا نکاح کیسے کر سکتی ہوں.....؟ ہاں! بتائیں، کیسے ہو سکتا ہے یہ.....؟'' حبیب کا نام اس کے لبوں سے اس اذیت سے نکلا کہ وہ بلبلا کر رو پڑی۔

گزرے ہوئے برے وقت نے اسے جو گہرے گھاؤ لگائے تھے وہ مندمل کب ہوئے تھے کہ اس نے پھر کرید ڈالے..... اور خود ان کی اذیتوں سے بے حال ہونے لگی۔ آنکھوں سے آنسو اور لبوں سے سسکیاں اور ہچکیاں نہ جانے کب، کب کا غبار اس کے سینے میں دھواں بن کر پھیلا ہوا تھا۔ آج جو ضبط کے بندھن میں دراڑ آئی تو سب کچھ سیلاب کی شکل میں بہہ نکلا تھا۔

شکیب پریشان ہو کر پانی کا گلاس لے کر آیا اور ماں کے پاس بیٹھ کر اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ کر اسے چپ

کرانے کی خاموش کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ آہستہ، آہستہ اس کی پیٹھ تھپک رہا تھا۔ تسلی دے رہا تھا۔ پھر شبن میاں نے بھی بھاری آواز میں اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے بٹیا..... اگر تم راضی نہیں ہو..... تو کچھ نہیں ہوگا..... رہا سوال نکاح کا تو میری ناقص معلومات کے حساب سے تو انتظار کی مدت سات سال بنتی ہے، شوہر نہ آئے تو خود ہی طلاق ہو جاتی ہے لیکن میرا علم ناقص ہے، میں کسی مولوی سے اس بارے میں معلومات کروں گا..... پھر بھی تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ تم تسلی رکھو..... بس کرو..... اس قدر آنسو مت بہاؤ..... میرے دل کو بھی تکلیف ہو رہی ہے اور وہاں جنت مکانی بیگم صاحبہ کی روح بھی تڑپ کر بے چین ہو رہی ہوگی۔ اللہ تمہیں صبر و سکون دے، بس کرو.....'' وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور تھکے، تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

کئی دنوں میں جا کر اس کا موڈ بحال ہوا لیکن اب بھی وہ پہلے کے مقابلے میں خاموش ہی رہتی تھی۔ اس نے اپنے چائے خانے کو بھی پہلے کے مقابلے میں بہتر کر لیا تھا۔ ایک الماری بنالی تھی اور ایک جانب کی دیوار کی تعمیر کے لیے بہت سے بلاک منگوا کر رکھے تھے کہ جس دن شبن میاں کو فرصت ہوگی وہ کسی مزدور کو پکڑ کر لائیں گے اور تعمیر ہو جائے گی۔ اس دن وہ دوپہر کے کھانے کے بندوبست میں مصروف تھی کہ منصور علی خان کی آمد ہوئی۔

''آپ شاید بہت سخت ناراض ہیں، میں آپ سے معذرت کرنے آیا تھا، مجھے علم نہیں تھا کہ آپ کے بارے میں اس طرح سوچنا گناہ ہو جائے گا۔ میں معافی چاہتا ہوں اور عرض یہ کرتا ہے جو ہوا اسے آپ بھول جائیں۔ اور میں بھی بھول جاتا ہوں بالکل اس طرح جیسے ہمارے درمیان یہ بات کبھی ہوئی نہیں تھی۔ دیکھیے..... اگر آپ نے مجھے معاف نہیں کیا تو میرا ضمیر مجھے شرمندہ کر، کر کے مار ڈالے گا۔ پلیز.....! بھول جائیں اس بات کو..... اور مجھے معاف کر دیجیے۔'' انہوں نے اس قدر عاجزی سے معافی مانگی کہ وہ خود شرمندہ سی ہوگئی۔

''کوئی، کوئی بات نہیں..... میں بھول جاتی ہوں..... آپ معافی نہ مانگیں، اچھا نہیں لگتا۔'' اس نے اٹک، اٹک کر اس طرح کہا کہ منصور اسے دیکھتے رہ گئے۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر مڑے اور اپنی کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔

☆☆☆

زندگی پھر اپنے معمول پر آگئی تھی۔ وہی مصروفیات، وہی معمولات ہاں یہ ضرور ہوا کہ شکیب نے میٹرک کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا اور اس کا ایک بہت اچھے کالج میں داخلہ بھی ہوگیا..... اب وہ صبح، صبح کالج کے لیے نکل جاتا تھا۔ تہمینہ نے ایک لڑکے کو ملازم رکھ لیا تھا جو کھانا چائے دفتروں میں پہنچانے کا کام کرنے لگا۔

وہ دن بھی ایسا ہی تھا، تہمینہ نے دوپہر کا کھانا اس لڑکے روشو کے ہاتھ دفتروں میں بھجوادیا تھا۔ وہ اپنی سائیکل کے دونوں جانب اسٹینڈ لٹکا کر ان میں کھانے کے ڈبے رکھ لیتا تھا اور اس کی سائیکل..... کھڑکھڑاتی ہوئی دفتروں کی جانب چلی جاتی۔ گرمی بہت تھی، تہمینہ نے برتن دھونے کے بعد اپنے جلتے ہوئے چہرے پر بھی پانی کے چھپاکے مارے اور اپنی ململ کی ساڑی کے پلو سے منہ پونچھتی ہوئی کاؤنٹر کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اب وہ تین بجے والی چائے کا بندوبست کرنا چاہتی تھی۔ کچھ برتن اٹھاتے ہوئے اس کی نظر سامنے جو پڑی تو وہ چونک کر رک گئی۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ سرخ ساڑی میں ملبوس وہ اندھا دھند بھاگتی ہوئی اسی کی طرف آرہی تھی۔ ہانپتی کانپتی پسینے میں شرابور..... چہرے پر بدحواسی کے آثار..... وہ ایسے جی جان توڑ کر بھاگ رہی تھی جیسے اس کے پیچھے کوئی آدم خور جانور لگے ہوں..... اگر وہ ذرا چوکی تو وہ اسے پکڑ کر ادھیڑ ڈالیں گے..... وہ ایسے ہی دیوانہ وار دوڑتی ہوئی اس کے نزدیک پہنچ گئی۔ چہرے پر ہوائیاں، آنکھوں میں آنسو اور پسینے سے تر بتر..... وہ اس سے

مدد کی بھیک مانگ رہی تھی۔

''راچھ..... آما کھے باچاؤ.....'' (پلیز ! مجھے بچاؤ.....) اس نے اکھڑی، اکھڑی سانسوں میں اس سے فریاد کی تو تہمینہ نے ایک لمحے کو سوچ کر اسے اندر آ کر اینٹوں کی دیوار کے پیچھے چھپ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ لپک کر اس تنگ سی جگہ میں گھس کر نظروں سے اوجھل ہوگئی..... ابھی وہ اندر گھسی ہی تھی کہ پیچھے، پیچھے ہاشو میاں اور اس کے دو تین ساتھی بھی دوڑتے ہوئے آئے۔

''تم کسی لڑکی کو ادر سے بھاگتا دیکھا؟'' چار خانے والی لنگی اور سفید باریک کرتے میں گہرے سانولے رنگ والا ہاشو میاں اس سے پوچھ رہا تھا۔ ہاشو میاں کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ بہت سے غیر اخلاقی اور غیر قانونی دھندوں میں ملوث ایک بدنام زمانہ شخص تھا۔ اس کے بارے میں سنا یہ جاتا تھا کہ وہ عورتوں، لڑکیوں کی خرید و فروخت کا گھناؤنا کاروبار بھی کرتا تھا۔ بنگلہ دیش سے غریب اور بے آسرا لڑکیوں کو اس کے ایجنٹ سبز باغ دکھا کر یہاں لاتے اور پیسے والے عیاشوں کو بھاری قیمت پر بیچ دیتے تھے۔ شاید یہ لڑکی بھی ایسی ہی بے آسرا لڑکی تھی جو نہ جانے کس طرح اس کے ہتھے چڑھی ہوگی..... اور موقع ملتے ہی اپنی غیرت اور جان بچانے کے لیے دوڑ پڑی..... تہمینہ کے ذہن میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یہ سب باتیں آئیں اور اس نے فیصلہ کرلیا۔

''ہاں..... لال ساڑی میں؟ وہ اُدھر گئی ہے.....'' اس نے انگلی اٹھا کر کیکروں کے جھنڈ کے اس پار دفاتر کے درمیان پتلی، پتلی گلیوں کی طرف اشارہ کردیا۔ وہ سب دوڑتے ہوئے اسی جانب چلے گئے۔ تہمینہ اپنے چائے کے انتظامات میں لگ گئی۔ پھر اس نے گھڑے سے ایک گلاس پانی بھرا اور لڑکی کی طرف آگئی۔

''پانی پیو..... اور چپ چاپ یہاں چھپی رہو..... وہ دوسری طرف چلے گئے ہیں لیکن آئیں گے ضرور دوبارہ..... میں بات کرلوں گی۔ بس تم خاموشی سے یہاں ہی بیٹھی رہو.....'' اس نے تسلی دیتے ہوئے اسے پانی کا گلاس پکڑا دیا اور واپس اپنی جگہ آگئی۔

چولھے میں راکھ میں دبے انگارے لے کر اس نے پتلی لکڑیاں ان پر رکھیں اور وہ جلنے لگیں تو موٹی لکڑیاں رکھ دیں اب کیتلی کھنگال رہی تھی کہ ان آدمیوں کی دوبارہ آمد ہوئی۔

''وہ تو ادر نئیں اے، تم جھوٹ بولا.....'' ہاشو میاں نے غرا کر پوچھا تو تہمینہ نے غصے سے اسے دیکھا۔

''وہ اُدھر نہیں ہے، بھاگ گئی کہیں..... تو میں نے کیا جھوٹ بولا۔''

''ادرام لوگوں سے پوچھا..... کسی نے ادر اسے نئیں دیکھا۔'' ہاشو میاں نے برے سے لہجے میں کہا۔

''تو اس میں میرا کیا لینا دینا ہے؟'' اس نے بھی اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''امارا کھیال ہے..... تم اسے چھپایا۔'' ہاشو میاں کی اس بات پر تہمینہ آگ بگولہ ہوگئی..... اس نے چولھے سے جلی ہوئی لکڑی کھینچ کر ہاتھ میں اٹھائی اور ہاشو میاں کو ملامت کی۔

''بہتر ہے..... یہاں سے چلے جاؤ ہاشو میاں؟ میرا تمہارے دھندوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، تمہیں جو کرنا ہے کرو..... پر آئندہ میں تمہیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتی..... جاؤ.....'' وہ جلی ہوئی لکڑی ہاتھ میں اٹھا کر چلائی تو ہاشو میاں اسے کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ شبن میاں بھی اس دوران وہاں آگئے تھے اور ان کے ہاتھ میں سبزی کاٹنے والا بڑا چھرا تھا اس لیے اس نے چلے جانے میں ہی بہتری جانی اور وہ چلا گیا۔ لیکن دھمکی آمیز اشارے کر کے گیا تھا۔

''بٹیا یہ اچھا آدمی نہیں ہے، اس کے منہ لگنا اچھا نہیں ہے.....'' شبن میاں نے فکر مندی سے کہا تو تہمینہ نے گھور کر انہیں دیکھا۔

''تو کیا اس پریشان حال کو جو ہماری پناہ میں آئی ہے چپ چاپ اس کے حوالے کردیتی تاکہ یہ درندے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں۔ نہیں شبن میاں! جس اللہ نے اس کی جان اور عزت بچانے کا موقع ہمیں دیا، ہمیں اس کا یہ موقع شکر کے ساتھ قبول کرنا چاہیے اور

اپنی ذمّے داری نبھانی چاہیے۔ اس جیسے غنڈے، بدمعاشوں سے ڈرنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی..... اب اس کا کرنا کیا ہے؟'' شبن میاں نے پوچھا تو تہمینہ نے گلے سے انہیں سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

''اسے گھر لے جائیں گے پھر پوچھیں گے کہ اس پر یہ افتاد کیسے پڑی پھر جو مناسب لگے گا وہ کریں گے۔ فی الحال تو آپ یہ پیسے لے کر بازار جائیں اور ایک شلوار قمیص کا سوٹ اور ایک کالا سادہ برقع لے آئیں۔ اس کی یہ سرخ ساڑی تو اس کی شناخت ہے، اسے پہن کر یہ ہمارے گھر گئی تو پہچان لی جائے گی۔'' تہمینہ نے نوٹ انہیں پکڑا دیا، وہ چلے گئے۔ شام کو انہوں نے کام کرنے والے روشو کو بلا کر سمجھایا۔

''دیکھو! یہ جو دیدی ہے ناں اسے ہمارے گھر تک لے جاؤ، ہم بھی آرہے ہیں پیچھے، پیچھے، ٹھیک؟'' روشو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ دونوں نکلے تو کچھ فاصلہ رکھ کر وہ اور شبن میاں بھی ان کے پیچھے، پیچھے چل پڑے۔ وہ دونوں اِدھر اُدھر دیکھتے جا رہے تھے کہ ہاشو میاں یا ان کے آدمی ان پر نظر تو نہیں رکھے ہوئے..... مگر انہیں کوئی نظر نہیں آیا۔ انہوں نے روشو سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو گھر کے پچھلے دروازے پر چھوڑ کر چلا جائے..... اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ شبن میاں نے سامنے کے دروازے پر پہنچ کر تالا کھولا تو تہمینہ اندر داخل ہوئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے شبن میاں کی نظر دور کھڑے گنے کے رس والے ٹھیلے پر گئی تو وہاں بینچ پر بیٹھے آدمی کو انہوں نے پہچان لیا۔ وہ ہاشو میاں کے ساتھ تھا۔

''بال، بال بچے ہیں بٹیا! تم نے بڑی سمجھداری کی اسے ساتھ لے کر نہیں آئیں..... ہاشو کے آدمی ہم پر نظر رکھے بیٹھے تھے۔'' تہمینہ نے لڑکی کو پچھلے دروازے سے اندر بلا لیا تھا۔ اب وہ تینوں کمرے میں بیٹھے تھے اور اس لڑکی کی بپتا سن رہے تھے۔

''میرا نام سونا ہے، میں بنگالی ہوں، ہم ڈھاکا میں رہتے تھے۔ ماں، باپ لڑائی میں مارے گئے تھے۔ میرا ایک ہی بھائی ہے، وہ کسی کی کوٹھی میں ملازم ہے، انہوں نے اسے رہنے کو کوارٹر دیا ہوا ہے، میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک دن مجھ کو مشتاق ملا۔ پتا نہیں کیسے اس نے مجھے شیشے میں اتار لیا۔ وہ بہاری تھا، میرے بھائی نے اسے دیکھا تو وہ اسے اچھا نہیں لگا۔ اس نے مجھے باہر نکلنے کو اس سے ملنے کو منع کر دیا۔ پر میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ مجھے اپنا چھوٹا بھائی برا لگنے لگا۔ مشتاق نے مجھے پٹی پڑھائی کہ میرے ساتھ بھاگ چلو..... ہم لوگ پاکستان جا کر شادی کر لیں گے میں اس کی باتوں میں آکر گھر سے بھاگ کر اس کے ساتھ یہاں آگئی۔'' وہ اب سسک رہی تھی۔

''شادی تو اس نے کی نہیں مجھ سے، کل رات کو میں نے چھپ کر اس کی باتیں سنیں تو اس نے ہاشو میاں سے میرا سودا کر دیا تھا۔ پانچ ہزار کے عوض..... اور ہاشو میاں نے مجھے آگے کسی اور کے ہاتھوں بیچنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ اس کا تو کام ہی یہی ہے، آج رات کو کسی کو آنا تھا مجھے لینے کے لیے..... میں نے موقع پا کر وہاں کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگنے کی کوشش کی تو ان لوگوں کو پتا چل گیا..... وہ مجھے پکڑنے کے لیے دوڑے..... اور آگے کا آپ کو پتا ہے۔''

''پھر..... اب کیا کرنا ہے؟ کہاں جاؤ گی..... دوبارہ واپس جانا چاہتی ہو اپنے بھائی کے پاس..... یا نہیں؟'' تہمینہ نے پوچھا تو اس نے سر جھکا لیا۔

''میرا بھائی مجھے جان سے مار ڈالے گا، وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا..... میں نے اس کے منہ پر کالک ملی ہے، وہ مجھے ضرور اس کی سزا دے گا۔'' اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

''بھائی ہے وہ تمہارا..... کوئی سزا بھی دے گا تو وہ اتنی بری نہیں ہوگی جتنی ہاشو دے سکتا ہے، اس لیے بہتر ہے کہ اسے خط لکھو..... شبن میاں کسی ذریعے سے خط بھجواتے ہیں، تمہارا خط بھی چلا جائے گا۔ اگر تمہارے بھائی کو تمہاری ذرا بھی پروا ہوئی تو وہ تمہیں لینے ضرور آئے گا..... جب تک تم یہاں بے فکری سے رہ سکتی ہو.....'' تہمینہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ہاں وہ آئے گا تو ضرور پر مجھے جان سے مارنے

کے لیے، وہ مجھے اپنے ساتھ واپس کبھی لے کر نہیں جائے گا، اِدھر میری وجہ سے اس کی بہت بدنامی ہوئی ہوگی..... کیا میں ..... میں یہاں نہیں رہ سکتی؟'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں سوال کیا تو تہمینہ نے اسے غور سے دیکھا۔

'تم یہاں اکیلے رہو گی..... تو بہت سے ہاشو ملیں گے تمہیں..... جینے نہیں دیں گے عزت سے۔ تمہارا بھائی اگر آتا ہے تو ہم اسے سمجھا بجھا دیں گے، وہ مان جائے گا۔ خیر! یہ بعد کی بات ہے، تم خط لکھ کر شبن میاں کو دو..... ابھی تو اس خط کے پہنچنے میں اور پھر جواب آنے میں نہ جانے کتنے مہینے لگیں گے۔ جب تک تم یہاں بے فکری سے رہ سکتی ہو..... بس باہر نہ نکلنا۔ تاکہ ہاشو کے کسی آدمی کی تم پر نظر نہ پڑے۔ ورنہ مشکل ہو جائے گی۔'' اس نے سمجھایا۔ اس رات تہمینہ نے شکیب کو بستر سمیت شبن میاں کے کمرے میں بھیج دیا اور سونا کے لیے اپنے پاس ہی بندوبست کر دیا۔ صبح وہ تینوں اپنے، اپنے کاموں پر روانہ ہو گئے۔ شکیب اپنے کالج اور شبن میاں سامان دکان پر چھوڑ کر منڈی چلے گئے۔ تہمینہ نے حسبِ معمول اپنے چائے خانے کے چولھے جلا دیے۔ اور روزانہ کا معمول چل پڑا۔ تہمینہ نے اس دن اور اس کے بعد بھی دو تین دن اور ہاشو میاں اور اس کے آدمیوں کو اِدھر اُدھر منڈلاتے دیکھا۔ وہ فکر مند ہو گئی..... اس دن دوپہر کو وہ اور شبن میاں کھانا کھا رہے تھے کہ تہمینہ نے کچھ سوچتے ہوئے ان سے پوچھا۔

''شبن میاں..... ساری عمر گزاری، کبھی شادی کے بارے میں آپ نے سوچا بھی نہیں کیوں.....؟''

''ارے بٹیا..... بڑے صاحب، بیگم صاحبہ اور پھر تم..... ہماری بٹیا..... تم سب ہمارا خاندان ہی تو تھے، سب کے ساتھ اس طرح وقت گزرا کہ شادی کا کبھی خیال ہی نہیں آیا.....'' انہوں نے بڑے رسان سے کہا۔

''اور اب..... اب تو کوئی ایسی خاص ذمے داری بھی نہیں ہے، اب کر لیں شادی.....'' تہمینہ نے کہا تو وہ حیران ہوئے۔

''کیا؟ ہم اور شادی.....؟ اس عمر میں شادی کریں گے ہم؟ کیا بات کر رہی ہو بٹیا۔''

''آپ کی عمر کتنی ہو گی؟ مجھ سے کتنے سال بڑے ہیں آپ.....؟ میری پیدائش کا دن یاد ہے آپ کو؟'' تہمینہ نے پوچھا تو وہ کچھ ہکا بکا سے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ آخری سوال سن کر مسکرائے۔

''ہاں بہت اچھی طرح یاد ہے، جس تم پیدا ہوئی تھیں حویلی میں بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں۔ ہم کھیلتے، کھیلتے اندر زنان خانے میں گئے تو ہماری اماں نے ہمیں بلا کر دکھایا۔

''دیکھ تو شبن..... ! کیسی پریوں جیسی شہزادی بھیجی ہے اللہ نے اس حویلی میں..... ہر طرف چاندنا ہو گیا ہے۔'' ہم نے بھی آگے بڑھ کر اس خوب صورت جھولے کی ریشمی ڈوری پکڑ لی جو اماں کھینچ کر جھولا ہلا رہی تھیں پھر بالکل نزدیک جا کر ہم نے آپ کو دیکھا تو ہمیں یہ خوب صورت گڑیا اس قدر پیاری لگی کہ ہم اماں سے ضد کر بیٹھے کہ ہم اسے گود میں لیں گے، اماں نے فوراً ڈانٹا۔

''اے ہٹو شبن میاں، اتنے چھوٹے بچے ہو، تم اسے سنبھال نہیں پاؤ گے۔ گرا دو گے۔'' ہم لینے کی ضد کر رہے تھے اور اماں منع کر رہی تھیں کہ سرخ رضائی میں لیٹی بیگم صاحبہ نے اماں سے کہا۔

''اے بوا بچہ ضد کر رہا ہے اسے نیچے بٹھاؤ اور ذرا کی ذرا گود میں دے دو اسے۔'' ان کی بات سن کر اماں نے ایسا ہی کیا۔

''یہ لو میاں..... بٹیا تمہاری گود میں آ گئی۔ اس سے باتیں کرو..... اور اسے بتاؤ کہ تم ہمیشہ بٹیا کا خاص خیال رکھو گے۔''

''بس! پھر اس دن سے ہم تمہیں بٹیا، بٹیا کہنے لگے، اس وقت ہماری عمر شاید چھ، سات سال رہی ہو گی لیکن ہمیں اچھی طرح یاد ہے وہ دن.....'' شبن میاں پرانی باتوں کو یاد کر کے مسکرا رہے تھے۔

''تو گویا..... عمر میں آپ ہم سے زیادہ نہیں چھ، سات سال بڑے ہیں لیکن بزرگی آپ نے اپنے اوپر ایسے طاری کر لی ہے جیسے آپ کوئی ہمارے ابا کی عمر کے ہوں..... یہ تو ٹھیک نہیں ہے شبن میاں.....''

"کیا فرق پڑتا ہے بٹیا! ہم تو پہلے دن سے آپ کو بٹیا کہتے اور سمجھتے ہیں، کبھی اپنی عمر کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔"

"ہاں لیکن میں نے سوچا...... اور مجھے لگا کہ اب آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔ آپ کی زندگی میں دوسراہٹ ...... آجائے گی اور بھلے برے وقت میں ساتھ دینے کے لیے بیوی موجود ہوگی۔" تہمینہ نے کچھ اس طرح کہا جیسے وہ اس بارے میں سوچ چکی ہے۔

"ارے کیا بات کرتی ہو...... ہمیں نہیں کرنا کوئی شادی وادی......" وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"شبن میاں! اگر آپ نے ہماری بات نہ مانی تو ہم آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جائیں گے، ورنہ پاؤں پکڑ لیں گے اور آپ کو راضی کیے بغیر چھوڑیں گے نہیں...... اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو تو ہاں کر دیجیے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ توبہ، توبہ، ہمارے سامنے ہاتھ جوڑو گی...... پاؤں پکڑو گی ہمارے...... توبہ، توبہ، ہم تو شرم سے گڑ جائیں گے۔" شبن میں نے گلوں پر ہاتھ، مار، مار کر کہا۔

"ٹھیک ہے، تو پھر طے ہوا کہ آپ کی شادی ہوگی...... لڑکی ہم نے پسند کر لی ہے۔ آپ نہ نہیں کریں گے۔ آپ کو ہمارے سر کی قسم ہے۔"

"آپ نے لڑکی بھی ڈھونڈ لی...... ارے ہم جیسے آدمی کو لڑکی کون دے گا بٹیا......؟"

"میں نے کہا ناں...... لڑکی ہے، آپ بھی جانتے ہیں...... سونا۔" تہمینہ نے نام لیا تو شبن میاں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کیا......؟ سونا؟ بٹیا! آپ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہ رہی ہیں...... یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

"نہیں...... ہم اس سے پوچھیں گے، اس کی رضامندی ہوگی تو بات بڑھائیں گے۔ ورنہ یہیں ختم کر دیں گے۔" پھر کچھ ہی دنوں میں سونا کی شادی سادگی سے شبن میاں سے ہوگئی...... اور وہ تہمینہ کے کمرے سے رخصت ہو کر شبن میاں کے کمرے میں چلی گئی۔

ایک سال کے اندر، اندر وہ ایک خوب صورت بچے کے ماں، باپ بھی بن گئے۔ تہمینہ اور شکیب کے لیے بھی اشرف میاں ایک کھلونا ہی تھے...... اس معصوم سے بچے کے دم سے ان کے گھر میں بڑی خوشیاں تھیں۔ وہ کلکاریاں مارتا تو اس کی چہکار سے گھر گونج اٹھتا۔ سونا نے بھی گھر اور گھر والوں کو بہت اچھی طرح سنبھالا۔ سب کچھ بہت اچھی طرح چل رہا تھا۔ شکیب کے انٹر سیکنڈ ایئر کے فائنل امتحان سر پر تھے، وہ محنت سے تیاری میں لگا ہوا تھا۔ تہمینہ نے روشو کی مدد سے اپنا چائے خانہ اچھی طرح سنبھال رکھا تھا۔ شبن میاں سبزی اور پھل بیچ کر اچھا کما رہے تھے، اچھا وقت گزر رہا تھا۔ تہمینہ کو شکیب سے بڑی امیدیں تھیں۔ وہ تھا بھی ذہین اور محنتی...... اس کا مستقبل ایک سہانے سپنے کی طرح ان کی آنکھوں میں سجا ہوا تھا۔

اس رات بھی وہ سب کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے کہ بیرونی دروازے کی کنڈی بجی...... شبن میاں نے دروازہ کھولا تو کوئی اجنبی شخص سامنے تھا۔ شبن میاں کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے کہا۔

"میرا نام مستفیض ہے، میں ڈھاکا سے آیا ہوں، یہ خط آپ نے مجھے لکھا تھا۔" اس نے ایک پرانا سا نیلا ڈاک کا لفافہ ان کے سامنے کر دیا۔ جس کے پچھلی جانب شبن میاں کا نام اور دکان کا پتا لکھا ہوا تھا۔

"میں دکان پر گیا تھا پر وہ بند تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا تو ایک آدمی نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ یہ آپ کا گھر ہے؟"

"ہاں...... یہ خط بھی میں نے ہی تم کو بھجوایا تھا۔ اور یہ گھر بھی میرا ہے، آؤ، آؤ اندر آؤ......" شبن میاں نے اسے بڑی محبت سے اندر بلا کر بٹھایا۔

"سونا کے بھائی ہو......؟" شبن میاں نے سوال کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا کر جھکا لیا۔

"ملنا چاہو گے اس سے؟" اس سوال پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تو شبن میں نے آواز لگائی۔

"سونا...... اے سونا......! جلدی آؤ تمہارا بھائی آیا ہے۔" ان کے الفاظ تھے یا صور پھونکا گیا تھا۔ سونا

دوڑتی ہوئی کمرے سے نکلی تو دوسرے کمرے سے تہمینہ اور شکیب بھی نکل آئے۔ سونا بڑی بے قراری سے دوڑتی ہوئی اپنے بھائی تک آئی پھر اس کی نظر بھائی کی سرد مہر آنکھوں سے ٹکرائی تو وہ اچانک رک گئی۔

''تو ابھی زندہ ہے..... اچھا ہوا، اب میں تجھے اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔'' مستفیض کا لہجہ خون خشک کرنے والا تھا۔

''نہیں مستفیض! یہ سزا کی نہیں ہمدردی کی مستحق ہے، یہ ایک لمحے کو بھٹکی ضرور تھی۔ لیکن برائی کی راہ پر چلی نہیں..... اپنی عزت، اپنی ناموس کی اس نے حفاظت کی ہے، تمہیں جو تکلیف اس کی طرف سے پہنچی ہے اسی کی معافی مانگنے کے لیے یہ تمہارے سامنے آنا چاہتی تھی۔ میں نے اسی لیے تمہیں یہاں بلایا تھا۔ شکر ہے کہ تم آگئے۔ اس کی بات سنو..... اس کی معافی قبول کرو..... کیونکہ اتنی بڑی دنیا میں تمہارا یہی ایک رشتہ ہے، اس کے بغیر تم اور تمہارے بغیر یہ..... دونوں دنیا میں اکیلے ہو.....'' شبن میاں نے مستفیض کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے دباتے ہوئے کہا تو سونا روتے ہوئے اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔

''مجھے معاف کردو بھائی! معاف کردو بھائی..... میں نے تمہیں جو بھی تکلیف پہنچائی۔ اس کے لیے معاف کردو..... مجھ سے بہت بڑی بھول ہوگئی تھی۔ میری بھول کو معاف کردو بھائی.....'' وہ اس کے پیروں سے لپٹی بری طرح رو رہی تھی اور وہ آنکھوں میں آنسو لیے بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نظر شبن میاں پر پڑی تو وہ بھی اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔ آخر کار اس کا غصہ ہار گیا۔ وہ جھکا اور بہن کو اٹھا کر گلے سے لگالیا۔ دونوں بہن، بھائی نے مل کر بے حساب آنسو بہائے۔ اور ان آنسوؤں میں سارے گلے شکوے اور کڑوے احساسات بہہ گئے۔ اب سب کے تعارف کی نوبت آئی۔ شکیب نہ جانے کب اشرف کو گود میں اٹھالایا تھا۔ وہی پہلے آگے بڑھا اور اس نے اشرف سے کہا۔

''لو بھئی..... ماما جی بڑی دور سے آئے ہیں..... ان سے تھوڑی باتیں تو کرو..... حال احوال پوچھو۔'' یہ کہہ کر اس نے اشرف کو اس کے ماما جی کے حوالے کیا تو اس نے سوالیہ نظروں سے شبن میاں کو دیکھا۔

''یہ میرا اور سونا کا بیٹا ہے۔'' شبن میاں نے ہنس کر کہا تو مستفیض نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں پہلے بھی کبھی آپ سے مل چکا ہوں۔''

''میں بھی ڈھاکا سے ہی یہاں آیا ہوں، شاید وہاں ہم کبھی ملے ہوں..... یہاں بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہیں دیکھ کر تمہیں ایسا ہی لگے گا..... کہ تم پہلے بھی ان سے مل چکے ہو..... درد کے رشتے ہیں ناں ہمارے اور تمہارے درمیان۔'' شبن میاں بول ہی رہے تھے کہ مستفیض یک دم گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی نظر تہمینہ پر تھی۔

''چھوٹی بیگم.....! آپ؟ یہاں؟ آپ زندہ ہیں؟'' الفاظ ٹوٹ، ٹوٹ کر اس کی زبان سے ادا ہوئے۔

''کیا تم بٹیا کو جانتے ہو.....؟'' شبن میاں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''حبیب سرکار کی بیوی تھیں ناں یہ..... ان دنوں لڑائی ہو رہی تھی، باہر بھی اور گھر کے اندر بھی..... چھوٹی سرکار اردو بولنے والی تھیں۔ یہ بات حبیب سرکار کے ماں، بابا کو پسند نہیں تھی۔ وہ ہر وقت آگ لگائے رکھتے تھے، حبیب سرکار نے غصے میں آکر ان کی زبان کاٹی تھی اور انہیں اتنا مارا کہ یہ مر گئی تھیں..... پھر انہیں باہر سڑک پر پھینکوا دیا تھا۔ اُدھر سے پاکستانی فوج کا ٹرک اٹھالے گیا تھا، ان کا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا۔ شکیب سرکار.....'' وہ نم، نم لہجے میں بتا رہا تھا۔

''ہاں، ہاں میں وہی بدنصیب ہوں، وہی ہوں میں..... کاش اس وقت مر گئی ہوتی لیکن دیکھو..... اتنا کچھ سہنے کے بعد بھی زندہ ہوں میں.....'' تہمینہ ابل پڑی تھی۔ شکیب نے اسے سہارا دیا۔ پھر بولا۔

''میں وہی شکیب ہوں، شکیب نامدار..... یہ میری ماں ہیں، یہ میرے نصیب تھے کہ میری ماں زندہ بچ گئی۔ ورنہ میں نہ جانے کہاں ٹھوکریں کھا رہا ہوتا..... میرے باپ نے ماں کو تو مار کر پھینکا تھا لیکن

مجھے تو زندہ پھینک دیا۔ اور اس طرح پھینکا کہ آج تک مجھے پوچھا نہیں..... ڈھونڈا تک نہیں..... کیا میں صرف ماں کا بیٹا تھا۔ باپ سے کوئی رشتہ نہیں تھا میرا.....؟'' شکیب بھی غصے میں آ گیا تھا۔ مستفیض اس کی بات سن کر تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔

''وہ بیچارہ اس قابل رہ کہاں گیا تھا کہ تم کو ڈھونڈتا..... وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ پوری، پوری رات وہ چھوٹی سرکار کو پکار، پکار کر دیواروں سے سر پھوڑتا تھا۔ چیختا تھا، چلاتا تھا۔ چیزیں توڑتا پھوڑتا تھا، ڈاکٹر اسے نیند کے انجکشن لگا کر سلاتے مگر وہ اٹھ کر پھر وہی حرکتیں کرتا..... صرف ایک شوندر بابا تھے جو اسے سنبھال سکتے تھے۔ وہ اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے، کچھ باتیں کرتے تو کبھی تو وہ بغیر دوا کے سو جاتا۔ ورنہ خاموش ہو کر ان کی باتیں سنتا رہتا۔ بہت دن کے علاج کے بعد..... اس نے چیخنا چلانا، توڑ پھوڑ کرنا..... اپنے آپ کو نقصان پہنچانا تو چھوڑ دیا پر اب وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ کسی سے کوئی بات کرتا، نہ کسی کی بات کا جواب دیتا۔ ہر چیز، ہر کام سے لاتعلق ہو گیا تھا، ماں، باپ سے تو بالکل ہی کوئی بات نہیں کرتا۔ شوندر بابا اصرار کر کے اگر کچھ کھلاتے تو تھوڑا بہت کھا پی لیتا۔ ورنہ ایسے ہی سارا دن گزر جاتا۔'' مستفیض دم لینے کو رکا تو شکیب نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر..... پھر بہت برا ہوا..... ایک دن شوندر بابا نے مجھے بلا کر کہا حبیب سرکار بوری گنگا کی سیر کو جانا چاہتے ہیں۔ ناؤ میں بیٹھ کر دور تک جانا چاہتے ہیں، میں اکیلے شاید انہیں سنبھال نہ پاؤں..... اس لیے تم میرے ساتھ چلو..... میں نے کچھ ضروری چیزیں لیں..... اور ہم موٹر میں بیٹھ کر گھاٹ پر پہنچ گئے۔ شام ڈھل چکی تھی اندھیرا ہونے لگا تھا۔ گھاٹ پر اور ناؤ پر روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ ہم تینوں بھی ناؤ پر پہنچے تو حبیب سرکار سیڑھیاں چڑھ کر اوپر عرشے پر آ گئے۔ وہاں آدھے حصے پر چھتیں لگی ہوئی تھیں۔ بقیہ آدھا حصہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر ہم وہاں بیٹھے تو ناؤ چل پڑی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا اور اس کے آس پاس پھیلا جنگل اور دریا کا پانی بھی سیاہ ہو گیا۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں دریا کے سیاہ پانی سے ایک سرخی مائل تھال اوپر آنا شروع ہوا۔ یہ چاند تھا۔ حبیب سرکار اس سارے ماحول کو ایسے بیان کر رہے تھے جیسے پہلے بھی دیکھ چکے ہوں۔

''دیکھو! یہ چاند ابھی تھوڑی دیر میں اوپر آئے گا تو سونے کے بجائے چاندی ہو جائے گا۔ ہر طرف سفید دودھیا چاندنی پھیلے گی تو وہاں اس جگہ ایک پری اترے گی۔ سفید ساڑی میں اس کے لمبے بال ہوا میں اڑ رہے ہوں گے اور وہ کہہ رہی ہو گی۔

''اُف اس قدر حسن..... کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں.....'' پھر میں کہوں گا... اونہوں... مجھے دیکھو۔ میں اتنے عرصے سے تمہارا حسن دیکھ رہا ہوں، اب تک پاگل نہیں ہوا تو تم اتنی سی دیر میں پاگل کیسے ہو سکتی ہو..... لیکن پھر میں ہی پاگل ہو گیا..... ہے ناں شوندر بابا..... میں ہی پاگل ہو گیا تھا ناں.....'' شوندر بابا نے انہیں تھپک کر تسلی دی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے..... پھر اٹھ کر ریلنگ کی طرف بڑھ گئے۔ چاند ابھر آیا تھا اور ہر طرف اس کی شفاف چاندنی پھیل گئی تھی۔ وہ ریلنگ پکڑے بڑی دیر تک نیچے پانی میں بننے والے بھنور دیکھتے رہے..... ناؤ تیزی سے چل رہی تھی۔ اچانک ہی ہم نے دیکھا کہ وہ ریلنگ پر چڑھے اور انہوں نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ میں اور شوندر بابا چیخ مار کر اُدھر دوڑے، پانی میں دور، دور تک دیکھا۔ مگر وہ نظر نہیں آئے..... ناؤ رک گئی تھی۔ ماجھیوں نے پانی میں چھلانگیں لگائیں۔ انہیں ڈھونڈا، دیر تک ڈھونڈتے رہے..... لیکن وہ نہیں ملے..... پھر کبھی نہیں ملے..... ہاں کبھی بھی نہیں.....'' مستفیض خاموش ہوا تو ایک ہچکی سی فضا میں گونجی اور خاموش ہو گئی۔

''ماں، ماں..... ماں کو کیا ہوا شبن میاں..... ماں.....'' تہمینہ بے ہوش ہو گئی تھی..... اور شکیب چیخ، چیخ کر اسے پکار رہا تھا۔ وہ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے..... کافی کوششوں سے بڑی دیر بعد اسے ہوش

آیا۔ تو وہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ خاموش تھی۔ دکھ کا ایک سمندر تھا جس نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اور وہ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو اس میں سے نکال نہیں پا رہی تھی۔ اس کے وجود پر جیسے منوں پتھر برس پڑے تھے جنہوں نے اسے زخمی کر دیا تھا۔ اور یہ ایک مستقل بوجھ بن کر اس کے دل پر بیٹھ گئے تھے۔ دل اتنا بوجھل ہو گیا کہ اس نے کئی دن اسے بستر سے نہیں اٹھنے دیا۔

مستفیض تو جیسے اس کا مجرم سا بن کر رہ گیا تھا۔ نہ وہ داستانِ حبیب سناتا نہ اسے یہ تکلیف پہنچتی۔

''یہ میرا مقدر ہیں مستفیض.....؟ ان دکھوں سے چھٹکارا شاید مرنے کے بعد ہی ہوگا..... تم اپنے آپ کو پریشان مت کرو..... اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے، میں کافی حد تک سنبھل چکی ہوں..... اور سنبھل جاؤں گی۔ یہ بتاؤ..... شکیب کے دادا، دادی اب کہاں ہیں؟''

''دادا مر گئے..... دادی اپنے پرانے چھوٹے سے گھر میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں، ان کی بڑی حویلی پر لڑاکوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ انہوں نے سب کو نکال دیا۔ میں اور شوندر بابا حویلی میں کام کرتے تھے تو وہاں سرونٹ کوارٹر میں اب تک رہتے ہیں، پچھلے سال شوندر بابا کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اب میں ہی ہوں پرانے لوگوں میں..... سونا حماقت نہ کرتی تو مجھے یہاں نہ آنا پڑتا..... میں نیپال ہوتا ہوا انڈیا کے راستے سے آیا ہوں، بہت مشکل سے، صرف سونا کے لیے پر میں بہت خوش ہوں کہ وہ اب آپ جیسے اچھے لوگوں میں ہے، مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ اسے بہت خوش رکھیں گے، اس لیے میں اب اطمینان سے جاؤں گا۔ لمبا سفر ہے، بہت دن لگیں گے، اس لیے اب میں اجازت چاہتا ہوں.....'' مستفیض نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

''وہاں جا کر کیا کرو گے؟ اسی حویلی میں کام کرو گے؟''

''نہیں، کئی مہینوں سے غائب ہوں وہاں سے۔ انہوں نے کسی اور کو رکھ لیا ہوگا میری جگہ..... اب تو جا کر کوئی نئی نوکری تلاش کروں گا۔''

''تو یہیں کیوں نہیں رہ جاتے، میرا ہوٹل چلاؤ۔ پیسے بھی مل جائیں گے کوئی چھوٹا سا گھر بنا لینا۔ شادی کر لینا بہن بھی ہے یہاں..... اور کیا چاہیے تمہیں..... جو یہاں نہیں ہے صرف وہاں ہی ملے گا؟''

''ایسا تو کچھ بھی نہیں ہے وہاں..... یہاں سکون تو ہے، وہاں تو ابھی تک لڑائی، مارا، ماری چل رہی ہے، وہ لوگ اب تک ہم کو مارتے پیٹتے ہیں لیکن پھر بھی اپنے لوگ تو ہیں۔''

''جن کو اپنا بنا لو، وہ سب اپنے ہو جاتے ہیں، یہاں بھی سب اپنے ہی ہیں، اچھی طرح سوچ سمجھ لو اور میرے مشورے پر غور کرو..... امید ہے تم یہاں رہنے کا فیصلہ کرو گے۔''

وہ تہمینہ کی بات کو رد نہیں کر سکا اور وہیں ٹھہر گیا۔ تہمینہ کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ دل کے عارضے نے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اس لیے اس کا ہوٹل بھی اب مستفیض نے سنبھال لیا تھا۔ اور تہمینہ نے صحن میں بنا ہوا چھوٹا کمرا جسے دکان بنانے کا خیال تھا..... عارضی رہائش کے لیے اسے دے دیا۔

مستفیض ایک ہوشیار لڑکا تھا۔ اس نے جلد ہی ہوٹل کے کاروبار کو اور پھیلا دیا۔ سامنے کی خالی جگہ پر اس نے لکڑی کی ٹیبلیں اور بینچیں ڈلوا دی تھیں تو اب وہاں بھی لوگ آ کر بیٹھنے اور کھانے پینے لگے۔ اب وہ صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک مستقل چلتا تھا۔ بلکہ کچھ عرصے کے بعد اس نے رات کو چائے پراٹھے بھی شروع کر دیے تھے۔ اس طرح اس کی واپسی اکثر رات گئے ہوتی تھی۔ اب ہوٹل چل نہیں رہا تھا بلکہ دوڑ رہا تھا۔

سب کچھ بہت اچھا جا رہا تھا کہ اچانک نامعلوم وجوہات کی بنا پر شہر کے حالات خراب ہونا شروع ہو گئے۔ کبھی کبھی کہیں کوئی موٹر سائیکل والے آتے..... تڑتڑ فائرنگ کرتے اور آناً فاناً ساری دکانیں، ہوٹل وغیرہ بند ہو جاتے۔ کبھی ایک دن، کبھی دو دن ہڑتالیں ہونے لگیں، سارا کاروبار ٹھپ..... مستفیض اور شبن میاں دونوں فارغ گھر میں بیٹھ کر وقت گزارتے..... آمدنی کم ہوئی تو مالی پریشانیاں گھیرنے لگیں۔

کچھ عرصے میں ہی انہیں محسوس ہونے لگا کہ ان

کے علاقے میں کچھ زیادہ ہی فائرنگ اور قتل و غارت گری ہو رہی ہے۔ ایک دو مرتبہ تو قریب کی دوسری بستی کے لوگوں نے ہتھیار لے کر مورچہ بندی کی اور ان کے علاقے سے کسی کے بھی باہر نکلنے پر پابندی لگادی۔ نوکریاں، کاروبار کرنے والے، اسکول، کالج، یونیورسٹی میں پڑھنے والے..... یہاں تک کہ خوانچہ لگانے والے بھی اپنے علاقے میں مقید ہو کر رہ گئے۔ جو باہر نکلتا وہ گولیوں سے بھون دیا جاتا۔ پھر پولیس آتی تو راستہ کھلتا اور زندگی معمول پر آتی۔ لیکن چند روز کے سکون کے بعد پھر وہی مار ماری۔

شکیب بھی کالج سے فارغ ہو کر اب یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ یونیورسٹی جانا تو اب کم ہی ہو گیا تھا۔ لیکن گھر پر بھی وہ اپنی پڑھائی میں لگا رہتا تھا۔ تہمینہ اس کی پڑھائی متاثر نہ ہونے کا خصوصی اہتمام کرتی تھی..... گزرتے وقت کے ساتھ حالات اتنے خراب ہونے لگے کہ شبن میاں اور مستفیض نے فیصلہ کیا کہ بڑی سڑک پر واقع ان کا ہوٹل اور دکان اگر بند ہوتے ہیں تو وہ کرانہ دکان میں گھر پر ہی ایک چائے خانہ کھول لیتے ہیں اور ایک کریانہ اسٹور کا سامان رکھ لیتے ہیں۔ اچھے حالات میں وہ سامان خرید کر لے آیا کریں گے۔ یوں روزی کا بندوبست ہونے لگا۔

پچھلے دو دنوں سے مسلسل فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ صاف لگتا تھا کہ دو گروہ آپس میں لڑ رہے ہیں، بستی کے کتنے ہی نوجوان ہلاک اور زخمی ہو کر گھروں پر آئے۔

''یہ کیا چل رہا ہے شبن میاں.....! ہمارے بچوں کے پاس یہ ہتھیار کہاں سے آئے؟ کس طرح یہ لڑ بھڑ رہے ہیں، کتنے مر گئے، کتنے آئے روز زخمی ہو جاتے ہیں..... کیا آپ کو نہیں لگتا مشرقی پاکستان میں بھی حالات اسی طرح خراب ہونا شروع ہوئے تھے۔ اور پھر کیا ہوا تھا؟'' تہمینہ نے سوال کیا تو شبن میاں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''ٹھیک کہتی ہو بٹیا.....! پر یہ مشرقی پاکستان نہیں ہے، پچھمی پاکستان بلکہ پورا پاکستان ہے، رہا سوال ہتھیاروں کا تو ہاشو میاں جیسے لوگ ہیں ناں..... وہ اکثر لڑکوں کو اکساتے اور ہتھیار خریدنے پر آمادہ کرتے ہیں..... وہ اور انہی جیسے لوگ ہتھیاروں کا غیر قانونی کاروبار کر رہے ہیں، وہ اپنا پیسہ بنا رہے ہیں اور لڑکے اپنی جان سے کھیل رہے ہیں۔ دیکھیں! کیا ہوتا ہے۔''

رات کا پچھلا پہر تھا..... وہ سب گہری نیند میں تھے کہ وحشیانہ انداز میں دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز نے سب کو بیدار اور خوفزدہ کر دیا..... وہ سب اٹھ کر کمروں سے باہر آئے تو ایک کرخت آواز نے حکم دیا۔

''دروازہ کھولو..... ورنہ توڑ دیا جائے گا..... کھولو.....''

شبن میاں نے سب کی طرف دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔ دو ہتھیار بند رینجرز کے سپاہی درّانہ وار اندر گھسے۔ ان سب کو دیکھا گھر کو دیکھا اور آگے بڑھ کر شکیب کو پکڑ لیا۔ اور دونوں جانب سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ تہمینہ نے چیخ مار کر اسے چھڑانے کی کوشش کی تو اسے ایک زبردست دھکے کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ فریاد کرتی ہوئی ان کے پیچھے باہر تک گئی۔ لیکن ان لوگوں نے اسے پکڑ کر ٹرک میں ڈال دیا..... تہمینہ نے دیکھا وہاں اور بھی کئی لڑکے تھے..... ان کے گھر والے فریاد کر رہے تھے لیکن ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔

معلوم ہوا کہ پولیس اور رینجرز نے چاروں طرف سے بستی کا محاصرہ کر کے گھروں پر چھاپے مارے تھے اور جس گھر میں انہیں لڑکے نظر آئے وہ سب کو اٹھا کر لے گئے ہیں..... وہ سب ایک دوسرے کو تسلیاں دے رہے تھے کہ ''ان کے لڑکے بے گناہ ہیں چھوڑ دیے جائیں گے، آج نہیں تو کل..... ورنہ پرسوں..... آجائیں گے بچے.....'' لیکن تہمینہ کے دل کو پنکھے لگے ہوئے تھے..... وہ جانتی تھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کل اور پرسوں کے دن میں تفتیش کے نام پر انہیں کس عذاب سے گزرنا ہوگا کس طرح کا..... بے رحمانہ تشدد کیا جائے گا ان پر..... اس کا دل بہت..... بے چین، بہت بے قرار تھا..... اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شکیب کو ان سے چھین کر لے آئے۔

''شبن میاں، جتنے پیسے ہیں رکھ لیجیے...... ہم چلتے ہیں، تلاش کرتے ہیں شکیب کو...... کس تھانے میں رکھا ہوا ہے انہوں نے میرے بچے کو...... جتنی رشوت دینا پڑے، ہم اسے چھڑا لائیں گے، نہ جانے میرا... بے گناہ بچہ کس عذاب سے گزر رہا ہوگا......'' تہمینہ نے چادر اوڑھتے ہوئے شبن میاں سے کہا تو وہ بھی سر ہلا کر چلنے کو تیار ہو گئے۔

''بٹیا......! شاید ہاشو میاں کو پتا ہوگا کہ یہاں کے لڑکوں کو کس تھانے میں لے کر گئے ہیں، میں ذرا تھوڑی معلومات لے لوں تو چلتے ہیں۔''

پھر وہ دونوں نہ جانے کہاں، کہاں بھٹکتے رہے، تمام دن اس تھانے سے اس تھانے میں، وہاں سے کہیں اور...... جو جہاں کی نشاندہی کرتا وہ وہاں پہنچ جاتے...... لیکن شام تک ڈھونڈنے کے باوجود انہیں شکیب کا پتا کہیں سے نہ ملا۔ دن گزر گیا اور شام سے رات ہو گئی تو تہمینہ کا صبر ضبط جواب دے گیا۔ وہ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ہچکیوں اور سسکیوں سے اس قدر روئی کہ اس کے آنسوؤں نے شبن میاں کو بھی رُلا دیا۔ وہ دونوں بڑی دیر تک فٹ پاتھ پر بیٹھ کر روتے رہے۔ آس پاس سے گزرنے والے انہیں ترحم آمیز انداز میں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ آخر کار دونوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ شبن میاں نے ایک رکشا روکا اور گھر کی طرف چل پڑے۔ بستی کے باہر ہی انہیں پولیس کی گاڑیاں اور رینجرز کے ٹرک کھڑے نظر آئے۔ رکشے والے نے بھی وہیں روک دیا۔

''میں اندر بستی میں نہیں جاؤں گا خطرہ ہے، کوئی گولی ہی نہ مار دے...... آپ یہیں اتر کر پیدل چلے جاؤ...'' شبن میاں نے خاموشی سے اس کا کرایہ ادا کیا اور وہ دونوں پیدل بستی کی طرف چل پڑے...... گھر پہنچے تو مستفیض اور سونا نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا لیکن وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے خاموشی سے اپنے، اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔

رات گزرتی رہی اور وہ سب ماتم اور سوگ کے عالم میں اپنے، اپنے ٹھکانوں پر جاگتے رہے۔ تہمینہ کو تو بستر بھی انگاروں بھرا لگ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کو بھی بستر پر نہیں لیٹی...... مسلسل کمرے کے طول و عرض میں ٹہلتی رہی۔ اس کا بیٹا نہ جانے کن حالوں میں تھا۔ اسے ایک پل کے لیے قرار نہیں تھا...... دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی ساری دعائیں صرف اس کے لیے تھیں۔

ایسے میں ایک بار پھر بیرونی دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ مکینوں کی سانس اوپر کی اوپر ہی رہ گئی۔ اب نہ جانے کون سی نحوست اس گھر میں آمد کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ ''یا اللہ خیر......''

لیکن اس بار روشو کی خوف و ہراس میں ڈوبی آواز بھی آئی۔

''جلدی باہر آؤ، جلدی آؤ...... شکیب بھائی!''

شکیب کا نام سن کر شبن میاں نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ وہ انہیں لے کر ایک جانب دوڑتا چلا گیا۔ مستفیض بھی ان کے پیچھے بھاگا...... تہمینہ دروازے میں کھڑی زندگی اور موت کے درمیان جھول رہی تھی۔ اپنی بد نصیبی پر اسے کوئی شبہ نہیں تھا...... لیکن اب بیٹے کے حوالے سے وہ کسی آزمائش کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ٹھہری ہوئی آنکھوں اور رکی ہوئی سانسوں کے ساتھ بہ مشکل کھڑے رہنے کی کوشش کر رہی تھی...... تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا شبن میاں اور مستفیض کسی کو ہاتھوں پر اٹھا کر لا رہے تھے۔ وہ اس کے نزدیک سے گزر کر اندر گئے اور وہ بے حسی سے انہیں دیکھتی رہی...... وہ شکیب تھا اس کے لٹکے ہوئے بازو اور...... بے جان سے پیر بتا رہے تھے کہ اب وہ محض ایک گزری کہانی ہے۔ اس کے سارے احساسات منجمد ہو گئے اور وہ وہیں چوکھٹ سے لگی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کے اندر سے کسی نے چیخ کر کہا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ کچھ باقی نہیں رہا جس کے لیے وہ جیے...... اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ آنے لگی۔ شاید وہ گر رہی تھی کہ سونا نے چیخ ماری۔

شبن میاں شکیب کو پلنگ پر لٹا چکے تھے...... وہ دوڑ کر تہمینہ کے پاس پہنچے تو اس نے بجھتی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''وہ زندہ ہے، شکیب زندہ ہے بیٹا! حوصلہ پکڑو..... سنو.....! شکیب زندہ ہے، اسے چل کر دیکھو.....''

شبن میاں نے اسے جھنجوڑ ڈالا تو اس کے منجمد احساسات میں کچھ روانی آئی۔ شبن میاں کے الفاظ نے اسے دوبارہ زندگی کی طرف بلا لیا۔ وہ سونا کا سہارا لے کر بدقت اٹھ کر کھڑی ہوئی اور شکیب کی جانب بڑھی۔ وہ بہت بری حالت میں تھا..... چہرے پر نیل اور زخم تو نظر آ ہی رہے تھے البتہ جسم کا کیا حال ہوگا..... اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ وہ بالکل بے ہوش تھا۔ سانسیں بہت مدھم چل رہی تھیں۔

روشو بھاگ کر ڈاکٹر کو اس کے گھر سے جگا کر لے آیا تھا..... وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے ایک انجیکشن فوری طور پر لگایا۔ پھر ایک ڈرپ بھی لگا دی۔ اس نے اشارے سے تہمینہ اور سونا کو وہاں سے ہٹانے کو کہا تو سونا تہمینہ کو سہارا دیتی ہوئی وہاں سے لے گئی۔ ڈاکٹر نے مستفیض کی مدد سے شکیب کی شرٹ قینچی سے کاٹ کر بہ مشکل اتاری کیونکہ وہ جسم پر خون کے ساتھ بری طرح چپک گئی تھی۔

شرٹ اتری تو شبن میاں کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور وہ وہاں سے ہٹ گئے۔ شکیب کا سارا بدن لہو، لہو تھا۔ جگہ، جگہ سے کھال پھٹی ہوئی تھی، کہیں زخم، کہیں نیل صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے بہت بری طرح مارا پیٹا گیا ہے، اس کا سارا بدن داغ، داغ تھا۔ ان سے دیکھا نہیں گیا۔ وہ رخ پھیر کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگے۔

وہ تینوں اس کے زخموں کے اندمال کے جتن کر رہے تھے، ڈاکٹر تھوڑی، تھوڑی دیر بعد ڈرپ میں نہ جانے کون، کون سے انجیکشن ڈال رہا تھا۔ اس کے زخموں پر کہیں ٹنکچر، کہیں مرہم لگا رہا تھا، وہ دونوں بھی اس کی مدد کر رہے تھے، تہمینہ بار، بار آ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل ٹکڑے، ٹکڑے ہو رہا تھا۔ پھر اس نے صحن میں مصلیٰ بچھا کر اللہ کے سامنے اپنا دستِ سوال دراز کر دیا۔ اسے ہر قیمت پر اپنے بیٹے کی زندگی چاہیے تھی۔

آخر کار صبح ہوتے ہی اس کی سانس کچھ ہموار ہوئیں تو ڈاکٹر نے مطمئن ہو کر انہیں تسلی دی کہ ''اب وہ بہتری کی طرف مائل ہے، ایک دو گھنٹوں میں اسے ہوش بھی آ جائے گا۔ میں دوپہر میں پھر چکر لگاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی جب شکیب نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے مہربان چہرے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بلک، بلک کر رو دیا۔ اس طرح کہ آج تک نہیں رویا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور اس کے ساتھ سب رو رہے تھے۔ بڑی دیر بعد یہ طوفان تھما..... شبن میاں نے اسے مستفیض کی مدد سے اٹھا کر تکیے کے سہارے بٹھا دیا۔ پانی پلایا، سونا جلدی سے دودھ میں ہلدی ڈال کر لے آئی۔ اور گلاس اس کے منہ سے لگا دیا..... وہ نڈھال سا تکیے پر سر ڈالے بیٹھا رہا۔ تہمینہ اور دوسرے اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں؟ کیسے تسلی دیں.....؟ الفاظ ہی ختم ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور تہمینہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ماں، میرا کیا قصور تھا.....؟ ایسا کون سا جرم کیا تھا میں نے کہ مجھے جیتے جی اس جہنم سے گزرنا پڑا۔ جتنے زخم میرے چہرے پر ہیں ناں ماں.....! اس سے زیادہ بڑے گھاؤ، میری روح پر لگائے ہیں انہوں نے۔ اتنی تذلیل، اتنی توہین، اتنی بے وقعتی کہ میری روح کرچی، کرچی ہو گئی ہے۔ میں ان سے اپنا جرم پوچھتا رہا۔ اور وہ مجھے مارتے اور گالیاں دیتے رہے۔'' وہ کپکپا کر چپ ہو گیا تو شبن میاں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''جو گزر گیا..... اسے بھولنے کی کوشش کرو بیٹا..... یہ سب یاد کرتے رہے تو زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔''

''اس کے بعد میں زندہ رہنا بھی نہیں چاہتا..... وہاں تو مجھے لگا تھا کہ میں مر گیا ہوں..... پتا نہیں یہاں زندہ کیسے ہو گیا۔ ماں.....؟ ضرور تم نے میری زندگی کے لیے دعائیں کی ہوں گی لیکن اب نہ کرنا..... تمہیں میری قسم ہے ماں.....! اب میرے زندہ رہنے کی دعائیں نہ کرنا..... میرے لیے تو یہ زندگی عذاب ہے..... موت میں راحت اور سکون ہے۔ ماں

تمہارے بیٹے کو راحت اور سکون کی بہت سخت ضرورت ہے۔ بہت ضرورت ہے۔'' وہ نڈھال ہو گیا تھا۔

شکیب کے ٹوٹتے ہوئے لہجے میں ایسا نہ جانے کیا تھا کہ تہمینہ سے برداشت نہ ہوا..... وہ چیخ کر رو پڑی۔ وہ بری طرح چلا، چلا کر رو رہی تھی۔ اور سب اپنے، اپنے آنسوؤں کے ساتھ خاموش تھے۔ کسی نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی..... شاید یہ سوچ کر کہ اس کے دل کا غبار جتنا نکل جائے اچھا ہے، آنسو اندر رہے تو زہر بن جائیں گے۔ ڈاکٹر صبح شام آ کر اسے دیکھ جاتا۔ انجیکشن، دوائیں اور مرہم پٹیوں کے ذریعے وہ اس کے زخموں کا علاج کر رہا تھا۔ اور زخم بھرتے بھی جا رہے تھے لیکن وہ صرف اس کے جسم کا علاج تھا۔ روح پر جو زخم لگے تھے انہوں نے اسے توڑ کر شکستہ کر دیا تھا۔ وہ چپ چاپ منہ لپیٹے پڑا رہتا۔ راتوں کو سو نہیں پاتا..... سوتا تو چیخ مار کر جاگ جاتا..... کسی سے کوئی بات نہ کرتا اور نہ ہی اسے کھانے پینے سے کوئی دلچسپی رہ گئی تھی۔ تہمینہ زبردستی کر کے اسے تھوڑا بہت کھلا پلا دیتی..... ورنہ وہ تو اپنے آپ سے بیگانہ سا ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا تھا کہ اسے کسی اچھے ماہرِ نفسیات کی ضرورت ہے۔ وہ آہستہ، آہستہ ٹھیک ہو جائے گا اس کے مشورے کو مانتے ہوئے تہمینہ خود اسے رکشے میں بٹھا کر کافی دور ایک ماہرِ نفسیات کے پاس لے جانے لگی۔ اس سے کچھ تبدیلی آنا شروع ہوئی لیکن بہت کم، کم۔ اپنی بیماری کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری..... نفسیاتی علاج سے شکیب آہستہ، آہستہ نارمل زندگی کی طرف آنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اب بھی وہ پہلا والا شکیب نہیں تھا..... یہ شکیب زندہ ضرور ہو گیا تھا لیکن زندگی کی ساری حرارتوں سے محروم..... ایک بے روح چلتا پھرتا وجود.....

''شکیب..... بیٹا کچھ اپنی کتابوں وغیرہ کو دیکھو..... کچھ پڑھنے کی کوشش کرو..... تمہارا ذہن بٹ جائے گا.....'' تہمینہ نے ایک روز کہا۔

''کیا کروں پڑھ کر ماں.....! وہ کسی دن پھر آئیں گے..... مجھے اٹھا کر لے جائیں گے..... پھر جہنم کے اس عذاب سے گزار کر مردہ یا نیم مردہ حالت میں کسی سڑک پر کسی نالے میں پھینک جائیں گے..... کیا فائدہ پڑھنے کا..... سب بیکار ہے۔'' اس کے الفاظ تو آزردگی کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن لہجے میں آگ دبی ہوئی تھی۔

''نہیں میری جان! خدا نہ کرے کہ دوبارہ ایسا ہو..... اچھی امید رکھو اور اچھی زندگی کی کوشش کرو..... بھول جاؤ ان تلخیوں کو..... کوشش کرو کہ بھول جاؤ.....'' تہمینہ نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

''کیا یہ ممکن ہے..... بھول جانا ممکن ہے ماں؟'' اس کی بات پر تہمینہ اسے بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔

ان میں کبھی، کبھی اس موضوع پر اسی قسم کی گفتگو ہو جاتی تھی۔ حالانکہ تہمینہ کی کوشش ہوتی تھی کہ یہ موضوع کبھی زیرِ بحث نہ آئے لیکن کوشش کے باوجود کبھی، کبھی ایسا ہو جاتا تھا اس تلخ گفتگو کے بعد شکیب اکثر باہر نکل جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ تہمینہ نے مستفیض کو اس کے پیچھے بھیجا۔ پریشان ہو جاتی تھی کہ کہیں کچھ الٹا سیدھا نہ کر لے..... لیکن اس نے آ کر بتایا کہ وہ صرف محلے کے لڑکوں کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہے جن سے اس کی کچھ دوستی ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے واپس آ جاتا ہے۔

ایک دن شکیب باہر سے آیا تو ایک نئی بات تہمینہ سے کی۔

''ماں! ہم لوگ یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں..... کسی دوسرے ملک میں..... جہاں زندگی آسان ہو.....''

''مثلاً..... کس ملک میں بیٹا؟''

''یورپ..... امریکا، کینیڈا یا پھر اپنے پرانے دیش بنگال، مطلب بانگلہ دیش میں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ کہیں جانے کے لیے پاسپورٹ، ویزا اور ٹکٹ وغیرہ کے لیے بہت سے پیسے چاہیے ہوتے ہیں، کیا ہمارے پاس اتنے پیسے ہیں۔'' تہمینہ نے پریشانی سے کہا۔

''ہیں نہیں، ہو تو سکتے ہیں..... ماں ہمارا ہوٹل ہے ناں جب ہم یہاں سے جانے کا طے کر لیں گے تو آپ اسے بیچ دیجیے گا۔ اتنے پیسے تو مل ہی جائیں گے کہ ہم دونوں باہر کہیں جا سکیں.....'' اس نے پورے

اعتماد سے کہا تو تہمینہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کسی بھی طرح اس کا حوصلہ مجروح کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''ٹھیک ہے ناں.....! ہم یورپ بلکہ انگلینڈ چلتے ہیں.....آپ اور میں ان کی زبان بھی بول لیتے ہیں.....اس سے ہمیں آسانی رہے گی، ہے ناں ماں؟'' اس کے لہجے میں دبا، دبا سا جوش محسوس کر کے تہمینہ کو ایک گونا اطمینان سا ہوا کہ وہ ذہنی طور پر بہتر ہو رہا ہے۔ اس لیے اس نے اسے کسی بات کے لیے منع نہیں کیا.....بلکہ موجودہ حالات جو روز بروز بگڑتے جا رہے تھے اور جو صورتِ حال ان کو درپیش تھی..... اس میں کسی وقت بھی ممکن تھا کہ شکیب کے ساتھ دوبارہ وہی سب کچھ ہو جائے.....جس کے ہونے کے تصور سے ہی وہ ہولا جاتی تھی..... اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو دونوں ماں بیٹوں کی زندگی کا اختتام ہو جائے گا..... اسی سوچ نے تہمینہ کو مجبور کیا کہ وہ شکیب کو وہ سب کچھ کرنے کی اجازت دے دے۔ جو وہ پلان کر رہا ہے۔

شکیب اکثر ناشتا کر کے گھر سے نکل جاتا.....اس نے لندن جانے کی ٹھان لی تھی.....ان دنوں وہاں جانا اتنا کچھ مشکل بھی نہیں تھا۔ وہ اس بارے میں معلومات جمع کر رہا تھا.....اور تھوڑی، تھوڑی کر کے وہ تہمینہ کو بھی آگاہ کرتا رہتا تھا۔ وہ خوش تھا تو تہمینہ بھی خوش تھی۔

''بس ماں! اب میں اپنا اور تمہارا پاسپورٹ بنواتا ہوں.....تم ہوٹل بیچنے کی تیاری کرو.....جیسے ہی پاسپورٹ پر ویزا لگے گا۔ ہم دونوں ٹکٹ خریدیں گے اور پھُرررر سے اڑ جائیں گے.....اور پھر کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آئیں گے..... ہیں ناں ماں؟'' اس نے خوش ہو کر ماں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا تو اس کے انداز دیکھ کر وہ بھی بھرپور طریقے سے مسکرائی اور اثبات میں سر ہلایا۔ اور پھر سوچوں میں کھو گئی.....شکیب اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر اس کا سوچ و فکر میں گھرا چہرے کا تاثر دیکھتا رہا..... جہاں کہیں، کہیں دکھ کی پرچھائیاں بھی محسوس ہو رہی تھیں۔

''کیا بات ہے ماں.....؟ تم پریشان ہو؟ دکھی ہو؟'' اس نے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اداسی سے مسکرائی۔

''نہیں بیٹا! میں سوچ رہی تھی کہ کچھ لوگ ہوتے ہیں، جن کے مقدر میں ہجرت لکھ دی جاتی ہے۔ تمام عمر وہ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری جگہ ہجرت کرتے رہتے ہیں۔ مہاجر ہونا ان کی شناخت اور ان کا نصیب بن جاتا ہے۔ دوسری، تیسری نسل بھی گزر جائے۔ تب بھی وہ مہاجر ہی رہتے ہیں، کسی جگہ کی مٹی میں ان کی جڑیں نہیں اترتیں..... ہر جگہ ان کے لیے زمین سخت اور پتھریلی ہو جاتی ہے۔ حالات کی کروٹ کا ایک دھکا اور بادِ مخالف کا ایک جھونکا انہیں جڑوں سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور وہ اپنے بسے بسائے گھر چھوڑ کر ہوا کے دوش پر سوار..... پھر نئی جائے پناہ کی تلاش میں، نئی ہجرت کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں اب ہمیں ہی دیکھ

رئیل اسٹیٹ ایڈوائزر
DHA. KARACHI
DHA. City Karachi
BAHRIA TOWN KARACHI
میں خرید و فروخت کے لیے مستند نام
ریاض حسین
ایڈریس: راحت کمرشل لین 2
DHA PHASE 6 KARACHI
فون نمبر: 0300-3658964

لو..... تمہاری دوسری اور میری چوتھی ہجرت ہے..... اتنی بڑی دنیا میں کوئی خطۂ زمین ایسا نہیں ہے۔ جہاں ہم اور ہماری نسلیں مستقل طور پر آباد ہو جائیں..... اور ہماری شناخت تبدیل ہو جائے..... ہماری اگلی نسلیں مٹی کے فرزند کہلانے کے حقدار قرار پائیں۔'' تہمینہ کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''ماں.....! کیوں اداس ہوتی ہو..... یہ بھی تو دیکھو ناں کہ ہمارے جیسے ہجرت پر ہجرت کرنے والوں کے لیے ساری دنیا اپنا وطن بن جاتی ہے۔ جہاں جائیں..... اپنی دنیا بنالیں..... اور لوگوں کا کیا ہے، تم خود ہی تو کہتی ہو کہ جسے اپنا بنالو..... وہ اپنا بن جاتا ہے..... پریشان نہ ہو..... اللہ نے شاید اسی میں ہماری بہتری رکھی ہو.....'' شکیب نے بڑے پیار سے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ مسکرائی اور جھک کر بیٹے کی پیشانی چوم لی۔

شکیب کئی دن ان کوششوں میں لگا رہا۔ ہر روز صبح نکل جاتا اور دن ڈھلے اس کی واپسی ہوتی..... نہ جانے کیا، کیا کر رہا تھا..... اس کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب اپنے کاموں کے سلسلے میں کچھ مایوسی کا شکار ہو رہا ہے۔ حالانکہ ابتدا میں وہ بڑے جوش و خروش سے اپنی مصروفیات میں لگا ہوا تھا..... اب وہ جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا..... یہاں تک کہ ایک دن وہ واپس آیا تو بالکل ہی ٹوٹا ہوا اور شکست خوردہ سا محسوس ہوا۔ تہمینہ کچھ پریشان ہوئی۔

''کیا بات ہے شکی.....! طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہے..... اتنے خاموش کیوں ہو؟ آتے ہی منہ لپیٹ کر پڑ گئے۔ کیا بات ہے؟'' تہمینہ نے گھبرا کر پوچھ ہی لیا۔

''ماں! مجھے لگتا ہے کہ میں وہ انسان ہوں..... جو مقدر کی سختیاں سہنے کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے..... میرے آگے بڑھنے کے ہر راستے پر مشکلات کی ایک چٹان میرے سامنے آجاتی ہے۔ جسے عبور کرنا ممکن ہی نہیں رہتا..... میں کیا کروں.....؟'' شکیب کا لہجہ شکستہ تھا۔

''کیا ہوا بیٹا؟ ایسا کیا ہو گیا ہے جو اتنے پریشان ہو رہے ہو؟''

''ماں.....! ایک ہفتہ پہلے میں پاسپورٹ آفس گیا تھا۔ اپنا اور تمہارا پاسپورٹ بنوانے کے لیے..... انہوں نے شناختی کارڈ مانگا۔ میں نے بتا دیا کہ وہ تو نہیں ہے تو انہوں نے کہا۔ پہلے شناختی کارڈ بنواؤ..... پھر پاسپورٹ بنے گا۔ اگلے دن شناختی کارڈ کے دفتر گیا تو انہوں نے کہا کہ تم بانگلہ دیش سے غیر قانونی طور پر یہاں آئے ہو..... وہاں کچھ ایجنٹ گھومتے پھر رہے تھے، میں نے ان سے مدد مانگی تو انہوں نے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آج کل سختی بہت ہو رہی ہے۔ ب فارم کے بغیر اب کسی کا شناختی کارڈ نہیں بنے گا۔ میں جتنی ممکن تھیں کوششیں کرتا رہا..... لیکن کہیں سے کوئی امید نہیں حاصل ہوئی۔ تم بتاؤ ماں.....! اب میں کیا کروں.....؟ میرے تو سارے ارادے مٹی میں مل گئے..... بس اب تو یہیں رہ کر مجھے اپنی موت کا انتظار کرنا ہے..... کہ کب وہ آئیں مجھے گھسیٹ کر، اس جہنم سے گزار کر موت کے گڑھے میں پھینک دیں..... کیونکہ شاید یہی میرا مقدر ہے۔'' بولتے، بولتے اس کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہو گیا تو تہمینہ کا دل جیسے کٹ سا گیا۔ اس نے اس کی پیشانی سے بال ہٹائے اور جھک کر پیار کیا۔

''اتنی جلدی مایوس ہو گئے..... میرے بیٹے ہو کر اس طرح مایوس ہونا تمہیں جچتا نہیں بیٹا..... ایک در بند ہو جائے بلکہ سارے در بند ہو جائیں تب بھی قدرت ایک دروازہ کھلا رکھتی ہے۔ نہ فکر کرو..... نہ مایوس ہو..... اس کھلے دروازے کو تلاش کرو..... ان شاء اللہ راستہ مل جائے گا۔''

ماں کی بات سن کر شکیب نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو تہمینہ نے مسکرا کر اسے تسلی دی..... وہ بھی کچھ اطمینان حاصل کر کے مسکرایا۔

اس دن شام سے گئے ہوئے شکیب کو رات ہو گئی۔ اب تک واپسی نہیں ہوئی تھی۔ تہمینہ نے کچھ پریشان ہو کر شبن میاں سے پوچھا۔

''یہ آج کل کہاں ہوتا ہے شبن میاں! ذرا دیکھیے

کتنی رات ہوگئی ہے اب تک نہیں آیا۔ کہاں جاتا ہے؟ کن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، کچھ پتا ہی نہیں ہے مجھے، پوچھتی ہوں تو ٹال دیتا ہے، آپ کو کچھ معلوم ہے۔ کہاں ہوگا یہ اس وقت؟''

''معلوم ہے بیٹا.....! وہ ہاشو میاں کے اڈے پر ہوتا ہے..... وہاں فالتو قسم کے لڑکے آتے ہیں..... چائے سگریٹ چلتے رہتے ہیں۔ کہیں پر کیرم بورڈ پر کھیل ہو رہا ہوتا ہے..... تو کہیں تاش کی بازیاں لگی ہوتی ہیں، یہ بھی کبھی کیرم کھیل رہا ہوتا ہے کبھی تاش..... سگریٹ پیتے ہم نے دیکھا نہیں اسے..... ہاں چائے پیتا رہتا ہے.....'' شبن میاں کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

''ہائے میرے اللہ.....! یہ لڑکا کن راستوں پر چل پڑا ہے۔ آپ نے روکا نہیں اسے۔ منع نہیں کیا اسے ہاشو میاں جیسے غنڈے کے اڈے پر جانے سے.....'' تہمینہ پریشان ہوگئی۔

''پریشان نہ ہو بیٹا.....! ہم نے پوچھا تھا اس سے..... اس نے بڑا معقول جواب دیا کہ آپ فکر نہ کریں شبن میاں..... میں یہاں صرف تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنا ذہن بٹانے کی کوشش کرتا ہوں..... آپ کی اور ماں کی تربیت مجھے کبھی اخلاقی بگاڑ کی طرف جانے نہیں دے گی۔ اس لیے پریشان نہ ہوں..... میں نہ کوئی نشہ کرتا ہوں اور نہ ہی کسی اور اخلاقی بے راہ روی کی طرف مائل ہوں..... اور نہ ہی ایسا کبھی ہوگا..... ان شاء اللہ۔'' وہ سرد آہ بھر کر بولے۔

''بس بیٹا.....! تھوڑے دن ہم نے بھی چھپ کر خاموشی سے اسے دیکھا۔ وہ ایسا ہی ہے جیسا کہتا ہے اس لیے فکر نہ کرو.....'' شبن میاں نے اسے تسلی دی اور سونے چلے گئے۔

بارہ بجے کے بعد اس کی آمد ہوئی تو تہمینہ صحن میں ہی پلنگ پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''ارے ماں! آپ سوئی کیوں نہیں اب تک..... بہت رات ہوگئی ہے..... کیا بات ہے؟'' اس نے ماں سے پوچھا۔

''شکی! میں تمہاری طرف سے بہت پریشان ہوں..... یہ تم نے کیا طریقہ اختیار کرلیا ہے۔ نہ جانے کہاں، کہاں بھٹکتے پھرتے ہو..... اتنی رات کو واپس آتے ہو..... پریشانی ہو تو نیند کہاں آتی ہے۔''

''ارے ماں.....! تمہیں بالکل پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں کہیں بھٹکتا نہیں ہوں..... ہاشو میاں کے کلب میں ہوتا ہوں..... وہاں بہت سے لڑکے ہوتے ہیں، انہی کے ساتھ گپ شپ کرتا ہوں، کھیلتا ہوں، چائے وائے پیتا ہوں اور پھر واپس آجاتا ہوں.....''

''ہاشو میاں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں..... سارے برے دھندے کرتا ہے، غنڈا ہے، دادا گیر ہے علاقے کا..... اس نے نیا یہ جو اڈا بنایا ہوا ہے، یہاں کوئی اچھا کام تو نہیں ہوتا ہوگا..... یقیناً وہ سارے لڑکے جو وہاں بیٹھتے ہوں گے۔ اب تک ہر قسم کی برائیوں میں گلے، گلے تک غرق ہو چکے ہوں گے، تم کہاں تک پہنچے ہو.....؟'' تہمینہ نے ایسا سوال کیا کہ شکیب ہنس کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''ماں.....! تمہیں کیا اپنی تربیت پر یقین نہیں ہے؟ یقیناً وہاں برائیاں بھی ہیں..... نشہ بھی ہوتا ہے، جوا بھی ہوتا ہے اور بھی شاید کچھ ہوتا ہو..... لیکن تمہاری قسم ماں..... تم نے بچپن سے مجھے برائیوں سے نفرت کرنا اس طرح سکھایا ہے کہ میرا مزاج ہی نہیں ہے کہ میں کسی اخلاقی گھٹیا پن میں شامل ہوں۔ تم یقین رکھو ماں.....! میں نے کسی اخلاقی برائی کو نہیں اپنایا۔ بالکل بھی نہیں.....''

''مجھے تم پر بھروسا ہے میری جان! لیکن ماحول اور پھر اس طرح کے لوگ ورغلا کر..... ہاتھ پکڑ کر زبردستی گھسیٹ لیتے ہیں اپنی طرف..... آدمی مجبور ہو جاتا ہے، تم بھی ہو سکتے ہو.....''

''اونہہ ہوں..... بالکل نہیں..... کبھی نہیں..... میرا یقین رکھیں، بھروسا کریں.....''

''وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن کیوں جاتے ہو وہاں..... لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے وہاں جانے والوں کو..... پھر کیوں جاؤ تم.....؟''

''ہاں! یہ سوال ہے ملین ڈالر کا..... ماں! جتنی

میری زندگی گزری ہے اس میں یہ سبق سیکھا ہے میں نے..... کہ ہمارے جیسے کمزور اور بے آسرا لوگ زمین پر قدم جما کر کھڑے نہیں ہو سکتے..... جب تک کہ ہمیں کوئی مضبوط سہارا میسر نہ ہو..... یہ مضبوط سہارے دولت، اختیار اور طاقت کے ہیں..... اور ہم خیر سے ان تینوں سے محروم ہیں..... اس دن جب انہوں نے ہماری پوری بستی کا محاصرہ کر کے بلا تخصیص مجرم و معصوم سب لڑکوں کو گھروں میں گھس کر پکڑا تھا۔ اس رات بھی کچھ لڑکے تھے جو پکڑے نہیں گئے تھے، میں بعد میں جب ان سے ملا اور پوچھا کہ وہ کیسے بچ گئے؟ تو انہوں نے بتایا کہ انہیں کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ انہیں ہاشو میاں کا تحفظ حاصل تھا۔ ہاشو میاں اس علاقے میں طاقت کی علامت ہے ماں! جو لڑکے اس کے سائے میں ہوتے ہیں، انہیں پکڑنے یا پکڑوانے کی کسی میں ہمت نہیں ہے۔ وہ انہیں پورا تحفظ دیتا ہے..... اور اس کے بدلے میں وہ اس کے لیے کام کرتے ہیں۔"

"کیسے کام.....؟" تہمینہ نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کام..... کیسے کام.....؟" شکیب نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بس ایسے ہی کام ہوتے ہیں تمہیں تو پتا ہے ناں....." اس نے تفصیل بتائی۔ "یہی سب کام ہوتے ہیں وہاں....."

"شاباش میرے بچے.....! ایسے سارے کام کرنے والے اور کروانے والے تمہارے نزدیک اس قابل ہیں کہ ان سے تم دوستیاں کرو..... ان کے ساتھ وقت گزارو.....؟ اور ایک دن تم بھی انہی راستوں کے مسافر بن جاؤ..... کیا یہی تمہارا مستقبل ہے؟"

"نہیں ماں..... میرا مقصد ذرا دوسرا ہے، تم جانتی ہوں ناں میں اس ملک میں رہنا ہی نہیں چاہتا۔ میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں لیکن..... یہاں کے سسٹم نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں، شناختی کارڈ اور پاسپورٹ میرا نہیں بن سکتا..... اور اس کے بغیر میں جا نہیں سکتا۔ میں نے ہاشو میاں سے بات کی تھی..... سب کچھ بتایا اسے جو کچھ مجھ پر گزری..... اور جو کچھ گزرنے کا خوف ہے مجھے تو اس نے مجھے بہت تسلی دی اور کہا کہ اگر میں پہلے سے تمہیں جانتا ہوتا تو وہ سب کچھ بالکل نہ ہوتا جو تمہارے ساتھ ہوا..... کیونکہ میرے بھی کچھ لڑکوں کو اٹھا لیا تھا انہوں نے..... پر میں انہیں ٹرک سے اتار لایا تھا۔ خود انہوں نے حوالے کیا انہیں..... وہ سب بیس، بیس ہزار کے عوض اس تشدد سے بچ گئے۔ جو میں نے سہا....." وہ حیرت زدہ سی ماں کو سب بتا رہا تھا۔

"خیر..... جو گزر گیا..... اسے لوٹایا نہیں جا سکتا..... اب صورتِ حال یہ ہے کہ..... اس نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ بغیر پاسپورٹ بغیر ویزے کے مجھے یورپ بھجوا سکتا ہے۔ طریقہ قانونی نہیں ہے لیکن بے شمار لوگ مجبور ہو کر اس طریقے سے باہر جا رہے ہیں..... وہ اب تک..... بے شمار لوگوں کو بھجوا چکا ہے، مسئلہ پیسوں کا ہے، وہ پچاس ہزار لیتا ہے لیکن مجھے اس نے خاص رعایت دی ہے، چالیس پر راضی ہے وہ۔ ماں! سفر پانی میں ہوگا..... پہلے چھوٹی لانچوں میں..... پھر بڑی کشتیوں یا چھوٹے جہازوں میں..... لیکن گارنٹی ہے کہ یورپ پہنچ جاؤں گا۔ ماں! میں اکیلا چلا جاؤں..... وہاں کہیں پہنچ کر ٹھکانا..... کر لوں پھر تمہیں بلا لوں گا..... کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم سفر کی سختیاں برداشت نہیں کر پاؤ گی..... اس لیے مجھے اکیلا جانے دو ناں....." اس نے تہمینہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس طرح ٹھنک کر ضد کی جیسے کوئی ٹافی مانگ رہا ہو۔ تہمینہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا..... وہ اٹھ کر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی نظروں میں سوال بڑھتے ہی گئے..... وہ آتے جاتے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا اور وہ نظریں چرا جاتی۔ لیکن کب تک.....

"ماں! ہاشو میاں کا ایک گروپ اگلے مہینے میں نکل رہا ہے، وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں جانا چاہتا ہوں اس گروپ میں..... یا ابھی نہیں، میں جانا چاہتا ہوں ماں؟ آپ اجازت بھی دو..... اور ہوٹل بیچ کر پیسے بھی دے دو..... میں وہاں جا کر کچھ نہ کچھ کام کروں گا اور تمہیں پیسے بھیجوں گا دوبارہ خرید لینا یہ ہوٹل، یہ میرا وعدہ ہے کہ ہوٹل خریدنے کے لیے پیسے

میں ضرور بھیجوں گا..... اور پھر جیسے ہی مجھے وہاں سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا... مل جائے..... تو تم بھی آجانا ماں.....! ہم وہاں ساتھ، ساتھ رہیں گے۔ سکون اور اطمینان سے..... کوئی ڈر، خوف نہیں ہوگا، ٹھیک ہے ناں ماں.....؟'' اس نے امید بھری نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تو وہ سر ہلانے کے سوا کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ اب شکیب یہاں کسی قیمت پر نہیں رکے گا۔ اس نے ہر حال میں جانے کی ٹھان لی ہے۔ حالانکہ وہ کسی صورت اپنے بیٹے سے جدا ہونا برداشت کرنے کی اہل نہیں تھی۔ لیکن اگر اسے روکتی بھی تو کس برتے پر..... یہاں تو اس کی زندگی جوہڑ کے گندے پانی کی طرح ٹھہر چکی تھی۔

شناختی کارڈ بننا ممکن نہ تھا..... اور اس کے بغیر وہ آگے پڑھ سکتا تھا، نہ مقابلے کا امتحان دے سکتا تھا اور نہ ہی اسے کوئی باعزت نوکری مل سکتی تھی۔ وہ یہاں محض ایک پناہ گزین تھا..... یہاں کا شہری تسلیم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آئندہ کی ساری زندگی وہ ایک مشکوک دہشت گرد کے طور پر رہے اور زندگی کی سزا کاٹنے کے لیے چھوٹے موٹے یا غیر قانونی کام کرتا رہے۔ یا پھر باہر کہیں اور قسمت آزمائی کے لیے چلا جائے..... یہ سب سوچ کر وہ اپنے دل پر پتھر رکھنے پر مجبور ہوگئی۔

''شبین میاں.....! ہوٹل بیچنے کے لیے بات کیجیے کسی سے..... شکیب کو پیسے چاہئیں باہر جانے کے لیے۔ چالیس ہزار تو اسے دینے ہیں باقی کچھ اور ہاتھ خرچ کے لیے کم از کم پچاس ہزار تو ہونے چاہئیں..... دکھائیں دو چار لوگوں کو..... اور ہوٹل پر بورڈ لگوا دیجیے برائے فروخت کا۔''

''بٹیا! مستفیض کہہ رہا تھا کہ بیس ہزار وہ دے دے گا۔ بیس ہزار ہم کردیں گے، باقی آپ اگر بندوبست کرلیں تو اس کا خرچ نکل آئے گا، ہوٹل بک گیا تو ہم سب بڑی مشکل میں آجائیں گے اور اگر ہوٹل ہاتھ میں ہی رہا تو جلد ہی ہم یہ پیسے کمالیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' تہمینہ نے سر ہلا کر منظوری دے دی اور یوں شکیب انامدار، ایک بڑے باپ کا بیٹا، رخصت ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

سامان زیادہ نہیں لے جانا تھا۔ یہ ہاشومیاں کی ہدایات تھیں۔ ''صرف ایک بیگ، وہ بھی جو اپنی پیٹھ پر لاد سکو اور آسانی سے اسے لے کر دوڑ بھی سکو..... کیا معلوم کہاں، کیا حالات درپیش ہوں..... زیادہ سامان ہوا تو دوڑ بھاگ مشکل ہوگی۔'' ہاشومیاں نے سارے لڑکوں کو بتا دیا تھا کہ ''یورپ تک کا سارا سفر غیر قانونی ہے لیکن ایک بار وہاں پہنچ کر وہاں کی زمین پر قدم رکھ دیا تو سارے مسئلے حل ہوجائیں گے۔ وہاں پہنچ کر اگر تم نے کہا کہ تمہارے ملک میں..... تمہیں وہاں کے لوگوں سے جان کا خطرہ تھا۔ تم جان بچا کر وہاں سے بھاگے ہو تو تمہیں فوراً پناہ مل جائے گی۔ شروع کے کچھ دن تمہیں گزر بسر کے لیے مالی امداد اور قیام طعام بھی ملے گا۔ اس کے بعد کوئی نوکری بھی مل جائے گی۔ بس پریشان مت ہونا..... اور ہمت مت ہارنا۔ زندگی ہمت والوں کی ہی بدلتی ہے۔''

سورج ڈھل رہا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور وہ جانے کے لیے تیار کھڑا تھا..... نیلی جینز اور چیک شرٹ پہنے..... وہ نظر لگ جانے کی حد تک پیارا لگ رہا تھا۔ اب یا تو تہمینہ کی نظر تھی یا شاید سچ مچ ایسا ہی تھا۔ لیکن ایک بات کا یقین تہمینہ کو تھا کہ آج وہ اسے آخری بار دیکھ رہی ہے، اب شاید وہ اسے کبھی نہیں دیکھ پائے گی۔

اسے خدشات تو تھے لیکن اپنی ذات کے حوالے سے اسے معلوم تھا کہ اس کا دل بے ایمان ہو رہا ہے، کسی بھی وقت دغا دے سکتا ہے۔ لیکن شکیب کے بارے میں خوش گمانی رکھتی تھی کہ شاید وہاں جا کر اس کی زندگی کچھ بہتر ہوجائے۔ آج دونوں ماں بیٹوں نے دوپہر بھر جی بھر کر پرانی باتیں کیں..... ساری گزری باتوں اور یادوں کو دُہرایا۔ اس دوران وہ ہنسے بھی، روئے بھی، غصہ بھی آیا اور پھر اپنے حال پر آگئے اور حال یہ تھا کہ وہ رخصت کے لیے تیار کھڑا تھا۔ تہمینہ نے اسے گلے لگا کر بہت سے آنسو بہا کر بہت پیار کر کے رخصت کیا سونا بھی آنسو بہا رہی تھی۔ مستفیض اور شبین

میاں تو اسے چھوڑنے اس کے ساتھ کیماڑی تک جارہے تھے۔ جہاں سے رات کو ایک لانچ کے ذریعے اس کی روانگی تھی۔ ہاشو میاں نے ان سب کو بہت تسلیاں دی تھیں کہ وہ فکر نہ کریں..... اس کے لوگ بہت سے لوگوں کو پہنچا چکے ہیں..... تھوڑے دن زیادہ لگیں گے لیکن وہ بھی خیریت سے پہنچ جائے گا۔

ہاشو میاں کے دو آدمیوں نے مستفیض اور شبن میاں کو باہر سے ہی رخصت کر دیا..... انہیں لڑکوں کو لے کر کافی دور جانا تھا اور وہ وہاں تک جا نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ وہ دونوں شکیب سے گلے مل کر..... اسے دعائیں دے کر، ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتے ہوئے واپس آگئے تھے۔

صحن میں چار پائیاں بچھی تھیں..... آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ تہمینہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز چاند کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی کہانیاں اور کتنے لوگ وابستہ تھے اس چاند سے..... اس کی گزری زندگی کے بہت اہم لمحے اس چاند سے وابستہ تھے۔ آج وہ سب اسے یاد آرہے تھے۔

اشہد یار خان نے جب گلاب کے وہ گجرے اس کے ہاتھوں میں پہناتے ہوئے پیار کی پہلی سرگوشی کی تھی..... اسد بھائی کی شادی میں یاسمن ہار اور گجروں کی ڈالیاں صحن میں بچھے تخت پر چھوڑ گئی تھی..... اور وہ وہاں کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا پہنے تو ایسے میں وہ ملکوتی وجود اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا..... اشہد یار خان..... اور اس نے گلاب کے دو گجرے اٹھا کر اسے دیے اور سرگوشی کی۔ ''آپ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں اور گلاب کے گجرے آپ پر بہت سجیں گے۔'' وہ بھی ایسے ہی پورے چاند کی بھرپور چاندنی والی رات تھی۔ جب اس سرگوشی نے اس کے دل کے اندر کی دنیا کو جگمگا دیا تھا۔

پھر اسے وہ چاندنی رات یاد آئی..... جب ایک بڑی ناؤ پر وہ ایسے ہی خوب صورت چاندنی کے فسوں میں کھوئی ہوئی تھی اور اس کے حسن نے اسے مبہوت کر رکھا تھا تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا کہ.....

''اُف! اس قدر حسن..... کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں.....'' اور ایسے میں ہی آواز آئی تھی کہ.....

''اونہہ ہوں مجھے دیکھو.....! میں اتنے عرصے سے تمہیں دیکھ رہا ہوں، اب تک پاگل نہیں ہوا۔ تو تم کیسے ہو سکتی ہو.....'' اسے حبیب کے وہ ملتے ہوئے جذبے اور ان کی شدتیں یاد آئیں تو اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''یا اللہ.....! اچھی شکل دی تھی تو نصیب بھی اچھے دیے ہوتے.....'' گزرتی یادوں کی دھول اس کی آنکھوں میں پڑی تو آنسو برس پڑے۔ ''جن لوگوں سے میرا محبت کا رشتہ جڑا..... انہیں موت کو گلے لگانا پڑا..... میرے خدا.....! میرے شکیب کو زندہ سلامت رکھنا۔ اس پر اپنا کرم کرنا میرے مولا.....!'' وہ آنکھیں بند کر کے دعاؤں میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

وہ تقریباً بیس لڑکے تھے جنہیں لانچ والوں نے ویران ساحل کے اندھیرے حصوں سے اٹھایا تھا۔ چھ لڑکے تو ہاشو میاں کے حوالے سے شکیب کے ساتھ ہی آئے تھے۔ باقی الگ، الگ جگہوں سے اٹھائے گئے تھے۔ لانچ کا عملہ خوفناک شکلوں والے چار ارکان پر مشتمل تھا۔ سیاہ فام، گھونگریالے بالوں والے..... وہ لمبے تڑنگے لوگ..... ہتھیار بند بھی تھے۔ ایک آدمی لانچ چلا رہا تھا اور تین ہاتھوں میں گنیں لیے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ چند لڑکے آپس میں باتیں کرنے لگے تو ان میں سے ایک نے انتہائی درشتگی سے انہیں خاموش رہنے کا حکم دیا۔

''باپ کا شادی میں آیا اے.....؟ چپ کر کے بیٹھو نی.....'' اس نے اس قدر غصے سے کہا کہ وہ سب سہم کر خاموش ہو گئے۔ شکیب خاموش بیٹھا انہیں دیکھ کر سوچتا رہا کہ ''ابتدا اگر ایسی ہے تو آگے نہ جانے اور کن، کن لوگوں سے واسطہ پڑنے والا ہے۔'' وہ کچھ فکر مند سا نظر آنے لگا۔

لانچ کئی گھنٹے اندھیروں میں سفر کرتی رہی۔ کبھی تیز رفتاری سے اور کبھی انجن بند کر دیا جاتا اور وہ خاموشی سے آگے بڑھتی رہتی۔ پھر شاید کسی محفوظ جگہ پہنچ کر دوبارہ انجن چلا دیا جاتا تھا۔ اس طرح سفر کرتی ہوئی وہ آخر کار

چھوٹے اسٹیمر سے جا لگی۔ جو شاید گہرے سمندروں میں مچھلیاں پکڑنے والا ٹرالر تھا۔ لانچ سے کسی نے نیلے رنگ کی ٹارچ تین بار جلا بجھا کر غالباً کوئی خفیہ سگنل دیا تھا۔ کیونکہ کچھ ہی دیر میں ٹرالر کے اوپر سے رسی کی سیڑھیاں نیچے لٹکائی گئیں اور لانچ والوں نے شور مچادیا۔ ''جلدی کرو..... سیڑھیوں سے اوپر چڑھو..... جلدی اوئے جلدی کرو..... میری ٹائم والے آگئے تو تمہارے ساتھ ہم بھی پھنس جائیں گے۔'' وہ غصے میں ہدایات دیتے، گالیوں پر اتر آئے..... وہ جلد سے جلد انہیں ٹرالر پر بھیجنا چاہ رہے تھے۔ اس جلدی کی گھبراہٹ میں وہ سب پریشانی میں اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک لڑکا توازن کھو کر سمندر میں گرا..... اس کی تیز چیخوں نے فضا کو لرزا دیا..... مگر نہ تو ان میں سے کسی نے اسے بچانے کی کوشش کی اور نہ ہی لڑکوں پر چیخنا چلانا بند کیا۔

''وہ ڈوب رہا ہے..... اسے بچاؤ تو سہی..... مرجائے گا وہ.....'' ایک لڑکا چلایا تو لانچ والوں نے اسے گندی، گندی گالیاں دے کر کہا کہ اگر وہ اسے بچانا چاہتا ہے تو وہ اسے بھی سمندر میں پھینک دیتے ہیں وہ جا کر بچالے اسے..... ان کے پاس ٹائم نہیں ہے۔ بیس میں سے انیس لڑکے ٹرالر کے عرشے پر پہنچ گئے۔ تو رسی کی سیڑھیاں اٹھالی گئیں..... اور انہیں ہانک کر سیڑھیوں سے نیچے لے جایا گیا۔ پورے ٹرالر پر سڑی ہوئی مچھلیوں کی ناقابلِ برداشت بو پھیلی ہوئی تھی۔ شکیب سمیت بہت سے لڑکوں کو ابکائیاں آنے لگیں۔ شکیب نے جیب سے تولیا رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا۔ جو ماں نے وقتِ رخصت اسے دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس میں اس نے حسن کا عطر لگا دیا ہے جو اس کا پسندیدہ ہے اور جب بھی وہ اس رومال کو سونگھے گا اسے ماں کی خوشبو آئے گی۔ ''سچ ہے ماں..... تم ہی میرے ساتھ ہو.....'' اس نے رومال سے آنے والی خوشبو سونگھتے ہوئے ماں کو یاد کیا۔

ان سب کو دو کیبنوں میں جگہ دی دی گئی۔ جہاں اوپر تلے لکڑی کے تین، تین بیڈ بنے ہوئے تھے..... وہ سب لڑکے وہاں اپنی، اپنی سہولت کے حساب سے ٹھہر گئے..... کچھ دیر کے بعد ان کے لیے ابلے ہوئے چاولوں کا ایک، ایک پیالہ اور پانی کی ایک، ایک بوتل دی گی۔ اور ان سب کو اپنے، اپنے کیبن تک محدود رہنے کی سخت ہدایات تھیں۔ کیونکہ اب وہ پاکستانی ساحلوں سے ہٹ کر بین الاقوامی سمندر میں آگئے تھے۔ اور بقول ٹرالر والوں کے یہاں خطرات زیادہ ہیں۔

ٹرالر کبھی چل پڑتا تھا اور کبھی، کبھی گھنٹوں کے لیے کہیں کھڑا ہو جاتا۔ غالباً سمندر میں پڑے جال سمیٹنے کے لیے..... اور مچھلیوں کو پروسس کر کے ڈیپ فریزر میں ڈالنے کے لیے پھر آگے بڑھ جاتا۔

وہ اپنے کیبنوں سے بس ایک چھوٹی سی شیشہ لگی کھڑکی سے باہر دیکھ سکتے تھے..... اور وہاں سے جب بھی باہر دیکھتے ہر طرف سمندر کے نیلے پانیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا..... ان سب نے تھک کر اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ اس ٹرالر میں نہ جانے کتنے عرصے محبوس رہے۔ بیس دن کے بعد تو ان سب نے دن گننا بھی چھوڑ دیے تھے۔

عملے کے لوگوں میں کچھ چپٹے سے ناک نقشے والے لوگ تھے۔ غالباً مشرقِ بعید سے تعلق رکھنے والے، بہت سخت گیر اور سرد مہر..... کبھی، کبھی وہ ان میں سے کچھ لڑکوں کو عرشے کی صفائی ستھرائی کے لیے بھی لے جاتے تھے۔ پھر واپس کیبن میں.....

ایک دن رات کو ان کے کیبن کے دروازے زور، زور سے دھڑ دھڑائے گئے وہ اپنی زبان میں چلا، چلا کر کچھ کہہ بھی رہے تھے۔ الفاظ تو سمجھ میں نہیں آرہے تھے لیکن ان کے اشاروں سے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ ان سب کو جلد سے جلد باہر آنے کو کہہ رہے تھے۔ وہ سب باہر آئے تو وہ انہیں لے کر سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔ وہ انجن روم سے گزرتے ہوئے اور نیچے پہنچے تو وہاں منوں نمک کی بوریاں اور مچھلیوں کا ایک ڈھیر برف کے ساتھ دبا پڑا تھا۔ ان میں سے ایک برف کے اس چھوٹے، چھوٹے ٹکڑوں پر سے گزرا تو وہ اس کے بوٹوں کے نیچے چر، چر کر کے چر چرائی۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ایک بیلچے سے برف ہٹانا شروع کی اور اس کونے کو صاف کر

کے نیچے جھک کر کچھ اٹھایا تو فرش کا ایک مستطیل ٹکڑا اٹھتا چلا گیا۔ ان لڑکوں کو لانے والے دوسرے آدمی نے انہیں دھکے دے کر اس طرف بھیجا..... وہاں نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں..... وہ ان سیڑھیوں پر سے نیچے اتارے جانے لگے۔ نیچے اندھیرا، نمی اور خنکی تھی۔ یہ غالباً اس ٹرالر کا کوئی خفیہ حصہ تھا..... وہ تمام لڑکے اس تنگ جگہ میں ٹھونس کر اوپر کا دروازہ عجلت میں بند کر دیا گیا۔ پھر انہوں نے اس پر برف ڈالنے کی آوازیں بھی سنیں.....

''یا اللہ! یہ جیتے جی کس طرح قبر میں اتار دیا گیا ہمیں؟ اتنا گھپ اندھیرا اور گھٹن کہ سانس رک رہی ہے، اور پھر یہ سردی.....'' کسی لڑکے نے کربناک انداز میں تبصرہ کیا تو باقی کسی نے کچھ نہیں کہا..... وہ سب اپنے، اپنے طور پر اپنے شکستہ اعصاب کو قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

نہ جانے کب تک اس طرح اندھیری قبر میں وہ دفن رہے پھر چھت کے نزدیک ایک روزن سے امید کی طرح روشنی کی ایک کرن پھوٹی شاید صبح ہوگئی تھی اور سورج ابھر آیا تھا۔ اس لیے اس کی روشنی اس باریک سے سوراخ کے ذریعے ایک چمکدار لمبی شعاع کی شکل میں اس اندھیرے میں داخل ہو کر اس کوٹھری کو روشن کر رہی تھی۔

ان سب نے اس معمولی سی روشنی میں اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ بہ مشکل دس بائی دس کا ایک ڈبا نما حصہ تھا جس میں وہ سب ایک دوسرے سے چپکے ہوئے بیٹھے تھے۔ اب تک خنکی شدید سردی میں بدل چکی تھی اور ان سب پر کپکپی طاری تھی۔ اور اسی روشنی کی کرن نے انہیں بتایا کہ کونے میں دو تین میلے بوسیدہ سے اونی کمبل پڑے ہوئے ہیں، وہ ان کی طرف لپکے..... اور ایک کمبل میں جتنے لوگ سما سکتے تھے انہوں نے لپیٹ لیے..... ان کمبلوں سے ناقابلِ برداشت بدبو اٹھ رہی تھی۔ عام حالات میں وہ شاید ان کے نزدیک جانا بھی پسند نہیں کرتے لیکن اس وقت شدت کی سردی میں وہ واحد بچاؤ تھے اس لیے بادلِ ناخواستہ وہ سارے انہیں لپیٹ کر بیٹھ گئے۔ سردی سے کپکپاتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ کب انہیں اس عقوبت خانے سے باہر نکالا جائے۔ سورج کی وہ مہربان کرن جو اس قبر نما کوٹھڑی کے اندھیروں سے لڑ رہی تھی جلد ہی معدوم ہوگئی اور وہ دوبارہ پھر اندھیروں میں ڈوب کر بے شناخت ہوگئے۔ اب پھر انہیں صرف انتظار تھا۔ جانے کتنے گھنٹے یا دن گزر گئے وہ بھوکے پیاسے، نڈھال گردن ڈالے ہوئے پڑے ہوئے تھے کہ چونکے اور ان میں زندگی پھر سے ہچکیاں لیتی ہوئی بیدار ہونے لگی۔

اوپر کا دروازہ کھلنے کی آوازوں نے وہاں چھایا ہوا موت کا سناٹا توڑا تھا۔ پھر دروازہ کھلا اور کسی نے چلاتی ہوئی آواز میں ٹارچ سے اشارہ کرتے ہوئے انہیں اوپر آنے کو کہا..... انہوں نے اپنی سن ہو جانے والی ٹانگوں کو بہ مشکل حرکت دی۔ اٹھ کر ایک دوسرے کا سہارا لیتے ہوئے وہ آہستہ، آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آئے تو ہر ایک نے وہاں رک کر لمبی، لمبی سانس لی..... بے شک وہاں مچھلی کی سڑاند تھی..... لیکن کچھ نہ کچھ آکسیجن بھی تھی..... ان کے دم میں دم آیا تو وہ آگے بڑھے۔ انہیں پھر دوبارہ انہی کیبنوں میں بھیج دیا گیا۔ جہاں انہیں وہی پیالہ بھرا ابلے چاول اور پانی کی ایک، ایک بوتل دی گئی۔ پر اس دفعہ بڑی نوازش کے طور پر چاولوں پر ابلی ہوئی مچھلی کا بڑا سا قتلہ بھی رکھا ملا تھا۔ بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ میری ٹائم والے اس طرح کے ٹرالر پر بھی چھاپے مارتے رہتے ہیں کہ وہ کسی غیر قانونی کارروائی میں تو ملوث نہیں ہیں منشیات اور ہتھیاروں کی اسمگلنگ کے علاوہ انسانی اسمگلنگ کا کاروبار بھی عروج پر تھا اور اکثر اس طرح کے ٹرالرز اس کام میں ملوث تھے..... اس لیے ان پر چھاپے بھی پڑتے رہتے تھے۔

نہ جانے کتنے بے گنتی، بے شمار دن گزر گئے تھے کہ ایک اندھیری رات میں پھر اسی طرح ہلچل مچی۔ ان سب کو ان کے کیبنوں سے نکالا گیا اور حکم ہوا کہ سامان سمیت آؤ..... عرشے پر لائے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ موٹے رسوں کی سیڑھیاں نیچے کی طرف لٹکی ہوئی ہیں اور نیچے ہوا بھری ایک بڑی سی ربڑ کی کشتی پانی میں ہچکولے لے رہی ہے..... وہ سب سنبھل، سنبھل کر

اترتے ہوئے کشتی میں جا بیٹھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ربڑ کی کشتی نامعلوم منزلوں کی طرف روانہ ہوگئی۔

ابھی ان کے سفر کو شاید ایک ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا ہوگا کہ کشتی کے عملے میں ایک بار پھر ہلچل سی مچی..... کشتی والوں نے سب کو نیچے فرش پر لیٹ جانے کا حکم دیا اور کشتی کی رفتار بڑھ گئی۔ وہ بہت تیزی سے اندھا دھند کہیں دوڑتی ہوئی جارہی تھی۔ آسمان کی سیاہی کچھ کم ہونا شروع ہوئی اور دور افق پر روشنی کی ایک باریک سی پٹی نمودار ہو کر غائب ہوگئی۔

اچانک کسی بحری جہاز پر لگا ہوٹر بڑی بھیانک آواز میں چلایا۔ کشتی کے عملے کی بوکھلاہٹ اور بڑھ گئی۔ کشتی کی رفتار اور بڑھ گئی تھی۔ وہ سب دم سادھے کشتی کے فرش پر پڑے اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کررہے تھے۔ تیز رفتاری کے سبب سمندر کا پانی چھینٹوں کی شکل میں اندر آکر ان سب کو بھگو رہا تھا۔ تیسری بار تنبیہہ کے طور پر ہوٹر کی آواز پھر آئی۔ لیکن کشتی کی رفتار میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی ہاں اب سیدھی جانے کے بجائے زگ زیگ کے انداز میں دوڑتی جارہی تھی۔

پھر سمندر کی خاموش فضا تڑ، تڑ کی ہولناک آواز سے گونجی اور کئی گولیاں آکر کشتی کو لگیں۔ ربڑ کی دیواروں کو پھاڑ کر وہ اندر فرش پر لیٹے کئی مسافروں کی زندگی کو چاٹ گئیں..... عملے کے دو ارکان بھی پہلے ہی حملے میں خون کے فوارے اگلتے جسموں کے ساتھ اندر کی طرف گر گئے تھے۔ لیکن کشتی کو چلانے والا ابھی زندہ تھا اور کشتی اسی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

وہ کوسٹ گارڈ والوں کی اسٹیئرنمالانچ تھی۔ جنہوں نے اس نارنجی رنگ کی بڑی ساری ربڑ بوٹ کو اپنے علاقے میں غیر قانونی طور پر سفر کرتے ہوئے رکنے کی ہدایت کی تھی..... اور تین بار تنبیہہ کے بعد انہوں نے فائر کھول دیا تھا..... وہ شاید آگے جا کر اسے پکڑ بھی لیتے لیکن وہ تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی کسی دوسرے ملک کے سمندروں کی بحری حد کراس کر گئی تھی۔ اس لیے انہیں واپس ہونا پڑا اور وہ بوٹ کئی لاشوں کو لے کر آگے چلی گئی..... اس کے کئی مسافر اپنی آخری ہجرت کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ شکیب بے حس و حرکت ان بے جان اور نیم جان جسموں کے درمیان پڑا تھا۔ بوٹ کی رفتار دھیمی ہو رہی تھی اور وہ بے سمت چلتی ہوئی سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ رات کی سیاہی آنے والے دن کی روشنی سے شکست کھا کر رخصت ہو رہی تھی۔ عین اس کی آنکھوں کے سامنے آسمان پر ایک ہی ستارہ روشن رہ گیا تھا صبح کا ستارہ.....

انجن کی آواز معدوم ہوگئی۔ شاید ڈیزل ختم ہونے کے سبب وہ بند ہوگیا تھا۔ اور ہلکی روشنی میں شکیب کی نظر انجن کے سامنے سیٹ پر پڑے جسم پر پڑی تو اس کی غیر فطری حالت نے بتادیا کہ وہ بھی گولیوں کا شکار ہو کر جان ہار چکا ہے..... اور بوٹ میں جگہ، جگہ گولیوں سے ہو جانے والے سوراخوں سے پانی بوٹ کے اندر بھر رہا تھا۔

کب تک..... آخر کب تک یہ شکستہ سفینہ پانی کی سطح پر ڈولے گا۔ پانی بھرا تو آخر کار یہ اپنے مردہ اور نیم مردہ مسافروں سمیت پانی کی گہرائیوں میں اتر جائے گا۔

اسے بے پناہ نقاہت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر گولیوں کے زخم تھے اور ان زخموں سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تیزی سے نہ صرف توانائی بلکہ شاید اپنے حواس بھی کھو رہا تھا۔ بڑھتی روشنی میں آس پاس کے خدوخال کچھ نظر آنا شروع ہوئے تو اس نے دیکھا کہ کشتی کی نارنجی دیواروں کے درمیان اس کے فرش پر بیس بائیس لوگ اپنے ہی خون کے تالاب میں پڑے ہوئے ہیں۔ جن میں کوئی حرکت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اوپر گہرا نیلا آسمان تا حدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ بس..... اور کوئی نظارہ کوئی منظر نہیں تھا۔ ہلکی، ہلکی ہوا سے ڈولتی کشتی کی حرکت اسے محسوس بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی جسمانی توانائیاں غالباً اپنی آخری حدوں تک پہنچ رہی تھیں۔ کیونکہ نیلا آسمان اب اپنی جگہ سے کبھی، کبھی ڈولتا نظر آرہا تھا اسے۔ آنکھیں وہ زبردستی کھولنے کی کوشش کررہا تھا جاتے، جاتے وہ اس دنیا کو آخری لمحے تک دیکھنا چاہتا تھا۔ حیرت تھی کہ اس کی ذہنی توانائیاں اب تک سلامت تھیں۔ اور اس وقت وہ سب کچھ سوچ سکتا تھا جو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

اس کا ذہن دنیا کے اس کونے پر پہنچا جہاں ایک چھوٹی سی بے خانماں بستی میں اس کا نشیمن تھا..... وہاں کے سارے کرداروں میں اسے ایک خوب صورت کمزور جسم والی ململ کی ساڑی میں لپٹی عورت یاد آئی۔ جسے وہ ماں کہہ کر پکارتا تھا۔ اسے یاد کر کے اس کے ہونٹ کھنچے جسے شاید مسکراہٹ کا شائبہ قرار دیا جا سکے۔

"دیکھو ماں..... ! تمہارا بیٹا آخری ہجرت کی طرف جا رہا ہے، تم کہتی تھیں ناں انسان اس دنیا میں ہی مہاجر ہے، اسے ایک مخصوص وقت یہاں کے کوچوں میں گزار کر ہجرتوں کے دکھ اٹھا کر الگ، الگ خطوں میں دھکے کھا کر آخر کار ایک آخری ہجرت پر جانا ہی ہے۔ اس آخری ہجرت کے بعد ہی اس کے قدموں کو مستقل زمین ملے گی۔ وہ جنت کی ہوگی یا دوزخ کی..... یہ اس کے عمل پر ہے..... تو بس..... ! تمہارا بیٹا اب اس آخری ہجرت کے سفر پر ہے..... اب تم سے ملاقات اگلی دنیا میں ہی ہوگی..... ہم وہاں ملیں گے ناں ماں.....؟" اس کا سن ہوتا ہوا ذہن انہی سوچوں میں ڈوبتا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک ایک پرندے کی قیں، قیں کی آواز نے اسے ایک جھٹکے سے بیدار کر دیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سفید پروں اور سیاہ چونچوں والا وہ بحری پرندہ اوپر پرواز کر رہا تھا۔ پرندہ..... جو موت کی اس آبی وادی میں زندگی کا استعارہ تھا۔ کہیں آس پاس ہی تھی زندگی..... اور زندگی کی طلب اچانک اس کے اندر اس قدر طاقت سے بیدار ہوئی کہ وہ اپنی ناتوانی سے لڑتا ہوا لمبی، لمبی سانسیں لے کر اپنے آپ کو سنبھال کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا..... بار، بار کشتی کی دیوار کو پکڑ کر اپنے بوجھل سر اور جسم کو اٹھاتا پھر گر جاتا..... پھر اٹھتا پھر گر جاتا..... پھر آخر کار وہ اپنی جان توڑ کوششوں کے بعد اٹھ کر کشتی کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

اسے ملگجی روشنی میں بہت دور افق کے پاس سبز رنگ کی ایک لکیر سی نظر آئی۔ وہیں آسمان پر کچھ اور پرندے بھی اڑتے نظر آئے۔ زمین..... ساحل..... زندگی..... اس کو خوشی کے ایک بے پایاں احساس نے نئی توانائی فراہم کی..... وہ مسکرایا۔ خوشی کے ایک بحرِ بے کراں میں غوطہ لگا کر وہ ابھرا..... تو اسے ذہنی حقائق کا ادراک ہوا۔

ساحل بہت دور تھا۔ کشتی آدھی سے زیادہ پانی میں ڈوب چکی تھی اور اس میں مسلسل بھرنے والا پانی کتنی دیر میں اسے مکمل طور پر ڈبو دے گا، وہ نہیں جانتا تھا۔ اٹھ کر بیٹھنے کی جدوجہد میں اس کے زخموں کے منہ دوبارہ کھل گئے تھے اور وہاں سے خون کا بہاؤ دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔ اور اس بہاؤ میں اس کی زندگی بہہ رہی تھی۔ وہ کتنی دیر اور زندہ رہ سکے گا۔ اسے نہیں معلوم تھا۔

ساحل سے اتنی دور اس کی کشتی کو دیکھا جا سکے گا؟ کوئی اس کی مدد کو آ سکے گا؟ یہ بھی پتا نہیں تھا..... کیا وہ کنارے پر پہنچ کر ڈوب جانے والا ہے؟ اس تکلیف دہ خیال کی شدت سے گھبرا کر اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔ نہ جانے کب تک اس طرح بیٹھا، بیٹھا موت کے نزدیک کھسک رہا تھا کہ ایک آواز نے اس کے حواس میں بیداری پیدا کی۔

پھر کوئی پرندہ اس کے سر پر آ کر چلایا تھا۔ غالباً کشتی پر موجود خون کی بُو ان کو متوجہ کر رہی تھی..... اس نے بے پناہ ناتوانی کے زیرِ اثر بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ سامنے ستارۂ سحری چمک رہا تھا..... دور سے ایک چھوٹی سی سفید کشتی اسے اپنی طرف آتی محسوس ہوئی۔ کیونکہ اب اسے انجن کی ہلکی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

پرندہ..... کشتی اور صبح امید کا ستارۂ سحری..... اس کے لیے زندگی کے استعارے تھے..... لیکن اسے زندگی ملے گی یا نہیں..... وہ نہیں جانتا تھا اس نے بجھتی، بند ہوتی آنکھوں کو زبردستی کھول کر پوری طاقت استعمال کر کے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر اس دنیا کو پتا نہیں خوش آمدید کہا تھا یا خدا حافظ..... پھر اس کا ہاتھ بھی گر گیا اور آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔

دور نظر آنے والی سفید چھوٹی بوٹ چلانے والے نے اس ڈوبتی کشتی پر کسی کو ہاتھ ہلاتے دیکھا اور کشتی کی رفتار بڑھا دی۔

(ختم شد)

ہکے لے پائی لک کے دکھ

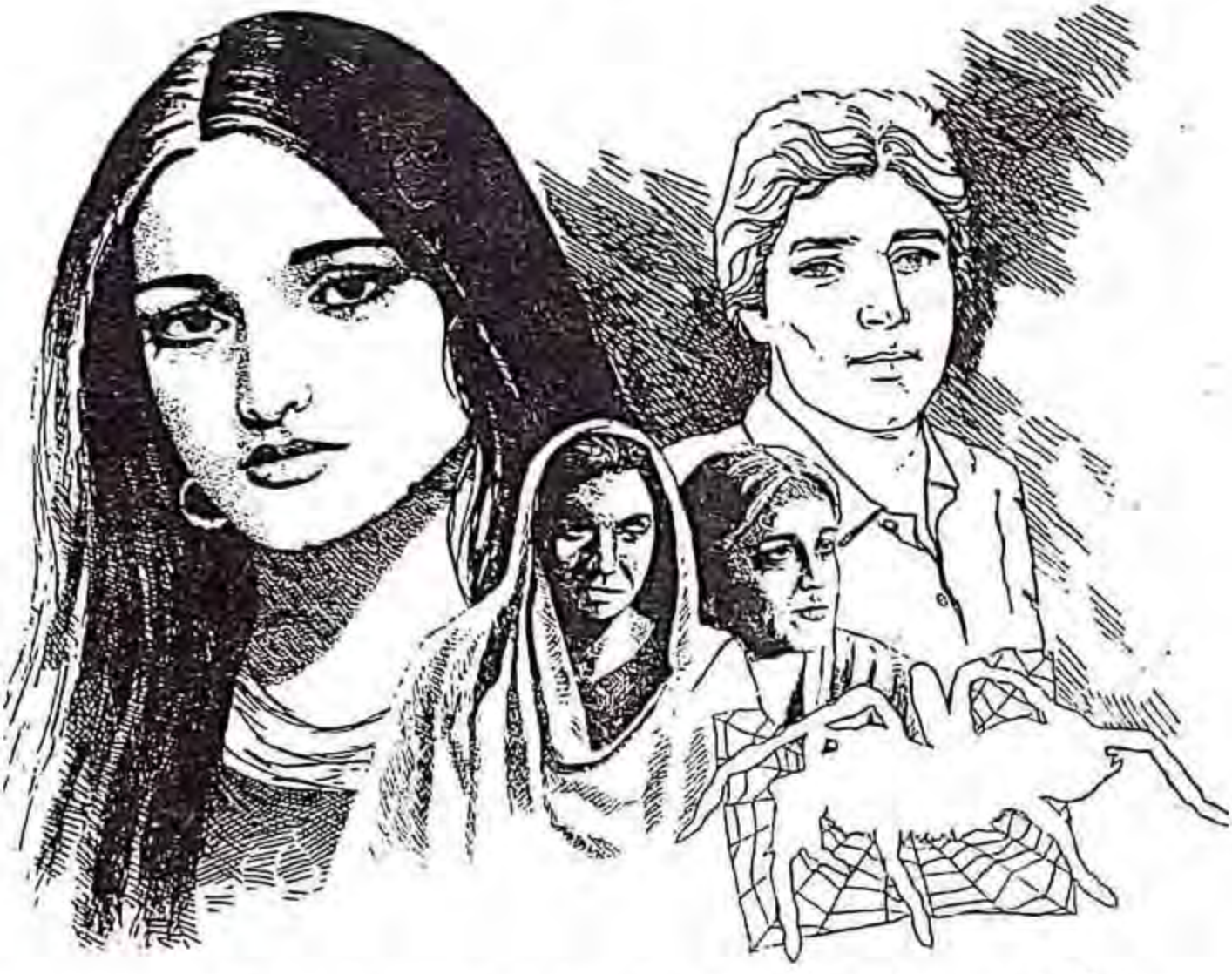

نگہت اعظمی

''تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ کم از کم مجھ سے تو ذکر کرتیں... حیرت ہے تم نے مجھے بھنک بھی نہ لگنے دی۔ بھلا بچیوں کے رشتے بھی کوئی اس طرح خاموشی سے طے کر دیتا ہے۔'' رضیہ بیگم اپنی خالہ زاد بہن صفیہ کے گھر اپنی بیٹی ایشل کی بات طے ہونے کی مٹھائی دینے آئی تھیں اور جب صفیہ کو ایشل کے رشتے کا پتا چلا تو وہ جیسے شدید صدمے اور رنج کی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

''صفیہ تمہیں اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے۔ ایشل ماشاء اللہ سے بائیس سال کی ہو گئی ہے چھ ماہ بعد اس کا ماسٹرز مکمل ہو جائے گا۔ یہی تو لڑکیوں کی شادی کی عمر ہوتی ہے۔'' رضیہ بیگم اُن کی صدمے کی کیفیت کو حیرانی سمجھ کر ان کی حیرت پر حیران ہو رہی تھیں۔

''اب تم سے کیا کہوں......؟ اور اب کہنے کا فائدہ بھی کیا......؟'' صفیہ کچھ کہتے، کہتے رک گئیں۔

''جو تمہارے دل میں ہے ضرور کہو، میں برا نہیں مانوں گی۔'' رضیہ بیگم کے اندر بھی وہی تجسس بیدار ہو گیا

تھا جو انسانی فطرت کا لازمی جز ہے۔

''اصل میں مجھے ایشل بہت پسند تھی..... میں نے تو کئی دفعہ تم سے اشاروں، اشاروں میں ذکر بھی کیا تھا.....'' صفیہ نے دکھ سے بوجھل لہجے میں اپنا جملہ پورا کیا۔

''تو تم نے کھل کر کیوں نہیں کہا۔ مجھے علم غیب تھوڑی تھا۔ اور نہ ہی میں اشاروں کی زبان سمجھتی ہوں..... اگر تم مجھ سے ذکر کرتیں تو بھلا میں شاہ ویز کے رشتے سے انکار کر دیتی.....'' صفیہ کا دکھ مکمل طور پر رضیہ بیگم میں منتقل ہو چکا تھا۔ ان کی کیفیت صحرا میں... سرگرداں اس پیاسے مسافر کی سی تھی۔ جسے کسی نے ٹھنڈا میٹھا پانی دکھا کر اس کے سامنے سے ہٹا دیا ہو۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو رکھا ورنہ ان کا دل چاہ رہا تھا وہ وہیں پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگیں۔

''ساری غلطی میری ہی ہے، واقعی مجھے تم سے کھل کر بات کر لینی چاہیے تھی۔ تمہیں یاد ہوگا میں نے صغرا خالہ کے چہلم میں تم سے پوچھا بھی تھا کہ ایشل کی بات تو کہیں طے نہیں ہوئی تو تم نے کہا تھا۔'' ابھی تو ایشل پڑھ رہی ہے اس کے باپ اس کی تعلیم مکمل ہونے سے پہلے اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے، بس یہ سوچ کر میں نے رشتے کا ذکر نہیں کیا اور میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر اس کا کہیں سے رشتہ آیا تو پہلے تم مجھ سے ضرور ذکر کرو گی..... میرا تو ارادہ تھا کہ ایشل کا فائنل ہو جائے تو مٹھائی لے کر تمہارے گھر آؤں گی۔'' صفیہ ساری تفصیل بتاتے، بتاتے روہانسی ہو گئیں۔

''بس سب نصیب کی باتیں ہیں، ہم تم کیا کر سکتے ہیں.....'' انہوں نے اپنے اندر پیدا ہونے والے طوفان کو روک کر بظاہر بہت دھیمے لہجے میں یہ جملہ کہا۔

''خیر اللہ مبارک کرے، کون لوگ ہیں لڑکا کیا کرتا ہے؟'' صفیہ نے رضیہ بیگم کے لہجے کا ملال محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''تمہارے بہنوئی کے دوست کا بیٹا ہے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کیا ہے۔ ٹی وی کے ایک چینل میں پروڈیوسر ہے۔ لڑکے کے دو بڑے بھائی اور دو بہنیں ہیں..... دو بھائیوں اور ایک بہن کی شادی ہو چکی ہے، ایک چھوٹی غیر شادی شدہ بہن ہے، وہ ابھی پڑھ رہی ہے۔'' رضیہ بیگم نے بے دلی سے ساری تفصیل بتائی۔

''شادی شدہ بھائی ساتھ ہی رہتے ہیں؟'' اتنا سب کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی صفیہ کی تسلی نہیں ہوئی انہوں نے مزید سوال داغ دیا۔

''ہاں..... دونوں بھائی اپنی فیملیز کے ساتھ، ساتھ ہی رہتے ہیں، اچھا بڑا سا دو منزلہ گھر ہے، اوپر کے حصے میں دونوں بھائی اور نیچے والے پورشن میں یہ لڑکا اس کے ماں، باپ اور بہن رہتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے اچھی بڑی سسرال ہے۔'' صفیہ نے سادگی سے پوچھا تھا مگر رضیہ بیگم کو لگا وہ طنز کر رہی ہیں۔

''ہاں ماشاء اللہ سے مل جل کر رہنے والے لوگ ہیں، میں نے تو رشتہ پکا کرنے سے پہلے ایشل اور لڑکے کی بات چیت بھی کرا دی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو او کے کیا تب میں نے رشتے کی چھان بین کرا کے منظوری دی۔'' رضیہ بیگم نے صفیہ کے فطری تجسس کو طنز سمجھتے ہوئے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

''یہ تو تم نے بہت اچھا کیا..... میں بھی اس کی قائل ہوں جن کو ایک ساتھ زندگی گزارنی ہے وہ تو پہلے ایک دوسرے مل لیں۔ اسی لیے تو انتظار کر رہی تھی کہ شاہ ویز آ جائے تو پہلے اس کی ایشل سے ملاقات کرا دوں پھر رشتہ لے کر جاؤں..... اب اتفاق دیکھو وہ پچھلے ہفتے ہی آیا ہے اور میں ایک دو روز میں تمہارے گھر آنے والی تھی۔'' صفیہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک زبردست قسم کا کاری وار ان کے دل پر کیا جس کے اثر سے وہ بلبلا اٹھیں۔

''خیر اللہ جو کرتا ہے بہتر ہوتا ہے.....'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ان کے اندر جو بھونچال کی کیفیت تھی وہ وہی جانتی تھیں کہ انہوں نے اسے کس طرح اپنے اندر چھپایا ہوا تھا۔

وہ گھر جانے کے لیے اٹھنے لگیں تو صفیہ نے

اصرار کر کے انہیں کھانے پر روک لیا۔

''کھانا کھا کر جانا، میں نے کڑھی اور خشکہ بنایا ہے۔'' صفیہ کے اصرار پر رضیہ بیگم کو کھانے پر رکنا ہی پڑا۔ کھانے سے تھوڑی دیر پہلے شاہ ویز بھی آ گیا۔

شاہ ویز کو دیکھ کر ان کا دل بھی دہائیاں دینے لگا۔ اتنا خوبرو، مہذب اور قابل لڑکا ان کا داماد بنتے، بنتے رہ گیا۔

شاہ ویز نے ایم بی بی ایس میں پوزیشن لی تھی، وہ اسپتال میں جاب کے ساتھ، ساتھ ماسٹرز بھی کرتا رہا۔ پھر ایم ڈی کرنے کے بعد امریکا چلا گیا۔ جہاں وہ آج کل کارڈیالوجی میں اسپیشلائزیشن کر رہا تھا۔ سارا خاندان اس کی قابلیت اور اچھے اخلاق کے گن گاتا تھا۔ انہوں نے نہ جانے کتنی دفعہ اسے اپنے تصور میں ایشل کے ساتھ دیکھا تھا۔ ان کی کتنے برسوں کی چھپی ہوئی خواہش تھی لیکن انہوں نے کبھی کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا کہ انہیں اس کا تصور ہی نہیں تھا کہ صفیہ بھی ایسا سوچ سکتی ہیں، حالانکہ وہ اور صفیہ خالہ زاد بہنیں ہونے کے ساتھ، ساتھ بہت اچھی دوست بھی تھیں لیکن شادیوں کے بعد ان کے درمیان خاصے فاصلے پیدا ہو گئے تھے۔ صفیہ کی سسرال ان کی سسرال کے مقابلے میں خاصی مالدار تھی اور وہ لوگ پڑھے لکھے اور روشن خیال بھی تھے۔ جبکہ ان کی سسرال والے پیسے کے لحاظ سے بھی خاصے کمزور اور پرانی ڈگر پر چلنے والے لوگ تھے اسی وجہ سے انہیں اس بات کا شائبہ بھی نہیں تھا کہ صفیہ کا ایسا خیال ہو سکتا ہے اور اس وقت... شاہ ویز کو دیکھ کر ایسا دکھ ان کے اندر انگڑائیاں لے کر بیدار ہوا جس سے اس سے پہلے وہ آشنا نہیں تھیں۔

''میں تو چاہتی ہوں کہ اب یہ آیا ہے تو اس کا نکاح کر کے ہی بھیجوں، میں نے سوچ لیا ہے اب اس کے لیے لڑکیاں تلاش کرنا شروع کر دوں۔'' صفیہ کھانے کے دوران اپنی آئندہ مہم کی تفصیل بیان کر رہی تھیں اور کڑھی، چاول رضیہ بیگم کے حلق میں اٹک رہے تھے۔

☆☆☆

صفیہ کے گھر سے اپنے گھر تک آتے، آتے رضیہ بیگم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا وہ گھر میں داخل ہوئیں تو ان کا چہرہ اتنا دھواں، دھواں ہو چکا تھا کہ ان کے شوہر تنویر حسین پوچھے بغیر نہیں رہ سکے۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، صفیہ کے گھر میں تو سب خیریت ہے ناں.....؟''

''تنویر ہم سے بڑی غلطی ہو گئی ہم نے ایشل کا رشتہ کرنے میں جلد بازی کر دی۔'' وہ جو اتنی دیر سے ضبط کر رہی تھیں تنویر حسین کے پوچھتے ہی رہ نہ سکیں اور ان کے سامنے فوراً دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

''آپ کا بھی جواب نہیں ہے..... جب میں کہہ رہا تھا کہ جلدی نہ کریں اور اسے آرام سے ماسٹرز کرنے دیں تو آپ کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں ماسٹرز کے چکر میں اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نہ نکل جائے..... اور اب جب سب آپ کی مرضی کے مطابق ہو گیا تو آپ کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہو رہا ہے۔'' تنویر حسین نے جھنجلا کر اپنی بات پوری کی۔

''تو مجھے کیا پتا تھا صفیہ ہماری ایشل کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔'' ان کا لہجہ دکھ سے بوجھل تھا۔

''واقعی..... تو انہوں نے پہلے کیوں نہیں کہا.....؟''

''وہ شاہ ویز کا انتظار کر رہی تھیں، اب وہ آ گیا ہے تو وہ ایک دو روز میں اس کا رشتہ لے کر آنے والی تھیں۔''

''اوہ.....'' انہیں بھی افسوس ہوا۔ ''واقعی شاہ ویز بہترین لڑکا ہے۔'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

''لیکن اب کیا ہو سکتا ہے.....؟ خیر جو ہوا یقیناً اس میں خدا کی بہتری ہو گی..... آپ اتنا پریشان نہ ہوں.....'' انہوں نے جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال کر انہیں تسلی دی۔

''اس میں سارا قصور صفیہ کا ہے، اسے مجھ سے ذکر تو کرنا چاہیے تھا۔'' ان کا دل کسی طرح قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

''چھوڑیں اس قصے کو یہ سب نصیب کی باتیں ہیں، آپ خواہ مخواہ دل برا نہ کریں.....'' تنویر حسین نے

بیوی کی دلجوئی کی۔ ''اور ہاں اب ایشل کے سامنے اس بات کا ذکر نہ کیجیے گا۔''

''خیر اب میں اتنی بھی باؤلی نہیں ہوئی کہ اس کے سامنے ایسی بات کروں..... خدا میری بچی کا نصیب اچھا کرے، ویسے محسن میں کیا برائی ہے، ہزاروں سے اچھا ہے۔'' رضیہ بیگم نے اپنے آپ کو تسلی دی لیکن کیا دکھ دل کے کسی کونے میں سر پھوڑا کر بیٹھ گیا۔

کہاں محسن اور کہاں شاہ ویز.....

☆☆☆

موسم سرما کی غیر محسوس اداسی نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ خزاں کے موسم کی بے کیفی نے طبیعتوں کو بھی بے کیف کر دیا تھا۔ رضیہ بیگم کی طبیعت خراب ہوگئی اور اتنی خراب ہوئی کہ دو دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ صفیہ کو رضیہ بیگم کی بیماری کا پتا چلا تو وہ شاہ ویز کے ہمراہ انہیں دیکھنے اسپتال پہنچ گئیں۔ اس دن اتفاق سے ایشل کے سسرال والے بھی آئے ہوئے تھے۔ ایشل کی چھوٹی نند اسی اسپتال میں ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ وہ بھی وہیں موجود تھی، صفیہ اور شاہ ویز کو وہ نازک سی معصوم صورت لڑکی بہت پسند آئی انہوں نے وہیں اسپتال میں ایشل کی ساس سے اس کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیں۔ اور رضیہ بیگم کے اسپتال سے گھر آنے کے دوسرے دن ہی اسی سلسلے میں ان کے پاس پہنچ گئیں۔

''مجھے تو ایشل بہت پسند تھی۔ بس خدا نے شاہ ویز کے ساتھ اس کا جوڑا نہیں بنایا تھا..... خیر..... مجھے تو ایشل کی نند بہت پسند آئی ہے، شاہ ویز کو بھی وہ اچھی لگی..... میں چاہتی ہوں شاہ ویز کے جانے سے پہلے اس کا نکاح کر دوں.....'' صفیہ نے پھر ان کے زخموں کو ہرا کر دیا۔

''اتنی جلدی..... مجھے نہیں لگتا کہ ایشل کے سسرال والے اتنی جلدی مان جائیں گے۔''

''ابھی تو شاہ ویز کے جانے میں پندرہ دن ہیں، ہم کل ہی ان کے گھر رشتہ لے کر چلتے ہیں، ویسے تم تو ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہو..... لوگ تو اچھے ہی ہیں ناں..... ظاہر ہے اچھے ہیں جبھی تو تم نے اپنی بیٹی کا رشتہ کیا ہے.....'' وہ خود ہی سوال کر رہی تھیں اور خود ہی جواب دے رہی تھیں اور رضیہ بیگم کی یہ حالت تھی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں..... پہلے تو انہوں نے بیماری کا بہانہ بنا کر جان چھڑانا چاہی لیکن جب وہ جان کو آ گئیں تو بالآخر انہیں ان کے ساتھ جانے کی ہامی بھرنی پڑی۔

☆☆☆

ایشل کی سسرال والوں نے جب شاہ ویز کو دیکھا اور بعد میں جب اس سے بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ ان کی دور پرے کی رشتے داری بھی نکل آئی۔

پھر ایشل کی جیٹھانی کا کزن شاہ ویز کا بہت گہرا دوست نکل آیا جو امریکا میں شاہ ویز کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ سارے معاملات دنوں میں طے پا گئے اور شاہ ویز کے جانے سے پہلے اس کا نکاح ایشل کی نند مزنہ سے ہوگیا۔

☆☆☆

رضیہ بیگم کو ایشل کا شاہ ویز سے رشتہ نہ ہونے کا دکھ تو تھا ہی لیکن یہ دکھ اور سوا ہوگیا جب شاہ ویز کا نکاح مزنہ سے ہوا ان کے اندر گویا دکھ کے انگارے دہکنے لگے، جن کو بجھانے کے لیے انہیں صبر کی سلیں رکھنی پڑ رہی تھیں۔

نکاح میں شاہ ویز اور محسن ساتھ کھڑے تھے اور دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے رضیہ بیگم کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

محسن برا نہیں تھا۔ سانولا سا قبول صورت لڑکا تھا لیکن شاہ ویز کی خوب صورتی اور وجاہت کے سامنے اس کی شخصیت بالکل دب کر رہ گئی تھی۔

قدرت کا نظام انسانوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ جتنی وہ اداس تھیں ایشل اتنی ہی خوش تھی۔ اسے اپنی سسرال سے بہت پزیرائی مل رہی تھی۔ اس کی پوزیشن شادی سے پہلے ہی اپنی سسرال میں بہت مستحکم ہوگئی تھی اور انہیں ایشل کی خوشی پر حیرانی ہو رہی تھی۔ اسے ذرا بھی ملال نہیں تھا کہ اس کے منگیتر کے مقابلے میں اس کی نند کا شوہر کتنا وجیہہ اور پڑھا لکھا ہے۔

☆☆☆

ایشل کی شادی اور مزنہ کی رخصتی ساتھ، ساتھ ہی ہوئی۔ مزنہ شادی ہو کر امریکا چلی گئی اور ایشل کراچی میں رہ گئی۔ وہ اپنی بھری سسرال میں اتنی مصروف ہوئی کہ مہینہ بعد بھی میکے نہ آپاتی اور میکے آتی تو ایک رات بھی نہ رکتی۔ محسن کو پسند نہیں تھا کہ وہ رات کی اپنی امی کے گھر رکے پھر وہ جاب بھی کر رہی تھی۔ اس کے پاس فرصت بھی نہیں ہوتی جبکہ مزنہ سال میں ایک بار ضرور پاکستان کا چکر لگاتی اور پورا مہینہ میکے میں رہتی۔ وہ جب بھی پاکستان آتی اس کے ٹھاٹھ باٹ، شان و شوکت دیکھ کر ان کا پالا ہوا دکھ انگڑائیاں لے کر بیدار ہو جاتا۔ وہ اسے لاکھ جھڑکتی، تنبیہہ کرتیں، بہلاوے دیتیں لیکن وہ اپنی من مانی پر اتر آتا اور ان کو اذیت اور پچھتاووں کے کچوکے دیتا رہتا۔

''بس قسمت کی بات ہے، وہ شہزادیوں کی طرح رہتی ہے، اور ہماری بچی کی قسمت میں سسرال والوں کی خدمت کرنا رہ گیا ہے۔'' وہ ٹھنڈی آہیں بھرتیں۔

''تم خواہ مخواہ کیوں کڑھتی رہتی ہو..... ایشل اپنے گھر میں بہت خوش ہے، سسرال والے قدر کرتے ہیں اور ہمیں کیا چاہیے.....'' تنویر حسین ہمیشہ یہ کہہ کر ان کے زخمی دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتے لیکن وہ بھی کیا کرتیں؟ الفاظ کے مرہم سے اگر دل کے زخم بھرا کرتے تو دنیا میں شاید کوئی بھی دکھی نہ ہوتا۔

کچھ دکھ تو اللہ کی طرف سے انسان کا امتحان ہوتے ہیں اور کچھ دکھ انسان اپنے لیے خود پیدا کرتا ہے پھر ان کو پال پوس کر جوان کرتا ہے اور ساری زندگی اس کے ناز اٹھاتا رہتا ہے اور پھر وہ دکھ اتنے سرکش اور باغی ہو جاتے ہیں کہ لاکھ تنبیہہ اور سرزنش کے باوجود آپ کے اختیار میں نہیں رہتے۔

ایشل کی ماں کی زندگی میں کوئی دکھ نہیں تھا۔ دو بیٹے تھے، وہ اور ان کی بیویاں بے حد مہذب اور سعادت مند تھیں۔ پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں خدا نے ہر نعمت سے نوازا تھا۔ لیکن ہر نعمت کے حاصل ہونے کے باوجود یہ پالا ہوا دکھ انہیں مسلسل کچوکے دیتا رہتا۔

نظم

کیا خبر.....
پھر اس رات
ہم ہوں نہ ہوں
تو اے سالِ گزشتہ
کی اخیر شب
آنے والے دنوں سے
کچھ نہ کہنا بس چپ رہنا
کہ اس لڑکی کے ستارے تو
تمام عمر.....
گردش میں ہی رہے
یہ تو
گرتے پتوں سے بھی ڈر جاتی ہے

کاوش: جبینا، کراچی

☆☆☆

ایشل کے دیور کی شادی تھی۔ مزنہ، شاہ ویز اور دونوں بیٹیوں کے ہمراہ آئی ہوئی تھی۔ شادی کے سارے فنکشنز میں اسے وی آئی پی کا درجہ ملتا رہا۔ ہر جگہ مزنہ تھی۔ ہر کام اس کے مشورے سے ہو رہا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا کہ ایشل کی اہمیت مزنہ کے مقابلے میں دوسرے درجے کی شہری کی طرح ہے۔

پھر بھی انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے مزنہ کے چہرے پر وہ شادابی نہیں جو ایشل کے چہرے پر ہے۔ محسن شادی کے پانچ سال بعد بھی ایشل کا اس طرح خیال رکھتا جیسے وہ نئی نویلی دلہن ہو، شادی کے ابتدائی دنوں میں انہوں نے کھوجنے کی خاطر ایشل سے پوچھا تھا۔

''تم خوش ہو ناں..... محسن اچھا لڑکا ہے.....؟''

''ہاں امی، آپ فکر نہ کریں..... میں بہت خوش ہوں.....'' کھلکھلا کر ہنس دی۔'' اس کی خوشی اور مسرتوں کے رنگوں سے مزین ہنسی نے ان کے دل کو کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔

''شاہ ویز بھی بہت اچھا لڑکا ہے، تمہاری ساس کو تو بہت خوشی ہوگی کہ انہیں اتنا اچھا داماد مل گیا.....'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گئیں جو کہنا نہیں چاہتی تھیں۔

''بہت ہی زیادہ خوش ہیں، وہ تو کہتی ہیں میں نے تو خوابوں میں نہیں سوچا تھا کہ مجھے ایسا شہزادوں جیسا داماد مل جائے گا۔'' ایشل نے انتہائی سادگی اور صاف دلی سے ساس کے کہے ہوئے جملے دہرا دیے۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں.....'' ان کے دل کا اطمینان پھر سے رخصت ہوگیا۔

''مزنہ بھی خوش ہے ناں.....'' چند لمحوں کے وقفے کے بعد انہوں نے یہ سوال کیا۔ وہ نہ جانے کیا سننا چاہ رہی تھیں۔

''ہاں، ہاں بہت خوش ہے اور کیوں نہ خوش ہو.....شاہ ویز اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔''

''ویسے مزنہ کا شاہ ویز کے ساتھ جوڑ نہیں بنتا۔ پتا نہیں صفیہ کو اس میں کیا نظر آیا۔ دیکھا جائے تو مزنہ بالکل عام سی شکل کی ہے، بہت کہہ لو تو قبول صورت کہہ لو.....''

''امی آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں، مزنہ اتنی پیاری تو ہے سب سے بڑھ کر اس کی عادتیں اتنی اچھی ہیں کہ ہر ایک اس سے محبت کرتا ہے، اس کی سب سے بڑی کوالٹی یہ ہے کہ وہ دلوں کو مسخر کرنے کا گُر جانتی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے.....'' انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔

☆☆☆

''مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے مزنہ کچھ چپ چپ سی تھی۔''

دیور کی شادی اور مزنہ کے امریکا جانے کے بعد ایشل رہنے کے لیے آئی تو باتوں، باتوں میں انہوں نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

''نہیں امی، ایسی کوئی بات نہیں.....آپ کو خواہ مخواہ وہم ہوگیا ہے۔'' ایشل نے فوراً ماں کے خدشے کی تردید کردی۔

''پتا نہیں مجھے ایسا لگ رہا ہے اور مجھے تو شاہ ویز بھی بہت کمزور اور بجھا، بجھا سا نظر آرہا تھا۔''

''پتا نہیں آپ نے اپنی آنکھوں میں کون سا مائیکرو اسکوپ فٹ کرلیا ہے کہ آپ کو اچھے خاصے ہنستے مسکراتے لوگ بھی خاموش اور افسردہ نظر آنے لگے ہیں۔'' ایشل نے ہنستے ہوئے ان کی بات کی تردید کردی اور اس تردید نے ان کے اندر کی خوشی کو ماند کردیا۔

لیکن چند ہی دنوں بعد ان کی خواہش نے مجسم صورت اختیار کرلی اور سارے خاندان پر یہ خبر قیامت بن کر ٹوٹ پڑی کہ شاہ ویز کو کینسر ہوگیا۔

''اللہ رحم کرے ابھی تو بچے بہت چھوٹے ہیں اور بیچاری مزنہ.....کتنی کم عمر ہے.....'' وہ ایشل کی ساس سے ہمدردی کررہی تھیں یا ہمدردی کے پردے میں اپنی اندر کی بے قراری کو قرار میں بدل رہی تھیں۔

''آپ دعا کریں، اللہ بہتر کرے گا۔''

''ڈاکٹروں نے کچھ امید دلائی ہے؟''

''ڈاکٹروں سے کس بات کی امید، امید تو اللہ کی ذات سے ہے وہی زندگی دیتا ہے اور شفا بھی.....''

''بس بہن کیا کریں.....اس مرض کا نام ہی اتنا خوفناک ہے کہ انسان کی آدھی جان تو مرض کا نام سنتے ہی نکل جاتی ہے خیر گھبرانے کی بات نہیں وہاں تو علاج کی سہولتیں ہیں لیکن برین ٹیومر اور وہ بھی آخری اسٹیج پر.....میری تو راتوں کی نیندیں حرام ہوگئی ہیں، ہر وقت بچی کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہوں کہ خدا اس کے سہاگ کو سلامت رکھے۔''

''بس آپ کی دعاؤں کی ہی ضرورت ہے۔'' مزنہ کی ماں انتہائی صبر وضبط کے مرحلوں سے گزر رہی تھیں۔

☆☆☆

برین ٹیومر اور وہ بھی آخری اسٹیج.....کسی کو یقین نہیں تھا کہ وہ بچ سکتا ہے، وہ ہر فون یہی سوچ کر اٹھا رہی تھیں کہ شاید ایشل کے گھر سے کوئی روتے ہوئے انہیں یہ خبر سنائے مگر دن گزر گئے۔ صفیہ خالہ بھی امریکا چلی گئیں، شاہ ویز کا علاج ہو رہا تھا۔ اور خبریں مل رہی تھیں کہ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے، کبھی

سنتیں کہ سر کے سارے بال جھڑ گئے ہیں۔ کبھی سنتیں کہ اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ کبھی سنتیں رنگ بالکل سیاہ ہوگیا ہے، کبھی یہ خبر ملتی کہ مزنہ بہت پریشان ہے، سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے، ہنسنا بولنا ختم ہوگیا ہے؟ ہر وقت روتی رہتی ہے۔

☆☆☆

اب انہیں کوئی دکھ نہیں تھا، کوئی غم نہیں تھا کہ ان کا لے پالک دکھ کہیں سر نیہواڑے بیٹھا تھا۔ ان کی.... بے قراری کو قرار آگیا تھا۔ دل سے دکھ کا کانٹا نکل چکا تھا۔

☆☆☆

”امی اگلے مہینے مزنہ اور شاہ ویز پاکستان آرہے ہیں۔“ ایشل نے انہیں فون پر اطلاع دی تو موبائل ان کے ہاتھ سے گرتے، گرتے بچا۔

”تم نے تو بتایا تھا شاہ ویز کی حالت بہت خراب ہے، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔“

”ہاں امی ایسا ہی تھا لیکن آج کے دور میں بھی معجزے رونما ہوتے ہیں اور آج کے دور کا معجزہ سائنس کی ترقی ہے، کچھ مہینے تک تو یہی سننے میں آرہا تھا۔ لیکن پچھلی دفعہ جو آپریشن ہوا ہے اس کے نتائج کافی امید افزا ہیں، مزنہ بتارہی تھی اب شاہ ویز کی حالت کافی بہتر ہے۔“

”ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟“ ان کے اندر سر نیہواڑے لاڈلے لے پالک سپوت جیسے دکھ نے سر اٹھایا۔

”ایسا کیوں نہیں ہوسکتا۔ کیا دعاؤں میں طاقت نہیں ہے؟ کیا خدا دعائیں قبول نہیں کرتا......!“ ایشل کے لہجے میں تیزی آگئی تھی۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں، دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے...... میں تو خود دن رات اس کے لیے دعائیں مانگا کرتی ہوں......“ انہوں نے اپنے اندر کی خبیث سی خواہش کو الفاظ کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

انہوں نے راستے سے پھولوں کا بکے اور مٹھائی لی۔ وہ شاہ ویز کی صحت یابی کی مبارک باد دینے اس کے گھر جارہی تھیں۔ سارے راستے وہ اس کے اور مزنہ کے بارے میں سوچتی رہیں اور شکر کرتی رہیں کہ ایشل کی شادی شاہ ویز سے نہیں ہوئی۔ ورنہ آج ایشل پر بھی وہی گزر رہی ہوتی جو مزنہ پر گزر رہی ہے۔ شاہ ویز .... کتنا خوب صورت اور صحت مند تھا اور اب کتنا... بدصورت ہوگیا تھا۔ انہوں نے اس کی تصویریں واٹس ایپ پر دیکھی تھیں۔ ”سنا ہے یہ بیماری انسان کو اندر سے کھوکھلا کردیتی ہے۔ وہ بظاہر تو ٹھیک ہوجاتا ہے لیکن اس کے اندر سے زندگی کی امنگ ختم ہوجاتی ہے پھر ان دواؤں کے مضر اثرات ساری زندگی ساتھ، ساتھ چلتے رہتے ہیں۔“ وہ نہ جانے کیا، کیا سوچ کر ان کے گھر میں داخل ہوئیں۔ صفیہ خالہ ان کے گلے سے لگ کر اس طرح روئیں کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

”بس اللہ نے بڑا کرم کیا میرے بچے کو زندگی دے دی۔ تمہیں کیا بتاؤں میں نے کس طرح اپنے رب کے آگے جھولی پھیلائی تھی، کس طرح اس سے دعائیں مانگیں، بس میرے رب نے میری دعاؤں کی لاج رکھ لی...... میرے بچے کو واپس میرے پاس بھیج دیا۔“ صفیہ خالہ کے آنسو رک نہیں رہے تھے۔

”شاہ ویز اور مزنہ کہاں ہیں؟“

”یہیں مارکیٹ تک گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔“ اور چند لمحوں کے بعد وہ دونوں بچوں کے ہمراہ ہنستے مسکراتے گھر میں داخل ہوئے۔

”شاہ ویز...... مزنہ......“ وہ ان کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ اتنے دنوں سے ان کے ذہن نے جو مزنہ اور شاہ ویز کا خاکہ بنایا تھا اور جو انہوں نے ان دونوں کی تصویریں دیکھی تھیں وہ اس سے کہیں مختلف تھیں۔

شاہ ویز پہلے کی طرح خوب رو اور صحت مند تھا۔

اور مزنہ اسی طرح تروتازہ اور خوش تھی۔

ان کے دل کا قرار اور سکون رخصت ہوگیا تھا۔ اور لے پالک دکھ اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر دل کی مسند پر براجمان تھا اور ان کو دیکھ کر شیطانی انداز میں مسکرا رہا تھا۔

❀❀❀

سلسلے وار ناول

قسط 4

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت... اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حسین جذبے... کہیں یہ پھول برساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں... غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی سرہونِ منت ہے... لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے... اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل پزیر تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے
کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے
ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے
ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر
محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے
وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا
اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے

وہ جیکٹ کندھے پر ٹکا کر تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس کے انداز میں شدید عجلت تھی۔ موبائل جیب میں تھا۔ ائرفون کان سے لگا تھا..... وہ کسی سے جلدی، جلدی بات کر رہا تھا۔

''ہوں..... واٹ، شٹ اپ۔'' وہ غرایا۔ جیب سے موبائل نکالا، کال ڈراپ کی اور تیزی سے لاؤنج تک آیا..... سامنے شاید امی کھڑی تھیں..... وہ تیزی میں تھا دیکھ نہیں سکا..... معاً امی نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ شاید تین ماہ بعد اُن کے درمیان کوئی بات ہونے والی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے رک سا گیا۔

''تم نے ہمیشہ مجھے مایوس کیا۔'' امی نے عجیب انداز میں کہا تھا۔ اُن کے لہجے میں بہت روکھا پن تھا..... احتشام آگے نہیں بڑھ سکا۔

''میری بات کبھی نہیں مانی اور وہی کیا جو میرے خلاف جاتا ہو۔'' ان کی آواز سرد تھی، انتہائی برفیلی۔ وہ لمحوں میں ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔

''یہ آپ کی سوچ ہے جو میں بدلنے کی اتھارٹی نہیں رکھتا.....'' احتشام کی آواز بھی سرد تھی۔ وہ اسی سرد عورت کا بیٹا تھا، اسی جیسا برفیلا، برف کا گلیشئر۔

''میری بات سنو۔'' امی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو دبوچ لیا۔

''میں سن رہا ہوں، آپ بات جاری رکھیں۔'' اس نے اِک نظر موبائل پر ڈالی۔ اسکرین بلنک ہو رہی تھی۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ رک نہیں سکتا تھا پھر بھی رک گیا۔

''کیا اذان نے تم سے بات نہیں کی؟'' انہوں نے ذرا دبی آواز میں پوچھا۔

''بہتر تھا آپ اذان سے ہی اپنی خواہش پوری کروالیتیں، میں تو ہمیشہ آپ کو مایوس کرتا ہوں۔'' وہ تلخ ہوا..... وہ تلخ رہا کرتا تھا..... اس کی بنیاد میں ہی تلخیاں تھیں۔

''تم سے کیوں نہیں.....؟'' انہیں غصہ آ گیا۔

''کیونکہ مجھ میں آپ کی خواہش کا ''بار'' اٹھانے کی اہلیت نہیں.....'' وہ سخت کھردرے لہجے میں بولا تھا۔

موبائل کی روشن اسکرین کو دیکھ کر کچھ الرٹ ہوا..... ایک میسج ٹائپ کیا۔

''لیکن میں فیصلہ کر چکی ہوں۔'' امی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر ہی لیا..... وہ موبائل جیب میں رکھ کر ان کی طرف مڑا۔

''کیسا فیصلہ؟'' اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

''ماہم کا رشتہ مانگنے کا فیصلہ.....'' امی نے بڑے غیر مناسب وقت میں اس کے سر پر ضرب لگائی تھی۔ وہ ایڑھیوں کے بل گھوم گیا۔ آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔

''شوق سے مانگیے.....'' احتشام نے سنجیدگی سے کہا..... ماں کا بے تاثر چہرہ غور سے دیکھا اور بولا۔ ''میرے لیے نہیں بلکہ اذان کے لیے..... او کے اللہ حافظ!'' اس نے آگے بڑھ کر موبائل کان سے لگا لیا۔ ماتھے پر دو بل پڑے۔

''کیلگری ''اے''، یعنی بالکل سچ.....؟'' وہ چلتا ہوا لاؤنج کے دروازے تک پہنچا۔

''تم نے کوڈ بریک کیا؟'' وہ ہینڈل گھما کر باہر نکل آیا..... ''او دیٹس ویری گڈ..... واٹ.....؟ لائیو ڈراپ ہو گیا؟'' وہ چلتا رہا، آگے بڑھتا رہا..... پھر پورچ میں رکا۔ گاڑی نکالی اور برابر موجود عظیم الشان عمارت کو اِک نظر دیکھا..... خاصی قدیم اور پُراسرار عمارت تھی۔ سوچوں کے کئی بند کھولتی ہوئی..... وہ گہری نگاہ سے دیکھتا رہا۔

''پارسل..... ''موونگ ڈراپ'' کیا جائے گا..... یہیں کہیں.....؟'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے موبائل بند کیا..... گاڑی اسٹارٹ کی۔ گارڈ نے گیٹ کھول دیے تھے..... اسے کنٹرول آفس پہنچنا تھا..... اس سے پہلے احتشام نے اذان کو ایک ای میل کی تھی..... کچھ دیر بعد اذان کی کال آ گئی۔

''ٹارگٹ کوئی نقصان نہ کرے.....'' وہ متفکر تھا۔

''ممکن نہیں..... ٹارگٹ کے کچھ مشن ادھورے ہیں، پہلے ان کو مکمل کرے گا۔'' احتشام نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''اگر اس دوران نقصان ہوا تو؟'' اذان فکرمند تھا..... اور ایک ٹھیک نکتہ اٹھا رہا تھا۔
''نہیں ہوگا..... مطلب کسی پلاننگ کے تحت نہیں ہوگا، ٹارگٹ کی پلاننگ میں ایسی کوئی چال فی الوقت نہیں ہے..... بنا پلاننگ کچھ ہو سکتا ہے.....'' اس کا اندازہ سوچتا ہوا تھا۔
''اس کے لیے کیا لائحہ عمل ہے؟'' اذان کی آواز آئی۔
''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' وہ خود اسی نکتے پر غور کر رہا تھا۔
''جب بھی کوئی شخص ڈراپ وصول کرے گا..... تو کوئی ''سروسنگ سگنل'' چھوڑے گا، ہمیں اس نشان تک پہنچنا ہے.....'' اذان نے بڑی گہری بات کہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔
''اس شخص تک پہنچ جاؤں گا.....'' احتشام کا اعتماد کمال کا تھا، اذان الجھا۔
''پر کیسے.....؟''
''یہ میرا ہیڈک ہے.....'' اس نے آخری بات کے بعد لائن ڈراپ کر دی تھی۔ اس کے ماتھے پر اب بھی دو بل تھے..... وہ ہونٹ بھینچ کے بہت ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اور پردۂ اسکرین پر ایک چہرہ بہت روشن دکھائی دے رہا تھا۔ اتنا روشن کہ اس کا دل بند ہونے لگا۔

☆☆☆

اس نے مڑ کر دیکھا..... پیچھے کوئی نہیں تھا..... جانے اس کا وہم نہ ہو..... وہ آگے بڑھنے لگی۔ ڈھولک کی تھاپ اور تالیوں کی گونج بہت پیچھے رہ گئی تھی۔
کچھ اور آگے آئی تو نورس کی گاڑی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔
''نورس ابھی یہیں تھی؟'' وہ جیسے دھک سے رہ گئی..... پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھی..... چمکتی دمکتی گاڑی کے لاک کھلے تھے۔ چابی اگنیشن میں لگی تھی..... ڈرائیور کہیں نہیں تھا۔ عائم حیران رہ گئی..... پھر اس نے کچھ سوچ کر فرنٹ ڈور کھول لیا تھا..... اور بلا ارادہ ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سامنے ہی ایک چکنی سلپ رکھی تھی۔ عائم نے محتاط انداز میں اٹھالی۔ لکھا تھا۔
''عائم گاڑی چھوڑ کے جا رہی ہوں۔ بہت ضروری کام تھا، تمہیں بتا نہیں سکی تم گھر چلی جانا..... جامعہ کا ڈرائیور گاڑی لے آئے گا۔'' نورس کی خوب صورت رائٹنگ عائم پہچانتی تھی۔ نورس کی اس مہربانی نے عائم کا دل صاف کر دیا۔ ورنہ وہ اندر ہی اندر کبیدۂ خاطر ہو رہی تھی۔ زوبیہ آنٹی سے کہتی تو وہ اسے ضرور ڈراپ کر آتیں تاہم عائم کو احسان لینا گوارا نہیں تھا..... ویسے بھی ان کی بیٹی کا اہم فنکشن چل رہا تھا۔ اسے ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگا۔ اس نے اگنیشن میں چابی گھما کر گاڑی اسٹارٹ کی تو معاً کوئی فرنٹ ڈور کے شیشے پر جھک آیا۔ پھر دو انگلیوں سے شیشہ بجایا۔ عائم خوفزدہ ہو گئی..... پھر غور کیا تو پتا چلا..... باہر کوئی لڑکی کھڑی تھی۔ عائم اس کا اشارہ سمجھ کر شیشہ کھسکانے لگی۔ لڑکی کچھ اور نیچے جھک آئی۔
''عائم ہو؟'' لڑکی نے جیسے تصدیق چاہی تھی اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ لڑکی جیسے مطمئن ہو گئی۔
''یہ ثریم نے دیا ہے..... جامعہ پہنچا دینا..... اور یہ پھول تمہارے لیے.....'' اس لڑکی نے ایک پیکٹ اور بکے عائم کو دیا..... عائم کچھ حیران رہ گئی تھی۔ پھر لڑکی نے وضاحت کی۔
''اس پیکٹ میں کچھ نوٹس ہیں..... ثریم تو لیو پر ہے ناں اس نے سوچا جامعہ میں نوٹس لڑکیوں کو چاہیے ہوں گے.....'' لڑکی کی وضاحت نے عائم کو مطمئن کر دیا تھا۔ اس نے دونوں چیزیں احتیاط سے فرنٹ سیٹ پر رکھ دیں..... لڑکی کو خدا حافظ کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔
''صبح ہی پہنچاؤں گی.....'' اس نے بہ آواز بلند سوچا تھا۔ پھر پھولوں پر اک نگاہ ڈالی..... گاڑی میں بھینی، بھینی خوشبو پھیل رہی تھی۔

''یہ ٹریم نے میرے لیے بھیجے؟ مگر کیوں؟'' بہت دیر بعد اسے پھولوں کے بارے میں سوچنے کا خیال آیا تھا۔ پھر وہ سر جھٹک کر ڈرائیو کرنے لگی..... رات کے وقت وہ عموماً ڈرائیو نہیں کرتی تھی۔ لیکن آج تو مجبوری تھی..... وہ مین روڈ پر آئی تو آگے پھر پولیس موبائل کھڑی تھی۔ عمائم کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

جیسے کچھ غلط ہونے والا تھا۔ اسے پولیس موبائل سے ڈر سا لگا۔ اسٹیرنگ پر رکھے ہاتھ کپکپا گئے تھے جب ایک چمکتی آنکھوں والے آفیسر نے ہاتھ آگے کر کے اسے رکنے کا اشارہ دیا۔ اس نے بادلِ ناخواستہ گاڑی روک لی تھی۔ آفیسر نے اسے باہر نکلنے کا کہا۔ عمائم ٹھس بن گئی..... پھر دل کڑا کر کے بولی۔

''مجھے کیوں روکا ہے؟'' اس کا انداز سخت تھا۔ وہ خود کو با اعتماد ظاہر کر رہی تھی۔

''تلاشی چاہیے..... گاڑی کی محترمہ، پلیز باہر تشریف لائیے۔'' آفیسر اب کرختگی سے بولا تھا۔

عمائم پسینہ، پسینہ ہو گئی تھی۔ یہ آج اس کے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔

''کیوں تلاشی چاہیے؟ عزت دار شہریوں کو تنگ کرنے کا آپ کو کیا حق پہنچتا ہے؟ جائیے..... جا کر کرمنلز کی تلاشیاں لیں؟ چوروں اچکوں کو پکڑیں..... تنہا خواتین کو تنگ کرنے سے کیا ''مجرم'' پکڑ لیں گے آپ۔'' اس نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔ آفیسر کی چمکتی آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

''محترمہ! یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔'' اس نے کرختگی سے کہا۔

''تنہا خواتین کو تنگ کرنا؟'' وہ برجستہ بولی۔ تب آفیسر کچھ سوچنے لگا..... پھر آرام سے بولا۔

''اپنا آئی ڈی کارڈ دکھا دیں.....''

''وہ تو گھر میں رکھا ہے، میں شادی کے فنکشن سے آ رہی ہوں۔'' عمائم نے کچھ خائف ہو کر کہا۔

''اور گاڑی کے کاغذات.....؟'' آفیسر نے تلخی سے پوچھا۔

''وہ بھی نہیں ہیں..... مطلب گھر پر ہیں..... یہ گاڑی میری اتالیق کی ہے.....'' عمائم بے ربط سی بتانے لگی۔ آج بری پھنسی تھی۔ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ وہ سخت خوفزدہ تھی۔

''یعنی گاڑی مشکوک ہے؟'' آفیسر ماتھے پر بل ڈال کر بولا تھا۔ پھر اس نے کسی اور کو آواز دی۔ ایک لیڈی آفیسر مستعدی سے آگے بڑھی تھی۔ آفیسر نے اسے کچھ سمجھایا تھا۔ لیڈی آفیسر تیزی سے آگے بڑھی۔ اس دوران عمائم تیزی سے سوچتی رہی، کیا کرے؟ کس سے مدد مانگے؟ کسے بلائے؟ بابا صاحب کو؟ تایا ابو کو؟ ایمان کو؟ نہیں، نہیں، اس نے سارے آپشن خود ہی مسترد کر دیے..... لیڈی آفیسر نے فرنٹ ڈور جارحانہ انداز میں کھولا تھا۔ پھر اسے بازو سے دبوچ کر باہر نکالا۔ عمائم کی چیخ نکل گئی تھی۔ پھر اس نے دل کڑا کر کے برجستہ کہا۔

''میں ایس پی اذان کی کزن ہوں.....'' اس کے منہ سے بلا ارادہ ہی نکلا تھا۔ حتیٰ کہ وہ خود بھی حیران رہ گئی تھی۔ لیڈی آفیسر رک سی گئی تھی پھر اس نے مشکوک نظروں سے عمائم کو گھورا۔

''جھوٹ بولتی ہو.....'' وہ گہری نظر سے اسے کھوج رہی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں..... آپ اذان کو کال کر کے پوچھ لیں۔'' عمائم نے تھوک نگل کر جواب دیا تھا۔

اب یہ جرأت کر تو لی تھی اگر اذان نے ہی اسے کزن ماننے سے انکار کر دیا تو تب.....؟ آگے کے آپشن دہلا رہے تھے۔ لیڈی آفیسر نے ساتھی سے کچھ کہا تھا پھر اس نے کسی کو کال کی.. یقیناً اذان کو تھوڑی دیر بعد آفیسر اس کے قریب آیا۔ اس نے عمائم سے معذرت کی..... اب کے اس کا انداز اور لہجہ بدلا ہوا تھا۔ عمائم کو جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ یعنی اذان نے اسے کزن تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے سر سے جیسے بلا ٹل گئی تھی۔

گھر پہنچ کر اس نے گاڑی سے سامان اٹھایا اور محتاط انداز میں اندر آ گئی..... اندھیرے میں ڈوبی ٹھنڈی گیلری سے گزر کر اپنے کمرے میں آتے ہوئے اسے ہلکی آوازوں کی بھنبھناہٹ نے روک لیا تھا۔ گول کمرے سے

آواز آرہی تھی۔ اس نے تھوڑا سا پردہ سرکا کر دیکھا۔ وہاں اذان بیٹھا تھا اور لقمان سے کوئی بات کر رہا تھا۔ عمائم وہیں رک گئی۔ کچھ دیر بعد اذان عجلت میں باہر آیا۔ عمائم چونکہ سامنے کھڑی تھی اس لیے ٹکر ہوتے، ہوتے بچی تھی۔ اذان، عمائم کو دیکھ کر رکا نہیں تھا۔ حالانکہ ابھی چند لمحے پہلے اسے اتنی بڑی فیور دے چکا تھا۔

عمائم کو اس کا انداز بہت برا لگا..... وہ تو اسے تھینکس بولنا چاہتی تھی۔ جو بھی تھا..... اذان کی وردی کے بیج نے اسے بڑی مصیبت سے بچالیا تھا۔

اذان اور احتشام دونوں بھائی خود پسند تھے۔ ان کی ''خودی'' پر لعنت بھیج کر وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ ثریم کا دیا گیا پیکٹ احتیاط سے الماری میں رکھا۔ پھول ٹیبل کے گل دان کے پاس رکھنے لگی تھی۔ پھر بیڈ پر گلدان اور بُوکے رکھ کر خود فریش ہونے چلی گئی۔ کپڑے چینج کر کے واپس آئی تو موبائل کی میسج بیپ بجی۔ اس نے فون اٹھایا۔ اسی اجنبی کا میسج تھا۔

''کہا تھا ناں..... شادی پر مت جانا..... اتنی بڑی مصیبت سے بچی ہو.....'' اس نے کپکپاتی انگلیوں سے اگلا میسج کھولا۔

''میری باتوں کو اتنا لائٹ کیوں لیتی ہو؟'' جیسے خفگی سے کہا گیا تھا۔ ''کتنی مرتبہ کہا ہے..... اتنی بے نیاز نہ رہا کرو..... اردگرد پر غور کرو.....'' وہ خفا تھا، خفا لگ رہا تھا۔ عمائم جیسے تھک گئی۔ آخر یہ کون تھا؟ اتنا ہمدرد؟ اتنا احساس کرنے والا؟ خیال رکھنے والا۔

وہ موبائل ہاتھ میں لیے اس اجنبی کو سوچتے، سوچتے سوگئی تھی۔ صبح اٹھی تو طبیعت قدرے نڈھال تھی۔ فریش ہو کر نماز ادا کی۔ پھر تسبیح لے کر بیڈ پر آگئی..... جیسے ہی دائیں طرف اس نے گردن موڑ کر دیکھا گویا آنکھیں ابل کر باہر آگئی تھیں۔ پھولوں کا بکے تنکا تنکا بکھرا پڑا تھا۔ گل دان کارپٹ پر گرا تھا۔ ایک، ایک پھول کی پتی نوحہ کناں تھی..... اس نے رات گل دان میں پھول سجائے تھے پھر اجنبی کے میسج میں دھیان نہیں رہا اور وہ سوگئی..... صبح پھولوں کا یہ حشر تھا..... ایک خیال ایک احساس کے تحت وہ چیتے کی سی تیزی کے ساتھ بھاگتی ہوئی الماری تک آئی تھی۔ کپڑوں کے ڈھیر نیچے کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ کوئی پیکٹ نہیں..... اس نے ساری چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ لیا۔ پوری الماری کھنگال ڈالی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ عمائم کا دماغ سائیں، سائیں کر رہا تھا۔ آخر کون رات کو اس کے کمرے میں آیا؟ کس نے ایسی جرأت کی؟ کون اتنا دیدہ دلیر تھا؟

وہ سن ہوتے دماغ کے ساتھ باہر آئی تھی۔ ٹھنڈی گیلری سے گزر کر کچن اور پھر گول کمرے سے ہوتی ہوئی لونگ روم میں آگئی۔ وہاں چائے کا دور چل رہا تھا۔ ماما، تائی امی، بسمہ چاچی، عمائم حواس باختہ سی تائی امی تک آئی۔

''امی.....! میرے کمرے میں رات نہ جانے کون آیا تھا؟ ہر چیز الٹ پلٹ ہے.....'' اس نے متفکر انداز میں ایک غیر مناسب وقت میں اپنی پریشانی تائی امی تک پہنچائی..... اسے کم از کم ماما کے سامنے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ تاہم وہ اتنی پریشان تھی کہ اس نزاکت کو سمجھ ہی نہیں سکی..... اس اثنا میں ماہم بھی چلی آئی۔ معاملہ گمبھیر تھا سو وہیں بیٹھ گئی۔

''کیا مطلب؟ کون آیا؟'' تائی امی ہراساں ہوگئیں..... بسمہ بھی چونکی..... ماما اور ماہم کی دلچسپی خاصی کمال کی تھی۔ دونوں معنی خیزی سے عمائم کو دیکھنے لگیں۔

''امی..... ہر چیز اوندھی پڑی ہے..... اور میرا کچھ ضروری سامان بھی غائب ہے.....'' عمائم نے گھبرا کر کہا۔ ثریم کا پیکٹ اس کے پاس امانت تھا..... اب وہ امانت کہاں چلی گئی تھی؟ عمائم سخت متوحش تھی۔

''تمہارے کمرے میں کون جاسکتا ہے بیٹا..... وہیں کہیں ہوگا..... دھیان سے دیکھو.....'' تائی امی اٹھ کر اس کے کمرے میں چلی گئیں۔ بسمہ تفکر سے اسے دیکھنے لگی۔

''کیسا سامان غائب ہوا ہے؟'' بسمہ نے نرمی سے پوچھا۔

''کچھ ڈاکومنٹس تھے۔'' عمائم نے بے چینی سے بتایا۔ ماما نے پہلو بدل کر اسے دیکھا تھا۔

''میں نے سمجھا..... کوئی سونا چرا کر لے گیا.....'' ماما نے طنزیہ کہا تھا۔ ماہم بھی مسکرانے لگی۔ بڑی دل جلانے والی مسکراہٹ تھی۔

''آج تک اس گھر سے کچھ چوری نہیں ہوا..... اب یہ الزام نہ جانے کس کے سر آتا ہے۔'' ماما نے ہاتھ جھاڑے تھے۔ تبھی تائی امی فتاں وخیزاں واپس آئیں۔

''تم نے دروازہ لاک نہیں کیا تھا؟'' وہ متفکر سی پوچھ رہی تھیں..... ماما کو خوب گدگدی ہوئی..... آخر کون عمائم کے کمرے میں گیا تھا؟

''ذہن سے نکل گیا..... میں بہت تھکی ہوئی تھی۔'' اس نے افسردگی سے بتایا۔ وہ سخت بے چین تھی۔ ''آخر ثریم کو کیا جواب دے گی۔''

''اب یہ تو اچھا بھلا الزام ہے..... جوان لڑکی کے کمرے میں کون گیا؟ پھر ذہن میں طرح طرح کے سوال آئیں گے، کہیں لڑکی کو تو.....؟'' ماما نے آنکھیں گھما کر معنی خیزی سے کہا تھا۔ تب تائی امی کی گھوری نے انہیں چپ کروادیا۔

''شرم کرو..... بچی پریشان ہے..... تم اسے اور پریشان کر رہی ہو؟'' تائی امی کی ڈپٹ پر ماما اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔

''ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں تائی امی..... یہ تو الزام ہے، ایک تو چوری کا، دوسرا عمائم کے روم میں کسی لڑکے کے گھسنے کا..... آخر کس نے ایسی غیر اخلاقی حرکت کی؟ کون تھا آخر لقمان، سبحان، ایمان، اذان؟'' ماہم بظاہر بڑی ہمدردی سے کہہ رہی تھی..... تاہم عمائم جانتی تھی اس کے لفظ، لفظ میں طنز پوشیدہ ہے۔

''ماہم..... تم خاموش رہو..... میں خود دیکھتی ہوں، کس نے ایسی نازیبا حرکت کی۔'' تائی امی نے غصے سے کہا تھا۔ پھر عمائم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گئیں..... پیچھے سے ماہم کی جلی کٹی آواز آئی۔

''لکھوالیں مجھ سے..... سو فیصد ایمان ہوگا..... وہی مرتا ہے اس مادھو بالا پر۔'' ماہم نے طنزیہ کہا اور پاؤں پٹخ کر وہاں سے چلی گئی..... ماما کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا..... وہ اموکو ان کے بیٹے کی تازہ ترین رپورٹ دینے اوپر چلی گئی تھیں۔

تائی امی اور عمائم دونوں روم میں واپس آگئی تھیں۔ پھر انہوں نے دروازہ بند کیا اور عمائم کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''تم محفوظ ہو میری جان۔'' انہوں نے بے اختیار عمائم کو خود میں بھینچا۔ عمائم ان کے سوال پر جیسے کٹ گئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ کیسے، کیسے سوالوں کا اب سامنا کرنا پڑے گا۔

''میرے ڈاکومنٹس چوری ہوئے ہیں، وہ کسی کی امانت تھے۔'' عمائم نے سر جھکا کر وضاحت کی تھی۔ تائی امی کی تسلی ہوگئی تھی..... انہوں نے اسے بھی دلاسا دیا۔

''تم فکر مت کرو..... میں سب سنبھال لوں گی۔ قصوروار کو سزا ملے گی، ایسے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ آخر کس نے اتنی جرأت کی؟'' انہوں نے عمائم کا ہاتھ دبایا اور باہر نکل گئیں..... اس کے پورے وجود پر بوجھ لد گیا تھا۔

☆☆☆

''اس پیکٹ میں کیا تھا؟'' عمائم نے کچھ نہیں سوچا..... اس اجنبی لڑکی نے کہا تھا، ثریم کے نوٹس ہیں۔ عمائم نے نوٹس ہی سمجھے..... تاہم وہ پھول؟ آخر ثریم نے اسے پھول کیوں بھیجے تھے؟ یہ بات ہضم ہونے والی نہیں تھی۔

پورا دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا..... یہاں تک کہ ایمان کو بھی خبر ہوگئی..... وہ دوسرے ہی لمحے عمائم کے سامنے تھا۔

''تمہارے کمرے میں کون آیا تھا؟'' ایمان کے سوال نے اسے غصہ دلایا۔ وہ پہلے ہی شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ ایمان کو دیکھ کر پھٹ پڑی۔

''مجھے کیا خبر.....؟'' اس نے غصے میں کہا تھا۔ ایمان کچھ سنبھل گیا۔

''تم ایسی بے پروا تو نہیں تھیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا..... عمائم الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔

''کیا کرنے آئے ہو.....؟ تعزیت کرنے یا جتانے..... میں اتنی غیر محتاط کیسے ہوگئی؟'' وہ تکلیف زدہ آواز میں بولی تھی۔ ایمان سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ سوچتا رہا۔

''عمائم..... یہ معمولی بات نہیں ہے۔'' وہ بے انتہا سنجیدہ تھا۔

''میں بھی جانتی ہوں۔'' اس کا سر جھک گیا۔ اب نہ جانے کس، کس کے سوال کا جواب دینا پڑے گا۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔

''اس پیکٹ میں ایسا کیا تھا..... جسے چرانے کی ضرورت پڑی کسی کو.....؟ اور پھر کسے خبر تھی تمہارے پاس کوئی پیکٹ ہے؟'' ایمان نے بڑا ٹھوس نکتہ اٹھایا تھا۔ وہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔ آخر اس نے خود کیوں نہیں اس پہلو پر غور کیا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے سوچا تھا۔ پھر ایمان سے شیئر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اتنا بوجھ خود نہیں اٹھا سکتی تھی۔ عمائم نے سر جھکا کر سارے واقعات کھول دیے۔ شادی سے واپسی پر اجنبی لڑکی کا پیکٹ دینا اور پولیس موبائل کا روکنا..... ایمان کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

''عمائم.....! تم تمہیں اس لڑکی سے پیکٹ نہیں لینا تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو جاتا..... اگر لے آئی تھیں تو اتنی بے پروائی نہیں برتنی تھی۔ یقیناً اس پیکٹ میں کچھ حساس چیز ہوگی۔ آگے پھر پولیس کا ناکہ تھا۔ وہ لڑکی پیکٹ تمہیں پکڑا گئی۔ بعد میں مصیبت ٹلتے ہی وہ اپنا سامان لے گئی۔ نہ جانے کون تھی؟ ہمارے گھر سیکورٹی کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے عمائم.....؟ میں شام سے کہوں گا..... وہ اپنے گارڈز سے کہے اِدھر بھی نظر رکھے..... اب اس معاملے کی بار یکی میں نہ جاؤ..... دفع کرو اور محتاط رہو..... تائی امی کو میں مطمئن کر دیتا ہوں۔'' ایمان نے نرمی سے اسے تسلی دی تھی۔ عمائم کے دل سے بھی بوجھ ہٹ گیا تھا۔ وہ ذرا مطمئن ہوئی تھی۔ شاید معاملہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنا سامان لے جا چکی تھی۔ مگر معاملہ کہاں ختم ہوا تھا..... معاملہ تو شروع ہی اب ہوا تھا۔ جب ثریم حواس باختہ سی صبح سویرے اس کے گھر چلی آئی تھی اور اس کا آنا خطرے کی علامت تھا۔ وہ اچھی خبر لے کر نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

پیکٹ والا معاملہ ایمان سے گفتگو کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ عمائم بھی پُرسکون ہوگئی تھی۔ پھر تائی امی کو بھی ایمان نے کوئی تسلی دے کر مطمئن کر دیا تھا۔ دوبارہ یہ مسئلہ نہیں اٹھایا۔ تاہم ماما اور ماہم کبھی، کبھی طنزیہ فقرہ ضرور کستی تھیں۔ چونکہ وہ عادتاً عمائم کو ٹیز کرتی تھیں۔

اس دن وہ دادی کو آک کے ڈوڈوں کی گانٹھ دینے پچھلے صحن میں گئی تو انہوں نے اسے روک لیا۔ یہ بھی عجیب معجزہ تھا۔ دادی نے اسے مخاطب کرلیا تھا۔ وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔ دادی نے سنہری فریم والی آنکھوں سے جھانکا..... بڑی، بڑی خوب صورت بادامی آنکھیں..... روئی کے گالے جیسے سرخ و سفید گال..... دودھ سے بال، ململ کا سفید دوپٹا..... دادی کس قدر حسین تھیں۔ جوانی میں کیا قیامت ہوں گی؟ عمائم مسحور سی کھڑی رہ گئی..... دادی نے ڈوڈوں کی گانٹھ کھول کر عمائم سے کہا۔

''رات کو کمرے کا دروازہ لاک کر کے سویا کرو..... جان ہے تو جہان ہے، اتنی جرأت نہیں کسی کی، آنکھوں میں جوتوں سمیت گھس کر تمہیں نقصان پہنچا دے..... اس گھر کی فصیلیں بڑی اونچی ہیں۔ پھر بھی اپنی حفاظت تم پر فرض ہے..... اور فرض قضا نہیں کرتے.....'' انہوں نے بغیر دیکھے اپنی بات مکمل کی تھی۔ عمائم گم صم سی رہ گئی۔ انہوں نے کتنا سچ کہا تھا۔ عمائم شرمندہ سی ہوگئی تھی۔

''دادی! میرا قصور نہیں تھا۔'' اس نے بھیگی آواز میں کہا۔

''جانتی ہوں.....'' انہوں نے گدے اٹھا، اٹھا کر جھاڑے..... ''جو بھی آیا تھا تمہیں نقصان پہنچانے کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔'' ان کی آواز میں یقین بول رہا تھا۔ اس یقین میں عمائم بہہ گئی تھی۔ آنکھ میں نمی سی آگئی۔ اتنے سالوں

میں پہلی مرتبہ دادی نے ازخود اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ اسی احساس سے سرشار ہوگئی تھی۔ جب وہ برآمدے سے گزری تو وہیں وائٹ پالش شدہ کرسی پر اذان بیٹھا تھا۔ اخبار دیکھتا ہوا، عمائم کے آگے بڑھتے قدم رک گئے تھے..... اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ اخبار میں گم تھا۔ وہ کچھ سوچ کر اس کے قریب آگئی..... پھر اس نے گلا کھنکھار کے اذان کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ چونک گیا تھا۔ اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ جیسے کہنا چاہتا ہو۔ ''خیریت؟''

''مجھے تمہیں تھینکس بولنا تھا.....'' عمائم نے انگلیاں مسل کر آہستگی سے کہا۔ اذان حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ عمائم اب مزید شکریے کے لیے الفاظ سوچ رہی تھی۔ آخر اس کے عہدے سے بغیر اسے بتائے فائدہ حاصل کر چکی تھی۔ ایک شکریہ تو بنتا ہی تھا۔

''کس لیے.....؟'' اذان نے حیرانی سے پوچھا۔

''تم نے مجھے فیور دی۔'' عمائم دھیمی آواز میں بولی۔ فیور کی تفصیلات سے اذان بھی ناواقف تھا۔ تبھی الجھی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''کب؟'' اذان نے پوچھ ہی لیا۔ عمائم اس سوال پر رک سی گئی تھی۔ پھر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ جیسے کچھ سمجھنا چاہتی ہو..... اذان بھی فیور کی تفصیلات پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر اچانک احتشام وہاں سے گزرا۔ ان دونوں کو قریب دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ وہ تنتنے پھلا کر اُدھر آیا۔

''امی بلا رہی ہیں تمہیں..... مذاکرات سے فرصت ملے تو ان کی بات سن لینا۔'' وہ تلخی سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ عمائم دنگ رہ گئی تھی جبکہ اذان شرمندہ ہوگیا تھا۔ تاہم جاتے، جاتے ہمدردی سے بولا۔

''میں نے تمہیں کوئی فیور نہیں دی..... اس شکریے کا بھلا کیا سوال؟ ویسے بھی مجھے ایک دن پہلے پتا چلا تمہارے ڈاکومنٹس چوری ہوئے ہیں..... میں تو افسوس بھی نہیں کر سکا۔'' وہ بولتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ عمائم کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

''تو پھر اس آفیسر نے کسے فون کال کی تھی؟ اور مجھے بغیر تلاشی کے کیسے آنے دیا؟'' عمائم حیران رہ گئی۔ ایک اور الجھن اور ایک مزید گانٹھ..... اس کا ذہن تھک سا گیا تھا۔ آخر یہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا تھا۔ اجنبی کالز کا سلسلہ اور یکے بعد دیگرے پریشانیوں کے انبار..... وہ سوچتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف آگئی۔

اور اس سے اگلی سویر ثریم نے آکر عمائم کی الجھنوں میں مزید اضافہ کیا۔ اس کے تقاضے نے عمائم کو چکرا کر رکھ دیا۔

''وہ پیکٹ کہاں ہے عمائم.....؟'' ثریم سخت پریشان تھی۔ عمائم چپ سی کر گئی۔ آخر جواب کیا دے؟ سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

''کیا وہ پیکٹ تمہارا تھا؟'' عمائم ہق دق رہ گئی..... ثریم نے ایسی نگاہ سے اسے دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔

''وہ پیکٹ میں نے بھجوایا تھا۔ کیا میری کزن نے تمہیں نہیں دیا؟'' ثریم نے اڑی رنگت سے پوچھا۔

''ہاں..... دیا تو تھا.....'' عمائم کی آواز مدھم ہوگئی۔

''تو پھر وہ کہاں ہے؟'' ثریم بے چینی سے بولی۔

''اس پیکٹ میں کیا تھا؟'' عمائم نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔

''اس میں نورس کے نوٹس تھے..... اور تم جانتی ہوں ناں نورس اپنے نوٹس کے لیے کیسی بدلحاظ ہے۔'' ثریم نے بے چینی سے کہا تھا۔ عمائم کا سر جھک گیا۔ وہ کیسے ثریم کو بتاتی..... نورس کا پیکٹ چوری ہو چکا تھا۔

''عمائم! تم چپ کیوں ہو؟'' ثریم نے کسی دھڑکے کے تحت پوچھ لیا۔ عمائم خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تم نے وہ پیکٹ مجھے کیوں بھجوایا.....؟ نورس کو خود دے دیتیں۔ وہ بھی تو شادی میں موجود تھی۔'' عمائم نے کنپٹی دباتے ہوئے کہا۔ وہ بہت ڈپریسڈ تھی..... اور ثریم کے سامنے شرمسار بھی۔

''نورس نے فنکشن سے جا چکنے کے بعد مجھے میسج کیا تھا کہ میں ابھی کے ابھی نوٹس تمہارے ہاتھ بھیج دوں...... اسے ضرورت ہے......'' ثریم نے بہ مشکل کہا۔ کسی انہونی نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا۔

''پھر میں نے اپنی کزن سے کہا وہ جلدی سے میری اسٹڈی ٹیبل سے گرین پیکٹ اٹھا کر تمہیں دے آئے۔ میری کزن اندر گئی اور اسے لاؤنج سے گرین پیکٹ اور پھول ملے۔ ہاں......اسے لاؤنج سے پیکٹ مل گیا تھا۔ حالانکہ پیکٹ تو میں نے اسٹڈی ٹیبل پر رکھا تھا۔'' ثریم بولتے، بولتے خود ہی رک گئی۔ وہ کچھ بے ربط سی ہو رہی تھی۔

''کیا پتا اسٹڈی ٹیبل سے کسی نے اٹھا کر لاؤنج میں رکھ دیا ہو، میری کزن کو غلط فہمی ہوئی ہو۔'' ثریم کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ تاہم عمائم چکرا کر رہ گئی تھی۔

''اور وہ پھول کیوں بھیجے تھے؟'' عمائم نے حیرت سے پوچھا۔ ثریم نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

''میں نے نہیں بھیجے...... پیکٹ کے پاس رکھے تھے۔ میری کزن نے ایسے ہی اٹھا کر تمہیں دے دیے......'' ثریم خود بہت الجھی ہوئی تھی۔ عمائم بہت دیر تک ہر پہلو پر غور کرتی رہی۔ سوچتی رہی۔ پھر ثریم کی خفگی، رنجیدگی اور خوف کو کم کرتے ہوئے بولی۔

''نوٹس ہی تھے ناں...... میں اور بنوا دوں گی۔ تم پریشان نہ ہو......'' عمائم بولتے، بولتے ایک دم رکی...... ثریم نے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر پوچھا تھا۔

''وہ پیکٹ کہاں گیا؟'' اس کی آنکھوں میں واضح خوف تھا۔ نورس کی ڈانٹ کا خوف...... بے عزتی کا خوف......

''ثریم! وہ، وہ چوری ہو گیا۔'' عمائم نے شرمندگی سے بتایا سامنے بیٹھی لڑکی ساکت رہ گئی تھی۔

''کیسے؟'' وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

''میرے اسی کمرے سے۔'' عمائم نے بجھی، بجھی آواز میں اسے تفصیل بتائی تھی۔ ثریم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''نورس نہیں چھوڑے گی یار......'' وہ خوف کے مارے رونے لگی۔ عمائم دھک سے رہ گئی۔

''نوٹس ہی تو تھے ناں...... میں خود نورس سے بات کر لوں گی۔'' عمائم نے اسے تسلی دینی چاہی مگر ہر لفظ کھوکھلا اور بے جان ہو رہا تھا۔ ثریم کے آنسو رکتے ہی نہیں تھے۔ رک ہی نہیں سکتے تھے۔

''نورس نے سخت دھمکی دی ہے۔'' ثریم نے آنسوؤں کے بیچ بتایا۔ ''اگر وہ پیکٹ اسے نہ ملا تو میرے ساتھ بہت برا کرے گی۔'' وہ کانپتی آواز میں روتی رہی تھی۔ عمائم دھک سے رہ گئی۔

''صرف نوٹس کے لیے ایسی دھمکی......؟'' وہ اندر تک کانپ سی گئی۔

''اس پیکٹ میں نوٹس نہیں تھے...... کچھ اور ہی تھا۔ جو نہ ملا تو میرے اور تمہارے لیے تباہی ہے۔'' ثریم چیخ پڑی تھی۔

☆☆☆

وہ تین دن بخار میں پھنکتی رہی۔ جامعہ سے بھی ناغہ ہوا۔ ویسے بھی نورس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ نہ جانے نورس کا کیا ضروری سامان تھا جو چوری ہو گیا۔ چوتھے دن اس کا بخار اتر گیا تھا مگر جامعہ جانے کی جرأت نہ کر سکی۔ وہ عالمہ بننے کے چوتھے درجے میں تھی۔ یہ چوتھا اور آخری درجہ تھا۔ ایک، ایک دن اس کے لیے قیمتی تھا۔ ناغے کی گنجائش نہیں تھی۔ بخار کے دن تو بہانے میں گزر گئے تھے۔ آگے کیسے بہانہ ہوتا پانچویں دن تائی امی نے اسے گھیر لیا۔

''جامعہ کیوں نہیں جا رہیں؟'' ان کا انداز ٹٹولتا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے متفکر رہتی تھیں، اب بھی متفکر تھیں۔ عمائم سے کوئی بہانہ نہ بن پڑا۔

''امی...... کل سے جاؤں گی، آج کل کلاسز نہیں ہو رہیں۔'' اس نے تھکے، تھکے لہجے میں کہا...... تائی امی مطمئن ہوئی یا نہیں مگر خاموش ضرور ہو گئی تھیں۔ دو گھنٹے بعد عالی کی کال آ گئی۔ عمائم کو اتنا غصہ تھا کہ کال ڈراپ کر دی۔ پھر اس کے ٹیکسٹ شروع ہو گئے۔ عمائم نے بغیر پڑھے ڈیلیٹ کر دیے تھے۔ عالی بھی ایک ہی نام کی

ڈھیٹ تھی۔ اِدھر میسج بھیجتی اُدھر کالز کرتی، عمائم نے تنگ آ کر موبائل آف کر دیا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ عالی نے گھر کے نمبر پر کال کر دی۔ حریم بتانے کے لیے آئی تھی۔

''تمہارا نمبر کیوں بند ہے؟'' حریم نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹا کے پوچھا۔ عمائم نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''پھر تمہاری دوست ناک میں دم کیوں کر رہی ہے، پورے لاؤنج میں بھونچال آیا ہوا ہے، فون کی گھنٹیوں نے کان پھاڑ ڈالے۔ اُدھر شام بھائی بیٹھا تھا۔ اسے غصہ آ گیا۔ فون کا پلگ ہی نکال دیا۔'' حریم نے مزید تفصیلات سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ عمائم کو بری طرح تاؤ آ گیا۔

''یہ شام بھائی تمہارا ہر وقت ہمارے گھر کیوں گھسا رہتا ہے، اسے اپنے گھر کوئی کام نہیں.....'' عمائم نے چڑ کر کہا۔

''آں..... ہر وقت کہاں؟ وہ تو اتنا مصروف رہتا ہے، خیر تم بتاؤ..... موبائل کیوں بند کر رکھا ہے۔'' حریم نے خاصی دلچسپی اور تجسس سے پوچھا تھا۔ عمائم گہری نظر سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے لہجے میں خاصی بے چینی اور اشتیاق تھا۔ جیسے فون بند کرنے کے پیچھے کوئی بڑی وجہ تھی۔

''بیٹری ختم ہے۔'' عمائم نے چڑ کر جواب دیا۔

''تو چارج کر لو ناں.....'' حریم نے لگے ہاتھوں مشورے سے بھی نوازا تھا۔ عمائم نے ایسے سر ہلایا جیسے اسی مشورے کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ حریم آئے اور چارجنگ کا مشورہ دے۔

''اچھا..... چلتی ہوں، ویسے عمائم، تمہارے روم سے کون سا پیکٹ چوری ہوا ہے؟'' جاتے جاتے اس نے اپنے تجسس کو باہر نکال ہی دیا تھا۔ عمائم نے اسے گھور کر دیکھا۔ حریم ڈرتے ہوئے بھاگ گئی تھی۔ پھر دوبارہ سے کچھ سوچ کر پلٹ آئی۔

''وہ شام بھائی کہہ رہا تھا۔ سب کہانی ہے، ایک دم فلاپ آج تک چوری نہیں ہوئی..... پھر کون اتنا دیدہ دلیر تھا جو عمائم کے کمرے میں گھسا..... وہاں کون سے جواہرات رکھے تھے، کیا وہ چور کاغذ چرانے آیا تھا۔'' حریم نے سہمے، سہمے سے انداز میں پوری تفصیل کہہ سنائی تھی۔ اس کے ہلکے پیٹ میں کوئی بات رکتی ہی نہیں تھی۔ جبکہ عمائم دنگ رہ گئی تھی۔ پھر اسے بے طرح ناگواری نے گھیرا تھا۔

''تمہارے شام بھائی کو کیا تکلیف ہے؟ وہ کیوں میرے معاملے میں بول رہا ہے؟ میرے کاغذ چوری ہوئے ہیں یا ہیرے، شام صاحب اپنے کام سے کام رکھیں.....'' وہ سخت غصے میں بولی تھی پھر اس نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ حریم سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ باہر کی ہر چھوٹی، بڑی خبر اسے دیتی تھی پھر یہ کیسے ناممکن تھا کہ اس کی ہر بات چھپا لیتی۔ یقیناً ایک دو ساتھ ٹانکا لگا کر بتاتی ہوگی، اسے حریم کی عادت کا پتا تھا۔

''میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا۔ چلتی ہوں۔'' حریم منمنا کر بولی۔ پھر جلدی سے باہر نکل گئی۔ عمائم نے گہری سانس کھینچ کر موبائل آن کیا تھا، اسی پل عالی کی کال آ گئی۔ اور اسے سنتے ہی بنی۔

''تم ابھی تک ناراض ہو۔'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''میں نہیں ناراض..... تم نے کون سا میرے ساتھ برا کیا ہے، بس ڈاج دے کر چلی گئیں۔'' عمائم نے بھیگی آواز میں کہا تھا۔ اسے رہ، رہ کر عالی کی فون کال اور میسج یاد آ رہا تھا۔ کیسے اجنبی بن کر ٹیکسٹ بھیج دیا۔ ''تم گھر چلی جاؤ عمائم۔'' وہ غصے سے سوچتی رہی۔ ''کیا ہیلی کاپٹر پر چلی جاتی.....؟'' اسے اور بھی بہت کچھ یاد آیا۔ پولیس موبائل لیڈی آفیسر..... اگر گھر کے کسی فرد کو پتا چل جاتا کہ عمائم کی گاڑی کو پولیس موبائل نے روکا تھا تو جانے اس کا کیا حشر ہوتا؟

''مجھے کام تھا عمائم.....'' عالی نے بہ مشکل کہا تھا، وہ اندر سے خاصی شرمندہ تھی۔ ''پھر تم نورس کے ہمراہ آئی تھیں۔ نورس کا فرض تھا تمہیں واپس ساتھ لے کر جاتی.....'' اس نے ٹھیک نکتہ اٹھایا تھا۔ وہ جز بز رہ گئی۔

''اب میں نورس کو کیا کہوں.....؟ اس کا پیکٹ گم کر چکی ہوں.....'' عمائم نے اسے تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ عالی حیران رہ گئی۔

''ویسے پیکٹ میں کیا تھا؟'' وہ سخت متجسس تھی، عمائم نے اس کے لہجے پر غور کیا، وہ کچھ بے چین بھی لگ رہی تھی۔
''مجھے کیا خبر، ثریم نے تو کہا تھا اس میں نوٹس تھے۔ پر مجھے معاملہ کچھ اور ہی لگتا ہے۔'' عمائم گہرے لہجے میں بولی۔
''سو فیصد معاملہ کچھ الگ ہے، نوٹس کے لیے نورس ایسا تہلکہ تو نہ مچاتی.....'' عالی سر ہلا کر رہ گئی تھی۔
''کیا کر دیا نورس نے.....؟'' عمائم بھی ٹھٹکی۔
''کیا تمہیں نہیں پتا.....؟'' عالی حیران ہوئی۔
''نہیں تو۔'' عمائم بھی حیران ہوئی۔
''نورس نے ثریم کے گھر جا کر خاصا تماشا لگایا۔ اس کا قیمتی پیکٹ وہاں رہ گیا تھا۔ جسے ثریم نے اپنی کزن کے ہاتھ تمہیں بھیجا اور تم نے وہ پیکٹ کہیں غائب کر دیا۔ اب ثریم کی خیر ہے نہ تمہاری.....'' عالی نے جیسے اسے ڈرا کر رکھ دیا تھا۔
''میں نورس سے معذرت کر لوں گی۔'' عمائم نے تہیہ کیا تھا، عالی نے فوراً ٹوک دیا۔
''بے فائدہ ہے، وہ کوئی وضاحت نہیں لے رہی۔ اسے بس پیکٹ کی ضرورت ہے۔'' عالی سنجیدہ تھی۔
''کون سا ہیرے تھے اس میں.....'' عمائم کو غصہ آ گیا۔ اسی پریشانی میں اس نے فون بند کر دیا تھا۔ پھر حریم کے بلانے پر باہر آ گئی تھی۔ تائی امی گیلری میں کھڑی تھیں۔ عمائم کو ناشتے کی ٹرے پکڑا کر کچن میں چلی گئیں۔ وہ ٹرے لے کر لاؤنج میں آ گئی۔ بھوک ذرا بھی نہیں تھی۔ بس تائی امی کی خاطر ناشتا زہر مار کر لیا تھا۔ جب وہ خالی ٹرے لے کر کچن کی طرف جا رہی تھی تب ہال سے آتی آوازوں کو سن کر ٹھٹک گئی۔
''یہ کوئی معمولی بات نہیں، آئندہ کے لیے محتاط رہو۔ میں احتشام سے بات کرتا ہوں۔ ہمارے گھر کے لیے ایک گارڈ کا بندوبست کرے..... عمائم ٹھیک ہے ناں.....؟'' یہ تایا ابا تھے، متفکر سے تائی امی کی کسی بات کے جواب میں کہہ رہے تھے، عمائم کا دل بھر آیا۔ وہ جو اس معاملے کو لائٹ لے رہی تھی۔ ایسا معمولی ہرگز نہیں تھا، گھر کے سب افراد اندر ہی اندر متفکر تھے جو بھی تھا انہیں عمائم کا کچھ نہ کچھ احساس تو تھا ہی..... عمائم کا دل بھر، بھر آیا..... وہ بجھے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔
دوسرے دن بڑی ہمت مجتمع کر کے اس نے جامعہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ تیاری کے دوران بھی خوف کا احساس حاوی رہا۔ جانے نورس کیا رویہ رکھے گی؟ اسے ہمیشہ ٹیچرز کی ڈانٹ ڈپٹ سے ڈر لگتا تھا۔ ویسے تو وہ بڑی ذمے دار لڑکی تھی، جانے کیسے بھول چوک میں پڑ گئی۔
وہ مزید چھٹیاں افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ عالمہ بننے کا چوتھا درجہ یعنی آخری سال تھا۔ اس کی پڑھائی متاثر ہو رہی تھی۔ اس نے آج تک بلا سبب کبھی چھٹی نہیں کی تھی۔ کبھی کوئی کلاس مس نہیں کی تھی۔ مگر اب جیسے ریکارڈ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ سالانہ امتحانات کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ جیسے ہی امتحان ہوتے وہ جامعہ سے فارغ ہو جاتی۔ ڈگری نتیجے کے بعد آنی تھی۔ کم از کم وہ نورس کا سامنا کرنے سے بچ جاتی۔
اس نے مرے، مرے ہاتھوں سے عبایا پہنا، حجاب لیا اور فائلز اٹھا کر باہر آ گئی۔ تائی امی برآمدے میں تھیں انہیں خدا حافظ کہا اور پورچ کی طرف بڑھ گئی..... ایسے ہی برابر نگاہ اٹھی تو دل اپنی لائن سے ہٹ گیا۔ وہ ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے اِدھر ہی دیکھ رہا تھا۔ ویسی ہی سرد برفیلی نظروں سے عمائم تیزی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔
''اللہ! اسے کوئی کام نہیں..... ہر جگہ مجھ سے ٹکرا جاتا ہے۔'' اس نے گھبرا کر سوچا پھر ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی نکالے۔ جاتے، جاتے اِک چور نگاہ اس نے ریلنگ کی طرف ڈالی تھی۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ اور عمائم کو لگا جیسے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر اس کی نگاہ کے سرد تاثر سے ڈر گئی تھی۔
باہر برابر والے گیٹ کے قریب ایک جیپ کھڑی تھی۔ جانے برابر والے گھر کون آیا تھا۔ ''اذان یا احتشام کا کوئی دوست ہوگا؟'' اکثر یہاں پراڈو وغیرہ کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ عمائم کی جیسے ہی نگاہ مڑی اور وہ حیران رہ گئی۔ چمکتی آنکھوں والا آفیسر کھڑا تھا۔ وہی پولیس موبائل والا..... جس سے اذان کے نام پر فیور لی تھی اور اس فیور

کا اذان کو پتا تک نہیں تھا۔ عمائم کچھ اور بھی خوفزدہ ہوگئی۔ اس نے جلدی سے گاڑی کا شیشہ اوپر چڑھا دیا تھا۔ پھر بھی اسے لگا کہ چمکتی آنکھوں والے آفیسر نے اسے بہت غور سے دیکھ کر موبائل کان سے لگایا تھا۔ جیسے کسی کو اطلاع دی ہو..... اسے آفیسر کا انداز خاصا مشکوک لگا تھا۔ یا پھر اسے ہی ان دنوں ہر کوئی مشکوک لگتا تھا۔

گاڑی کچھ آگے بڑھی تو عمائم نے سکون کی سانس لی۔ تبھی اس کے موبائل پر میسج آیا تھا۔ اس نے سرعت سے میسج کھول کر پڑھا۔ جیسے ہی پڑھتی گئی آنکھوں کی پتلیاں سکڑنے لگیں۔

''جہاں جارہی ہو، بے فائدہ ہے، مناسب ہے کہ پلٹ آؤ.....'' ایک الجھا ہوا میسج تھا۔ عمائم دھک سے رہ گئی۔

''آخر اس میسج کا مطلب کیا تھا؟'' وہ متفکر سی سوچنے لگی تھی۔ اب وہ اسے کس بات سے منع کررہا تھا۔ عمائم سمجھی نہیں..... الجھتی رہی..... وہ خاصی ذہین تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ کوڈ ورڈ سمجھ لیتی۔ یہاں تو ایک الجھن ختم ہوتی اور دوسری کا آغاز ہوجاتا تھا۔

اس نے مزید کسی ٹیکسٹ کا انتظار کیا تھا۔ تاہم یہ انتظار بے سود تھا۔ کوئی اور میسج نہیں آیا البتہ حواس باختہ عالی کی کال ضرور آگئی تھی۔

''عمائم.....! تم کہاں ہو.....؟'' وہ گھبرا کر پوچھ رہی تھی۔ عمائم نے حیرت سے کہا۔

''جامعہ آرہی ہوں۔''

''آں ہاں.....'' عالی کچھ دیر سوچ میں ڈوبی پھر بے ساختہ چیخی تھی۔ ''تم نہ آؤ.....'' وہ جیسے رک، رک کر عجیب لہجے میں بولی تھی۔ عمائم حیران رہ گئی۔

''کیوں نہ آؤں.....'' اس نے خفگی سے پوچھا۔ ''میرا اتنا حرج ہورہا ہے، تائی امی بھی خفا لگ رہی تھیں۔ مزید چھٹی کی تو اور لوگ بھی سوال کریں گے۔ یہ لوگ مجھ سے اتنے بے خبر نہیں ہیں۔'' عمائم بولتی چلی گئی۔ عالی نے خاموشی سے اس کی پوری بات سنی تھی پھر مدھم لہجے میں بولی۔

''تمہیں نورس نے جامعہ سے اسٹرک آف کردیا ہے۔'' عالی کے مدھم لہجے نے اس کے سر پر کاری ضرب لگائی تھی۔ وہ جیسے بھونچکی رہ گئی۔

☆☆☆

محبت نے اسے منہ کے بل گرا ڈالا تھا۔ وہ گری تو بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی..... اس توڑ پھوڑ نے اسے پھر سے پہلے والی عمامہ بنادیا..... دلیر، خودسر اور ضدی عمامہ..... وہ سمجھ گئی کہ شام کی بزدلی کبھی اسے بابا کے سامنے کھڑا ہونے نہیں دے گی۔ وہ احمق اور ناسمجھ تھی۔ شام کی مروت، احسان مندی کو بزدلی سے تعبیر کرتی تھی۔ جہاں عمامہ کی سوچ ختم ہوتی تھی وہیں سے شام کی سوچ کا آغاز ہوتا تھا، وہ شام کو کبھی سمجھ ہی نہیں پائی تھی تو پھر اس کی محبت اور محبت کی رمزوں کو کیسے جان پاتی؟

اسے بس اتنی خبر تھی کہ شام پر فیقہ پھپھو کو مسلط کیا جارہا ہے اور خود اس کی ذات پر فرخ نامی ایک نامور وکیل کو مسلط کیا جارہا تھا۔

طے یہ پایا تھا کہ فیقہ اور عمامہ کی ایک ساتھ رخصتی کی رسم ادا کی جاتی..... فیقہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا، اعتراض شام کو بھی نہیں تھا۔ اعتراض ہوتا تو کم از کم ایک لفظ تو منہ سے ضرور پھوٹتا..... عمامہ کے دل کو ٹھیس پر ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ شام کی فرمانبرداری اس کے اندر بغاوت کو اور ابھار رہی تھی۔ پھر جیسے ہی اس نے اعلانِ جنگ کیا شام نے بہت آرام سے دادی کی باتوں میں آکر رخصتی پر آمادگی ظاہر کردی۔ اپنے سے دُگنی عمر کی بدصورت عورت کے ساتھ۔ بھلا یہ جوڑ بھی کوئی جوڑ تھا؟ پر جوڑ تو اوپر والا بناتا ہے، یہ عمامہ کیوں سمجھ نہیں پارہی تھی۔

شام دل سے راضی تھا یا نہیں..... کسی کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا..... تاہم طابہ بھابی کے طعنے عمامہ کا چین غارت کردیتے تھے۔ جب وہ اپنی سگی ماں تک اپنی ''خواہش'' نہیں پہنچا پارہی تھی پھر طابہ تک اس کے عشق کی

خبر کیسے پہنچی.....؟ اور جب طابہ کو پتا چل ہی گیا تھا پھر اسے کیا ضرورت تھی فیقہ پھپھو اور دادی کو سب کچھ بتانے کی؟ اور دادی کو جب سب کچھ پتا چل ہی گیا تھا پھر کیوں فیقہ کو زبردستی شام سے بیاہا؟ اور اپنا زور آزما کر پھر کیوں جان سے پیاری پوتی کے خلاف محاذ کھڑا کر لیا؟

ایک محبت اس کا جرم تھا جس کی اسے ''سزا'' دی جا رہی تھی۔ محض طابہ کی ''شر انگیزی'' پر دادی اور فیقہ نے اس سے بات چیت بند کر دی تھی۔ نہ صرف بات چیت بند کی بلکہ اس سے بھی پہلے دادی ''تصدیق'' کے لیے شام تک پہنچ گئیں اور شام کا جواب بھلا کیا ہو سکتا تھا؟ اپنے کمرے میں سارا، سارا دن بند رہتی عمامہ بس آتی جاتی ہواؤں سے پوچھ لیا کرتی تھی۔ اسے خود پر غصہ آتا اور نفرت محسوس ہوتی تھی۔ وہ گھٹ، گھٹ کر مرنے لگی تھی۔

دادی کتنی چالباز عورت تھیں۔ یہ اسے بہت بعد میں پتا چلا..... اسی شب انہوں نے شام کو اپنے کمرے میں طلب کیا..... جانے اندر کیسی عدالت لگی تھی؟ عمامہ کو کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ بے چین سی اپنے کمرے میں ہی سر پٹختی رہی۔

☆☆☆

دادی کے کمرے میں صرف شام اور شام کی خالہ تھیں..... وہ خالہ جس نے شام کو اس کے دلال باپ سے بہ مشکل آزاد کروایا تھا۔ وہ باپ جو بیس ہزار کے عوض شام کو بیچ رہا تھا۔ خالہ نہ ہوتیں تو جانے وہ آج کہاں ہوتا؟ بس کہانی کو وہاں سے جوڑا تھا جب وہ باپ کے ہاتھوں بکنے والا تھا۔ وہ اسے ایک، ایک بھولی بسری بات یاد دلا رہی تھیں۔

''تم گوشت کے لوتھڑے تھے صرف، جب میں منصور جیسے خبیث سے تمہیں چھین کر لائی تھی۔ اپنے پوتوں کے پوتڑے نہیں دھوئے تھے کبھی، میں تمہارے پوتڑے اپنے ہاتھ سے دھوتی تھی۔ تمہیں راتوں کو جاگ، جاگ کر پالا ہے، خود پیدا نہیں کیا..... پر پالنے کی ایک، ایک مشکل خود اٹھائی..... تمہیں اتنا بڑا کیا..... پڑھایا، لکھایا۔'' وہ تمہید سے بات شروع کر کے ابھی رکنا نہیں چاہتی تھیں مگر شام نے انہیں روک دیا تھا۔

''مجھے سب کچھ یاد ہے خالہ! مجھے یاد تو تب دلائیں گر میں بھولا ہوں..... مجھے ذرا، ذرا سی بات یاد ہے، آپ کی محبت، آپ کے احسانات، آپ آگے چلیں..... مجھے کیوں بلایا.....؟ یہ بتائیں؟'' اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ جن بیٹوں کے باپ دلال اور جواری ہوں اُن کے سر کبھی اٹھا نہیں کرتے۔ نہ اپنوں کے سامنے نہ غیروں کے سامنے اور نہ خود اپنے سامنے..... پھر وہ کیسے سر اٹھا پاتا۔

''مجھے طابہ نے بتایا ہے۔ عمامہ کو فرخ کے رشتے پر اعتراض ہے.....'' وہ الجھ کر گول مول سے انداز میں پوچھنے لگیں۔

''عمامہ کو اعتراض ہے تو اس سے پوچھیں.....'' شام نے آہستگی سے کہا۔ جانے کیوں اس نے نگاہ چرا لی تھی۔

''طابہ نے کہا ''وجہ'' تم ہو۔'' وہ صاف لفظوں میں بولیں۔ لہجے میں کچھ ''رڑک'' رہا تھا۔

''تو پھر؟'' شام نے الٹا سوال داغا..... وہ منہ کھولے اس کا اعتماد ملاحظہ کرنے لگیں۔ وہ تو ذرا بھی گڑبڑایا نہیں تھا۔ کیا طابہ نے سچ ہی کہا؟ ان کی جان پر بن آئی۔

''فرض کرو بیٹا! اگر تمہارے دل میں عمامہ کا خیال ہے بھی تو.....'' انہوں نے پھر سے بات جوڑ توڑ کر جتانی چاہی تھی جب ایک مرتبہ پھر شام نے انہیں روک دیا۔

''میں فرض کر لیتا ہوں کہ میرے دل میں عمامہ کا خیال نہیں بلکہ وہ خود پوری موجود ہے تو.....؟'' اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ کر خالہ کا چہرہ ملاحظہ کیا تھا۔ ان کی رنگت پیتا مبرگی تھی۔ وہ جیسے دھیرے، دھیرے لرزنے لگیں..... تب شام نے ادھوری بات مکمل کر دی تھی۔

''خالہ! میں فرض نہیں کرتا..... مفروضوں پر زندگی کی عبارت نہیں لکھتا۔ ریت کے گھروندے نہیں بناتا..... ادھوری کہانیاں نہیں لکھتا..... عمامہ کا ''باب'' بند ہے تو بند ہی رہنے دیں..... بند اور بندھ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بندھ ٹوٹ جائیں تو تباہی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا..... آپ بس ''بند'' تک رہیں..... عمامہ کا باب بند ہے، کوئی

کچھ بھی کہے..... سچ یا جھوٹ؟ میرے پاس کوئی وضاحت نہیں۔'' وہ دھیمی آواز میں بولتا چلا گیا تھا۔ تب خالہ اپنی جگہ سے کانپتی ہوئی اٹھی تھیں انہوں نے سر سے اپنی چادر اتاری اور شام کے پیروں میں رکھ دی۔ وہ جیسے ششدر رہ گیا تھا۔

''میری جان! میں جانتی ہوں، تمہارے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں..... فیقہ اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں بنتا..... بن ہی نہیں سکتا..... وہ تو کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی تمہیں آزما رہی ہوں..... فیقہ تمہیں چاہتی ہے، میری بچی نے عمر بھر خوشی کا ذائقہ نہیں چکھا..... میں تم سے بھیک مانگتی ہوں۔'' وہ شام کے پیر پکڑ کر اونچی آواز میں رونے لگی تھیں۔ تب وہ پوری جان سے ''تھرا'' اٹھا تھا۔ اس نے خالہ کا دوپٹا اپنے پیروں سے اٹھا کر ان کے سر پر لپیٹا..... وہ ان کے دونوں ہاتھ تھام کر بڑی دھیمی آواز میں بولا تھا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں خالہ! آپ یہ سب نہ بھی کرتیں..... تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا..... آپ سمجھتی کیوں نہیں خالہ! جو بغیر لڑے بغیر جنگ کیے ہتھیار پھینک دے، ایسے لوگوں کو ان ہتھیاروں سے زیر نہیں کرتے۔'' اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ وہ ان کے دوپٹے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دوپٹا جو کچھ دیر پہلے اس کے پیروں میں پڑا تھا۔

''اور ایک آخری بات، میرا حرامی باپ، میرا حوالہ ہے اور یہ حوالہ مجھے کبھی سر اٹھانے نہیں دیتا۔ اتنی سی بات تو ہے، جسے کوئی سمجھ نہیں پاتا..... نہ عمامہ، نہ عمامہ اور نہ ہی عمامہ.....'' وہ زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا۔ وہ کیا بول رہا تھا؟ خالہ سن نہیں پائی تھیں۔ سننا چاہتی بھی نہیں تھیں۔

☆☆☆

وہ بڑے دن بعد کچن میں آئی تھی۔ کام تو کچھ خاص نہیں تھا۔ بس چائے بنانی تھی۔ تاہم کچن سے اٹھتی اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو اس کے معدے میں گرہیں ڈالنے لگی تھی۔ اسے یاد آیا، بہت دن ہو چکے تھے اس نے پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا تھا اور پہلی مرتبہ طاہرہ نے بھی اس کی ''بھوک ہڑتال'' پر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اندر ہی اندر ماں سے بھی ناراض تھی۔ بن کہے ہر بات سمجھ جانے والی ماں ان دنوں عمامہ کے ''حال'' سے اتنی بے خبر اور انجان تھیں کہ وہ ماں کے کٹھور پن پر اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ اسے دل کا ''بوجھ'' بٹانے کے لیے ایک سامع کی ضرورت تھی۔ مگر کوئی مخلص سامع اس کے اردگرد نہیں تھا۔

اسے سلیب کے پاس گم صم کھڑا دیکھ کر طاہرہ نے گلا کھنکھار کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اور وہ طاہرہ کی طرف متوجہ بھی ہو گئی تھی۔ اس کی سرخ سوجی آنکھیں، شکن آلود لباس، بکھرے بال، وہ اتنی ''بے حال'' تھی کہ اندھوں کو بھی اس کے دل پر گزرنے والی ''واردات'' کی خبر ہو جاتی۔ وہ بہت نا سمجھ تھی، اسی لیے اپنے تاثرات اور کرب کو چھپا نہیں پا رہی تھی۔ اس کے خواب ٹوٹے تھے، اس کا دل ٹوٹا تھا، وہ خود کو کیسے سنبھال پاتی؟ اور طاہرہ بہت زمانہ شناس تھی وہ اس کے اندر تک اتر آئی تھی۔ اسے اندر تک کھنگال آئی تھی۔

''دل پر چوٹ لگے تو درد بہر حال ہوتا ہے..... اب دیکھو ناں..... دادی کی خود غرضی کا کوئی انت ہی نہیں..... کہاں فیقہ پھپھو اور کہاں شام کل کا معصوم بچہ..... اماں کی تو قریب کی نظر ہی کمزور ہے، ہاتھ میں آیا داماد، دادی کی گود میں پھسلا دیا۔ کم از کم اسٹینڈ تو لیتیں..... اب شام کے ساتھ تو صاف بات ہے صرف تمہارا ہی جوڑ بنتا تھا ناں..... پھر میں تو تمہارے دل کا حال بھی جانتی ہوں..... اور شام بھی بڑا گھنا ہے..... ظاہر نہیں کرتا..... پر لکھوا لو مجھ سے..... پور، پور تمہاری چاہت میں ڈوبا ہوا ہے۔'' وہ ہاتھ میں کٹا ہوا دھنیا پکڑے اس کے قریب آ گئی تھی۔ پھر اس کی پُرحشت، اداس، ویران اور بے رنگ آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

''شام کو تم سے بے حد محبت ہے..... پر یہ دادی کی چالبازی دیکھو..... احسانات کی گانٹھ اس کے سر پر رکھ کر فیقہ پھپھو پلو سے باندھ دی..... بھلا اس فیقہ کو خود حیا نہ آئی۔ اسے تو ببانگِ دہل انکار کر دینا چاہیے تھا۔ پر ہاتھ آئی لکشمی کو کون ٹھکراتا ہے۔'' طاہرہ کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔ وہ اس کے گال تھپتھپانے لگی تھی۔ شاید متوجہ کرنے کی کوشش تھی۔ عمامہ نے چونک کر بھاوج کو دیکھا۔ عام حالات میں عمامہ کی کبھی رافعہ اور طاہرہ سے نہیں بنی تھی۔ مگر اس وقت

عمامہ کو اپنی سب سے بڑی ہمدرد یہی بھاوج طابہ ہی لگی تھی۔ اس کا دل جیسے پھر بھر آیا۔

''آپ جانتی ہیں، شام بھی مجھ سے محبت کرتا ہے؟'' عمامہ نے نم آواز میں پوچھا۔ جیسے تسلی اور تصدیق چاہتی ہو۔ طابہ اس کی دلی کیفیت سمجھ رہی تھی اسی لیے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''میری بھولی عمامہ! اس بات میں بھی کوئی ''شک'' ہے؟ وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔'' طابہ نے اس کے گال پر گرتا آنسو انگلی پر چن لیا..... اب وہ بڑی سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تو پھر بولتا کیوں نہیں.....؟ خاموش کیوں ہے؟ فیقہ پھپھو کے لیے انکار کیوں نہیں کرتا؟ دادی کے سامنے نہیں بول سکتا تو بابا سے بات کرے ناں..... بابا تو اس کی بات سمجھیں گے۔'' وہ بے قراری سے بولتی چلی گئی تھی۔ وہ پہلے والی مغرور عمامہ سے مختلف لگ رہی تھی۔ وہ عمامہ جوان بھاوجوں کے پاس دو گھڑی کھڑے ہو کر بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی اس وقت کیسی ''بے بس'' کھڑی تھی۔

''تم اسے مجبور کرو گی تو بولے گا ناں..... ضرور بولے گا، بابا سے بھی کہے گا..... اور تمہارے بھائیوں کے سامنے بھی اسٹینڈ لے گا۔ آخر مقابل تمہاری پھوپی اور دادی ہیں، دیکھتے ہیں جیت کس کی ہوتی ہے پھوپی یا بھتیجی.....؟'' طابہ نے ہونٹوں کو سیٹی کی طرح گول کر کے جیسے اپنی بات سے لطف لیا تھا۔ وہ عمامہ کی کیفیت اور حالتِ زار پر مزے لے رہی تھی۔ بھابیوں کو پیر کی نوک پر رکھنے والی عمامہ کی بے بسی سے لطف لینا بھی ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ اس تجربے سے بے بہا فیض حاصل کر رہی تھی۔

''مجھے نہیں لگتا..... وہ دادی کے سامنے کبھی نہیں بولے گا۔'' عمامہ کو شام کی بزدلی پر رونا آ گیا۔

''بولے گا..... اس کا تو باپ بھی بولے گا..... مایوس کیوں ہوتی ہو..... پتھر تو نہیں ایک انسان ہی ہے ناں..... اور سامنے جنت کی حور کھڑی ہو..... تو اسے فیقہ جیسے برزخ کی طرف بڑھنے کون کا فر دے گا۔ وہ چپ ہے، سدا سے چپ ہے، تم اس کی چپ کو توڑ دو..... اسٹینڈ لو..... ابھی بگڑا تو کچھ نہیں..... رشتہ طے ہوا ہے ناں نکاح تو

نہیں..... تم ایسے دل چھوڑ کر بستر پر ڈھے گئیں..... اُدھر فیقہ خوشی کے شادیانے بجا رہی ہے، عمر بھر کسی نے گھاس نہیں ڈالی۔ اب ''بڑھاپے'' میں شام جیسا ہم سفر مل گیا ہے..... دھمالیں تو ضرور ڈالے گی۔'' طاہبہ نے لگے ہاتھوں نرم، نرم الفاظ سے اس کے ذہن پر لگے جالے اتار ڈالے تھے۔ وہ جالے جو شام کی بزدلی اور کھرے جواب نے ذہن پر تان دیے تھے۔ اس کے وہ دوٹوک الفاظ..... عمامہ بھلا کیسے بھول جاتی؟ طاہبہ تو جانتی ہی نہیں تھی۔ وہ شام سے بات کر چکی تھی۔ اپنی انا کو اس کے پیروں تلے رول کر کھرا جواب لے چکی تھی۔

''میں نے اس سے ہر آپشن پر بات کی تھی۔ وہ نہیں مان رہا..... فیقہ پھپھو سے شادی کر کے..... چاہے ساری عمر ناخوش رہ لے گا مگر ''حق'' اور ''محبت'' کے لیے نہیں لڑے گا۔'' عمامہ کو رونا آ گیا تھا۔ وہ بھل، بھل رونے لگی۔ طاہبہ نے اسے ساتھ لگا لیا۔

''تم بھی ناں عمامہ.....!'' طاہبہ نے اسے محبت اور لاڈ سے ڈپٹا..... ''نادان ہو، کم عمر ہو سمجھتی ہی نہیں..... اسے '' احسانات'' کا بار کہیں دیکھنے نہیں دیکھتا۔ اسے ان سب کی نگاہوں سے اوجھل کرو گی تو پھر اسے '' کچھ'' دکھائی دے گا۔'' طاہبہ نے کتنی مشکل بات اتنے آرام سے کہہ دی تھی۔ عمامہ اتنی مشکل بات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ پھر بھی سمجھنے کی کوشش کرنے لگی تھی اور یہ مشکل اس کی ''فہم'' نے آسان کر دی..... وہ طاہبہ کی بات کا مفہوم سمجھ گئی..... تبھی کچھ حیران اور متحیر تھی۔

''کیا یہ آسان ہے طاہبہ بھابی.....؟'' عمامہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''اسی گیٹ کے پار اللہ کی وسیع دنیا ہے عمامہ! پھر محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔'' طاہبہ کے ہونٹوں کی تراش میں پُراسرار مسکراہٹ آن رکی تھی۔ اس نے عمامہ کے چہرے پر بے خوفی کی چمک دیکھی۔ وہ کسی نتیجے پر پہنچ رہی تھی۔ وہ فطرتاً ضدی تھی اور فی الحال اپنی ضد کو کسی کے سامنے نہیں لا پا رہی تھی۔ وہ فطرتاً خودسر تھی تاہم اپنی خودسری کو ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ فطرتاً بے خوف تھی، نڈر تھی، دلیر تھی..... اسے ''راہ'' دکھانے کی دیر تھی۔ راستہ اس نے خود تلاش کر لیا۔

''اگر اماں، بابا، بھائی کوئی بھی نہ مانا تو.....؟ کیا وہ سول میرج کے لیے مان جائے گا؟'' عمامہ کی آنکھوں میں خوف پھڑ پھڑا رہا تھا۔ طاہبہ دھک سے رہ گئی۔ اس نے تو محض اسے ابتدائیہ بتایا تھا وہ تو لمحوں میں انجام تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے آہنی گیٹ کا رستہ دکھایا تھا۔ عمامہ تو اندھا دھند بھاگ پڑی تھی۔ طاہبہ نے تو محض؟ اور یہ عمامہ! کہاں تک پہنچ گئی تھی؟ طاہبہ ذرا دہل گئی۔

''آپ میرا ساتھ دیں گی بھابی؟'' وہ آس بھری نگاہ سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ طاہبہ چونک کر ہوش کی دنیا میں آئی۔

''ساتھ.....؟ نہیں..... نہیں عمامہ! میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی.....'' طاہبہ کو اچانک اپنے چار بچوں اور ایک شوہر کا خیال آ گیا تھا۔ کبھی بات کھل جاتی تو طاہبہ کا کچا چٹھا بھی سامنے آ جاتا..... وہ اپنا معاملہ کلیئر ہی رکھنا چاہتی تھی۔

''پھر بھی میں تقی سے بات کروں گی..... اور تم شام کا گریبان ضرور پکڑو..... لیکن اس سے بھی پہلے فرخ کے رشتے پر..... ''نہ'' بول دو۔'' طاہبہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

☆☆☆

اتنے دنوں سے گھٹ، گھٹ کر اپنے کمرے میں پڑی عمامہ نے اچانک فرخ کے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس کا انکار جیسے بھونچال لے آیا..... سب سے زیادہ غصہ دادی اور فیقہ کو چڑھا ہوا تھا۔ ماں تو عمامہ کے انکار کی جرأت پر حواس باختہ تھیں..... کم از کم انہیں عمامہ سے ایسی ''بہادری'' کی توقع نہیں تھی۔ بڑی بھابیاں حیران جبکہ چھوٹی دو پُرتجسس تھیں..... بھائیوں کے رویے نرم تھے، خصوصاً تقی اور طاہر بھائی..... دونوں نے ماں سے کہا۔

''آپ معاملہ معلوم کیجیے اماں! عمامہ بلاوجہ انکار نہیں کر سکتی۔'' وہ پریشان ضرور تھے تاہم مشکوک ہرگز نہیں تھے۔ انہیں عمامہ سے کسی ''بدفعلی'' کی توقع جو نہیں تھی۔ وہ معاملے کو بہت ہلکا لے رہے تھے۔ چھوٹی بہن جو نا سمجھ تھی، کچھ کم عمر بھی تھی۔ دور شہر شادی کے خیال سے خوفزدہ تھی..... حالانکہ شیخوپورہ اتنا دور بھی نہیں تھا۔ ان کے نزدیک

عمامہ کے انکار کی کوئی بڑی ''وجہ'' ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ چھ بھائیوں کا عمامہ پر اعتبار تھا جس کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔

طاہرہ خود عمامہ سے تفصیلی پوچھ گچھ چاہتی تھیں، ایک تو اتنے دن سے وہ گھریلو معاملات سے کٹی ہوئی تھی، کمرا بند کیے پڑی رہتی اور طاہرہ بھی جان کر اسے ''چھیڑتی'' نہیں تھیں۔ جانے ان کے دل کو کیسے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ جیسے وہ بیٹی سے کچھ پوچھنے کی غلطی کر لیتیں تو ہر ''بھرم'' کی دیوار گر جاتی۔ وہ اسی لیے عمامہ سے نگاہ چرائے ہوئے تھیں حالانکہ ایک ماں کے اندر جو خطرے کا الارم اللہ نے قدرتی طور پر لگا رکھا تھا وہ وقتاً فوقتاً بجتا ہی رہتا تھا پر وہ جان کر کان بند کیے رکھتیں۔ انہیں اتنا تو اطمینان تھا کہ ان کے گھر کی فصیلیں اتنی اونچی نہ سہی شام کے ''کردار'' کی فصیل بڑی اونچی تھی۔ عمامہ کوئی انتہائی قدم اٹھا ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ شام اس کی حوصلہ افزائی کبھی نہ کرتا۔ ان کی ساس کا دعویٰ تھا انہوں نے گوشت کے لوتھڑے جیسے شام کو پالا پوسا ہے، حالانکہ سچ تو یہ تھا کہ شام کی پرورش اور تربیت طاہرہ نے کی تھی۔ وہ انہی کی گود میں پرورش پا کر اتنا بڑا ہوا تھا..... انہیں اپنی تربیت اور پرورش پر مان نہیں تھا۔ انہیں شام کے ''کردار'' پر تفاخر تھا۔ اور وہ ان کے اس فخر کو کبھی نہ توڑتا۔

اور اس وقت صالح صمحانی..... تقی اور طاہر کی بات سن کر خاموشی سے اٹھ گئے تھے، عمامہ کا انکار اتنا معمولی واقعہ بھی نہیں تھا جو وہ ''بے خبر'' ہی رہتے۔ اس وقت عمامہ اپنے کمرے میں تھی اور سو رہی تھی انہوں نے صبح عمامہ سے بات کرنے کا سوچ کر قدم باہر کی طرف بڑھا دیے تھے۔ سر پر رکھے عمامہ شریف پر ایک ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کے قدموں میں عجیب سی لرزش تھی۔ اور سب سے عجیب بات تو یہ تھی کہ وہ شام اور عمامہ کو ایک ساتھ سوچ رہے تھے۔ انہیں اچانک شام کا بجھا چہرہ یاد آیا..... ساتھ اپنی ماں کی عجیب سی ضد اور فیصلہ..... انہیں ماں کے فیصلے سے سخت اختلاف تھا۔ اور ماں سے پہلی مرتبہ زندگی میں تلخ کلامی ہوتے، ہوتے رہ گئی تھی۔ کہیں بہت اندر انہوں نے شام کے ساتھ عمامہ کو سوچ رکھا تھا۔ تاہم یہ سوچ ایسی تھی کہ کبھی وہ بیوی سے بھی شیئر نہیں کر سکے تھے۔ پھر اماں کا اچانک بہیمانہ فیصلہ..... اتنا بے جوڑ اور ظالمانہ فیصلہ..... وہ تو شام کی وکالت کرتے الجھ گئے تھے۔ اماں نے آخر یہ سوچا بھی کیسے تھا؟ اور جب انہوں نے ماں سے اختلاف کیا تب انہوں نے صرف ایک بات کہہ کر ان کا ہمیشہ کے لیے منہ بند کروا دیا تھا۔

''تم بھی بیوی کی طرح خود غرض ہو صالح! عمامہ کو سوچتے ہو، فیقہ کو نہیں..... بہن پر بیٹی فوقیت رکھتی ہے، تم میں سے کسی کو فیقہ کا احساس نہیں..... میری بیٹی عمر بھر اپنی ذات کی قبر میں تنہا سسکتی رہی..... بھائی کی دہلیز نے اسے بوڑھا کر دیا پھر بھی پیر دہلیز سے باہر نہ نکالا..... تمہاری عزت کی خاطر ہونٹ سی لیے..... ہر طرف نگاہ دوڑا کر دیکھو..... تمہاری بہوؤں کے آنچل لہراتے ہیں، وہ انہیں دیکھتی ہے اور اپنا من مار لیتی ہے..... تم میں سے کسی کو میری ''اجڑی'' بیٹی پر ترس نہیں آتا.....'' اماں کا وار اتنا گہرا تھا کہ صالح صمحانی ''کراہ'' کر رہ گئے تھے پھر بھی انہوں نے اتنا ضرور کہا۔

''پر اماں.....! آپ بھی فیقہ کے لیے اپنے معیار سے نیچے نہیں آئی تھیں اس کا اتنا وقت ضائع کیا..... اب تک وہ اپنے گھر بار کی ہو چکی ہوتی.....'' وہ پیشانی مسلتے ہوئے آہستگی سے بولے تھے۔

''ہاں..... تو کیوں تمہاری فیکٹری کے مزدوروں سے بیاہ دیتی؟'' اماں نے چمک کر کہا۔ ''سارے چوہڑے، چمار میری فیقہ کے لیے ہی رہ گئے تھے۔'' وہ غضبناک ہوئیں۔

''چوہڑے چمار کہاں تھے، بس آپ بھی اماں..... اب رہنے دیں، شرافت نجابت کے ترازو میں عمر بھر ذات پات کو تولتی رہیں۔'' وہ دبی آواز میں خفگی سے بولے تھے۔ کتنے ہی رشتے اماں کی بے جا ضد کے ہاتھوں ناکام ہوئے۔ نتیجہ فیقہ کی بڑھتی عمر کی صورت میں نکلا..... اب تو اس پر بحث بیکار ہی تھی۔ اب اگر فیقہ کا سوچتے تو شام کے ساتھ زیادتی کا خیال مارے ڈالتا..... اماں نے بھی کس مشکل میں پھنسا دیا تھا۔ وہ کبھی جھنجلائے نہیں تھے مگر اب بار، بار جھلا جاتے تھے۔

''پھر بھی اماں! شام کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ کیا پالنے پوسنے کا خراج لیں گے، بچے کی اپنی کوئی مرضی، شوق، تمنا، خواہش نہیں.....'' وہ رنجیدہ سے بولے تھے۔ تصور کے پردے پر پھر عمامہ اور شام کا چہرہ لہرایا تھا۔

''مجھے تو شام اپنے بیٹوں سے بڑھ کر پیارا ہے..... اتنا فرمانبردار بچہ کہ حد نہیں..... کبھی شکایت نہیں لایا.....''
ان کی آواز ٹوٹنے لگی تھی۔ بات اپنی بیٹی کی تھی..... انہیں ''من'' مارنا ہی پڑا..... کیسے اپنے منہ سے بیٹی کو سامنے لے آتے؟ جب اماں خود اپنی بیٹی کے لیے خواہش رکھتی تھیں۔

''اس کا شوق، تمنا، خواہش بھی پوری کروادوں گی۔ پہلے فیقہ کو نمٹالوں.....'' اماں نے جیسے ناک پر سے مکھی اڑائی تھی۔ صالح صمحانی ''دق'' بیٹھے رہ گئے تھے۔ ماں کی بات کا مفہوم سمجھ نہیں آیا تھا۔ وہ الجھی نظروں سے انہیں دیکھتے رہے تھے۔ اماں نے ان کی الجھن دور کردی تھی۔

''شام کی دوسری شادی کروادوں گی..... کسی خوب صورت، کم عمر اور تعلیم یافتہ لڑکی سے..... ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ اسلام میں چار کی گنجائش ہے پھر تو شام سے زیادتی نہ ہوگی ناں.....؟'' انہوں نے جیسے بیٹھے بیٹھائے بیٹے کو سن کردیا تھا، لاجواب کردیا تھا۔ وہ گم صم رہ گئے تھے۔ ''تو اماں نے ہر آپشن پر غور کر رکھا تھا، شام کی دوسری شادی.....! اس کی مرضی اور پسند سے فیقہ کی نیا بھی پار لگتی اور شام بھی خوش ہوجاتا مگر اس سب پلاننگ میں عمامہ تو کہیں نہیں آتی تھی۔'' ان کا دل بجھ سا گیا تھا۔ شام سے دستبرداری کا خیال ہی بڑا سوہانِ روح تھا۔ انہوں نے تو بہت سال پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ عمامہ اور شام..... انہوں نے سر جھٹک دیا..... رستے میں دو تین بلاک تھے جن سے ٹھوکر لگتے، لگتے بچی..... پھر بھی عمامہ اور شام سے دھیان ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ گلی کے نکڑ میں مین ہول تھا۔ جس کا ڈھکن کسی نے بچے نے شرارتاً اٹھا رکھا تھا۔ وہ اپنے دھیان میں گم جارہے تھے۔

''فیقہ کے مقابل بھلا عمامہ کیسے آئے؟'' انہوں نے سر جھٹک دیا تھا تبھی بہت زور سے ٹھوکر لگی..... وہ منہ کے بل گر پڑے تھے..... اور جیسے ہی وہ گرے ان کا عمامہ شریف ہول پر جا پڑا..... ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ جیسے حواس باختہ سے ہول پر جھک کر اپنا عمامہ اٹھانے لگے۔

☆☆☆

باہر گہری رات اتر آئی تھی۔

عمامہ دبے قدموں اپنے کمرے سے نکلی..... گھر بھر پر ہو کا عالم تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا، بھابیاں اور بچے اپنے کمروں میں جاچکے تھے۔ بھائی سب ہی کمروں میں بند تھے۔ عشا کے بعد کوئی بھی گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ بس آج بابا کہیں نکل گئے تھے، نماز کے بعد بھی نہیں آئے۔ عمامہ نے سب کے سوجانے کی تسلی کرلی تھی۔ اب وہ ننگے پاؤں باہر نکل آئی۔ ہر طرف خاموشی اور مہیب سناٹا تھا۔ اس کے دل میں لحظہ بھر کے لیے خوف آیا۔ پھر وہ سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگی۔ معاً اسے آہٹ سی سنائی دی تھی، اس کا دل لرزنے لگا۔ ڈرتے، ڈرتے مڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے منال کھڑا تھا۔ لاجوردی کنٹھے والا..... رنگ برنگا سا منال..... اس نے منال کو جھک کر اٹھایا، اس کا لاجوردی کنٹھا کھینچا اور دبی آواز میں بولی۔

''جا..... چلا جا..... مجھے شام سے بات کرنی ہے۔'' اس نے نرمی سے منال کی نرم فر والی کھال پر پیار کیا..... وہ جیسے سمجھ کر باغ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ وہ دھک، دھک کرتے دل کے ساتھ جالی دار دروازے تک آگئی تھی۔ اس نے کنڈا ہلایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا..... وہ اندر بڑھ آئی تھی۔ تاہم شام کے کمرے تک جانے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ وہ کمرے کے باہر کھڑی رہی..... دروازہ کھلا تھا پر سامنے کا پردہ گرا تھا، نہایت مضبوط کپڑے کا پردہ تھا۔ جیسے غف کا کپڑا جیسے کمبل ہو..... اندر اور باہر کا منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔

وہ کھڑی رہی اور لرزتی رہی۔

پھر بیتتے وقت نے اسے گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر چٹکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ وہ سامنے ہی بیٹھا تھا۔ کسی غیر مرئی نکتے پر نگاہ جمائے، اس کے چہرے پر سوچوں کا جال بنا تھا۔ قریب میز پر چائے کا مگ رکھا تھا۔ ٹھنڈی برف ہوئی چائے، وہ سوچوں میں اتنا گم تھا کہ چائے پینا ہی بھول گیا تھا۔ عمامہ دبے قدموں اندر آئی

تھی..... پھر اس نے آرام سے چائے کا کپ اٹھالیا تھا۔ کپ آدھا خالی تھا، اس نے ذرا بلند آواز میں ٹھنڈی چائے کی چسکی بھری تھی۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ بری طرح ٹھٹک گیا تھا۔ اور کسی بڑے جھٹکے سے سنبھل کر کھڑا ہوا تھا۔

''عمامہ! تم یہاں.....؟'' وہ گھبرایا نہیں تھا تاہم پریشان ضرور ہوا تھا۔ شام اس وقت عمامہ کے ''انکار'' کو سوچ رہا تھا۔ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ وہ خود بھی سوچوں سے نکل کر مجسم آ کھڑی ہوگی..... وہ لمحہ بھر کے لیے سن ہو گیا تھا۔ عمامہ اسے دیکھتے ہوئے مزے سے ٹھنڈی ٹھار اس کی بچائی ہوئی چائے پیتی رہی۔ جیسے وہ یہاں چائے پینے تو آئی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے عمامہ کو سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس کا فیقہ سے رشتہ طے ہوا، اپنا فرخ سے رشتہ طے ہوا۔

''بار، بار کے ان جھٹکوں سے مجھے سمجھ آ رہی ہے..... تم کوئی زلزلہ ضرور لاؤ گی.....'' اس نے آگے بڑھ کر کھلی کھڑکی کو کچھ اور کھول دیا تھا۔ پھر پردہ بھی ہٹا کر باندھ دیا۔ ''اور مجھے نظر آ رہا ہے کہ میرے تنگی کے دن آنے والے ہیں۔'' اس کی آواز میں کانچ چٹخ رہے تھے۔

''مجھ پر زندگی تنگ ہوگی..... شاید نصیب میں یہی لکھا ہے..... دھتکار اور پھٹکار۔'' وہ اذیت سے مسکراتا ہوا عمامہ کی طرف پلٹا۔ وہ چائے ختم کر چکی تھی۔ اب بہت سکون سے اسے سن رہی تھی۔ وہ چپ ہوا تو آرام سے بولی۔

''جب پھٹکار اور دھتکار ہی نصیب ہے تو اپنی مرضی کی پھٹکار کیوں نہ ہو.....؟ کچھ حاصل، حصول کے بعد پھٹکار.....'' اس نے بہت گہری بات کی تھی۔ شام جیسے اندر تک چونک اٹھا۔

''یہ تمہارے اپنے الفاظ نہیں ہیں عمامہ! اس معاملے میں کسی اور کو بھی گھسیٹ لیا ہے؟'' وہ جیسے سن سا ہو کر بول پڑا تھا۔ عمامہ کے رنگ ڈھنگ چونکانے والے تھے۔ وہ پہلے سے بڑی بااعتماد نظر آ رہی تھی۔ شام کے درست اندازے نے اسے لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا ڈالا۔

''نہیں تو.....'' وہ ذرا ہکلائی..... جبکہ شام کے اندر دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔

''دیکھو عمامہ.....!'' شام گھبرا گیا۔ پریشان ہو گیا۔ ''دیکھو عمامہ! تم غلط کر رہی ہو؟ کیوں انکار کیا ہے؟ اب چاروں طرف سے سوال اٹھیں گے۔ جب ''وجہ'' پوچھی جائے گی تو کیا بتاؤ گی.....؟'' وہ جیسے پھٹ پڑا تھا..... شاید وہ عمامہ کا ہی منتظر تھا تاکہ اپنی بھڑاس نکال کر اس کا دماغ ٹھکانے لگا سکتا۔

''میں تمہارا نام لوں گی.....'' اس نے بڑے سکون سے دھماکا کیا تھا..... وہ چکرا کر رہ گیا۔

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔'' شام کے ہونٹ بہ مشکل پھڑپھڑائے تھے۔ وہ مضطرب و بے چین ہو گیا..... گھبرا گیا۔

''میں ایسا ضرور کروں گی.....'' عمامہ کا انداز اٹل تھا۔ وہ جیسے کچھ ٹھان کر ہی آئی تھی۔

''اچھا.....'' شام کا انداز طنزیہ ہو گیا..... ''میں ساتھ دوں.....؟ یا نہ دوں.....؟'' بڑا گہرا وار تھا..... عمامہ اپنی محبت کے پورے بت کے ساتھ لمحہ بھر میں ڈھے گئی تھی تاہم پھر بھی خود کو کمزور ظاہر کیوں کرتی؟ خود کو ڈھاتی کیوں؟ گراتی کیوں؟

''تم..... ہر دفعہ مجھے اتنا ہی ''خوار'' کرتے ہو۔'' عمامہ کی آنکھیں بہنے لگی تھیں حالانکہ وہ رونا تو نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی..... آنسو تھے کہ گرتے ہی جا رہے تھے اور شام کا جیسے اصل امتحان شروع تھا..... عمامہ کے گرتے، بہتے، بے مول ہوتے آنسو..... بھلا شام کی اوقات کیا تھی؟ جو وہ عمامہ کے بہتے آنسوؤں کو چن لیتا..... وہ تو کبھی ہاتھ بڑھانے کی جرأت کر ہی نہیں سکا تھا..... اب بھی ''ضبط'' کی انتہا تک پہنچ کر رخ موڑ گیا۔ عمامہ کے دل کو پھر سے دھکا لگا تھا..... یہ تو وہی تھی..... صوفی صالح صمجانی کی اکلوتی نورِ نظر..... طشتری میں اپنی محبت، عزتِ نفس، وقار اور انا کو سجا کر لے آتی..... اور ہر دفعہ ریزہ، ریزہ ہو کر واپس پلٹتی۔ وہ تو بار، بار اسے لفظوں کی مار مارتا اور دھتکارتا تھا۔ اسے پھر بھی سمجھ نہ آتی۔ یہ محبت، یہ کم بخت محبت ایسے ہی ''خوار'' کیا کرتی ہے..... جیسے عمامہ صالح صمجانی کو کر رہی تھی۔

''پھر آتی کیوں ہو خوار ہونے.....'' وہ دل پر پتھر رکھ کر چٹخا..... عمامہ کا دل پھر سے لہو، لہو ہوا تھا۔ وہ سرخ، اجاڑ آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''خوار ہونے نہیں، تمہیں کرنے.....'' اچانک اس کے دماغ کو غیظ چڑھ گیا تھا۔ شام کا دل سکڑ کر پھیلا..... وہ پلٹ کر اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔ پھر نگاہ چرا گیا۔

''عمامہ! پاگل مت بنو کوئی کمزوری مت دکھاؤ..... تمہاری ذرا سی نادانی مجھے سب کی نگاہ سے گرا دے گی۔'' وہ بکھر گیا تھا۔

''تمہیں صرف اپنا اور اپنی عزت کا خیال ہے، میری محبت کا نہیں..... مجھے یہاں تک لائے ہی کیوں.....؟'' عمامہ چلا اٹھی۔ شام اس الزام پر دنگ رہ گیا۔

''میں تمہیں یہاں تک نہیں لایا.....؟ یہ خرافات تمہاری اپنی پالی ہوئی ہیں..... مجھے تو اس بیکار محبت وحبت کا کچھ پتا نہیں..... میں نے کب تم سے ''اقرار'' کیا؟ کب ''وعدے'' اور ''عہد'' باندھے.....؟ پچھلے بیس سال پر نگاہ ڈالو..... میرے دفتر صاف اور شفاف ہیں..... تم خود عمامہ! تم خود اس راہ پر اندھا دھند بھاگی ہو..... اب مجھ پر الزام رکھو گی تو میں..... میں صاف مکر جاؤں گا..... تمہیں بتا رہا ہوں..... اب بھی خود کو لگام ڈال لو، مجھ میں اپنی ''عزت'' کی دھجیاں اٹھانے کا حوصلہ نہیں.....'' شام کے الفاظ عمامہ کے بت کدے کو سنگسار کر رہے تھے۔ وہ جیسے پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل جیسے شام کے پیروں تلے سسک رہا تھا۔ اسے شام کے کسی بھی لفظ پر یقین نہیں آیا۔ وہ لمحہ بھر میں حال سے بدحال ہوگئی۔ وہ شام پر چلانے لگی..... اس کا گریبان پکڑ کر چیختی رہی..... وہ اونچی آواز میں رو رہی تھی..... پھر اس کے پیروں میں بے دم ہو کر گر پڑی۔

''میرے ساتھ ایسا مت کرو..... پلیز شام! ایسا مت کرو..... محبت نہیں کرتے نہ کرو، مجھے نہیں چاہتے نہ چاہو..... پر یوں مجھے چاہنے سے انکار مت کرو..... کم از کم میرے منہ پر یہ الفاظ مت بولو..... ورنہ میں خود کو ختم کر لوں گی..... محبت کے اس سفر میں عمامہ تنہا ہے..... بالکل تنہا ہے..... تم ساتھ نہیں، تم پاس نہیں..... میرے وجود کے سہام (ٹکڑوں) کے لیے یہی احساس کافی ہے۔'' عمامہ فرش پر سر پٹختی کوئی جنونی لگ رہی تھی۔ کوئی دیوانی لگ رہی تھی۔ کوئی سر پھری لگ رہی تھی۔ وہ روتے، روتے بے دم ہو کر گر پڑی..... پھر کھڑی ہوئی پھر گر پڑی..... پھر کھڑی ہوئی پھر گر پڑی تھی۔ شام سے اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ ضبط اور صبر کے پل صراط پر کھڑا رہا۔ پیچھے ہٹا نہ آگے بڑھا..... وہ اٹھتی گرتی رہی تھی..... یہاں تک کہ شام بھی بے دم ہو کر دوزانو اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں عمامہ کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ بنک سنک سے درست عمامہ نہیں تھی..... یہ فیشن ایبل اور ماڈرن سی عمامہ نہیں تھی۔ اسے تو خود کو سجانے اور سنوارنے کا جنون تھا۔

چہرے پر میک اپ کے غازے ملنے کا شوق تھا۔ بال بنانے کا شوق تھا۔ یہ تو کوئی ژولیدہ حال عمامہ تھی۔ اسے یہاں تک اس مقام تک اس حال تک شام کی محبت لے آئی تھی۔ اور وہ اتنا بے رحم اور سنگ دل تھا کہ ایک بوند برابر لفظ کا مرواد ار بھی نہیں تھا۔ کم از کم ایک چھینٹ برابر لفظ کی تو عمامہ کی محبت ''حق دار'' تھی ناں..... اور شام ایسا مفلس، کنگال اور قلاش تھا کہ ایک چھینٹ برابر لفظ بھی عمامہ کے جلتے دل پر نہ گراتا..... اس کا دل پہلو میں پگھلتا اور تڑپتا رہا..... اور وہ بے خود سا، بے حال سا، بے چین سا عمامہ کو دیکھتا رہا..... پھر اس کے ہونٹ ذرا سا کھلے تھے پھر رات کی خاموشی اور بہتے وقت نے بڑے ٹھہر کر شام کی آواز، لہجے اور لفظوں کے اتار چڑھاؤ کو سنا تھا۔

''عمر بھر کے لیے یہ احساس کیا کافی نہیں عمامہ! تم شام کی وہ محبت ہو جو چڑھنے سے پہلے ہی ڈھل گئی..... تم تو میرا لاحاصل عشق ہو عمامہ!'' جب وہ لرزتی کانپتی اٹھ کر چلی گئی تھی تب وہ اونچی آواز میں زیر لب بڑبڑاتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ چوری چھپے عمامہ کا پیچھا کرتی طابہ نے شام کے وہ آخری الفاظ سن لیے..... وہ جیسے تھرا اٹھی تھی۔ پھر اس نے بڑے سکون سے دادی اور فیقہ کو بھی ''تھرا'' ڈالا تھا۔

(جاری ہے)

کون جانے رب کسے نواز دے

عنبرین ابدال

اس کا موڈ کل سے سخت آف تھا اور یہ کوئی نئی بات تھوڑی تھی۔ ہر ماہ کے آخر میں اشعر کو یمنیٰ کا یہ روپ سہنا پڑتا تھا۔ مہنگائی تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی اور ساتھ میں یمنیٰ کا غصہ بھی۔ وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پاتا تھا۔ جو اس کے ہاتھ میں تھا کرتو رہا تھا پھر بھی آخر میں بالکل خالی ہاتھ ہو جاتا۔

''لاکھ بچت کروں خرچے ہیں کہ نہ جانے کہاں سے نکل آتے ہیں۔'' وہ مسکینی سے کہہ رہا تھا۔

''اپنے پاس ہے نہیں لوگوں کو دیتے پھرو، یہ کون سی کتاب میں لکھا ہے۔'' یمنیٰ نے تپتے ہوئے ..... ٹرے تقریباً پٹخنے کے انداز میں اس کے سامنے رکھی۔ اشعر نے بے بسی سے اپنے بارہ سالہ بیٹے اشتر کی طرف دیکھا۔

''بابا چپ۔'' اس نے گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ وہ اپنے بیٹے کی سمجھداری پر مسکرا دیا۔

''ہاں، ہاں اڑا لیں میرا مذاق۔'' یمنیٰ نے اسے مسکراتا دیکھ کر ایک بار پھر آڑے ہاتھوں لیا اور اندر کمرے میں چلی گئی۔

''اوہ یار، کیا چیز ہے تمہاری ماں.....'' اشعر نے

اشتر کے بال بکھیرتے ہوئے کہا۔

''چھ دن کی بات ہے بابا پھر دیکھیے گا مما کو، جب آپ کو پے ملتی ہے ناں تو بس دیکھنے والی.....'' ابھی اشتر کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ یمنیٰ نے ٹیبل پر چند سو، سو کے نوٹ لا کر پٹخے۔

''آپ جانیں آپ کے خرچے، مجھ سے نہیں جیا جاتا سسک، سسک کر میں ایک سوٹ کے لیے ترس، ترس کے مرگئی اور جناب دیالو بنے دوسروں کو پیسے.....'' بولتے، بولتے حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا پھنس گیا۔

''کم آن یمنیٰ مجھے احساس ہے کہ پچھلے دو ماہ سے تم سوٹ کی فرمائش کر رہی ہو پر چندا کیا کسی کی زندگی سے بڑھ کر ہے سوٹ..... آئی پرامس میں اس ماہ تمہیں ضرور لے کر دوں گا، پکا وعدہ..... اور وہ بیچارہ تو لے بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے ہی اسے زبردستی دیے، ماں کسی کی بھی ہو ماں ہی ہوتی ہے، وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہیں اور میں تمہاری پسند کا سوٹ.....''

''مجھے نہیں چاہیے کچھ بھی۔'' وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی کمرے میں چلی گئی۔

''بابا آ کے منا لیے گا، اب چلیں مجھے دیر ہو جائے گی اسکول سے۔'' وہ ماں کو دیکھتے ہوئے اشعر سے بولا۔ تو وہ بہ مشکل مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہم جا رہے ہیں لاک لگا لو۔'' اشعر نے چھوٹے سے لاؤنج سے ہی آواز دی اور بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر دروازہ پار کر گیا۔

''بابا آپ فکر نہیں کریں میں جلدی، جلدی پڑھ رہا ہوں، دل لگا کر پھر جاب کر لوں گا مما کو جب کہیں گی ناں ہم سوٹ لے دیا کریں گے۔'' اشتر نے بائیک پر بیٹھ کر اپنی پلاننگ بتائی تو اشعر کو اس پر ڈھیروں پیار آ گیا۔

☆☆☆

''مرتے رہو، سلگتے رہو بس۔'' یمنیٰ غصے میں... بڑبڑاتی ہوئی چیزیں سمیٹتی رہی۔ جب کمرے سے نکلی تو چھوٹی سے ٹیبل پر ناشتا اسی طرح پڑا تھا اور پیسے بھی..... اک پل کے لیے اسے شرمندگی نے آ گھیرا۔

''سارا دن اشعر بھوکا رہے گا، میں بھی ناں کیا ضرورت تھی صبح، صبح بکواس کرنے کی۔'' وہ اسی چیئر پر بیٹھ کر نہ جانے کیوں رو پڑی سب کچھ ٹھیک تھا۔ وہ تینوں کتنی پُرسکون اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے اگر بہت زیادہ نہیں تھا تو کم بھی نہیں تھا۔ ان کی چھوٹی سی فیملی دنیا کی سب سے ہیپی فیملی تھی۔ پھر سب بدل گیا۔ اشعر کی جاب نامعلوم وجوہات کی بنا پر چھوٹ گئی۔ اچھی بھلی گورنمنٹ جاب سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اصل میں کرپشن کسی اور نے کی نام اشعر کا بھی آ گیا۔ اشعر کو ڈس مس کر دیا۔ امید تو تھی کہ جاب اسے واپس مل جائے گی مگر اسی امید پر دو سال گزر گئے کچھ چارہ نہ بن پڑ رہا تھا۔ پھر چند ہزار کی نوکری میں بنتا ہی کیا تھا، اشتر کی فیس، کپڑے، بل، گھر کے خرچے وہ چکرا کے رہ گئی۔ اشعر نے پارٹ ٹائم جاب بھی اسٹارٹ کر لی پھر بھی خرچے تھے کہ کم نہیں ہوتے۔ خاندان برادری میں ملنا جلنا بھی پڑتا تھا۔ وہ تھک سی گئی تھی اب دل کو مار، مار کر گھر کے کام نپٹا کے فارغ ہوئی۔ اشعر کی پسند کا کھانا بنانے کا سوچ کے وہ پیسے اٹھا کر گھر کو لاک کیا اور ساتھ والے گھر میں چلی آئی۔

''مارکیٹ جاؤ گی؟''

''ہاں کیوں نہیں، میں ابھی خود آنے والی تھی تمہاری طرف۔'' رخسار اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''بیٹھو پہلے چائے پی لو۔''

''نہیں رخسار دیر ہو جائے گی۔ ویسے موسم بھی ایسا ہو رہا ہے کبھی بارش ہی نہ ہو جائے۔'' اس نے بادلوں کو آسمان پر اٹکھیلیاں کرتے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں چلو، اچھا بیٹا گھر کو لاک لگا کر رکھنا میں جلدی آ جاؤں گی اور دادی کو چائے بنا کر دے دینا۔'' رخسار نے اپنی بیٹی کو ہدایات دی اور اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ ''ہاں تو اب بتاؤ کیا بات ہے۔ اشعر بھائی سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟'' رخسار نے بیزار موڈ کو دیکھ کر پوچھا۔

''ارے نہیں بس ایسے ہی۔'' یمنیٰ نے ٹالا۔ دونوں باتیں کرتی ہوئی قریبی مارکیٹ چلی گئیں۔

گروسری اسٹور ابھی دور تھا رخسار چلتے ہوئے ایک دکان کی طرف بڑھی۔

"چلو آؤ یہاں کچھ کپڑے دیکھتے ہیں۔" وہ اسے لے کر ایک کپڑے کی دکان میں گھس گئی۔ سردی شروع ہو چکی تھی اسی خیال سے رخسار تین گرم سوٹ لے کر وہاں سے نکلی۔ تم بھی لے لیتیں یار یمنیٰ کتنے پیارے سوٹ ہیں اور قیمت کچھ بھی نہیں۔" اس کے نزدیک پندرہ سو، اٹھارہ سو کچھ بھی نہیں تھے۔ یمنیٰ کرب سے مسکرادی۔ اس کے پرس میں بہ مشکل بارہ سو تھے جس میں اشعر کو منانے کے لیے آج کی دعوت اور باقی کے دن بھی گزارنے تھے۔

ابھی وہ آگے بڑھی ہی تھیں کہ دو چھوٹے، چھوٹے بچوں پر نظر پڑی جو وہاں کھڑی گاڑیاں دھو رہے تھے۔ بچے نیم برہنہ تھے حتیٰ کہ پیر بھی جوتیوں کی قید سے آزاد تھے۔ اتنی سردی میں ٹھنڈے پانی سے گاڑیاں دھونا کمال تھا۔ یہ دونوں سویٹر اور شالوں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ یمنیٰ کو انہیں دیکھ کر بہت ترس آیا۔ ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی ایک نظر ان بچوں پر.....

وہ آگے بڑھی اور بچوں کو پچاس، پچاس روپے دینے لگی بچوں نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا اور اشارہ کیا کہ وہ سامنے دے دو جہاں ایک عورت کپڑا بچھائے پاپڑ، واپڑ بیچ رہی تھی۔ یمنیٰ اس عورت کی جانب بڑھی مگر عورت نے یونہی پیسے لینے سے انکار کردیا۔

"تم مجھ سے یہ چیزیں خرید لو" وہ عورت بولی۔

یمنیٰ کو جانے کیوں سردی کا احساس دوچند ہوا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "واہ مولا کہاں کسی کو اتنا دیا کہاں یہ....." چند لمحے اس نے سوچا اور گہری سانس لے کر وہاں سے اٹھی اور رخسار کے ساتھ سامنے لگی ریڑھیوں سے بچوں کے گرم کپڑے خریدنے لگی۔

"ارے یہ کس لیے؟" اسے چھوٹے بچوں کے کپڑے خریدتے دیکھ کر وہ حیرانی سے بولی۔

"چپ تو کر رخسار۔" وہ جلدی سے بولی اور ریڑھی والے سے بھاؤ کرنے لگی۔ بہ مشکل ساڑھے آٹھ سو میں اس نے چار سوٹ خریدے۔ ایک سو کی جرابیں اور ساتھ میں دو چھوٹی ٹوپیاں بھی لے لیں۔ اس کی اتنی ہی حیثیت تھی اور طاقت بھی۔

"یہ ریڑھی والے بھی نہ، نہ کرتے، کرتے بھی اتنے پیسے بنادیے۔" رخسار بڑبڑائی۔ یمنیٰ نے پیسے دے کر شاپر اٹھالیا واپس اس عورت کی طرف بڑھ گئی۔

"سنو تم اپنے بچوں کو یہ کپڑے پہناؤ، تمہاری سب سے بڑی دولت تمہارے بچے ہیں ان کا خیال رکھو۔ اچھی بات ہے تم بھیک نہیں مانگتیں مگر یہ میری طرف سے رکھ لو۔" یمنیٰ نے شاپر آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"میں واقعی مجبور ہوں مگر پھر بھی میں کبھی بھیک نہیں مانگوں گی۔" اس عورت کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"لو پہناؤ....."

"یمنیٰ تم نے اتنے پیسے؟ اور یہ جان کے رکھتی

زندگی کے نشیب و فراز کی ایک عجیب داستان، کبھی پرخطر جزیروں، دائروں میں قید تو کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکے ہوئے راہی کے مانند، سنسنی خیز حالات سے نبرد آزما.....

عمر عبداللہ کے سحر انگیز قلم سے

ایک نئے انداز، نئے رنگ، نئے ڈھنگ میں.....
عشق کے دشوار گزار مرحلے..... حسن کے قافلے.....
جذبات کا تلاطم..... دریاؤں کی روانی..... سمندر کے طوفانوں اور بھنور میں لپٹی خوبصورت داستان.....

بہت جلد

سسپنس کے صفحات پر جلد ہی پڑھیں گے

ہیں اپنے بچوں کو ایسے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ پیسے دیں۔'' رخسار اس کے کان میں بولی۔

''رخسار چپ کرو پلیز دیکھو وہ بھیک پھر بھی نہیں مانگ رہی۔'' وہ عورت اسے تشکر سے دیکھ کر دعائیں دینے لگی۔

وہ رخسار کا ہاتھ پکڑ کر پلٹ آئی۔

''بس جلدی چلو لگتا ہے بارش آنے والی ہے۔''

وہ دونوں تیز، تیز قدم اٹھاتیں گھر کی جانب مڑ گئیں..... اب وہ اسے کیا بتاتی کہ جو تین ساڑھے تین سو اس کے پاس ہیں اسی سے باقی کے دن بھی گزارنے ہیں۔ جب سے وہ گھر لوٹی تھی عجیب سی سرشاری سے چھائی ہوئی تھی۔ وہ بار، بار اپنی آنکھیں صاف کرتی جو نہ جانے کیوں تھوڑی، تھوڑی دیر بعد بھیگ سی جاتی تھیں۔ وہ بار، بار خدا کا شکر کرتی کہ اللہ اسے کسی کے کام آنے کا حوصلہ دیا۔ شام کو اشعر کے سامنے دال روٹی اور ساتھ چٹنی رکھ کر اس نے سوری کیا تو اشعر نے کھلے دل سے اسے معاف کر دیا۔

''سوچا تھا آج آپ کے لیے اچھا سا ڈنر بناؤں گی۔'' وہ جوش میں بولتے، بولتے چپ ہوئی۔

''ہاں تو ہے ناں اچھا سا ڈنر..... میرے لیے سب سے بڑی دولت پتا ہے کیا ہے یمنیٰ؟'' اشعر نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''خوش باش فیملی اور ذہنی سکون جو دنیا کے کسی دولت سے نہیں لی جا سکتی۔ یہ سکون کی دولت کسی، کسی کو ہی حاصل ہوتی ہے ضروری نہیں کہ جس کے پاس ڈھیروں پکوان ہوں، وہی خوش رہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اشعر ہمیں ناشکری نہیں کرنی چاہیے، ہم اتنا شکر کریں گے کہ اللہ ہم سے راضی ہو جائے گا میں کوشش کروں گی اشعر کہ ہر حال میں خوش رہوں۔''

''خیر ہے اشتر، مما کو دیکھو ٹھیک ہے ناں!'' اشعر نے مصنوعی پریشانی سے کہا۔

''جی بابا لگ تو ٹھیک ہی رہی ہیں۔'' اشتر نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا تو یمنیٰ مسکرا دی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں اشعر وہ سب کا مالک ہے، کٹ ہی جائیں گے یہ دن بھی۔'' پھر اس نے اپنا کارنامہ اسے سنایا۔

''بہت اچھا کیا یمنیٰ..... بہت اچھا کیا کوئی بات نہیں ہم چار دن چٹنی کھا لیں گے اس کے بچوں کو ٹھنڈ نہیں لگے گی۔ آج دیکھو بارش بھی کس قدر ہو رہی ہے۔'' اشعر نے صحن میں پانی کو گرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''ہاں اشعر کیا ہوتا ان بچوں کا اگر میں بھی یونہی گزر جاتی۔'' یمنیٰ نے جھرجھری سی لی۔

''اللہ ہے ناں مالک سب کا رازق وہ بنا دیتا ہے کوئی نہ کوئی وسیلہ تم نہ ہوتیں تو کسی اور کو..... اسے سب کی فکر ہے۔''

''بے شک۔'' وہ دونوں آسودہ مسکراہٹ لیے کھانے پر جھک گئے۔ کون جانتا ہے یہ نیکی انہیں کیا صلہ دے۔ اس کا وعدہ ہے۔ ''تم میری مخلوق کو نوازو میں تمہیں نوازوں گا۔'' اور جب میرا مالک نوازتا ہے تو چھپر پھاڑ کے نوازتا ہے۔

اگلے دن صبح ہی صبح اشعر کے والدین بغیر اطلاع دیے ان کے پاس آ گئے تھے۔ وہ اپنے آبائی گاؤں میں رہتے تھے۔ یمنیٰ کو انہیں دیکھ کر صحیح معنوں میں پریشانی ہو گئی۔ صرف اس لیے کہ گھر میں راشن کے نام پر زیادہ کچھ نہیں تھا، وہ دونوں ٹیکسی سے اترے اور ان کے پیچھے ایک ملازم ان کا ساز و سامان لیے آ رہا تھا جس میں چاول اور آٹے کی بوری اور پھلوں کے ٹوکرے اور دو تین زندہ مرغیاں، دیسی گھی اور جانے کیا، کیا تھا۔ اشعر ابھی دفتر نہیں گیا تھا۔

''پتر، میں نے سوچا تجھے گاؤں آئے مہینوں ہو گئے ہم ہی تیرے پاس چکر لگا لیں۔''

''جی ابا جی ضرور..... کیوں نہیں.....'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور تشکر کے پانیوں سے لبریز تھیں۔

اشعر کے والدین ان کے بقیہ دنوں کا راشن لیے خود چلے آئے تھے، یہ تھا اللہ کی طرف سے بھرم..... جو ان کا مہینہ آرام سے گزار دیتا ہے۔

❁ ❁ ❁

ناولٹ

عاشق یا مراد

رفاقت جاوید

رشنا کی یہ عادت تھی کہ وہ جونہی رات کے کسی پہر بیدار ہوتی تو فوراً موبائل کے میسجز چیک کیا کرتی تھی۔ آج بھی حسبِ معمول اس نے رات کے آخری پہر میں جونہی کروٹ بدلی۔ اس نے موبائل آن کیا اور نیم غنودگی میں نیم وا آنکھوں سے وہی اِک نامعلوم انجان نمبر کا میسج پڑھ کر ہمیشہ کی طرح جھنجلا گئی۔

''کیا مصیبت ہے یار.....! نہ جانے یہ صاحب مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ تنگ کر ڈالا ہے ظالم نے اور

بے غیرت کہیں کا....." وہ بڑبڑاتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی اور ٹیبل لیمپ آن کر کے پانی کے دو گھونٹ حلق سے اتارے مگر اعصابی تناؤ کم نہ ہوا تو اس نے اسی نمبر پر فون کر کے اسے جی بھر کر ڈانٹنا چاہا مگر اس وقت ہمت نہ ہوئی کہ وہ کیسے اِک انجان شخص کو گالی گلوچ سے نواز کر اپنی گلوخلاصی کر لے۔

اسی اثنا میں ایک میسج اور آ گیا۔

''ڈیئر تمہیں مان گیا ہوں، میں سمجھتا رہا کہ مجھ سے بڑا ڈھیٹ جوان اس روئے زمین پر ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ تم بھی شیر کی خالہ ہی نکلیں کہ اس کی ہزاروں منت سماجت کے باوجود بلی نے ایک گر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ میری ایک عرضداشت پر غور ضرور کرنا۔''

رشنا دلچسپی سے میسج پڑھ رہی تھی کہ ادھورا میسج اسے بے قرار کرنے لگا۔

''اب عرضداشت بھیج بھی دو ڈھیٹ کہیں کے۔ بندہ بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اب میرا تجسس بڑھانے کے لیے میسج نامکمل ہی چھوڑ کر آف لائن ہو گیا۔'' وہ اس کی عرضداشت کے لیے ہمہ تن گوش ہو کر کروٹیں بدلتی رہی مگر میسج کی ٹون نہ آئی۔

اگلی رات پھر اسی وقت میسج آیا تو اس نے گہری نیند میں ہی موبائل آف کر دیا۔ جونہی صبح اس کی آنکھ کھلی اس نے فوراً موبائل آن کیا اور اسی نامعلوم کا نمبر دیکھتے ہی وہ پُراشتیاق نگاہوں سے میسج پڑھنے لگی۔

''ڈیئر جو لوگ دروازے پر دستک دیتی ہوئی دولت کو ٹھکراتے ہیں، خوشی کے تمام مواقع ضائع کرتے ہیں اور محبت و عشق کو بے وقعت سمجھتے ہیں، ان کا نام ناقابلِ فہم لوگوں کی بہ فہرست میں کندہ کر دیا جاتا ہے۔''

وہ میسج پڑھ کر تلملا کر رہ گئی۔ اس کا دل چاہ کہ اسے اسی وقت سرتاپا جلا دینے والا میسج لکھ کر خود کو پُرسکون کر لے مگر وہ اس عمل سے قاصر رہی۔

رات کو وہ پھر سے اسی میسج کی تنگ، تنگ پر جاگ کر اٹھ بیٹھی۔ ''یہ نامراد میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ میسجز کے لیے آدھی رات کا وقت کیوں؟ اب سمجھی کم بخت کہیں چوکیداری کر رہا ہوگا....." وہ دفعتاً خود کلامی کرتے ہوئے اس کا نمبر ڈیلیٹ کرنے لگی۔ ''کیسی عجیب ہے اس جاہل، گنوار اور نادان کی منطق.....

''ڈیئر یہ زندگی چار دن کا میلا ہے۔ اس میں دل نہیں لگاؤ گی تو یہ میلا آناً فاناً اجڑ جائے گا۔ جانتی ہو کیسے؟ تم کچھ نہیں جانتیں، چلو میں ہی بتائے دیتا ہوں، جب دوسروں کو خوش و پُرسکون رکھنے کے لیے اپنی راحت کو نثار کر دیا جاتا ہے تو پھر دل بلیوں اچھل کر ہر طرح کے خوف و ڈر اور وسوسوں اور خدشوں سے پاک ہو جاتا ہے، یہ اس دنیا کے میلے میں جانے کا ٹکٹ ہے جو معمولی سی کاوش سے تم حاصل کر سکتی ہو جانم..... کالج، گھر اور گھر سے کالج تک محدود رہنے کو زندگی نہیں کہتے۔ میری بات مانو..... ابھی تم جس وقت میں مقید ہو اس سے باہر نکل کر میلے کے رنگوں میں خود کو رنگ کر خوشی و طمانیت سے استوار کر لو۔ اپنے من میں جو خوف کا بیج تمہارے معاشرے نے بو رکھا ہے افسوس صد افسوس کہ تمہاری بزدلی و کم ہمتی سے اس کی خوب پرداخت ہوئی ہے، تمہیں ذرا مشکل تو پیش آئے گی اس تناور درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں..... تم بالکل بے فکر رہو، میری مانو گی تو میں یہ کام کیے دیتا ہوں۔'' میسج پھر سے اگلی قسط کا روپ دھار چکا تھا۔ اس نے دو بار تین بار میسج پڑھا اور اپنے کمرے کی لان کی جانب کھلنے والی کھڑکی کا معمولی سا پردہ سرکا کر باہر کا جائزہ لینے لگی۔ باہر کے ماحول میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ گیٹ کے باروہی اونچے لانبے درختوں کے جھرمٹ میں بجلی کے قمقمے روشنی بکھیر رہے تھے اور اس کے چھوٹے سے گھر کے پورچ میں کھڑی ایک عدد سوزوکی اور وقتاً فوقتاً سڑک پر چلتے ہوئے چوکیدار کی سیٹی کی آواز حتیٰ کہ آسمان پر تاروں کا راج رات کی سیاہی میں نمایاں کردار ادا کر رہا تھا غرضیکہ سب معمول کے مطابق تھا۔ بجز اس کے کہ قلب و ذہن میں پرلے درجے کا اضطرار اسے کچوکے لگا رہا تھا۔

ممی کو یہ مسئلہ بتانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اسے ہر وقت ہر لباس میں باپردہ ہونے کی

تلقین کرتے ہوئے اسے لعنت ملامت بھی کرنے لگتی تھیں۔ اگر وہ آرگیو کرتی تو بیسیوں طرح کی دھمکیاں دی جاتیں اور اپنی ناراضی کا اظہار کر کے اسے احساسِ گناہ سے ہمکنار کر دیتیں۔

رات دھیرے، دھیرے گزر رہی تھی۔ اور وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی کہ اس مسئلے کا ذکر اپنی سہیلی حسینہ سے کرے یا نہیں جو کہ اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ گہری دوست ہونے کے باوجود حسینہ طبعاً اور مزاجاً اس سے قدرے مختلف تھی۔ وہ جتنی بے باک اور نڈر تھی شوخ و شریر تھی اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت اس میں کوٹ، کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ رشنا اس کے بالکل برعکس تھی مگر پھر بھی ان کی خوب بنتی تھی۔ کیونکہ حسینہ کی ماں رشنا کا خیال رکھنے میں بے مثال تھیں حتیٰ کہ حسینہ کے کپڑوں کے ساتھ اس کے لیے بھی ضرور جوڑا خریدتی تھیں۔ رشنا بہترین سامع تھی اور حسینہ حد درجہ باتونی اور شرارتوں میں اپنی مثال آپ اور اوپر سے چار بھائیوں کی لاڈلی بہن بھی تھی۔

حسینہ اس پر رعب جماتی اسے دوستی کے ناتے اپنی حالت بہتر رکھنے کی تلقین کرتی اور کلاس میں بھی اس کی استاد بنی رہتی تھی۔

☆☆☆

رشنا کی ممی، شبینہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ رشنا بارہ سال کی تھی کہ اس کے والد کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا۔ جس میں ماں بیٹی تو بال، بال بچ گئیں مگر احمد حسین اللہ کو پیارے ہوگئے یہ ایسا صدمہ تھا کہ اس نے شبینہ کے اعصاب کمزور کر ڈالے تھے۔ اس بھری دنیا میں جب تک شوہر کی قربت سلامت رہے تب تک زمانہ ساتھ ہے۔ یہ گرگٹ کے جیسا رنگ بدلنے والا زمانہ، نیکی، بدی، اچھے برے حالات میں دم قدم چلتا رہتا ہے۔ جب نوشتۂ تقدیر نے ماں، بیٹی کو اس لاقانونیت کے مارے معاشرے میں تنہا چھوڑ دیا تو ان کی اپنی ہی جائداد کے لیے احمد حسین کے بھائی بٹوارے کے محاذ پر مقابلے اور چھینا جھپٹی کے لیے اتر آئے۔ شبینہ ابھی اپنے شوہر کی ناگہانی موت کو قبول ہی نہ کر پائی تھیں کہ اس افتاد سے وہ یکسر شوہر کی جدائی بھول گئیں اور اپنی دال روٹی کے تحفظ کے لیے سر پر کفن باندھ کر عدالتوں کے چکر لگانے لگیں۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اولادِ نرینہ نہ ہونے کا خمیازہ ماں نے بھی بھگتا اور بیٹی کو بھی طوعاً و کرہاً برداشت کرنا پڑا۔ وہ دو کنال کی کوٹھی میں معمولی سے حصے دار کی حیثیت سے اپنا معمولی حصہ لے کر ایک چھوٹی سی کالونی میں دو کمروں کا گھر خرید کر شفٹ ہو گئیں۔ ان کے لیے سسرال کی ہماہمی اور اس زیادتی و بے باکی کا دکھ معمولی نہیں تھا۔ شبینہ اس ظلم و ستم اور بے انصافی کو سہہ نہ سکیں اور دھیرے، دھیرے اپنی ذمے داریوں سے نابلد ہوتی ہوئی اس چھوٹے سے گھر میں بند ہو کر رہ گئیں۔ اس قیدِ تنہائی میں انہیں سکون و اطمینان جیسی انمول دولت تو مل گئی مگر رشنا کا مظلومیت میں گھٹ، گھٹ کر رونا، اول جلول رہنا، پُراسرار حالات سے مقابلہ کرنا اور اجنبی چیزوں کا ڈر اس کے رگ و ریشے میں اترتا ہوا ماں کی نظروں سے اوجھل رہا۔

شبینہ عبادت گزاری میں مصروف رہتیں اور رشنا رات بھر واٹس ایپ اور فیس بک کے مزے لیتی ہوئی نہ جانے کب سو جایا کرتی۔ جب علی الصباح اسے ماں جگانے آتیں تو وہ کوشش کے باوجود نماز کے لیے اٹھنے سے قاصر رہتی۔ اس کے بعد جب تک وہ کالج رخصت نہیں ہو جاتی تھی۔ اسے ڈانٹ ڈپٹ، لعنت ملامت اور پھٹکار سے خوب نوازا جاتا۔ آسمان سے فرش پر منہ کے بل گرنے کا دکھ ماما کے تمام تقاضوں پر غالب آچکا تھا۔ جس بیٹی کی مسکراہٹ سے شبینہ نہال ہوا کرتی تھیں اور اس کی آنکھوں میں معمولی سی خفگی، اداسی اور پریشانی کو دیکھ کر شبینہ دہل جایا کرتی تھیں۔ آج حالات نے انہیں اپنے خون سے ہی بے حس کر ڈالا تھا۔ رشنا اٹھتے بیٹھتے ماں کے بارے میں سوچا کرتی۔ ان کی دکھوں، غموں، حسرتوں اور بے بسی و لاچارگی کی آماجگاہ میں جھانکتی تو وہاں دھندلاہٹ کو نہ پاکر اس پر ماضی کے ہر دن کی پرت کھلنے لگتی تھی۔ مگر وہ بیچارگی و بے ہمتی میں نہ ماں کا حوصلہ بڑھا سکتی تھی نہ ہی خود کو بیوقوف بنا کر بہلا سکتی تھی۔ ہر رات دو بجے اسے انجان میسجز آنے لگے تو

وہ ان سے قدرے الجھ بھی جاتی مگر کسی وقت بہل بھی جاتی مگر اس کا انکشاف نہ تو حسینہ سے کر سکی نہ ہی اپنی ماں سے..... جبکہ اس کی نیت میں فتور ہرگز نہیں تھا۔ ورنہ وہ جھٹ سے میسجز کے جواب دے دیتی۔

☆☆☆

''ممی! آپ سے ایک بات پوچھنا چاہ رہی ہوں..... ڈانٹیں گی تو نہیں.....'' وہ ذرا ڈرتے، ڈرتے بولی۔

''کیا مطلب..... غلط اور ناجائز بات پر نہیں ڈانٹوں گی کیا..... پھر بولو کون ہمدرد اٹھے گا تمہارے لیے جو سیدھی راہ پر ڈالنے کی جرأت و ہمت کرے گا۔'' وہ قرآن کریم بند کر کے نرمی سے بولیں تو رشنا نے اچنبھے سے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں کے مزاج کے مطابق ان کا نرم لہجہ کچھ انوکھی بات تھی۔

''بولو رشنا کیا کہنا چاہتی ہو.....؟'' وہ پھر نرماہٹ سے بولیں۔

''ممی میں بہت حیران و پریشان ہوں کہ آپ نے مجھے چند دنوں سے ڈانٹا کیوں نہیں.....؟ کیا آپ نے مجھے اپنے مطابق ڈھال لیا ہے یا آپ ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

''بیٹا سچی بات کہوں..... میں نے ہی ہار مان لی ہے، تمہارا پہناوا بدلا نہ ہی تمہاری روٹین بہتر ہوئی۔ میں نے سوچا تم سے خواہ مخواہ مغز ماری کا کیا فائدہ؟ جس گھر بھیجوں گی وہاں سے کفن میں ہی نکلنا..... یہ سوچ کر اس گھر کو چھوڑو گی تو ان کے رنگ میں رنگنا تمہیں آسان لگے گا کیونکہ شوہر واحد ایسی ہستی ہے جس کی خوشی کی خاطر عورت غیر معمولی طور پر خود کو بدل لیتی ہے۔ رہی سہی کسر بچہ نکال دیتا ہے۔ یہ سوچ کر اب مطمئن ہو گئی ہوں۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔

''ممی میں نے سوچ لیا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ بالکل فضول ہے اور آپ نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر شادی کا کیسے سوچ لیا؟''

''اس کی وجہ بتاؤ، یہ کیا بات ہوئی کہ شادی نہیں کروں گی..... اسلام نے اسے لازم قرار دیا ہے۔ ورنہ جنت کا دروازہ وا نہیں ہوگا۔'' وہ الجھ کر بولیں۔

''اگر میں نے شادی کی اور یہاں سے سدھار گئی تو جو جینے کا بہانہ آپ کو مل گیا ہے وہ تو میری رخصتی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔'' وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ''اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ممی.....''

''واہ تم اتنی گہری سوچ رکھتی ہو، مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ کبھی میرے پاس بیٹھو اپنے دل کی باتیں کر کے میری بھی سن کر دل ہلکا کرو..... تو مجھے تمہاری اور تمہیں میری سمجھ آئے۔ مگر ایسا نہیں ہوا.....'' وہ اپنے دکھ کو اندر سموتے ہوئے بولیں۔

''وہ تو ناممکن تھا ممی..... مجھے لگتا ہے آج بھی ممکن نہیں..... میری دوھیال نے آپ کو اپنے ظلم اور ناانصافی کا نشانہ بنایا تھا..... میں آج تک یہ نہ سمجھ سکی کہ میں قصور وار کہاں پر تھی؟'' وہ بہ مشکل منمنائی۔

''یہ سوال بہت پہلے پوچھ لیا ہوتا تو تم نے اتنے سال شش و پنج میں نہ گزارے ہوتے۔ تم اس معاملے میں بے قصور ہو بیٹا، میں ہی اس بے انصافی کو ہضم نہیں کر سکی۔ دراصل غیر متوقع رویے ہی تو انسان کی خوشیوں کے قاتل بن جاتے ہیں۔'' وہ آنسو ضبط کرتے ہوئے بولیں۔ ''اب تم بڑی ہو گئی ہو، میری ذمے داریوں کو تم نے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ جب ان سے جان چھڑا کر شوہر کے گھر سدھارو گی تو تم بہت اچھا محسوس کرو گی۔'' وہ اسے تھپکی دیتے ہوئے بولیں۔

''ممی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ ایک دم سے لرزی۔

''بیٹا ڈر مجھ سے لگ رہا ہے یا میری باتوں سے.....؟'' وہ معمولی سا مسکرائیں۔

''ممی آپ سے کیونکر ڈروں گی۔ اس دنیا میں بسنے والے ہر انسان و حیوان سے ڈرتی ہوں۔ کیا یہی کافی نہیں کہ اب آپ سے بھی ڈرنے لگوں.....'' وہ بھی مسکرا کر بولی۔

''یہ تو میں بخوبی جانتی ہوں رشنا..... اس لیے تو میری کسی نصیحت پر تم کان نہیں دھرتیں۔ کہ ماں ظالم

سہی پر اولاد کی خوشیوں کا قتال نہیں کرتی..... یہی وجہ ہے کہ تم اپنی مرضی کی خود مالک بنی بیٹھی ہو....." وہ یک دم زہریلے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"اب آپ کو یہ ادراک تو ہو ہی گیا ہے کہ میں آپ کی آج کی گفتگو سے ڈر گئی ہوں اور اس سے پہلے آپ کے قدرے نرم رویے سے خوفزدہ تھی کہ ضرور کوئی نہ کوئی دھماکا ہونے والا ہے۔" وہ مشکوک نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"رشتے کا طے کرنا دھماکا ہوسکتا ہے۔ لیکن شادی دھماکا نہیں ہوسکتی۔" وہ بے پروائی سے بولیں۔

"رشتہ اور میرا..... یہ خوب رہی ممی..... مجھے آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے، آپ میری زندگی اور میں آپ کی حیات کا اِک خوب صورت وخوش آئند ذریعہ ہوں۔ اس کو تسلیم کرنا بہت ضروری ہے ممی..... ورنہ میری شادی گھاٹے کا سودا ہے۔ وہ بھی اِک انجان لڑکے سے۔ ممی وہ زمانہ گیا۔ جب والدین بچوں کی زندگیوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ اب سوشل میڈیا کا دور ہے۔ بیسیوں میں ایک کا چناؤ کرنے والے بچے ہوتے ہیں اگر آپ نہیں مانیں تو میں یہ گھر چھوڑ کر کسی یتیم خانے چلی جاؤں گی۔ وہاں یتیم بچوں کی ماں بن کر خدمت کرنا مجھے منظور ہے ممی....." وہ آنسو گراتے ہوئے بولی۔ "مگر شادی نہیں کروں گی وہ بھی آپ کی پسند اور مرضی کی۔ آپ کی اس ذہنی حالت میں آپ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کی ہرگز سزاوار نہیں ہیں۔"

"رشنی میں اچھی بھلی تو ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوا۔ اللہ سے لو لگانا کوئی بیماری نہیں ہے پگلی۔ یہ یاد رکھو کہ یہاں کی کوئی جگہ محفوظ نہیں بیٹا۔ یہ چھت چاہے ہماری اپنی ہے، سلین زدہ ہی سہی یہی ہمارا تحفظ ہے، گھر سے باہر قدم نکالنے کا تصور بھی مت کرنا..... میں نے تمہارا رشتہ طے نہیں کیا، رشتہ ڈھونڈنے کا ارادہ کیا ہے..... تم اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہوجاؤ پھر تمہاری شادی کروں گی اپنی مرضی سے، اپنی پسند سے... یہ بات پلے باندھ لو....." وہ درشتی سے بولیں۔ "کیونکہ جتنا میں نے دنیا کو پہچانا ہے، میرا فیصلہ ہی درست ہوگا۔"

"ممی آپ نے خود کو گھر کے اندر بند کر کے کیا سیکھا ہے؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "آپ کچھ نہیں جانتیں۔ اگر آپ دنیا کی شناخت رکھتیں تو مجھے تنہا اس بحر میں دھکا نہ دے دیتیں۔ میں نے اس خاموشی اور تنہائی میں دنیا کی حقیقت اور زندگی کی وقعت کو پہچانا ہے۔ نشیب وفراز میں ڈوبتے ابھرتے رویوں کو پرکھا ہے اور اس کا ناقابل تلافی نقصان اٹھایا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بہت آہستگی سے بولی۔ "تم نہیں جانتیں کہ یہ دنیا میں بسنے والے مکین کیسی، کیسی جبلت کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔"

"ممی دنیا میں مکس اپ ہوئے بغیر نہ تو دنیا کے قانون اور نہ ہی زندگی کے قواعد وضوابط کا ادراک ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اس اکیلے پن سے کچھ درس حاصل کیا ہوتا تو سب سے پہلے آپ میرے دامن کو مامتا کے تمام حقوق سے لبریز کر رہی ہوتیں۔ آپ نے تو دنیا سے آنکھیں بند کر کے مجھے بھی دیکھنا چھوڑ دیا ہے میرا تجزیہ کریں ممی..... میں بھی ایک نارمل لڑکی نہیں ہوں۔ نہ ہی میری زندگی نارمل اصولوں کو مدِنظر رکھ کر گزر رہی ہے، میں چاہے پی ایچ ڈی کرلوں میرے باطن کا خلا کبھی پُر نہیں ہوگا..... آپ کو کیا معلوم کہ میں نے یہ گھر کیسے سنبھالا اور کیسے چلایا ہے، اگر مجھے حسینہ اور اس کی ماما کا سہارا نہ ہوتا تو جو چند لاکھ آپ نے مجھے سونپے تھے وہ ابھی تک ختم ہوچکے ہوتے اور آج یہ گھر بھی نہ رہتا۔ کاش آپ نے کبھی پوچھ ہی لیا ہوتا۔ اگر حسینہ کے نرم دل پاپا اپنے بزنس میں میرا شیئر نہ ڈالتے تو ہم دونوں ہرگز سروائیو نہ کرسکتے۔ آپ کیونکر جانیں..... انجانا پن ہے تو پھر شانتی ہی شانتی..... آپ کو تو اسی کی لت پڑ چکی ہے۔" وہ روہانسی ہوکر پہلی بار انکشاف کر رہی تھی۔

"پلیز رشنی تم جیسے بھی زندگی کی اس گاڑی کو گھسیٹ رہی ہو مجھے مت بتاؤ۔ میرے کمزور اعصاب کچھ بھی جاننے اور سمجھنے کی مجھے اجازت نہیں دیتے۔" وہ کرب سے بولیں۔

''میرا خیال ہے تم میرے دکھ کا اندازہ لگانے میں ناکام رہی ہو..... تمہیں نصیحت کرنے کا اِک مقصد تھا تم سے سختی سے پیش آنا وقت کی ضرورت تھی۔ سمجھنے کی کوشش کرو..... تم جیسی کم گو اور گہری سوچ رکھنے والی لڑکی کو ماں اور کیا سمجھا سکتی ہے۔ مگر شادی کا فیصلہ کرنا ممتا کا تقاضا سمجھو اور اس میں ٹانگ مت اڑانا۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولیں۔

''ممی ماں ہی اولاد کا مضبوط ستون ہوتی ہے، جس سے اولاد زندگی کے ہر اچھے برے دنوں میں لپٹ کر اپنی خوشی اور غمی کا اظہار کر کے دل کو ہلکا کر لیتی ہے۔ یہاں تو ایسا سین سرے سے ہی غائب رہا۔'' وہ جز بز ہوتی ہوئی بولی۔ ''اور اب آپ میری شادی کا فیصلہ کرنے پر بضد ہیں۔ فار گاڈ سیک ممی.....''

''ہوں.....'' ماں نے سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں کے درمیان خاموشی چند ثانیے قائم رہی۔

''رشنا آج تم نے منہ کھولا ہی ہے تو سب کچھ اگل دو۔'' وہ تھوڑے توقف کے بعد گویا ہوئیں۔

''ممی مجھے اور کچھ نہیں کہنا..... آخر میں صرف ایک التجا کرنے کی اجازت طلب کرتی ہوں۔'' وہ نظریں جھکا کر بولی۔

''بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں تمہاری التجا کیا ہوگی۔'' وہ نخوت سے بولیں۔

''آپ کچھ نہیں سمجھیں ممی..... گستاخی معاف، معذرت کے ساتھ آپ کو ڈپریشن نے بری طرح جکڑ لیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اسٹیٹس کا نشہ انسان کو ذہنی طور پر کمزور بنا دیتا ہے۔ اس کے لیے زندگی کا معمولی سا جھٹکا ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ جب کمزور ذہن بیمار پڑ جائے تو دل میں طاقت نہیں رہتی۔ زبان قوتِ گویائی سے محروم ہو جاتی ہے تو کیا ایسا مریض کوئی بھی فیصلہ کرنے کی شد بُد رکھتا ہے۔ آپ خود کا تجزیہ کرنے میں بھی ناکام ہیں، اس بیماری کے بعد آپ کا پہلا ری ایکشن تھا کہ دنیا میں دلچسپی لینا چھوڑ کر صرف اور صرف اس رب کے عشق میں کھو جانا ہی آپ کو بہتر لگا تھا۔ آپ کے ساتھ بھی یہی سانحہ ہوا۔ ایک دن ایسا آیا کہ یہ ذہنی مریض ایک کمرے میں بند ہو گیا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ہی خود ساختہ دنیا میں مگن رہ کر آپ نے کیا پایا؟ میرا رب آپ سے کیسے راضی ہو سکتا ہے، جس نے اپنی بیٹی کو ہی فراموش کر دیا..... یہ تو اِک معجزہ ہے کہ آپ آج مجھ سے اس موضوع پر بات کر رہی ہیں..... ورنہ اس وقت آپ نفسیاتی اسپتال میں ہوتیں.....'' وہ سخت الفاظ نرماہٹ سے ادا کر کے خاموش ہو گئی۔

''یعنی تم نے اپنی اچھی بھلی ممی کو پاگل قرار دے ڈالا ہے۔ کیا مجھ پر اب اس ظلم کی کسر باقی رہ گئی ہے جو تمہیں آج یہ الزام تراشی کا خیال آ گیا۔ میری بات غور سے سنو۔ جب دنیا نے ہی مجھ سے منہ موڑ لیا تھا اور اپنوں نے ہماری جائداد پر قبضہ کر لیا۔ گھر کے حصے کر کے میری جنت کو اونے پونے داموں بیچ دیا اور ہمیں دو کمروں کے اس جہنم میں پناہ لینی پڑی۔ رشنا پستی سے بلندی تک پہنچنے کے لیے ہمیں شب و روز محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں تمہارے پاپا نے کسر نہیں چھوڑی، رزقِ حلال کمایا اور میں عیاشی کی زندگی گزارتی رہی جبکہ انہیں اپنی محنت سے کمایا ہوا رزق استعمال کرنے اور انجوائے کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ سب کچھ ہماری کمفرٹ کے لیے چھوڑ کر اس دارِ فانی سے تہی دست ہی رخصت ہو گئے۔ ایک تو ان کے بے وقت جانے کا دکھ جو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ دوسرا اپنوں کی طوطا چشمی کا قلق جو مجھ پر ہر لمحے تازیانے برساتا ہے، کچوکے لگاتا ہوا مجھے اپنے حسین ماضی میں دھکیل دیتا ہے تو میں اسی کے فسوں میں اپنے رب کے قریب ہو کر شکرانہ ادا کرنے لگتی ہوں کہ اس نے مجھے تھوڑا ہی سہی اپنی بے حساب نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا وقت بخشا اور مجھے حسن کی قربت میں رہنے کا موقع دیا۔'' وہ یہ کہتے ہوئے آنسو گراتی چلی گئیں۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے، میں سمجھ سکتی ہوں لیکن یہ تو بتائیں کہ ان تمام مناظر میں آپ کی بیٹی کہاں پر ہے؟ کہیں بھی نہیں..... ہے ناں ایسے ہی، نہ کل آپ کی زندگی میں تھی اور نہ آج کہیں نظر آتی ہوں۔'' وہ

المناک لہجے میں بولی۔

''رشنا تم میرے دل میں بستی ہو، میں نے تمہیں اس دنیا سے نپٹنے کے لیے خود سے دور رکھا۔ میری زندگی کا کیا بھروسا اب تو اس سے یقین ہی اٹھ گیا ہے۔ اس لیے تم اکیلی سروائیو کرنا سیکھ لو..... دوسروں کے سہارے کی بیساکھی تو دیمک زدہ ہوتی ہے، وقت گزرنے کے ساتھ جب ٹوٹ جاتی ہے تو علم ہی نہیں ہوتا انسان منہ کے بل گر جاتا ہے۔ آج تم اپنا تجزیہ کرو کہ تم نے میرے بغیر زندہ رہنا سیکھ لیا ہے۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر بولیں۔ ''مجھے تم پر فخر ہے بیٹا۔''

''یہ سب خوش فہمی ہے آپ کی۔ ممی میں ڈرپوک ہوگئی ہوں..... آپ نے دنیا کو اسی ڈر کی وجہ چھوڑا ہے ناں..... ایک دن میں بھی اپنے ہی خول میں چلی جاؤں گی کیونکہ میں نے آپ سے یہی سبق سیکھا ہے، یہ قصور میرا نہیں ہے ممی..... بے باکی، دلیری اور دانشمندی ماں سے لی جاتی ہے۔ آپ نے محبت و چاہت، لگاوٹ اور اپنائیت سے تہی دست رکھا۔ اور خود اپنے ہی مراق میں گم ہوگئیں..... ذرا غور و خوض کریں کہ اگر حسینہ میری زندگی میں نہ ہوتی تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ اسی کمرے میں بند رہ کر زندگی گزار جاتی۔ آپ نے مجھ پر بہت ظلم کیا ہے ممی..... میں پھر کہوں گی کہ قصور آپ کا نہیں..... آپ کے اس بیمار ذہن کا ہے، ورنہ کوئی ماں اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ ایسا سلوک روا نہیں رکھتی۔ میں نے آج تک ایسا نہیں دیکھا ممی..... حسینہ کی ممی مجھ پر ترس و رحم کھاتے ہوئے مجھے اپنے سینے سے لگا لیتی ہیں..... اپنے ہاتھوں سے نوالہ بنا کر مجھے کھلاتی ہیں، میرے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتی ہیں، میری حالتِ زار دیکھ کر مجھے فلم کے لیے اور کھانے کے لیے باہر لے جاتی ہیں۔ حسینہ جیسے میرے کپڑے خریدتی ہیں، مجھے ان کے وجود سے ماں کی خوشبو آتی ہے، ممی میں تو آپ کی بدبو کی وجہ سے اس کمرے میں نہیں آتی۔ مجھے سفوکیشن ہونے لگتی ہے، آپ کو دیکھ کر مجھے آپ پر ترس آنے کے بجائے غصہ آنے لگتا ہے، ممی مجھے حسینہ کی ماں جیسی محبت و توجہ دینے والی ممی چاہیے.....'' وہ بلک، بلک کر بولی۔

''تم سچ کہہ رہی ہو کیا؟'' ماں بے یقینی سے بولیں۔

''میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ آپ نے میرے ساتھ یہی تو ظلم کیا ہے۔ ممی ہمت کر کے آج سچ بولنے کی مجبوری نے مجھے آپ کے روبرو کھڑا دیا ہے۔ آئی ایم سوری.....'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے، تم تو میری امید و توقع کے بالکل برعکس نکلیں۔ میں نے سوچا کیا تھا اور تم نکلیں کیا.....'' وہ تاسف بھرے لہجے میں بولیں۔

''میں آج اپنی اصلیت آپ کے سامنے واضح کرنا چاہتی ہوں، آپ کو میری بات ماننا پڑے گی۔ ممی آپ کو اس کمرے سے نکلنا پڑے گا۔ میری خاطر ہی سہی..... آخر میں آپ کی اکلوتی اولاد ہوں، آپ کو جانور سے بدتر زندگی میں دیکھنے کی میری ہمت و قوت ختم ہو چکی ہے۔'' وہ التجا کر رہی تھی۔ وہ ممی کو واپس باہر کی نارمل دنیا میں لانا چاہتی تھی۔ اس روز بھی وہ انہیں مسلسل قائل کر رہی تھی۔

''بیٹا ایسا کرو تم یہاں سے بوریا بستر گول کرو اور حسینہ کے گھر کا فرد بن جاؤ حسینہ کا کوئی بھائی تو ہوگا۔'' وہ کریدنے کے انداز میں نقاہت سے بولیں۔

''ممی اس کے چار، چار بھائی ہیں اور حسینہ ان کے ساتھ پل کر بڑی ہوئی ہے۔ بعض اوقات مجھے گمان ہونے لگتا ہے جیسے حسینہ پانچواں بھائی ہے، اس کے سب بھائی مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ گڑیا بہن کہہ کر پکارتے ہیں تو میں نہال ہو جاتی ہوں۔'' اس کی بات سن کر شبینہ کے رگ و ریشہ میں قوت سرائیت کرنے لگی۔

''رشنا اب اسے میری طبیعت کا کمال ہی سمجھو کہ ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔'' ماں رسانیت سے بولتے ہوئے بالوں میں ایسے انگلیاں پھیرنے لگیں... جیسے سب گڈمڈ سوچوں کو سلجھا رہی ہوں۔

''شکر الحمد للہ ممی..... جلدی سے آئیڈیا شیئر کریں.....'' وہ کتھارسس کے موڈ میں بولی۔ ''بے شک آپ کا آئیڈیا بہت خوب ہوگا۔ مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔''

''مجھے یہ بتاؤ بیٹا..... اگر اس گھر میں تم ایک فرد

کی طرح آتی جاتی ہو تو حسینہ تمہیں اپنی بھابی کیوں نہیں بنالیتی، باہر کی دنیا بڑی ظالم ہے، وہ تم جیسی لاوارث بچیوں کو پاؤں تلے پامال کردیتی ہے۔ اور پھر اک بیمار ماں کی یتیم بیٹی سے رشتہ جوڑنا تو درکنار اس کا نام لینا بھی گناہ تصور کرتی ہے۔"

"وہ میرے بھائی ہیں ممی..... آپ کی سوچ درست نہیں۔ ویسے! آپ نے بہت خوب سوچا ہے۔ لیکن میرا مسئلہ بہت گمبھیر ہے۔ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی اور پھر وہ بھی بھائی سے توبہ استغفار....." وہ معاملہ فہمی میں بولی۔ "آپ کو اکیلا چھوڑ جاؤں..... یہ مجھے منظور نہیں۔"

"تم میری سوچ کی تعریف کرو رشنی..... میں تو ہر سوچ سے فارغ البال ہو چکی تھی۔ اب میرے ذہن میں یہ خیال کوندا ہے تو عمل کے لیے بھی کوئی رستہ نکل ہی آئے گا۔ مجھے اپنے رب سے امید ہے۔ وہ تمہارے لیے بہت بھلا فیصلہ کرنے والا ہے۔" رشنا، ماں کی باتیں سن کر حیرت و مسرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ "مجھے حیران کن نظروں اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے مت دیکھو..... حالانکہ میں بھی حیران ہوں رشنا میرا دل و دماغ اگلی دنیا سے نکل کر اس دنیا کے بارے میں کیوں سوچنے لگا ہے۔ میں پھر سے ہرٹ نہیں ہونا چاہتی۔ مجھے حسینہ کی ماں سے نہیں ملنا۔ مجھے گھر سے باہر قدم نہیں نکالنا۔ میں اپنے رب سے دور ہوتی جارہی ہوں۔" وہ بعینہ یہی محسوس کرتے ہوئے رو دیں۔

"ممی آپ رو پڑیں۔ بری بات، اچھے بچے روتے نہیں....." وہ انہیں بہلانے لگی۔ "ممی آپ کا جب بھی دل چاہا ہم باہر ضرور نکلیں گے۔ آپ پر نہ تو زبردستی کروں گی نہ ہی زور آوری کروں گی۔ سب آپ پر چھوڑ دیا ہے میں نے..... اوہ ممی آپ کی دوا کا وقت ہوا چاہتا ہے۔" وہ وال کلاک کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میری دوائی کا وقت..... ہاں..... میں بھی سوچ ہی رہی تھی۔ اس گولی کے بعد کیا مزے کی نیند آتی ہے۔" وہ ایک دم سے بولیں۔

"رشنا کہیں مجھے اس کی عادت تو نہیں ہو رہی..... نشہ اللہ میاں کو قطعاً پسند نہیں..... بے شک دوا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ انسان کو بیکار بنا دیتا ہے۔ آج کل میں اسی حالت میں تو ہوں..... مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو....."

"ممی! ایسا ہرگز نہیں..... یہ دوا اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ آپ کی ذہنی صحت بہتر ہو رہی ہے۔ آپ کی دلی تسلی کے لیے میں کل ہی آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔ آپ بالکل ری لیکس رہیں۔ آپ کی اور میری خوشیاں اور تمام خواہشیں مشترکہ ہیں، دکھ اور درد غم بھی سانجھے ہیں....." وہ اندر کی کشیدگی پر قابو پا کر بولی۔

"رشنا تم مجھے فریب دینے کی کوشش میں ہو..... یہ بھی اک روپ ہے دنیا کا..... تم بھی کرلو جو بھی کرنا چاہتی ہو۔ ایک دن تم بھی اقرار کرو گی کہ گوشۂ تنہائی میں عافیت ہی عافیت ہے۔ میں نے اپنی تمام تکالیف پر صبر کیا۔ اس کا شکر ادا کیا۔ جسے تم نے بیماری کا نام دے ڈالا....." وہ یکبارگی پھر حیرت و تاسف سے بولیں۔

"ممی میں آج کل اسی ذہنی بیماری کے بارے میں پڑھ رہی ہوں..... جن لوگوں کا آئی کیو لیول ہائی ہوتا ہے۔ وہ ہر بات میں مین میخ نکالتے ہوئے دھیرے، دھیرے ذہنی بیماریوں کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ insomnia اور paroniria یہ دونوں بہت ڈیڈلی بیماریاں ہیں پہلے آپ ان دونوں کا شکار ہوئیں اور اس کے بعد تنہائی کو اپنا ساتھی بنالیا..... جبکہ کلوزنیس..... intimacy تو مجھ سے ہونی چاہیے تھی۔ پھر کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔" وہ اصلاحی لہجے میں ذرا سا مسکرا دی تھی۔

"تم نہیں سمجھو گی..... خلوت نشینی میں بہت مزہ ہے۔ نہ ہی زندگی سے شکوہ رہتا ہے، نہ دنیا والوں سے regret کی نوبت آتی ہے۔ اگر تم میری ذمے داری نہ ہوتیں تو میں کب کی جنگلوں میں نکل گئی ہوتی۔ وہاں کے درندے ان انسانوں سے ہزار ہا درجے بہتر ہیں۔"

"ممی آپ نے پھر یہ نامعقول باتیں شروع کر دی ہیں، سوچ لیں علاج کا پیریڈ طویل ہو جائے گا۔" وہ اظہار رنج سے دھمکی دے کر بولی۔

"ٹھیک ہے اماں..... لگتا ہے جیسے میں تمہاری

بیٹی ہوں.....'' وہ مسکرا کر بہ رضا و رغبت لہجے میں بولیں تو رشنا ماں کو بوسہ دے کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

جب سے شبینہ کو سائیکاٹرسٹ نے دوا شروع کرائی تھی۔ رشنا امی کے کمرے میں سونے لگی تھی۔ کمرے کی کھڑکیاں جو کبھی کھلتی نہیں تھیں، ان پر لٹکے ہوئے میلے کچیلے بوسیدہ پردے کبھی ہٹائے نہیں جاتے تھے۔ کمرے میں قالین پر شبینہ کے میلے اور صاف کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جبکہ الماری خالی تھی۔ فرنیچر پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ کیونکہ ہر وقت دروازہ بند رہنے کی وجہ سے دیواریں اور چھت سیلن زدہ ہو چکی تھیں۔ عفریت کا ماحول اور پھر کمرے کی جان لیوا سڑاند میں رشنا چند لمحوں کے لیے زبردستی گھس جایا کرتی تھی۔ صبح کالج جانے سے پہلے ناشتا اور دوپہر کا کھانا ہاٹ پاٹ میں رکھ کر دروازے کے سامنے رکھی ہوئی میز پر سجا کر چلی جاتی۔ کبھی کبھار ماں تمام کھانا کھالیا کرتی تھیں۔ جبکہ کئی بار کھانا وہیں کا وہیں ہی دھرا رہتا تھا۔ جب بھی رشنا فکر مندی میں پوچھتی کہ ''آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا۔ کیا بھوک نہیں لگی'' تو الجھ کر گڑگڑانے لگتیں۔

''تم مجھے زہریلا کھانا کھلا کر اپنی جان چھڑانا چاہتی ہو۔ میں سب جانتی ہوں، آخر خون تو ددھیال کا ہی ہوا ناں.....''

لیکن اب یہ عالم تھا کہ جب سے شبینہ کو اپنی زندگی کے مقاصد کا ادراک ہو رہا تھا۔ وہ رشنا کی ہر بات پر آمادہ ہو جاتیں۔ رشنا کے پاس زیادہ پیسہ نہیں تھا لیکن گزر اوقات کے لیے کافی تھا۔ ماں کو خالی پن سے نکلتے دیکھ کر رشنا نے ماں کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ دونوں ماں، بیٹی چند دنوں کے لیے حسینہ کے گھر شفٹ ہو جاتے ہیں اور وہ دونوں بیڈ رومز، سٹنگ اور ڈائننگ ایریا کو وائٹ واش کرانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے بعد کچن اور باتھ روم کی باری آئے گی۔

''مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔'' شبینہ کو راضی کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ لامحالہ ماں نے آمادہ ہونے میں ہی مصلحت جانی۔ رشنا کی

ایک مہینے کی چھٹیاں آج تک اتنی کارآمد ثابت نہ ہوئی تھیں جتنی اس بار فائدہ دے گئیں۔ چھوٹا سا گھر اور سامنے چھوٹا سا لان جو بے حد سلیقے طریقے سے سجایا گیا تھا۔ شبینہ دیکھ کر چکرا گئیں۔ گھر کو جنت بنانے کے لیے وسیع و عریض محل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ سوچتی ہوئی گھر کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ حسینہ کی ماما کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کے مثبت اثرات بھی شبینہ کی شخصیت سے جھلک رہے تھے..... مگر وہ گھر پہنچ کر بھی رشنا سے یہی سوال کرتی رہیں کہ ''مجھے یہ بتاؤ کہ حسینہ کے گھر والے کھرے اور سچے ہیں..... نہیں ان میں منافقت تو نہیں۔ ریاکاری تو نہیں..... خوشامد سے ہم سے کچھ بٹورنا تو نہیں چاہتے۔ تم نے تمام پونجی اس کے بابا کو کس بل بوتے پر دے ڈالی۔ تم نے تو انجان لوگوں پر بھروسا کر کے اچھا نہیں کیا۔'' وغیرہ وغیرہ۔

''ممی یہ فرشتہ خصائل خاندان ہے۔ یہ ہماری ضرورت ہیں۔ حالات کے گرداب میں ہم پھنسے ہوئے ہیں، وہ ہمیں اس سے نکالنے کے خواہشمند ہیں اگر وہ ہمارے ہمدرد، مربی اور مسیحا نہ ہوتے تو ہمیں ایک مہینہ اپنے گھر میں ہرگز نہ ٹھہراتے، ممی نہ کرنے کے ہزاروں بہانے نکل آتے ہیں، انہیں کوئی مجبوری تو نہیں تھی۔''

''بیٹا یہ خوشامد کہیں تمہارے حصول کے لیے تو نہیں کی جارہی..... بینک میں جو بھی تھوڑا سا پیسہ تمہارے نام ہے اس کی انہیں خبر تو نہیں ہوگئی۔ میں تو فکرمند ہوگئی ہوں کہ کاروبار میں لگایا ہوا پیسہ ڈوب گیا تو ہم بھوکے پیاسے ہی مرجائیں گے۔''

''ممی مجھے آپ کی یہ فکرمندانہ باتیں سن کر خوشی ہوئی ہے کہ دوا آپ کو دنیا میں واپس لانے میں خوب مددگار ثابت ہوئی ہے۔ لیکن آپ تسلی رکھیں۔ یہ خاندان ہمیں ہرگز دھوکا نہیں دے گا۔ ممی! سب لوگ میرے تایا اور چچا کی فطرت کے نہیں ہوتے۔ اسی دنیا میں جہاں شیطانوں کی بھرمار ہے۔ وہاں فرشتوں کی تعداد بھی ان گنت ہے۔'' رشنا نے ترحم آمیز نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا..... ان کے چہرے پر ''بدحواسی'' کی مہر ثبت دیکھ کر وہ دہل سی گئی۔ ''ممی آپ کو علم تو ہے کہ آپ ایسی دوا کھا رہی ہیں جو دماغ میں کنکشن بنانے کا کیمیکل ہوتا ہے۔ ماحول بدلنے سے بھی یہ بنتی ہے مگر اس وقت آپ ٹینشن میں مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ آپ آرام کریں..... میں پڑھائی کے بعد آپ کے کمرے میں ہی سو جاؤں گی..... لائٹ گرین رنگ میں یہ کمرا کس قدر پُرسکون لگ رہا ہے کیوں ممی!'' وہ ماں کو بہلانے کی غرض سے خوشدلی سے بولی۔

''ہاں رشنا شاید تمہیں یاد ہو تمہارے ڈیڈی کو یہ رنگ بہت پسند تھا پھر انہوں نے کمرے کو بھی اسی طریق سے سجا ڈالا تھا۔ آہ لوگ چلے جاتے ہیں، ان کی یادیں اور باتیں ہی باقی رہ جاتی ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر خود کو مجتمع کرنے لگیں۔

''ممی اب میں چلتی ہوں، جلد ہی واپس آتی ہوں، آپ سونے کی کوشش کریں۔'' وہ ماں کو بوسہ دے کر بولی۔

''بٹیا اتنے صاف ستھرے کمرے میں نیند نہیں آئے گی۔ مجھے تو غلاظت میں رہنے کی عادت ہے۔ یہ فارمولا میرے جیسی عورتوں کے لیے ہے۔ تمہارے لیے نہیں، تم تو ایک باہمت لڑکی ہو..... میری فکر کرنا چھوڑ دو..... جب تک ڈاکٹر دوا کھانے کا مشورہ دے گا ضرور کھاتی رہوں گی۔ مجھے امید ہے کہ الٹی سیدھی ہانکتے ہوئے ایک دن اس بیماری سے نکل ہی آؤں گی.....'' وہ دو طرح کی کیفیات میں بولیں۔

''ان شاء اللہ ممی ایسا ہی ہوگا..... آپ صرف اپنی سوچ مثبت رکھیں۔ اب آپ یہاں سے اٹھیں تسبیح پکڑیں اور آپ اس نرم اور گداز بیڈ پر لیٹ کر تو دیکھیں۔ اس کی عادت چند منٹوں میں ہی آپ پر غلبہ پالے گی۔'' وہ شگفتہ لہجے میں بولی۔

''وہ کیسے..... میرے بیٹے.....'' وہ حیرت میں بولیں۔

''ممی یہ جو آرام و سکون ہوتا ہے ناں یہ انسان پر جادوئی طریقے سے اثر انداز ہوتا ہے۔ فوراً اس کی عادت ہوجاتی ہے جبکہ آپ کو دس سال بیت جانے کے بعد بھی اس گھٹن زدہ ماحول کی عادت نہیں ہو پائی۔

ورنہ آپ اپنا پارینہ رہن سہن اور تمام طریقے یوں یاد نہ رکھتیں۔ آپ بالکل ٹھیک ہو رہی ہیں۔ اسی خوشی میں مجھے دعا دیجیے۔'' رشنا نے ماں کو بیڈ پر بٹھا کر ان کے جوتے اتارے اور ٹانگیں اٹھا کر بیڈ پر رکھیں اور نئی خوشبو میں نہائی ہوئی کوئلٹ ان پر ڈال کر بولی۔ ''آپ اتنے آرام دہ بستر پر پل بھر میں سو جائیں گی۔''

''یہ کیسے ممکن ہے بیٹا..... تمہاری یہ میٹھی باتیں، ڈاکٹر کے مشورے اور دوائیں کب تک میرے دل کو بہلائے رکھیں گی۔'' وہ سرد آہ بھر کر بولیں۔

''ممی جب تک آپ ان کے ساتھ خود کو خوش کرنے کی کوشش میں لگی رہیں گی جس دن آپ نے کوشش چھوڑ دی آپ واپس پلٹ جائیں گی۔ اس لیے آپ نے اپنا وعدہ نبھانا ہے جو آپ نے مجھ سے کیا تھا۔''

''ہاں رشنی وہی وعدہ تو نبھا رہی ہوں۔ ہمارے دین میں وعدہ ایفا کرنے کو اولین سمجھا گیا ہے۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو بھی وعدہ کیا اسے ایفا کر کے بہترین مثال قائم کی ہے۔'' وہ عقیدت مندانہ لہجے میں بولیں۔

''بالکل درست..... آپ ڈپریشن جیسی موذی بیماری سے اسی لیے تو نکل رہی ہیں جو شخص اپنے جسم کی کیمسٹری کا ادراک رکھتا ہو وہ بہت سی بیماریوں سے بچ جاتا ہے۔ اب آپ کے باطن میں جو غصہ، نفرت اور حسرت کے کیمیکلز بنتے تھے آپ نے ان پر برف کا تودہ رکھ دیا ہے جونہی آپ کی طبیعت کا اضطراب کم ہوا تو ذہنی صحت بہتر ہونے لگی۔ کول ڈاؤن ہوتے ہی آپ کے ذہن میں مثبت سوچیں ابھریں۔ اس میں آپ کی کوشش شامل ہے۔ یہ دوائیاں تو محض ری لیکس کرنے کا کام کرتی ہیں جو وقتی اور عارضی سہارے دے سکتی ہیں۔ اصل کردار تو آپ کا ہی ہے۔'' وہ ماں کی ٹانگیں دباتے ہوئے بولی۔

''جی اماں سمجھ گئی.....'' وہ ذرا سا مسکرائیں اور آنکھیں بند کرنے لگیں۔ جونہی ان کے ہلکے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے تو رشنا دبے پاؤں اپنے سلیقے سے سجے ہوئے کمرے میں پہنچ کر خوشی سے اپنی ایڑی پر گھوم گئی۔

''ممی اگر آپ بیمار نہ ہوتیں تو پھر میں نفسیات ہرگز نہ پڑھتی۔ اب تو مجھے آپ جیسے مریضوں کے لیے بہت کچھ کرنا پڑے گا۔'' وہ پرسکون ہو کر اپنے بیڈ پر ہی کتابیں بکھیر کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

ٹنگ ٹانگ کی آواز پر اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ وہی انجان نمبر کا میسج دیکھ کر وہ حسرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔ بہت جلد خود کو نارمل کرنے کے بعد اس نے سوچا..... ''کوئی ہے جو میری پل، پل کی خبر رکھتا ہے، جب تک حسینہ کے گھر ہمارا قیام رہا مجھے ایک میسج نہ آیا۔ آج ہماری اس گھر میں پہلی رات ہے تو جھٹ سے میسج آ گیا۔''

''ویلکم بیک سویٹ ہارٹ..... تم نہیں جانتیں کہ میرا ایک مہینہ کیسے گزرا؟'' یہ پڑھتے ہی اس کی حیرت پھر سے اس کے دماغ پر سوار ہو گئی۔

''اب تو تم نے اپنا گھر بھی رینوویٹ کرا لیا ہے اگر اجازت دو تو اپنی اماں کو تمہارے گھر رشتے کے لیے بھیج دوں..... محبت یک طرفہ ہی سہی..... اشتیاق اور تجسس تو دو طرفہ ہے۔ اسی کے بل بوتے پر کیوں نہ شادی ہی کر لیں..... محبت کا کیا ہے، جب تم مجھ میں اس کی انتہا دیکھو گی تو پھر میری دیوانی ہو جاؤ گی۔''

''میں ابھی تمہاری خبر لیتی ہوں، کم بخت کہیں کے تم ہو کون..... میرے لیے مسٹری بن گئے ہو.....'' خود کلامی کرتے ہوئے اس نے اسی نمبر پر رنگ کیا۔ دوسری رنگ پر دوسری طرف سے کال اٹھا لی گئی تھی۔

''انجان نامراد عاشق..... مجھے اپنا نام اتا پتا تو بتاؤ.....'' وہ غصے میں پھنکاری مگر دوسری طرف خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''اگر انسان کے بچے ہو تو مجھے جواب دو اگر گدھے کی اولاد ہو تو ڈھینچوں، ڈھینچوں تو کر ہی سکتے ہو.....'' وہ تلملا کر بولی۔

''اگر شیطان کی نسل سے تمہارا تعلق ہے تو کان کھول کر سن لو..... مجھ پر تمہارا وار نہیں چلے گا۔'' وہ زور

دار لہجے میں بولی۔

''اگر جن اور بھوت ہو تو میرا پیچھا چھوڑ دو..... کیونکہ میں انسانوں کی بستی میں رہتی ہوں، جہاں جن کا بسیرا ناممکن ہے۔'' وہ اپنی طرف سے ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''او کے..... آج کے بعد تم نے مجھے میسج کرنے کی کوشش کی تو میں خود تمہیں ڈھونڈ نکالوں گی، یہ کون سا مشکل کام ہے۔'' وہ پھر چیخی..... اسی لمحے فوراً میسج آ گیا۔ رشنا نے ترنت میسج پڑھ لیا۔

''موسٹ ویلکم سویٹ ہارٹ، مجھے ڈھونڈنے کی کوشش تو کرو..... تمام مسئلہ حل ہو جائے گا..... ہاہاہا..... یہ کام میں نے تم پر چھوڑا..... میں بھی منتظر رہوں گا۔ اپنی آہو چشم قتالہ کی اس کاوش پر واری صدقے جاؤں.....''

''اچھا تو کیا میرے اڑوس پڑوس میں رہتے ہو.....'' وہ بے چینی سے بولی۔

''اری پگلی، تمہارے دل میں رہتا ہوں ذرا دل کو ٹٹول کر تو دیکھو.....'' میسج پڑھ کر وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔

''کالج میں میرے ساتھ پڑھتے ہو کیا؟ تو ڈر اور خوف کس بات کا..... سامنے آ جاؤ..... تمہیں کچھ نہیں کہوں گی..... قسم سے تمہیں معاف کر دوں گی یا تمہاری محبت کے گہرے سمندر میں غوطہ زن ہو کر عمر بھر کے لیے تمہاری ہو جاؤں گی۔''

''تم مجھے کالج سے نکلوا دو گی، کیا تم مجھے بیوقوف سمجھتی ہو، اس خوش فہمی میں مت رہنا، میں تو تمہیں دن دہاڑے بیچ آؤں، تمہیں خبر تک نہیں ہونے دوں گا۔''

یہ میسج پڑھ کر وہ خوف سے لرزی اور موبائل بند کر دیا۔

''کم بخت کون ہے جو مجھے اپنی آواز سے دور رکھنا چاہتا ہے، ضرور کولیگ ہی ہو گا یا اسی کالونی کا رہائشی ہو گا۔ جسے میں جانتی ہوں..... اگر وہ مجھ سے دو لفظوں میں بھی بات کرے تو میں اسے فوراً پہچان سکتی ہوں..... بہت شاطر اور چالباز انسان ہے جو صرف میسجز کے ذریعے مجھ تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

اس نے خود کلامی کرتے ہوئے کتابیں بند کر دیں اور لان کی جانب کھلنے والی کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھنے لگی۔ گیٹ سے پار چوکیدار کے موبائل کی تیز روشنی کے نقطے نے اسے دہلا دیا۔

''آہا..... چور تو چند فٹ دور کھڑا ہے، میں دنیا میں کھوجنے کا سوچ رہی تھی۔ مجھے تو یہ چوکیدار کی شرارت لگتی ہے، رات بھر اس کالونی کی چوکیداری کرنا آسان کام نہیں..... اس نے صرف مجھے ہی نہیں نہ جانے کتنی لڑکیوں کو بیوقوف بنا رکھا ہو گا۔ مجھے تو میرے رب نے اس کے چنگل سے بچا لیا ہے، نہ جانے کتنی ہی لڑکیاں اس کے میسجز پر بھروسا کرتی ہوں گی، اپنا بھی اور اس کا دل بہلانے کا سامان بنتی ہوں گی۔ اس سے پہلے بھی مجھے چوکیدار پر ہی شک تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ چوکیدار اپنا ہی لٹیرا ہو گا۔ کم بخت کہیں کا..... اس کی شکایت تو کرنی ہی پڑے گی۔ آخر ہم اس کو تنخواہ دیتے ہیں.....'' وہ خود کلامی کرتی رہی۔

اس کا دل چاہا کہ فوراً باہر نکل کر اسے دو چار سنا دے مگر اپنی ازلی بزدلانہ فطرت کی وجہ سے وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ پھر وہ خود کو سنبھال کر ہولے، ہولے چلتی ہوئی ماں کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوئی۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم سی روشنی میں اس نے آگے بڑھ کر ماں کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر سکون و طمانیت کی پرچھائیوں کو دیکھ کر وہ تمام خدشات اور وسوسوں سے باہر نکل آئی۔ اس کے لیے ماں کا صحت یابی کی طرف بڑھتے چلے جانا ایک معجزے سے کم ہرگز نہیں تھا۔ اس کی اپنی کوشش اور دعائیں بر آتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اسی لمحے اس کے بھرے، بھرے خوب صورت ہونٹوں پر دعائیں مچلنے لگیں۔

''یارب یہ معاملہ حل کر دے، میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنے والا یہ شیطان کون ہے، اس کو میرے سامنے کھڑا کر دے یا اسے تو ہی فنا کر دے۔ نہیں میرے رب اسے فنا کرنے کے بجائے نیک ہدایت جیسی دولت سے نواز دے۔ ورنہ اس شیطان کے یہ زہر میں ڈوبے ہوئے میسجز مجھے کہیں کا نہیں چھوڑیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ خوف اور ڈر، وہم اور شک مجھے بھی ذہنی مریض بنا ڈالے۔ میں یہ افورڈ نہیں کر سکتی۔''

☆☆☆

''رشنا! پلیز تھوڑی دیر کے لیے کتابوں کی جان بخشی کردو۔ میں تم سے ضروری مشورہ لینا چاہتی ہوں۔'' شبینہ نے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے کہا تو اس نے کتاب بند کر کے ماں کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھا۔

''مجھ سے لمبے بال نہیں سنبھلتے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں اپنے بالوں کو پرانے اسٹائل میں کٹوالوں۔''

''ممی کیوں نہیں..... اب تو میں آپ کا میک اور کراؤں گی۔'' وہ مسرت آگیں لہجے میں بولی۔

''یہ سنو اس پگلی کی بات..... اس حواس باختہ ماں کا میک اور کرائے گی۔ رشنا جان۔ اس کی ضرورت تو نہیں ہے، لمبے بالوں کی چٹیا سانپ کے مانند کمر پر جھولتی ہوئی مجھے کبھی پسند نہیں تھی۔ نہ جانے اتنے سال میں نے اس سانپ کو اپنے وجود پر ڈستے ہوئے کیسے برداشت کرلیا تھا۔'' وہ حیران کن لہجے میں بولیں۔

''ممی ان سالوں کو اپنی زندگی سے ڈیلیٹ کردینا ہی بہتر ہے۔ اب اس وقت کو یاد کرنا چھوڑ دیں۔ جب ہم اپنے عبرتناک ماضی کی دبی ہوئی چنگاریوں کی راکھ کو کریدتے ہیں تو وہ بھڑک کر ہمیں جلانے کی کوشش کرنے لگتی ہیں۔ آپ اسی وقت تیار ہوجائیں..... میں نے آپ کے لیے کپڑے خریدے ہیں ان میں سے وہ جوڑا نکالیے جو آپ کو سب میں سے پسند ہے۔'' وہ بچوں کی طرح چہک کر بولی۔

''ہائے بیٹا کیسی باتیں کرتی ہو، مجھے تو اپنی گھسے پٹے کپڑوں میں سکون ملتا ہے، لمبے بال سنبھالنا ذرا مشکل لگے تو اس لیے انہیں کٹوانے کا سوچ لیا۔ اسی سکون کی خاطر ہی بالوں کی کٹنگ کرانا چاہتی ہوں۔ مجھے اب ہر وہ کام کرنا ہے جس میں مجھے سکون ملے۔ نئے کپڑے مجھے تمہارے ڈیڈی کی یاد دلائیں گے۔'' وہ دکھی ہوگئیں۔

''وعدہ یاد ہے کہ یاد دہانی کراؤں؟'' رشنا ترنت بولی۔

''ہاں بیٹا یاد ہے۔ جیسا کہو گی کرنے کو تیار ہوں..... ایسا نہ ہو کہ گھر کو نیا پن سونپ کر کہیں اس بڑھیا کی جگہ نئی جوان ممی ہی نہ لے آؤ.....'' وہ قہقہہ لگا کر بولیں۔

''ممی آپ بڑھیا نہیں ہیں، خواہ مخواہ خود پر بڑھاپا طاری کر رکھا ہے میں اسی کو آپ پر سے اتارنے کا سوچ رہی ہوں، انسان کا جسم لاغر اور ضعیف ہوجاتا ہے لیکن دل کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ اگر سوچ جوان اور شگفتہ ہو تو پھر وجود بھی طوعاً و کرہاً جوانی کی طرف مائل ہو ہی جاتا ہے، اب آپ جوان ہیں، ذرا دس بار کہیں.....'' وہ خوشگوار قہقہہ لگا کر بولی۔

''بات تو ٹھیک ہے..... آج یہ بھی ہو ہی جائے۔ آخر کل تمہارے رشتے کے لیے میری اس چھوٹی سی جنت میں خوش نصیب لوگ بھی تو آئیں گے ناں..... اگر ماں ہی ناقابل قبول ٹھہری تو کون تمہیں اہمیت دے گا۔ اس دنیا کے سنگ چلنا ہماری مجبوری ہے، یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ تم نے یاد دلایا کہ میں ابھی زندہ ہوں اور ایک بیٹی کی ذمے داری میرے کندھوں پر لدی ہوئی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''ممی زندہ باد.....'' رشنا نے جذبات سے مغلوب ہوکر نعرہ لگایا۔ ''ممی ذرا یہ آواز بلند کہیے..... ہمارا ماضی اچھا تھا، حال بہتر اور مستقبل بہترین ہوگا۔ اس پر ہمیں ایمان ہے۔ ممی یہ جملہ ذہن نشین کرلیں.....'' یہ کہتے ہوئے اسے معاً ایک خیال آیا کہ ماں کو یہ مژدۂ راحت سنا کر خوش کردوں کہ میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہے کیونکہ مجھے اس دنیا کی اتنی سی تو سمجھ آگئی ہے کہ ہم دونوں کے درمیان ایک میل پارٹنر کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ سن کر شبینہ کی آواز میں رقت انگیزی سما گئی۔

''میری بچی..... مجھے اتنی بڑی خوشی اسی زندگی میں حاصل ہوگی۔ اس کا تو تصور بھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔'' وہ خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے اسے بازوؤں کے حصار میں لے کر دعائیں دینے لگیں۔

ایک نارمل عورت کے سے اس ری ایکشن پر رشنا جھوم گئی۔ سچ ہے کہ گھر کی چار دیواری کے اندر کا ماحول ایک عورت کو فرش پر اوندھے منہ بھی گرا سکتا ہے اور عرش کی سیر بھی کرانے کی اپنی مثال آپ ہے۔ وہ ماں

کے سینے سے لگی سوچتی چلی گئی۔

☆☆☆

''حسینہ! تمہاری سہیلی نے مطلب نکالا اور غائب ہوگئی۔ میں نہ کہتا تھا کہ وہ پرلے درجے کی خودغرض لڑکی ہے۔ بھائی، بھائی کہتے ہوئے اس کا منہ نہیں تھکتا تھا۔ اب کہاں گیا یہ بھائی اور تمہاری مدبرانہ آنٹی.....؟'' نائل نے حسینہ کو جی بھر کر چھیڑا۔

''نائل بھیا آج کل میری دوست بہت پریشان ہے، کوئی بھیدی ہے جو اسے رات کے دو بجے میسجز کے ذریعے بہت تنگ کررہا ہے، اب تو اس سے شادی کی خواہش کے ساتھ اغوا کرنے کی دھمکیاں بھی دینے لگا ہے۔ آج کل تو وہ گھر میں ہی قید ہوکر رہ گئی ہے۔ ڈر کے مارے ایک ہفتے سے کالج بھی نہیں جاسکی۔ آپ اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے کیسے، کیسے القابات سے نوازرہے ہیں، افسوس کا مقام ہے۔'' وہ تنبیہاً بولی۔

''میری اس سے بات تو کراؤ۔ چار بھائیوں کے ہوتے ہوئے اسے اغوا کرنے کی کوئی بھی جرأت نہیں کرسکتا۔ یہ اتنا آسان کام نہیں.....'' وہ شوخی بھرے انداز میں بولا۔ ''یہ پیارا اور ذمے دار بھیا اس کا مسئلہ پل بھر میں حل کرسکتا ہے۔''

''وہاں میری تسلی تشفی تو ناکام ہی رہی، مجھے تو اسے دیکھ کر افسوس ہونے لگا ہے، ماں صحت یاب ہوگئی اور یہ بیمار پڑنے لگی۔ یہ جو خوف اور ڈر ہوتا ہے ناں انسان کو زندہ لاش بنادیتا ہے۔ پہلے ماں غصے ونفرت میں زندہ لاش بنی رہی، اب یہ انہی کے نقش قدم پر چل نکلی ہے۔'' حسینہ نے پژمردگی میں کہا۔ ''بھیا آپ ہی کچھ کریں۔''

''ہم ہی کچھ کریں کے حسینہ..... تم فکر مت کرو۔ اس کی ماں کا علاج سائیکاٹرسٹ کے پاس تھا اس کا علاج مابدولت کے پاس ہے، آخر ہے تو منہ بولی بہن..... مجھ پر اسے ٹرسٹ بھی ہے اور مجھے چاہتی بھی ہے، یہاں ایک مہینہ کیا رہ کر گئی، اس نے سب سے زیادہ میری پسند کا خیال رکھ کر کھانے پکائے، میری خوب خاطر مدارت کرتی رہی..... یہ الگ بات ہے کہ بڑی سیانی وقت شناس نکلی۔'' وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔

''مائنڈ نہ کرنا میں نے تو ایسا ہی محسوس کیا ہے، اسے یہاں بلاؤ، آج سے ہی علاج شروع کیے دیتا ہوں، ڈاکٹر گھر میں موجود ہے۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''نیم حکیم خطرۂ جان..... ذرا سنبھل کر بھیا..... ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ سے خفا ہی ہوجائے۔ خبردار اس سے جو کوئی بدتمیزی کی۔ وہ سیریس ہونے کے ساتھ، ساتھ بہت نیک طبع لڑکی ہے، آپ بھی جانتے ہیں۔ وہ آپ کو اپنا رئیل بھائی سمجھتی ہے۔'' حسینہ نے فکرمندی سے کہا۔

''بھئی بہت اچھی طرح جانتا ہوں، تمہاری نیک پروین کو اس لیے تو دکھ ہورہا ہے اس کی بیماری کا سن کر۔ تم بے فکر رہو یہ جو بھائیوں کا سایہ ہوتا ہے ناں بہنوں کو بہت تحفظ دیتا ہے۔ اور دوستوں کی ہمراہی میں بھی لڑکیاں خود کو محفوظ ہی تصور کرتی ہیں، آج اسے دوست بن کر سمجھاؤں گا۔ دیکھنا کیسے کایا پلٹ ہوگی اس کی۔''

''مذاق مت کریں نائل بھیا، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں، اس کی یہ سوچ آپ تک پہنچائے دیتی ہوں کہ دوستی کے لیے اس دنیا سے لڑکیاں اٹھ گئی ہیں جو یہ ہماری کولیگز نامحرم لڑکوں کو دوست بنائے بیٹھی ہیں، خبردار جو اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ آپ کو بہت ندامت اور تاسف ہوگا۔'' وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''عجیب دقیانوسی سوچ ہے اس کی..... اس دور میں ایسی لڑکی کا ملنا جوئے شیر حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ چلو ابھی تم ہی اسے فون کرو اور میری بات کرادو۔''

''بھیا جانی آپ کے فون سے وہ فوراً بہل جائے گی اس وقت اسے میل فگر کے سہارے کی ضرورت ہے۔''

''مجھے بسروچشم اس کا سہارا بننا منظور ہے لیکن حسینہ فون کرنے کی ہمت نہیں ہورہی۔ یہ مناسب نہیں لگتا کیونکہ آج تک تو میں نے اسے فون نہیں کیا۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''بھیا آپ نے تین موبائل کس لیے رکھے ہوئے ہیں، آج اپنی پریشان حال بہن کو تسلی وتشفی ہی دے ڈالیے، اس وقت اسے آپ کی دلجوئی کی ضرورت

ہے۔'' وہ ذہنی ردوکد میں بولی۔

''چلو بھئی اگر تم ضد کرتی ہو تو تمہاری مان لیتا ہوں، ایک منٹ کا وقفہ چاہیے۔ مجھے سوچ لینے دو کہ تمہاری سہیلی کو اعتماد میں کیسے لیا جائے۔'' طویل توقف کے بعد وہ گہری سوچ سے باہر نکل کر مسکرا دیا۔ اور خود اعتمادی سے بولا۔

''حسینہ ایسے کرو..... ابھی اسے میسج کرو کہ ہم دونوں اس کی خود ساختہ بیمار پرسی کے لیے آرہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے.....'' یہ کہہ کر نائل نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنے موبائلز کو ٹٹولا اور ایک موبائل نکال کر اس کا نمبر کانٹیکٹ لسٹ میں ڈھونڈنے لگا۔

''یہ آئیڈیا سب سے بہتر ہے، میرے اچھے بھیا شکریہ، نوازش..... میں تیار ہو کر آتی ہوں پھر دونوں اس کی طرف چلتے ہیں۔'' وہ ایک دم سے اچھلی۔ ''یاد رکھیے گا، وہ ایک ہی ٹریک پر چلنے والی لڑکی ہے، اسے دوغلے پن سے بہت نفرت ہے، آپ جتنی اس کی مدد کر سکتے ہیں، بس اتنا ذکر کیجیے گا۔''

نائل نے اسے فون کیا تو پہلی ہی رنگ پر اس نے اٹھا لیا نمبر دیکھے بغیر اور چیختے ہوئے بولی۔

''کم بخت تم نے مجھے ذہنی طور پر بیمار کر دیا ہے۔ اب دن کے وقت تنگ کرنے پر تل گئے ہو، آج تمہاری یہ جرأت کہ مجھے شام کے پانچ بجے فون کر رہے ہو، تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ لاوارث، آوارہ یا ڈرپوک، آج مجھے اس کا جواب چاہیے..... نامراد کہیں کے، جب میں تمہیں فون کرتی ہوں تو تم آگے سے خاموش کیوں رہتے ہو؟ اور میسجز سے جواب دینے لگتے ہو، کیا تم گونگے اور بہرے ہو، اللہ کرے اندھے بھی ہو جاؤ.....'' وہ استحقاق سے چیخی۔

''ڈیئر چیخنا چلانا صحت کے لیے بہت فائدہ مند ہوتا ہے اور گالم گلوچ وہ بھی خدا کی قسم تم میرے سامنے ہوتے تو تمہاری زبان گدی سے کھینچ نکالتی تاکہ... مجھے یقین رہتا کہ تم گونگے ہو، اور تمہارے ہاتھ توڑ کر کتے کو کھلا دیتی۔ تاکہ تم عمر بھر یاد رکھو کہ کسی شریف زادی کا چین تم نے حرام کرنے کی پاداش میں یہ سزا بھگتی ہے۔'' نائل نے فوراً فون بند کر ڈالا۔

''یہ نمبر تو دوستوں کے لیے استعمال میں آتا ہے۔ اس سے میری بہنوں کا کوئی سروکار نہیں..... چل یار دوسرا موبائل نکالو اور اپنی منہ بولی بہن سے بات کرو۔'' اس نے توقف کے بعد رشنا کو فون کیا تو کئی رنگز کے بعد اس نے جواباً ہیلو نائل بھیا کیسے ہیں؟ کہا تو وہ مسکرا دیا۔ وہ ترنگ اور بے خودی میں سرگوشی کرنے لگا۔

''مان گیا ہوں تمہیں۔ اب تمہیں یہ خوشخبری کب سناؤں کہ میں بھی تمہیں اغوا کرنے کا پروگرام بنا چکا ہوں، کوئی دوسرا انجان اور غیر تمہیں کیونکر اغوا کر لے۔ جب گھر میں ڈاکو موجود ہے تو۔''

''نائل بھیا کیا میری آواز نہیں آرہی..... میں آپ کو رنگ کرتی ہوں۔'' وہ بے تابی میں ہیلو، ہیلو کرتے ہوئے بولی۔

فون بند ہو گیا تو نائل ہنس کر پھر سے اس کا نمبر ملانے لگا۔ ''اُف یہ لڑکیاں کتنی معصوم ہوتی ہیں، اعتماد، محبت و اپنائیت سے بھرپور..... نہ مذاق سمجھتی ہیں نہ سنجیدہ پن..... انہیں کسی کی نیت کی آگہی کا علم ہی نہیں ہوتا۔ اور بنتی ہیں عقلِ کل.....''

''آواز تو آرہی تھی رشنا بہن..... مجھے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ تم سے بات کہاں سے شروع کروں.....'' وہ مانوسیت اور بے تکلفی سے بے بہرہ ہو کر بولا۔

''بھیا آپ کو مجھ سے بات کرنے میں اتنی دقت کیوں ہو رہی ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔

''میں نے سنا ہے کہ کوئی جوان لڑکا تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' وہ چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

''آپ کو شرارت سوجھی اور ہماری جان گئی۔ نائل بھیا! ایسا ہی پڑھنے میں آیا ہے، نہ جانے کون سر پھرا ہے، مجھے تو اپنی کالونی کا چوکیدار معلوم ہوتا ہے، میں نے اسے کئی بار فون کیا کہ اس کی آواز پہچان سکوں مگر وہ شاطر تو مجھ سے بھی دس ہاتھ آگے نکلا۔ میری بات کا جواب میسجز سے دیے جا رہا تھا۔'' وہ جھلا کر بولتی رہی۔

''رشنا، چوکیدار کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہ کوئی اور ہے..... مجھے تفصیلاً بتاؤ اس نے بات کہاں سے

شروع کی تھی؟ اور تم نے جواب کیسے دیے.....؟ میرا مطلب ہے تم ان لڑکوں کی ذہنت کا ادراک نہیں رکھتیں۔ میرا خیال ہے اسی کالونی کا رہائشی لڑکا ہے، جوان مرد یا کوئی ساٹھ سنہ بھی ہوسکتا ہے۔'' وہ قیاس آرائیاں کرنے لگا۔

''نائل بھائی میں نے ایک میسج کا بھی جواب دینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ ورنہ اب تک سچ مچ اغوا ہوچکی ہوتی۔ آپ کو میں تمام میسجز فارورڈ کرتی ہوں..... آپ کو اس کی ذہنیت کا اندازہ لگانے میں کارآمد ثابت ہوں گے۔ مجھے تو کوئی شیطان ہی معلوم ہوتا ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اوکے..... میں اور حسینہ تمہاری طرف آنا چاہتے ہیں، آنٹی سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوگا اور تم سے بھی تفصیلاً اس مسئلے پر بات ہوسکے گی۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔'' ہم پانچ منٹ دور ہیں تم سے..... تم کچھ بھیا کے کھانے، پینے کا انتظام کرو۔''

ٹھیک ہے نائل بھیا..... ممی کے سامنے اس مسئلے کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں..... ایسا نہ ہو کہ وہ پھر سے ڈپریشن میں چلی جائیں۔ اور میں آپ کے لیے گرما گرم پکوڑے بناتی ہوں آپ جلدی سے آجایئے۔''

''تم فکر مت کرو..... ہم ایسی کوئی بات نہیں کریں گے جو آنٹی کے مزاج پر گراں گزرے اور میری فیس صرف پکوڑے..... یہ بات تو نہیں ہوئی رشنا.....'' لہجے میں اپنائیت کوٹ، کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''چلیں نائل بھیا آپ کو دودھ پتی بھی فیس کے ساتھ ہی پلا سکتی ہوں.....'' رشنا کے لہجے میں رنگ خلوص عبارت تھا۔ نائل کا دل و دماغ سراپا تحسین ہو کر رہ گیا۔

''کون کہتا ہے کہ تم بہن کہلانے کے قابل ہو۔ شاید حالات کا یہی تقاضا تھا۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا اس کے گھر پہنچ گیا۔

''نائل بھیا، حسینہ کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آئی؟ اس نے بھی آنے کی اطلاع دی تھی۔ اور آپ نے بھی صبح کا کہہ کر شام کو تشریف لائے ہیں، سب خیریت تو ہے۔''

''دراصل میں دن بھر سوچ بچار میں ہی الجھا رہا۔ اس لیے دیر ہوگئی۔ حسینہ باہر تمہارا انتظار کر رہی ہے رشنا.....'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ تو اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے آزاد کرالیا..... اور متعجب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''باہر کہیں چل کر بیٹھتے ہیں تاکہ کھل کر بات ہوسکے اور اس مسئلے کا حل نکال کر کل ہی اس پر عمل کیا جاسکے..... تم نے پہلے ہی بلا تامل بتایا ہوتا تو آج تم اس قدر پریشان ہرگز نہ ہوتیں.....'' وہ نادم ہونے کے بجائے ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

''نائل بھیا! بے شک میں ڈرپوک سہی..... مگر چودہ سال کی عمر سے اپنے تمام الجھے ہوئے معاملات خود ہی سلجھا رہی ہوں، جب ڈیڈی کی ڈیتھ ہوئی تو اس دن میں نے آناً فاناً دس سال کا سفر طے کرلیا تھا۔ جب ہم سے تمام جائداد ہتھیا لی گئی تھی تو یقین جانیے ممی کی حالت دیکھ کر میں دس سال مزید آگے بڑھ گئی۔ یقین جانیں مجھے اسی سرخروئی نے زندہ رکھا۔ اور پھر انکل کے زیر سایہ مجھے کبھی کسی کمی کا احساس نہیں ہوا۔''

''اور آج اس پریشانی میں تم بیس سال آگے چھلانگ لگا کر تقریباً پچاس سال کی ہوگئی ہو.....'' وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔

''یوں ہی سمجھیے نائل بھائی..... مگر حسینہ کی وجہ سے میری زندگی کا ہر لمحہ امید و آس میں گزر رہا ہے، بے تسکین کہیں سے نہیں.....''

''تو پھر سنو کہ آج اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کے بعد تمہیں ریورس گیئر لگانا پڑے گا اور اسی اسٹیشن پر رک جانا۔ جہاں سے تم نے سفر شروع کیا تھا۔ اس لیے اختلاج کی کیفیت سے باہر نکل کر دیکھو..... یہ مسئلہ جس کو تم اس وقت فیس کر رہی ہو، بہت معمولی سا ہے۔'' وہ دل نوازی سے بولا۔

''اوہ میرا بیٹا کب آیا؟'' شبینہ نے نائل کو لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر خوشدلی سے کہا۔

''آنٹی دو منٹ ہوئے ہیں، حسینہ باہر گاڑی میں انتظار کر رہی ہے، وہ آج کھانے کے لیے ریسٹورنٹ جانا چاہتی تھی مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ رشنا کے بغیر چلی جائے۔ اس لیے میں آپ سے ملنے اندر ہی آگیا کہ دونوں کام ہی

ہو جائیں.....'' وہ فوراً احتراماً کھڑے ہو کر بولا۔

''بیٹا! آج کل سب کے پاس وقت کی کمی ہو گئی ہے، کبھی کبھار چکر لگا لیا کرو، آج تم نے اچھا کیا..... نہ جانے یہ گھر میں قید کیوں ہے.....؟ دس بار پوچھ چکی ہوں کہ کوئی پریشانی لاحق ہے تو مجھے بتاؤ..... اور .... ری لیکس ہو جاؤ..... مگر کچھ نہیں بتا رہی۔ بیٹا یہ تو میرا مسئلہ ہی بن گئی ہے۔ تم ہی اس سے پوچھ لو۔ اللہ کرے کوئی مسئلہ نہ ہو، میرا وہم ہی ہو، اس کو غور سے دیکھو کیسی پیلی پڑ گئی ہے۔ شاید طبیعت ناساز ہے، میں کچھ نہیں جان پائی۔'' وہ فکرمندی سے بولیں۔

''ممی میں سب سے پہلے اپنی پریشانی آپ سے شیئر کروں گی۔ آپ بے فکر رہیں..... آپ کی بیٹی مسئلہ نہیں ہے۔ میرا مسئلہ بوریت ہے، ایک ہی طرح کی روٹین سے دل اچاٹ ہونے لگے تو اس میں تبدیلی لانا لازم ہو جاتا ہے ناں ممی..... آپ تلاوت قرآن پاک کر رہی تھیں۔ میرے لیے دعا کیجیے گا کہ کل کالج جانے کے لیے خوشی، خوشی تیار ہو جاؤں.....'' وہ ہلکی مسکان سے انہیں تسلی دینے کی غرض سے بولی۔

''فی الحال اپنے بھائی اور بہن کے ساتھ گھومو پھرو، نائل بیٹا انہیں فلم کے لیے بھی لے جانا..... جب یہ گھر واپس آئے تو اس کی سوگوار اور مایوس کن شکل پر مسرت کی پرچھائیاں ہوں۔'' اتنا کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔

''آنٹی آپ بہت نائس ہیں، تھینک یو..... ہمیں واپس آنے میں تھوڑی دیر ہو جائے گی، آپ بے فکر رہیے گا۔ آپ کے برخوردار کی زبان اور قلم میں بلا کی تاب و قوت ہے، ابھی اس کا مزاج درست کرتا ہوں۔'' وہ شگفتہ لہجے میں بولا۔

''بیٹا تم ان کے ساتھ ہو تو پھر فکر کیسی؟ جاؤ میرا بیٹا، خوب انجوائے کرنا۔'' شبینہ نے نائل کی چوڑی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور رشنا کو گلے لگا کر رب راکھا کہا۔

وہ دونوں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئے۔ نائل کی گاڑی گیٹ سے باہر ہی کھڑی تھی۔ وہ نائل کے ساتھ چلتی ہوئی گاڑی تک پہنچی تو ایک دم سے اچنبھے سے نائل کی طرف دیکھ کر بولی۔

''نائل بھیا حسینہ کہاں ہے؟''

''اسے رستے سے پک کر لیں گے۔ وہ ابھی تیار نہیں تھی۔ ایک تو تم لوگوں کے کیل کانٹے ہی پورے نہیں ہوتے۔'' وہ بناوٹی لہجے میں بولا۔

''آپ نے جھوٹ کیوں بولا؟ نائل بھیا اگر آپ یہ انکشاف کرتے تو میں پھر بھی آپ کے ساتھ چل پڑتی۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''جس جھوٹ میں مصلحت نظر آئے اسے جھوٹ نہیں کہنا چاہیے..... مگر کہہ سکتی ہو.....'' وہ دانت نکالتے ہوئے بولا..... اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

''یعنی مکر و فریب، جھوٹ سے بھی خطرناک.....'' وہ بے اختیارانہ بولی۔ ''مجھے آپ کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ایک لفظ انسان کے کردار کی مکمل داستان پیش کر دیتا ہے۔''

''یار اب گاڑی میں بیٹھ بھی چکو..... حسینہ سے درگت بنوانے کی نہیں ہو رہی۔'' وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے ذرا سا الجھ کر بولا۔ وہ متذبذب سی ہوتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کا منہ پھولا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں حیرت و تاسف کے گہری پرچھائیاں دیکھ کر نائل نے ہلکا سا میوزک لگایا تو رشنا نے فوراً بند کر دیا۔

''کیا ہوا؟ محترمہ کی شان میں گستاخی تو نہیں کی۔'' وہ خفیف سا ہو کر بولا۔

''نائل بھائی مجھے یہ بتائیں کہ پہلے جھوٹ کا سہارا لیا اور اب مجھے یار کیوں بولا ہے؟ مگر پر مگر..... کچھ پسند نہیں آئی آپ کی یہ تبدیلی.....'' وہ استفہامیہ لہجے میں بولی۔

''بڑی ہی دقیانوسی لڑکی ہو..... اگر آزاد خیال شوہر سے واسطہ پڑ گیا تو کیا کرو گی۔ کیا اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو گی۔''

''ہاں، چھوڑ دوں گی۔'' اس نے سختی سے کہا۔

وہ سختی سے بولا تو اس کا دل چاہا فوراً گاڑی رکوا کر سڑک کے درمیان ہی اتر جائے۔ مگر خود پر قابو پا کر

اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''سچ کہہ رہی ہو کہ جذبات میں ڈوب کر..... بے اختیارانہ بول گئی ہو کیونکہ یہ چھوٹی بات نہیں کہی تم نے..... شوہر کو چھوڑنا معمولی سی بات پر عقلمندانہ فیصلہ نہیں..... میاں، بیوی ہر وقت جھگڑنے کے باوجود ایک دوسرے سے گلوخلاصی نہیں چاہتے۔'' وہ پھر سختی و درشتی سے بولا۔

''نائل بھیا آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ باہر دیکھ کر چونکی اور موضوع سے ہٹ گئی۔

''ریسٹورنٹ۔'' وہ منہ پھلائے ہوئے بولا۔

''حسینہ کے بغیر.....؟ یہ ممکن نہیں..... اگر آپ حسینہ کو نہیں لینا چاہتے تو گاڑی روکیے اور مجھے یہاں ہی اتار دیجیے.....'' وہ خوفزدہ سی ہو کر رہ گئی۔

''محترمہ ذرا غور سے سنیے۔'' اس نے موبائل نکال کر میسجز پڑھنے شروع کیے تو وہ تھرتھرانے لگی۔

''میں نے آپ کو میسجز فارورڈ نہیں کیے تھے۔ یہ آپ کو کس نے بھیجے ہیں.....'' وہ عجیب خوفزدہ انداز میں ترنت بولی۔

''بہت نادان اور معصوم ہو..... یہ میسجز مجھے کون بھیجے گا۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ''ذرا آخری میسج پر غور کرو..... کہ اگر تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی تو میں تمہیں اغوا کرلوں گا..... اور آج میں نے یہ دھمکی پوری کر دکھائی ہے کیونکہ مجھے تم سے والہانہ محبت ہے آج کی نہیں..... یہ بہت پارینہ ہے، جب تم اول جلول بن کر رہتی تھیں، ڈری اور سہمی ہوئی۔ خود اعتمادی نام کو نہ تھی تم میں۔ تب سے تم پر مرتا ہوں اور اب میں برسرِ روزگار ہو چکا ہوں۔ تمہاری اور آنٹی کی ذمے داری اٹھانے کے قابل..... تو سوچا کہ تمہیں اغوا کرلوں۔ تم ہو بہت ٹیڑھی، تمہیں کسی منت، محبت بھری باتوں اور اپنی ان گنت خواہشات کے اظہار سے بھی سیدھا کرنے میں ناکام رہا تو دھمکیوں پر اتر آیا۔ بولو کہ میں کیا کرتا؟ آخر اغوا کرنے کا سوچ لیا۔ اسے دھمکی مت سمجھنا، یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔''

''نائل بھیا! مجھے یقین نہیں آرہا کہ آپ اس قدر بدنیت انسان ہیں۔'' وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے بولی۔

''یار محبت میں بدنیتی نہ ہو تو اسے محبت کا نام نہیں دے سکتے۔ مجھے ہر حال میں تمہیں حاصل کرنے کی چاہ تھی۔ اس کے بعد کوئی بھی قانون مجھ پر لاگو نہیں رہتا۔ محبت اسی آزادی میں پروان چڑھتی ہے..... اس کی ''بڑھاوت'' کے لیے صرف ایک ہی شرعی قانون کا میں پابند ہوں، باقی سب قانونِ زمانہ ہیں، ضابطے اور قاعدے ہیں، جن سے مجھے اتفاق نہیں.....'' وہ خوش الحانی میں بولا۔

''اوہ مائی گاڈ..... اس قدر چیٹنگ.....'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ پھر کیا کرتا؟ تم نے تو ہمارے گھر آنا ہی چھوڑ دینا تھا۔ بھائی بن کر تم سے بے لوث محبت بھی بٹوری۔ بہن کے روپ میں جی بھر کر فرمائشوں کا تمہیں عادی بھی بنا دیا۔ بولو کہ اب مجھے چھوڑ کر کہاں جانا چاہتی ہو اگر کالونی کا چوکیدار مجھ سے بہتر ہے تو تمہیں روکوں گا نہیں.....'' وہ بھویں چڑھا کر بولا اور پھر ہنسنے لگا۔

''میرا خیال ہے عزت کا رکھوالا اور میری پل، پل کی مخبری کرنے والا چوکیدار ہی میرا جیون ساتھی ہو سکتا ہے۔ مگر ایک عرضداشت ہے اگر اجازت ہو تو.....'' وہ سر جھکائے حیا و شرم سے لبریز لہجے میں بولی۔

''مابدولت کی طرف سے اجازت ہے۔'' وہ سینہ تان کر بولا۔

''عرض یہ ہے کہ مجھے منہ بولے نائل بھیا کو عاشق بامراد کے روپ میں ڈھالنے کے لیے تھوڑا سا وقت چاہیے.....'' وہ اس کی محبت پاش آنکھوں میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے بولی۔

ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں گاڑی پارک کرتے ہوئے وہ اب اسے والہانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''عاشق بامراد..... واہ فیصلہ تو ہو چکا جانِ من.....'' اس نے فتح مندی کے احساس میں اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

❀ ❀ ❀

ماہا زما

آسیہ عامر

''ماما! آپ انسولین لگالیں، میں آپ کے لیے ناشتا بنا کر لاتی ہوں۔'' ماہا نے بڑے پیار سے ساس کو دیکھتے ہوئے کہا، اور انسولین کا باکس فریج میں سے نکال کر انہیں پکڑایا اور خود کھلے ہوئے ریشم جیسے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر کچن کی طرف چل پڑی۔

''ماہا......!'' ماما نے آواز لگائی تو وہ کچن سے فوراً کمرے کی طرف بھاگی۔

''جی ماما......؟'' ماہا نے تابعداری سے آکر پوچھا۔

''زین العابدین رات کو کیا بہت دیر سے گھر لوٹا تھا؟'' ماہا کو لگا ماما کا موڈ سخت خراب ہے۔

''ماما وہ زین کے ساؤتھ افریقا والے دوست حارث بھائی آئے ہوئے ہیں تو سب دوستوں نے انہیں ہائی وے پر ٹریٹ دی تھی۔ اس لیے رات کو چار بجے گھر آئے تھے، آپ کو جگانا مناسب نہیں

سمجھا۔ ''ایسا کبھی ہوا نہیں کہ زین ماں سے ملے بغیر سو جائے۔'' ''اور اتوار کے دن تو آپ کو پتا ہی ہے وہ بارہ بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتے۔''

''ہونہہ......'' کہہ کر ماہا نے منہ دوسری طرف کرلیا جیسے کہہ رہی ہوں کہ جاؤ اپنی شکل گم کرو۔ ماہا نے کچن کا رخ کیا اور جلدی سے ماما کی پسند کا جو کا دلیہ پکا کر انہیں ناشتے میں لا کر دیا۔ اکثر اتوار کو ماما دلیے کی ہی فرمائش کرتیں...... آج ماہا نے خود ہی پکا دیا اور پھر دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگی کیونکہ ناشتا تو وہ زین کے ساتھ ہی کرتی چاہے دوپہر کے دو بج جائیں۔

ماہا ایک تمیز دار اور سگھڑ بہو تھی۔ وہ اپنے شوہر کے کہنے سے نہیں بلکہ اپنے دل سے انسانیت کے ناتے اپنی ساس کی ہر ممکن طریقے سے خدمت کرتی تھی شادی سے پہلے ہمیشہ اس نے یہی سوچا کہ وہ اپنی ساس کو ماں کی طرح سمجھے گی بلکہ اس کی بچپن کی سہیلی سے اکثر اس بات پر بحث ہو جاتی۔ مزملہ اور ماہا کی بچپن کی لازوال دوستی اسکول، کالج کے بعد اب شادی شدہ زندگی تک بھی قائم و دائم تھی۔ ایسی دوستیاں بہت کم بنتی ہیں جن کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہو۔ دونوں کے گھروں کا ماحول بھی ایک دم جدا تھا۔ ماہا کی ممی کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ اور وہ لوگ ایک پوش علاقے میں رہتے تھے لیکن شادی ہو کر اس محلے میں آ گئیں لیکن اس ماحول میں بھی ایڈجسٹ کرلیا تھا۔ جبکہ مزملہ کے گھر کا ماحول بہت گھٹا گھٹا سا تھا۔ جوائنٹ فیملی تین چچا... ایک پھپو اور دادی کے ہمراہ یہ لوگ رہتے تھے۔ مزملہ کے ابو نے ساری زندگی روزگار کے چکروں میں سعودی عرب میں گزار دی تھی۔ سال میں ایک دفعہ آتے تو دیورانیاں مذاق اڑاتیں کہ بھائی جان ہر سال ایک نیا کیلنڈر چھاپ کر چلے جاتے ہیں اسی طرح کرتے کرتے پانچ بچے ہو گئے ایک ایسی عورت جس کا شوہر پردیس میں کمائی کر رہا ہو اسے بہت سی باتوں کو مدِنظر رکھنا پڑتا ہے۔ بیٹیاں بھی اللہ تعالیٰ نے چار دے دیں مزملہ کو گھر سے باہر جا کر کھیلنے کی اجازت نہیں تھی، اسی لیے ماہا ہر وقت مزملہ کے گھر میں پائی جاتی۔

گھر سے باہر جاتے ماہا کے گلے میں دوپٹا ہوتا جبکہ مزملہ چادر اوڑھ کر جاتی پھر بھی ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی ہماری شکایت ہمارے چاچوؤں سے نہ کر دے وہ تو گھر بٹھا دیں گے کچھ پوچھیں گے بھی نہیں۔

شعور کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی مزملہ جب بھی اپنے جیون ساتھی کے متعلق سوچتی تو ہمیشہ ماہا سے یہی کہتی۔

''یار بے شک غریب لڑکے سے شادی ہو لیکن وہ میرے باپ اور چچاؤں کی طرح شکی نہ ہو۔'' ماہا اس بات سے چڑ جاتی۔

''کیوں شکی ہوگا؟ اور شکی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے ہو تو ہو شکی ...... ہاں ساس اچھی ہونی چاہیے جس کے ساتھ پورا دن گزارنا ہوتا ہے۔'' مزملہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہتی۔

''کیا شوہر کے ساتھ تو پوری زندگی گزارنی ہے؟''

''مزملہ تم دیکھنا میں ساس کو اپنی سہیلی بناؤں گی۔'' ماہا پُریقین انداز میں کہتی۔

''لیکن ماہا ساس کبھی سہیلی یا ماں نہیں بن سکتی، چاہے تم اپنے خون کا آخری قطرہ تک پلا دو......''

''کیوں بھئی ساس ڈریکولا ہوتی ہے؟'' ماہا نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

''ارے بہن میرا مشاہدہ کہتا ہے کہ اس رشتے میں اعتبار ہے ہی نہیں......''

''ارے چل آئی بڑی اعتبار والی۔'' ماہا نے مزملہ کی کمر پر چپت لگائی۔

''لو بھئی لگ گئی شرط تم اپنی ساس کو ماں بنا کے دکھانا میں تمہارا نام دی گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں لکھوا دوں گی۔'' مزملہ نے شرط لگانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو ماہا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ان شاء اللہ تعالیٰ میں تمہیں یہ شرط جیت کر دکھاؤں گی، میں اپنی ساس کو اتنی عزت، اتنا پیار دوں گی کہ جتنا اپنی ممی سے کرتی ہوں۔ سچے دل سے ان کی خدمت کروں گی تو وہ بھی گوشت پوست کا انسان ہوں گی ناں کب تک میری محبت کو جھٹلائیں گی۔''

''ارے بہن، ان تلوں میں تیل نہیں ہوتا۔''

مزملہ اپنی بات پر ڈٹی رہی۔

''دیکھو مزملہ ساس ہمیں اپنا لاڈلا پیارا بیٹا سونپتی ہے، بدلے میں ہم بغیر کسی غرض کے ان کی خدمت کرتے ہیں تو کیا برائی ہے؟'' اس نے بڑی معصومیت سے سہیلی سے کہا۔

''دراصل ماہا تمہاری ممی کے ساتھ ساس نام کا کانٹا نہیں لگا ہوا ہے ناں اس لیے تمہیں اس رشتے میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو... جب وقت آئے گا دیکھی جائے گی۔'' اور جب وقت آیا تو ماہا دل و جان سے اپنی ساس کی خدمت کرتی تھی۔

ماما ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ڈراما دیکھ رہی تھیں اور انہیں گرما گرم کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ اتنی دیر میں ماہا ٹی وی لاؤنج میں آئی جہاں پر ہیٹر چل رہا تھا۔ ماحول کافی گرم ہو چکا تھا۔ دسمبر کا آخری ہفتہ چل رہا تھا ایسی سردی میں تو ہر چیز پر برف جم رہی ہوتی ہے لیکن کبھی کبھار اس سردی میں آئس کریم کھانے کا بھی اپنا ہی مزہ ہوتا ہے لیکن اس وقت ماہا ابلے ہوئے انڈوں کے ساتھ گاجر کا حلوا اور ٹرے میں بھاپ اڑاتی کافی جس کی خوشبو پورے کمرے میں پھیل رہی تھی لے کر آئی۔ اور ماما کے پاس بیٹھ کر ایک کپ انہیں تھمایا اور ساتھ ہی انہیں حلوا اور ابلے ہوئے انڈے بھی دیے تو وہ شکر گزاری کے تاثرات لیے اسے دیکھنے لگیں۔ اکثر ایسا ہوتا ماما کچھ بھی سوچتیں ماہا۔ دہی کر لیتی کبھی تو وہ خوش ہو جاتیں اور کبھی چڑ بھی جاتیں کہ کیا ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے اس کی وجہ سے ان کی پرائیوسی ختم ہو رہی تھی۔ ہمیشہ اکیلے رہنے کی عادت تھی کچھ بھی کھایا پیا جمع کیا کسی نے نہیں دیکھا اب سارا کچھ ماہا کے ہاتھ میں تھا۔

ماہا کی یہ عادت تھی کہ ممی صوفے پر لیٹی ہوتیں تو وہ ان کے پیر اپنی گود میں رکھ کر نرم ہاتھوں سے دبانے لگتی یا زیتون کے تیل سے مساج کرنے لگ جاتی۔ ممی کو بہت سکون ملتا اور دل سے کتنی دعائیں نکلتیں۔ اب ماہا ساس کے گھٹنوں یا پیروں میں درد ہوتا تو وہ ان کی زیتون کے تیل سے مالش کر دیتی۔ عصر کی نماز کے بعد سورۂ بقرہ کا آخری رکوع پڑھ کر گھٹنوں پر جہاں درد ہوتا وہاں پھونک مار کر دم کر دیتی جس سے درد کم ہو جاتا۔ ہر ممکن طریقے سے ان کا خیال رکھتی اس سے اسے خود اپنے دل کو سکون ملتا تھا ایسا لگتا جیسے اس کے ارد گرد بہت سارے چھوٹے، چھوٹے جگنو ٹمٹما رہے ہیں جن کی روشنی اس کے چہرے کو منور کر دیتی اور زین کو ماہا پہلے سے بھی زیادہ پیاری لگتی۔ اور یہ نیچرل پروسس ہے کوئی ہمارے اپنوں کا خیال رکھتا ہے تو قدرتی طور پر ہمارے دل میں اس کے لیے پیار بڑھ جاتا ہے۔

زندگی بڑے اچھے انداز سے گزر رہی تھی لیکن موسم بدل رہا تھا جس کا اثر سب سے پہلے نازک سی ماہا کو ہوا۔ فلو، کھانسی اور پھر تیز بخار چڑھ گیا۔ صبح زین کے آفس جانے کے وقت اس نے ناشتا بنانے کے لیے اٹھنے کی کوشش کی تو ہمت نہیں ہوئی۔ زین نے ماما کو بتایا کہ ماہا کو تو بہت تیز بخار ہے، میرے لیے اور ماہا کے لیے ناشتا بنا دیں۔ یہ سن کر ساس کا تو اچھا خاصا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ لیکن برداشت کر گئیں اور بیٹے کو کہنے لگیں۔

''بیٹا ایسا کرو ماہا کو اس کی امی کے گھر چھوڑ جاؤ آفس جاتے، جاتے کافی دنوں سے یہ گئی بھی نہیں ہے، دوسرے جگہ بدل جائے گی تو طبیعت میں بھی بہتری ہوگی۔ دو تین دن ماں کے ہاں رہ آئے گی۔'' زین کی تو کوئی اعتراض نہیں ہوا لیکن ماہا کو شدید حیرانی ہوئی کہ بیمار ہو کے کیا میں اپنی امی کے گھر چلی جایا کروں اور تندرست ہوں تو یہاں رہوں؟ یہ کیا بات ہوئی۔ ایک دفعہ پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا جب تو وہ خوشی، خوشی چلی گئی تھی۔ اس لیے کہ اس کا اپنا دل چاہ رہا تھا جانے کا۔ خیر ابھی اس نے خاموشی سے اپنا ناشتا ختم کیا اور زین کے ساتھ چلی گئی کہ چلو وہاں پر امی اور مزملہ میں دل لگ جائے گا یہاں تو بخار میں اکیلی پڑی رہتی، اپنے دل کو اس نے تسلی دی۔ بخار تو ماہا کو تھا لیکن پھر بھی وہ ہی ساس کا حال احوال بھی پوچھتی رہی اور ساتھ ہدایات بھی دیں کہ اپنا خیال رکھیے گا۔ موسم ٹھنڈا گرم چل رہا ہے وغیرہ، وغیرہ۔ اُدھر مزملہ کو پتا چلا کہ ماہا اپنی امی کی طرف آئی ہوئی ہے تو وہ بھی ملنے کے لیے

آ گئی..... بچپن کی دوست کو دیکھ کر ہمیشہ ہی ماہا کو ایسی خوشی ہوتی جیسے اسکول، کالج لائف میں مزیدار دن گزرا کرتے تھے، ہمیشہ کی طرح دونوں شروع ہوجاتیں اپنے بچپن کے حسین لمحات کو یاد کرنے..... اب بھی کالج کے دنوں کو یاد کررہی تھیں کہ آنٹی چائے کے ساتھ سموسے، شامی کباب اور بسکٹ وغیرہ رکھ کر چلی گئیں، جانتی تھیں کہ بڑے دنوں بعد ملی ہیں اب خوب باتیں ہوں گی۔ ماہا کی طبیعت میں بھی کچھ بہتری آئے گی۔

''مزملہ تمہیں یاد ہے جب ہم کولڈ ڈرنک پی کر پچھلے گراؤنڈ میں جا کر دیوار پر اتنی زور سے مارتے تھے کہ کانوں میں کھسر پھسر کرتی ہوئی لڑکیاں ڈر کر ہم جاتیں کہ پتا نہیں کہیں بم پھٹا ہے اور ہم وہاں پر پڑی ہوئی خالی بوتلیں اٹھا کر کینٹین کے اصغر بھائی کو واپس کر کے باقی پیسے لے لیتے اور ان پیسوں سے آئس لولی کھاتے تھے کہ گنتی کے تو پیسے ملتے تھے۔'' دونوں سہیلیاں ہاتھ پر ہاتھ مارے قہقہوں پر قہقہے لگا رہی تھیں۔

''اور ہیرو بھائی کے وہی بڑے، کتنا یاد آتے ہیں ناں.....''

''کون ہیرو بھائی؟'' ماہا نے مزملہ کو چھیڑا۔

''چل ہٹ میں وہی بڑوں کی بات کررہی ہوں بدتمیز.....'' مزملہ نے اس کی کمر پر کس کے مارا۔ ماہا نے اتنی زور سے چیخ ماری ممی کے کمرے میں بھاگی ہوئی آئیں کہ ماہا کے اوپر کوئی چھپکلی تو نہیں گر گئی کیونکہ چھپکلی کو دیکھ کر اس کی ایسی ہی چیخیں نکلا کرتی تھیں..... ممی کو دیکھ کر دونوں ایک دوسری کی شکل دیکھ کر ہنسنے لگیں..... ممی سمجھ گئیں کالج کے لگڑ بگے تھو خیرے یاد آرہے ہیں۔

''ویسے مذاق کے علاوہ ہیرو بھائی تمہیں اتنی حیرت سے دیکھتے تھے کہ بیچارے پر ترس آتا تھا۔'' مزملہ نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

''ماہا میں ہر روز صبح اٹھ کر جب آئینہ دیکھا کرتی تھی تو پتا ہے کیا دعا کرتی تھی؟''

''ہاں بتاؤ کیا دعا کرتی تھیں؟''

''اے اللہ پاک جیسی تو نے میری صورت اچھی بنائی ہے میرے اخلاق بھی اچھے کردے..... اسی لیے میں نے کالج کے آزاد ماحول میں بھی اپنے آپ کو بچا کر رکھا یہاں تک کہ اپنی سوچ کو بھی پاک رکھا، کبھی کسی کے بارے میں غلط نہیں سوچا۔''

''ارے یار مجھ سے زیادہ تمہیں کون جانتا ہے..... تم تو سیریس ہی ہوگئیں۔'' ماہا بھی سیریس ہوگئی تھی۔

''اچھا تم اپنی ساس کی سناؤ کیا حال ہے، ان کا اور تمہاری کاوشیں کیا رنگ لا رہی ہیں ویسے میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ تم ٹائم ضائع کررہی ہو..... یہ ہوتے تو سگے رشتے ہیں لیکن ڈستے سوتیلے رشتوں کی طرح ہیں۔''

''اوہو..... مزملہ یار تم نے کبھی شہد کی مکھی کے بارے میں سوچا ہے کہ سب سے چھوٹی مخلوق ہمارے لیے شہد تیار کرتی ہے، اس سے اسے کیا حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ''کن'' فرمایا ہے تو وہ ایسا کرتی ہے تو ہم بھی رشتوں کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں، دراصل برائی کا کوئی وجود نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین کی کمی یا غیر موجودگی، برائی کی موجب ہے۔ جب ہم حقوق العباد سے ہٹتے ہیں تو برائیاں پیدا ہوتی ہیں اور ہم ہٹتے تب ہیں جب اللہ کا حکم نہیں مانتے.....'' آج اسے آتے ہوئے تیسرا دن تھا اور طبیعت اب کافی بہتر لگ رہی تھی۔ دونوں سہیلیوں نے بہت اچھا وقت گزارہ یونہی باتیں کرتے شام ہوگئی تو مزملہ رخصت ہوگئی..... اگلے دن چھٹی تھی اس لیے صبح ہی زین کو فون کردیا ابھی وہ سو کر اٹھا ہی تھا۔

''کیسی ہو.....؟'' زین نے پیار سے پوچھا۔

''آپ کے بغیر اداس ہوگئی ہوں.....'' ماہا کی آواز میں خمار تھا، محبت کا خمار.....

''تو پھر آجاؤ ناں گھر.....'' زین نے کہا۔

''ٹھیک ہے رات کو آپ مجھے لینے آجایئے گا میں آپ کا انتظار کروں گی۔'' ماہا فون بند کرنے لگی کہ زین کی آواز آئی.....

''اچھا ماہا دیکھو آنٹی سے کہنا ہمارے لیے رات کا کھانا نہ پکائیں، ہم ڈنر باہر کریں گے اوکے.....''

رات کو ماہا، زین کے لیے بڑے دل سے تیار ہوئی aqua کلر کے خوب صورت سوٹ میں سلور رنگوں

والا سیٹ پہن کر کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ امی نے کل ہی اسے جوڑا دیا تھا۔ زین نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

''ڈارلنگ تمہیں دیکھ کر اب تو دل چاہ رہا ہے کہ ڈنر کا پروگرام کینسل کر دیں اور سیدھے گھر چلیں اب آپ کے بغیر گزارہ نہیں.....'' اتنی دیر میں ممی فریش... جوس لے کر آ گئیں اور زین، ممی سے گپ شپ کرنے لگا۔

''اچھا آنٹی اجازت دیں اب ہم چلتے ہیں اور شکریہ آنٹی آپ نے ہماری بیگم صاحبہ کا اتنا خیال رکھا۔'' جوس ختم کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے بیٹا ماہا میری بیٹی ہے۔'' ممی کو خوشی ہوئی کہ زین، ماہا سے کتنا پیار کرتا ہے۔

سب سے پہلے زین نے ایک چائنیز ریسٹورنٹ کا رخ کیا وہاں سے کھانا کھانے کے بعد یہ لوگ مل کی طرف چلے گئے زین نے اس کے لیے سرپرائز رکھا تھا کہ ڈنر کے بعد ماہا کو شاپنگ کرائے گا نیو ایئر کا گفٹ بھی تو خریدنا تھا ماہا کے لیے..... ماہا نے بھی اپنے لیے اگر چار سوٹ خریدے تو ساس کے لیے گرم شال کے ساتھ جوڑا بھی لیا۔ گھر پہنچ کر ماہا تو گرمجوشی سے ماما سے ملی کیونکہ کافی دنوں بعد مل رہی تھی لیکن ماہا کی شاپنگ دیکھ کر ماما کو کچھ خاص خوشی نہیں ہوئی۔ اسے ان کے چہرے سے ہی ان کے موڈ کا اندازہ ہو گیا تھا کہ بگڑ گیا ہے۔ وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے میں چلی گئی جہاں اس کا محبوب شوہر اس پر پیار لٹانے کو اس کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

''ماما آج کے کھانے میں کیا پکاؤں.....؟'' ماہا پوچھتی ہوئی ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ ظہر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ لوگ کھانا ڈھائی، تین بجے تک کھاتے تھے، جب ماہا کی شادی ہوئی تو اس گھر میں کوئی بھی نماز نہیں پڑھتا تھا ماہا کو دیکھ کر سب نے نمازیں شروع کر دیں اپنی نند رانیہ کو بھی فون پر نماز پڑھنے کا کہتی..... ماہا رنگوں، خوشبوؤں، چاند، ستاروں سے پیاری، ماہا ہر بات کو مثبت لینے والی جب کوئی عمل کرتی تو اسے دیکھ کر سب کرنے لگ جاتے۔ جن کی سوچ مثبت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ہر کام میں آسانی پیدا کر دیتے ہیں۔ ماما کو نماز پڑھتا دیکھ کر ماہا نے سوچا فریج میں کوئی سبزی ہو گی وہی دوپہر کو پکا لیتی ہوں، رات کو نیو ایئر کا سرپرائز ہے، فریج میں ایک بند گوبھی رکھی تھی اب ماہا کو نہیں پتا اسے کیسے پکاتے ہیں، اس نے سوچا چلو ماما کے نماز پڑھنے تک کاٹ لیتی ہوں پھر ان سے پوچھ کر پکاؤں گی کہ کیسے پکاتے ہیں۔ ماہا نے جو پھول کو کھولنا شروع کیا تو یہ پرت در پرت کھولتی چلی گئی اندر سے کچھ نہیں نکلا۔ وہ سمجھی تھی شاید اس کے اندر کچھ ہو گا..... دراصل اس نے کبھی یہ سبزی پکائی نہیں تھی۔ اب ماما نے جو آ کے دیکھا تو پورا بند گوبھی کا پھول بہورانی نے کھول کر رکھ دیا ہے تو سمجھیں کہ بہو نے کبھی کچن میں قدم ہی نہیں رکھا۔ پچھلا سب بھول گئیں۔

شام کی چائے لان میں پیتے ہوئے اس نے ساس سے پوچھا۔

''ماما آج مجھے بہت کچھ خاص پکانا ہے، آپ اپنی مرضی سے کچھ بتا دیں۔'' ساس نے دل میں سوچا اپنے پچھلوں کی دعوتوں میں میرے بیٹے کا پیسہ اجاڑے گی۔ خاموشی سے چائے پیتی رہیں بولیں کچھ نہیں، ان کی چپ کا مطلب ماہا سمجھنے لگی سو اس نے رات کے کھانے میں بمبئی بریانی، چکن کڑائی، رشین سلاد بنالی۔ اور خود فریش ہونے کے لیے چلی گئی اسے پتا تھا کہ تھوڑی دیر میں زین اور رانیہ بھی آ جائیں گے کیونکہ اس نے آج ماما کو سرپرائز دیا تھا۔ آج ان کی سالگرہ تھی جو آج تک کسی نے نہیں منائی تھی۔ اس نے زین کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا جس کا رانیہ کو بھی نہیں پتا تھا، ماہا نہا کر باتھ روم سے باہر آئی تو بیڈ پر رکھا ہوا تکیہ دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ زین گھر آ گئے ہیں کیونکہ زین کی عادت تھی تکیے کو موڑ کر بیڈ کے سینٹر میں رکھ کر لیٹتے ہیں، ماہا نے سوچا جلدی سے تیار ہو کر زین سے ملا جائے پھر کیک کا پوچھوں کون سا لائے ہیں ابھی پلکوں پر مسکارا ہی لگا رہی تھی کہ زین کمرے میں آ گئے۔

''جانِ من جنت کی حور لگ رہی ہو..... بس اور کچھ نہیں لگانا کہیں میرا دم ہی نہ نکل جائے.....'' زین

نے بڑے دلبرانداز میں ماہا کی تعریف کی۔
''ہٹیں، یہ کوئی تعریف کرنے کا طریقہ ہے۔''
ماہا کو دم نکلنے والی بات پر تکلیف پہنچی۔
''ماہا سر کے بال سے لے کر پاؤں کے ناخن تک تم حسن کا مجسمہ ہو، تمہیں بہت پیار سے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے آج ایک بات بتاؤں میں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کوئی بہت بڑی نیکی کی ہوگی جو مجھے تم جیسی بیوی ملی جو صورت وسیرت میں بے مثال ہے۔'' اتنی تعریف سن کر ماہا تو شرما گئی سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہے اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کررہی تھی۔ اور موٹی، موٹی آنکھیں اور نشیلی ہورہی تھیں۔
''اچھا آپ نہا کر فریش ہوکر باہر آجائیں ایسا لگ رہا ہے جیسے رانیہ اور بچے آگئے ہیں۔''
''ماہا بات سنو.....'' ان سنی کرتی وہ باہر نکل رہی تھی کہ زین کی آواز آئی۔
''جی بولیں.....؟''
''تم نے رانیہ کو بتایا کہ ماما کی سالگرہ کی سرپرائز پارٹی رکھی ہوئی ہے؟''
''نہیں، میں نے آپ کے علاوہ کسی سے ڈسکس نہیں کیا۔'' اتنا کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ ابھی وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی کہ ماما کے کمرے سے آتی ہوئی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ جہاں کھڑی تھی وہاں سے ہل ہی نہیں سکی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ تہذیب سے گری ہوئی حرکت کرے یا خاموشی سے کچن میں چلی جائے لیکن اپنا نام سن کر قدم رک ہی گئے بلکہ رکنے ہی تھے کیونکہ لاعلمی آج اس کے علم میں آکے ہی رہے گی۔ ہمیشہ مزملہ جو اسے سمجھایا کرتی تھی کہ سمجھ، سمجھ کے سمجھنا بھی ایک سمجھ ہے جو سمجھ کے بھی سمجھے وہ ناسمجھ ہے تو ماہا آج تک ناسمجھ ہی رہی یا سمجھنا ہی نہیں چاہ رہی تھی کیونکہ وہ تو کچھ اور ہی چاہتی تھی ماما کی آواز میں جتنا زہر بھرا ہوا تھا وہ ماہا پتا نہیں کیسے برداشت کرگئی۔
''رانیہ تمہیں نہیں پتا، میں اسے زین کے ساتھ کیسے برداشت کرتی ہوں، اس نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا۔ صبح سویرے اپنی منحوس شکل لے کر جب میرے کمرے میں آتی ہے تو میرا دل نہیں چاہتا اس کی شکل دیکھنے کو اور میٹھی چھری ماما، ماما کرکے زین کے سامنے بڑی میسنی بنتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد مجھ سے بات بھی نہیں کرتی..... اس کی سب مکاریاں میں سمجھتی ہوں، آج بھی دیکھو کتنا خرچ کردیا ہے۔ پتا نہیں کون آرہا ہے تمہیں بلا کر نام تمہارا کردے گی کہ رانیہ کی دعوت کی تھی اور اس دن جب اپنی ماں کے گھر سے آئی تھی واپسی پر اتنی ہزاروں کی شاپنگ کرکے آئی تھی ایک بیگ تو چھپا دیا مجھے دکھایا بھی نہیں..... پتا نہیں اتنے قیمتی کپڑے کس کے لیے لائی ہوگی۔'' دوسری طرف رانیہ نے ماں کو سمجھایا۔
''ضروری نہیں ہے کہ جو ہمیں نظر آرہا ہو وہ درست ہو یا ہم سوچ رہے ہیں ویسا ہی ہو۔ کسی کے بھی بارے میں رائے قائم کرنے سے پہلے تھوڑا سوچ لینا چاہیے ماما آپ.....؟'' بات ابھی رانیہ کے منہ میں تھی کہ اس نے ماہا کو باہر سے لان کی طرف جاتے دیکھا ماں کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ ماہا نے ان کی باتیں سن لی ہیں اور وہ ماہا کے پیچھے آگئی۔۔۔ ماہا کی بچپن کی عادت تھی کہ جب بھی اداس ہوتی چھت پر جا کر چاند سے اپنی اداسی شیئر کرتی آج بھی چھت پر جا کر بادلوں میں چاند کو ڈھونڈ رہی تھی آج اس کا ہم سفر چاند بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔

دونوں ہم سفر ہیں
دونوں کا ایک سا مقدر ہے
وہ آسمان پر تنہا
میں زمین پر اکیلا

رانیہ نے پیچھے سے آکے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو دیکھا ماہا بے آواز رو رہی تھی اس نے اپنا منہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ رانیہ جان گئی ماہا نے سب باتیں سن لی ہیں۔
''رانیہ آج میں نے ماما کی سالگرہ کا سرپرائز رکھا تھا اور میں نے ماما کے لیے شاپنگ بھی کی تھی سوچا تھا ان کی سالگرہ پر دوں گی.....'' رانیہ شرمندہ سی ہوکر

اپنی چاند جیسی بھابی کو دیکھ رہی ہے جسے اس کی ماں سمجھ نہیں سکی تھیں۔ ماہا کی معصومیت پر اسے ترس آرہا ہے اور اپنی ماں کی سوچ پر شرمندگی ہورہی تھی لیکن اس میں بھی اس کی ماں کا قصور نہیں تھا۔

''ماہا ہم دونوں بھائی بہن چھوٹے، چھوٹے تھے جب ہمارے پاپا کا انتقال ہوگیا ایک جوان بیوہ عورت شوہر کے مرنے کے بعد اپنے بیٹے کو اپنا محبوب بنالیتی ہے کیونکہ اب مستقبل اس کا وہی بیٹا ہے۔ وہ عورت ڈرتی ہے کہ جوانی میں بیوہ ہوگئی کہیں بڑھاپے میں بیٹے کو بہو نہ چھین لے۔ میری شادی 18 سال کی عمر میں ماما نے کردی، حالانکہ میں زین بھائی سے کافی چھوٹی تھی ماما اس conflict میں رہتی تھیں کہ کہیں زین کو کوئی لڑکی نہ پسند آجائے اور وہ بیاہ کر اسے گھر لے آئے بعد میں میری شادی کون کرے گا جوانی میں بیوہ ہونے کی وجہ سے اپنی تربیت پر بھروسا بھی اٹھ گیا تھا حالانکہ ماما نے زین بھائی کی ایسی تربیت کی ہے کہ اگر ماما کہیں رات کو دن اور دن کو رات تو وہ خاموشی سے مان لیں گے۔ ساس بھی ماں ہوتی ہے لیکن رشتوں کی ڈسی ہوئی ہوتی ہے اس لیے بہو کو اپنی حریف سمجھنے لگ جاتی ہے، یہ ریت نسل در نسل چلی جاتی ہے نہ کسی بہو نے ختم کرنے کی کوشش کی نہ کبھی کسی ساس نے..... آکسفورڈ یونیورسٹی کے ہرے بھرے لان پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ میں نے بچپن میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے لان کی تصویر دیکھی تو میں نے ماما سے بہت ضد کی کہ مجھے بھی اپنے لان کی گھاس ایسی ریشم جیسی کرنی ہے۔ ماما ہر قیمت پر مجھے ایسی گھاس اپنے لان کے لیے چاہیے۔ ماما نے مجھے سمجھایا کہ تم اس کی قیمت ادا نہیں کرسکو گی میں نے ماما سے پوچھا کیوں تو انہوں نے مجھے بتایا کہ اس کی قیمت پانچ سو برس ہے پانچ سو سال..... اس طرح اس کی گھاس حاصل کرنے کے لیے تمہیں پانچ سو برس کا انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ کوئی خاص قسم کی گھاس نہیں ہے بلکہ عام گھاس ہے لیکن اس کے اس طرح بننے میں پانچ سو برس لگے ہیں اسے لگاتے ہوئے کوئی خاص طریقہ نہیں اپنایا گیا بس زمین ہموار کر کے اس پر گھاس جمادی پھر جب بھی گھاس بڑھتی اسے کاٹ کر اوپر سے رولر پھیر دیا جاتا اسی طرح پانچ سو سال تک کرتے رہے تو..... یہ گھاس تیار ہوگئی۔ مطلب یہ وقت کا سوال ہے قیمت کا نہیں ہر کامیابی جو چیز مانگتی ہے وہ ہے وقت..... ماما کی کہی ہوئی وہ بات میں نے تو گرہ میں باندھ لی لیکن ماما خود بھول گئیں۔ چھوٹی، چھوٹی باتوں کو اگر درگزر نہ کیا جائے تو یہ چھوٹی، چھوٹی باتیں بڑے، بڑے رشتوں کو کمزور کردیتی ہیں۔ ماہا تم سمجھدار ہو اور میں نے محسوس کیا ہے کہ تمہارا motive یہی ہے۔ اس گھر کو جنت بنانا ہے میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' رانیہ نے پیار سے ماہا کا یخ ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تو ہر طرف سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ پورا آسمان آتش بازی کے رنگوں سے رنگین ہوگیا۔ ماہا اور رانیہ نے مڑ کر دیکھا تو ماما اور زین پیچھے کھڑے ان کی باتیں سن چکے تھے۔ ماما نے آگے بڑھ کر ماہا کو گلے سے لگایا۔

''اپنی ماں کو معاف نہیں کروگی.....؟'' ماما نے شرمندہ ہوکر اس سے کہا۔

''ماما آپ کیسی باتیں کررہی ہیں، مجھے دکھ ہوا تھا لیکن میں نے آپ کے متعلق برا نہیں سوچا۔ جو ہوگیا اسے بھول جائیں۔'' پیچھے سے زین کی دہائیاں دیتی آواز آئی۔

''اگر تمام خواتین کی محفل برخاست ہوگئی ہے تو کیک کاٹ لیا جائے اب تو نیا سال بھی شروع ہوگیا میرے پیٹ کے چوہے اچھل، اچھل کر ایفل ٹاور تک جارہے ہیں۔'' سب نے ایک جاندار قہقہہ لگایا اور نیچے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ بادلوں میں چھپا ہوا چاند بھی بڑی شان سے باہر نکلا اور سیکڑوں ستاروں اور سیاروں کے بیچ میں ایسے چمک رہا تھا جیسے اس نے بھی آج پوری آب و تاب سے چمکنے کا تہیہ کرلیا ہو۔ نئے سال کا چاند نئے انداز میں چمک رہا تھا گواہ تھا کہ آج تک ساس، بہو کا ایسا رشتہ کبھی نہیں دیکھا جنوری کی ٹھنڈ میں چاند کی چاندنی گویا زندگی کی حدت کی نوید دے رہی تھی۔

مکمل ناول

محبت، اعتبار، اعتماد اور عشق

عقیلہ حق

دوسرا اور آخری حصہ

''یہ کیا ہے؟'' آبگینہ نے پیکٹ ہاتھ میں پکڑے بغیر تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

''یہ میری طرف سے آپ کے لیے گفٹ ہے۔'' تیمور مسکرایا۔ اسے یہ نخریلی سی لڑکی اچھی لگنے لگی تھی۔

''کیوں، آپ میرے لیے کیوں لائے ہیں؟'' آبگینہ نے تڑخ کر سوال کیا۔

''میں صرف آپ کے لیے نہیں بلکہ ساری کلاس کے لیے لایا ہوں، میں امریکا گیا ہوا تھا ناں ویکیشن میں۔'' تیمور نے پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''ایک بات میری آپ بہت غور سے اچھی طرح کان کھول کر سن لیں، آپ امریکا جائیں یا لندن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور محترم یہ ایک یونیورسٹی

ہے کوئی یتیم خانہ نہیں کہ آپ سارے مستحقین میں تحفے تقسیم کررہے ہیں اور میرے راستے سے ہٹیں، مجھے دیر ہورہی ہے۔'' آبگینہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے سے ہٹنے کو کہا۔

وہ جو ساری زندگی حاکموں کی طرح رہا، گاؤں تو گاؤں شہر کی بھی بڑے سے بڑے گھر کی حسین ترین لڑکیاں بھی اس کی آنکھ کے ایک اشارے کی منتظر رہتی تھیں۔

''مگر یہ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی لڑکی اُف.....'' وہ دل میں سوچ کر مسکرادیا۔

''ارے آبگینہ آپ اتنے نخرے دکھارہی ہیں، میں نے تو جس لڑکی کو بھی دیا اس نے بخوشی قبول کیا بلکہ وہ تو اب سارے ڈپارٹمنٹ کو دکھا چکی ہوں گی کہ اس کے لیے تیمور علی گفٹ لایا ہے اور تمہارے لیے تو میں خاص کر لایا ہوں.....اور.....''

''shut up mind yourlanguage''

آپ ہوتے کون ہو مجھے ''تم'' کہنے والے اور اس قدر بے تکلفی سے میرا نام لینے والے.....مسٹر وڈیرا تیمور علی ایک بات میری زندگی بھر یاد رکھنا۔ ہر عورت بکاؤ نہیں ہوتی..... ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی۔'' اس نے غصے سے کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا پھر جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے وہ پیکٹ اٹھایا اور دوراچھال کر آگے بڑھ گئی۔

''ہر عورت بکاؤ نہیں ہوتی، ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی۔ لیکن ہر ایک کی کوئی نہ کوئی قیمت تو ہوتی ہے؟'' تیمور نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

☆☆☆

''بس صاحب میرے مرد نے مجھے خریدا تھا۔''

''خریدا تھا؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں صاحب ہمارے قبیلے میں بیوی خریدی جاتی ہے.....بس پھر وہ مجھے لے کر شہر چلا آیا۔ اتنا بڑا شہر، میں اکیلی صاحب، وہ روز نشہ کر کے آتا اور پھر مجھے چار چوٹ کی مار مارتا.....اور جب پیسے ختم ہوگئے تو صاحب اس نے مجھ پر زندگی مشکل کردی.....کہتا کہیں بھی بھیک مانگ یا روڈ پر کھڑی ہوجا میرا نشہ پورا کر، میرے نشے کے لیے پیسے لا۔ بس صاحب پھر.....میں نے یہ پرندے لیے اور لوگوں کی منتیں کرنے لگی کہ ان کو آزاد کردو شاید کسی کی دعا سے کبھی میں بھی آزاد

ہو جاؤں۔ سارا، سارا دن بھوکی پیاسی گاڑی والوں کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہوں کبھی اتنے پیسے جمع ہو جاتے کہ شیدے کے نشے کے پورے ہو جاتے اور میں بھی دال روٹی کھا لیتی ہوں اور اکثر ایسا ہوتا کہ پرندے پنجرے میں پھڑ پھڑاتے رہ جاتے ہیں اور میں انہیں آزاد نہ کروا پاتی تو میری قید اور سخت ہو جاتی جب شیدے کا نشہ پورا نہیں ہوتا تو وہ مجھے چار چوٹ کی مار مارتا اور ساری رات میں اور میرے پرندے اپنی، اپنی قید میں روتے رہتے ہیں۔'' کہتے ہوئے گلابو کی آواز بھیگ گئی۔

وہ خاموش رہا لیکن اس کا دماغ گلابو کے سلسلے کو کہیں اور جوڑ رہا تھا۔

''لیکن کہاں.....؟''

☆☆☆

''دیکھو میری جان، میں جانتی ہوں کہ تمہارے بابا جانی ایک روایتی، سخت گیر قسم کے وڈیرے ہیں، گو کہ میں ہر وقت ان کی برین واشنگ کرتی رہتی ہوں لیکن میں ان کے اندر کا حاکم نہیں بدل سکتی۔ لیکن پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے کبھی مجھ پر روایتی وڈیروں والی سختی اور پابندی نہیں لگائی جو بات انہوں نے شادی سے پہلے کی تھی وہ نبھائی لیکن بیٹا ہم کسی انسان کی عادت بدل سکتے ہیں لیکن فطرت نہیں..... لیکن میرا بیٹا میری جان میں نے تمہاری فطرت کی بنیاد ہی نیکی، رحمدلی اور اچھائی پر رکھنے کی کوشش کی ہے، تم کبھی اپنی طاقت کسی کمزور پر استعمال نہیں کرنا، ہرگز نہیں کرنا۔'' تیمور کی ماں نے اپنی گود میں سر رکھے لیٹے بیٹے کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

تیمور آج بہت ڈسٹرب تھا گو کہ شہر میں پڑھنے کی وجہ سے اس کے باپ نے ایک پوش علاقے میں شاندار بنگلا اس کے لیے لے لیا تھا۔ جہاں ملازمین اور جان نثاروں کی فوج اس کی ایک آنکھ کے اشارے پر ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی۔ لیکن آج وہ یونیورسٹی سے سیدھا گاؤں چلا آیا..... غصہ ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ عام سے گھر کی ایک عام سی لڑکی..... اس سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں تو حویلی کے صحن کی جھاڑو لگاتی ہیں..... اس سے زیادہ ذہین لڑکیاں تو حویلی کے برآمدے میں بیٹھ کر چاول چنتی ہیں..... اس سے زیادہ باوقار لڑکیاں تو اس کی ماں کے پاؤں دباتی ہیں اور وہ..... وہ عام سے گھر کی عام سی لڑکی..... اس کے دیے ہوئے تحفے کو ٹھوکر مار دے..... اُف، لاکھ ماں کی پُرشفقت انگلیاں اس کے سر میں سرسرا رہی تھیں..... لاکھ ان کی میٹھی اور خوب صورت باتیں اسے بہلا رہی تھیں لیکن اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا وڈیرا..... وہ کیسے برداشت کرتا..... کیسے؟

☆☆☆

''ایک منٹ..... خاموش رہو.....'' ان خاتون نے اسلحے سے لیس اس گارڈ کو ڈپٹا۔

''گاڑی تم نہیں، یہ لڑکا چلا رہا تھا۔''

انہوں نے گاڑی کے اندر بیٹھے اس نوجوان کی طرف اشارہ کیا جو بس ایک سمت دیکھ رہا تھا۔

آج آبگینہ اپنی دوست کے گھر کمبائنڈ اسٹڈی کے لیے آئی ہوئی تھی، وہ دونوں سر جوڑے نوٹس بنا رہی تھیں کہ ایک زوردار دھماکا ہوا ایسا لگا خدانخواستہ زلزلہ آ گیا ہو..... وہ دونوں تیزی سے باہر لان کی طرف دوڑیں..... آبگینہ کے ساتھ، ساتھ مشعال کے لیے بھی یہ لمحہ ناقابلِ یقین تھا۔

''نہیں بیگم صاحبہ گاڑی میں چلا رہا تھا۔'' دوسرا اسلحہ بردار گارڈ جو اس لڑکے کو ہٹا کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا نے بصد اصرار کہا۔

''خاموش رہو تم، جب گاڑی دیوار توڑتی ہوئی لان میں گھسی تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر یہ لڑکا تھا..... تمہیں معلوم ہے آج ہمارے گھر میں دعوت ہے، دیکھو سارے لان میں کرسیاں لگی ہوئی ہیں اگر اس وقت مہمان بیٹھے ہوتے تو کس قدر جانی نقصان ہوتا، کیا تم لوگوں نے شہر کو بھی گاؤں سمجھ لیا ہے کہ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے..... یہ شہر ہے.....'' مسز علی کا غصہ ناقابلِ برداشت تھا۔ شام کو

دعوت، ٹوٹی ہوئی دیوار، کچلا ہوا فرنیچر اُف.....؟

''جی میڈم گاڑی میں ہی چلا رہا تھا۔'' وہ لڑکا گاڑی سے اتر کر بہت آرام سے بولا۔

''پھر یہ تمہارے گارڈز جھوٹ کیوں بول رہے تھے؟''

''میڈم یہ جھوٹ نہیں بول رہے تھے، ہم انہیں پالتے ہی اس لیے ہیں..... یہ تو ایک معمولی سا ایکسیڈنٹ ہے.....''

''معمولی سا ایکسیڈنٹ.....؟'' مسز علی بڑبڑائیں۔

''جی معمولی سا..... اگر یہاں کوئی مر بھی جاتا یا میرے ہاتھوں کوئی قتل بھی ہو جاتا تو عدالت میں ان کا حلفیہ بیان یہی ہوتا کہ قتل انہوں نے کیا ہے اور یہی پھانسی پر لٹکتے.....''

اتنے میں اس کی دوسری گاڑی آ گئی جس میں سے ایک ادھیڑ عمر کا قدرے مہذب آدمی اترا۔

''بیگم صاحبہ میں آپ سے معذرت کرتا ہوں، ہم جانتے ہیں ہماری وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی..... آپ کا جو بھی نقصان ہوا سے درست کروانا ہماری ذمے داری ہے، یہ آپ دو لاکھ روپے رکھ لیجیے اگر کم پڑیں تو.... بلاتکلف فون کر دیجیے گا اور ہماری یہ گاڑی'' اس نے وہاں کھڑی کی V8 طرف اشارہ کیا۔'' جب تک یہاں کھڑی رہے گی جب تک دیوار نہ بن جائے تاکہ آپ کے گھر کی بے پردگی نہ ہو..... اور ہم نے آپ کی تقریب کے لیے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں بکنگ بھی کروادی ہے، بیگم صاحبہ کا گاؤں سے فون آیا تھا سارا کام ان کی ہدایات کے مطابق ہوا ہے، امید کرتے ہیں آپ ہماری معذرت قبول فرمائیں گی۔''

ان صاحب کی اس قدر مہذبانہ گفتگو نے مسز علی کو جیسے خاموش کر دیا۔

''آپ تشریف رکھیے.....'' انہوں نے لان میں رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان صاحب سے کہا۔

''بہت نوازش بیگم صاحبہ.....'' انہوں نے لفافہ ٹیبل پر رکھا۔

''اور ہاں.....'' مسز علی نے ان صاحب کو مخاطب کیا۔ ''دیکھیے یہ لڑکا تو اتنا مغرور اور بدتمیز ہے کہ میں پولیس کو کال کرنے والی تھی لیکن آپ کے اخلاق نے مجھے کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے روک دیا ہے۔''

''آپ کا بہت شکریہ!''

''ہماری تقریب یہیں ..... ہمارے گھر میں ہی ہوگی آپ ہوٹل کی ریزرویشن ..... کینسل کروادیں۔'' مسز علی ان صاحب سے بات ہی کررہی تھیں کہ وہ لڑکا مسکراتا ہوا پھر بنی آبگینہ اور مشعال کے قریب گیا اور پھر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''مس آبگینہ آپ نے دیکھ لیا لوگ ہمارے لیے پھانسی پر لٹکنے تک کے لیے تیار ہیں۔ آئندہ احتیاط کیجیے گا۔''

''کچھ پھانسیاں جسموں کو نہیں روحوں کو لگتی ہیں مسٹر وڈیرا تیمور علی ولد وڈیرا حاکم علی ..... سوچو جب روح کے گلے میں پھندا لگے گا تو کیا کروگے۔'' آبگینہ نے اس کے دائیں بائیں اسلحہ بردار گارڈز کی پروا کیے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد لہجے میں کہا۔

وہ تو مشعال اس کا بازو پکڑ کر اندر لے گئی ورنہ شاید.....

''روح کو پھانسی.....'' تیمور علی گاڑی میں بیٹھ کر بڑبڑاتے ہوئے ہنسا۔

اور کاتب تقدیر کو اس کی ہنسی پسند نہیں آئی۔

☆☆☆

''تم سب کو اللہ کا واسطہ مجھ پر رحم کرو، خدا کے واسطے مجھے جانے دو، مجھے آزاد کردو، میرے ابا اماں پریشان ہورہے ہوں گے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ میرے ماں، باپ کی عزت خاک میں مل جائے گی۔'' وہ زور، زور سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ رو رہی تھی، بلک رہی تھی.....

وہ بند دروازے کی طرف یک ٹک دیکھتا رہا۔ اندر دروازہ وہ پیٹ رہی تھی، رو رہی تھی، بلک رہی تھی جو.....

یک دم اس کا دم گھٹنے لگا، جلدی سے گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں نائٹ بلب کی ملگجی روشنی میں ہر چیز دھندلی نظر آرہی تھی۔ اس کا پورا وجود پسینے میں شرابور تھا اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے گلاس میں پانی بھرا اور گلاس بھر پانی غٹاغٹ پی گیا۔ دل کی دھڑکن قابو سے باہر ہورہی تھی۔ اس نے ریموٹ سے لائٹ کھولی، جگمگاتا کمرا اسے تاریک لگا، 16 ڈگری پر چلتا اے سی بھی اس کا پسینہ خشک کرنے میں ناکام رہا، وہ بوجھل دل اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ اٹھا اور پھر آہستہ، آہستہ سیڑھیاں اترتا اس کمرے کے باہر جا کھڑا ہوا۔

ہاں وہی کمرا.....

اس نے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ دروازے پر ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

پورا کمرا خالی تھا، نہیں کمرا خالی نہیں تھا، کمرے کے ایک کونے میں وہ بیٹھی تھی۔ بکھرے بال، رو، رو کر سوجی آنکھیں، خشک پپڑیاں جمے ہونٹ، چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں، یہ وہ تو نہیں تھی۔

''مجھے جانے دو.....'' خالی کمرے میں سسکیاں گونجنے لگیں، کوئی اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔ کمرے کے پردے، دیواریں، کارپٹ، کھڑکیاں ہر چیز اس کے پیروں سے لپٹ کر رونے لگی۔

''مجھے آزاد کردو..... مجھے آزاد کردو..... مجھے جانے دو.....'' کی آوازیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے، اسے لگا اس کا وجود زمین پر کھڑا ہے لیکن اس کی روح کے گلے میں پھانسی کا پھندا لٹک رہا ہے، اسے رسی کی گرفت روح پر محسوس ہوئی تو اس نے بے ساختہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ لیا اور پھر وحشت زدہ سی کیفیت میں ان ساری آوازوں کے درمیان سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اور اب یہ روز کا معمول تھا۔

☆☆☆

''خوش ہو؟'' عادل کی بوجھل آواز نایاب کے کانوں میں گنگنائی۔

''پتا نہیں.....'' نایاب نے ہاتھ میں جگمگاتی ڈائمنڈ کی انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''پنک سوٹ میں آج تم بہت پیاری لگ رہی تھیں، دل چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا سے چھپا کر کہیں

دور بہت دور لے جاؤں جہاں کسی کی نظریں بھی تم پر نہ پڑیں تمہیں سامنے بٹھا کر بس دیکھتا رہوں.....''

آج شام ان دونوں کی منگنی ہوئی تھی، حبیب احمد نے بہت مان سے بھتیجی کا ہاتھ مانگا تھا اور جمیل احمد نے بھائی کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔

شادی چند ماہ بعد طے ہوئی تھی، عادل کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ رسم منگنی کو رسم نکاح اور رخصتی میں بدل دے.....لیکن اُف..... وہ کتنا بے بس ہے اس کا احساس اسے آج ہوا جب پہلی بار اس کا نرم و ملائم دودھیا ہاتھ اس کے اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھاما۔

گلابی جوڑے پر پرپل کام نفاست سے کیا ہوا میک اپ موتیا کی کلیوں سے گندھی چوٹی، قیمتی پرفیوم سے مہکتا وجود۔

''عادل بھائی پلیز ہاتھ چھوڑ دیں، نایاب ابھی ان شاء اللہ جلد ہی پوری کی پوری آپ کے ساتھ جائے گی تو برائے مہربانی ہاتھ چھوڑ دیں۔'' نرگس نے ہنستے ہوئے آہستگی سے عادل کے ہاتھ اس کا ہاتھ چھڑایا۔

''کچھ بولو ناں میری جان.....اتنی چپ کیوں ہو۔'' عادل کی جذبات سے بوجھل آواز ماؤتھ پیس میں ابھری۔

وہ خاموش رہی، اسے ڈھیروں شرم آرہی تھی، عادل کی قربت کے لمحات عادل کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ.....سیاہ ڈنر سوٹ میں عادل کتنا وجیہہ لگ رہا تھا۔ ہر ایک نے ان کی جوڑی کو چاند، سورج کی جوڑی کہا۔

لیکن چاند سورج کی جوڑی کہنے والے یہ بھول گئے کہ چاند اور سورج کبھی ملتے نہیں۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے.....!

''مجھے تم سے بے حد محبت ہے نایاب، تم میرے لیے واقعی نایاب ہو.....آج میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی کے ہر مقام پر میں تمہارے جائز کا بھی حمایتی ہوں اور ناجائز کا بھی.....تم کتنی معصوم ہو، کتنی سادہ، کتنی پیاری تم نہیں جانتیں.....میں آج اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھ رہا ہوں۔'' وہ کچھ دیر رکا۔

''اتنی دیر سے میں ہی بولے چلا جارہا ہوں، تم بھی تو کچھ بولو میری جان۔'' عادل اس کے منہ سے اقرارِ محبت سننے کے لیے بے قرار تھا۔

''آپ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں؟'' نایاب نے شرگیں لہجے میں پوچھا۔

''یار تم شرماتی ہوئی بہت پیاری لگتی ہو۔''

''بتایئے ناں.....؟'' وہ اپنے سوال پر بضد تھی۔

''بہت، بہت، پیار..... ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر پیار۔''

''اچھا.....'' نایاب کی شرگیں ہنسی ماؤتھ پیس میں ابھری۔ ''چلیں آزمالوں گی۔''

''آزمالینا میڈم.....'' عادل نے مستحکم لہجے میں کہا۔

اور آزمائش اس کا مقدر ٹھہر چکی تھی۔

☆☆☆

''مبارک ہو جانِ من.....آپ تو ہمارے دل کی رانی ہیں اور آپ نے کسی ٹٹ پونجیے سے ناتا جوڑ لیا آئی مین منگنی شگنی کرلی۔''

آبگینہ جو کیفے ٹیریا میں بیٹھی اپنی دوستوں کو ٹریٹ دے رہی تھی۔ تیمور علی کی اپنی میز پر اور پھر اس قدر عامیانہ سے اندازِ گفتگو پر کھول ہی تو اٹھی۔

''شٹ اپ.....آبگینہ نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے دانت پیستے ہوئے کہا اور کھڑی ہوگئی۔ ساتھ ہی اس کی ساری دوستیں بھی کھڑی ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

''کیا غضب ڈھا رہی ہے کمبخت.....'' تیمور کے دل نے کہا۔

''اچھا چلو غصہ چھوڑو.....آؤ دوستی کرلیں.....'' تیمور نے اس نام و نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

''چٹاخ.....'' ایک زوردار آواز کیفے ٹیریا میں گونجی ہال میں بیٹھے سارے لوگ چونک گئے، کچھ تو اپنی جگہ پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تیمور علی گال پر ہاتھ رکھے سرد

انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا، جہاں سے وہ تنتاتی ہوئی باہر گئی تھی۔ اور.....

☆☆☆

''اس کا فون بند ہے.....'' شاہدہ بیگم سے نومان (نایاب کا بھائی) نے فکرمندی سے کہا۔

''نہیں آنٹی..... وہ میرے گھر پر نہیں ہے۔''

''جی آنٹی..... میں جلدی آ گئی تھی اس وقت وہ یونیورسٹی میں ہی تھی۔''

''جی مجھے پتا نہیں.....''

''اللہ رحم کرے.....''

''میں دوسری دوستوں سے معلوم کر کے بتاتی ہوں۔'' یکے بعد دیگرے نایاب کی ہر دوست کا یہی جواب تھا۔ مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں، ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا اور جمیل احمد کو ایسا لگا جیسے ان کے سارے گھر پر سیاہ اندھیری دبیز چادر تن گئی ہو۔

''کہاں رہ گئی؟ کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا؟'' نومان نے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے فکرمند لہجے میں کہا..... ''میں اسپتالوں میں معلوم کرتا ہوں اور اگر وہاں نہیں ہوئی تو پھر تھانے.....''

''نہیں بیٹا تھانے نہیں جانا..... میری عزت نیلام ہو جائے گی۔'' جمیل احمد نے جلدی سے بیٹے کو ہاتھ اونچا کر کے روکا۔

''لیکن ابا.....'' نومان سراپا احتجاج تھا۔

''بس بیٹا، خاموشی سے ڈھونڈو اسپتالوں میں دیکھ آؤ، اس کی سہیلیوں سے معلوم کر لو..... نہیں ملے تو.....''

''نہیں ملے تو.....'' شاہدہ بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

''کوشش کرو بھائی جان کے گھر تک یہ بات نہ پہنچے۔'' جمیل احمد نے شاہدہ بیگم کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ان کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جہاں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں خودکش دھماکے کی خبر چل رہی تھی۔ ان کے دماغ نے کلک کیا۔

وہ جانتے تھے کراچی یونیورسٹی اور وہ ہوٹل ایک دوسرے سے بہت دور اور ان کے گھر کے مخالف سمت میں ہے لیکن پھر بھی.....

شاہدہ بیگم گھڑی، گھڑی دروازے پر جا کر دیکھ رہی تھیں، عشا کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

جمیل احمد نے بے چین بیوی کو دیکھا اور پھر ہاتھ میں بندھی گھڑی کو دیکھا۔

''دروازہ بند کر دو..... شاہدہ، اب وہ نہیں آئے گی۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں..... اور ان کی دائیں آنکھ سے ایک آنسو روکنے کی ہزار کوششوں کے باوجود پھسلتا ہوا ان کے چہرے پر پھیل گیا۔

بالکل اس کالک کی طرح.. جو اُن کے خاندان پر پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

''بیٹھو.....!''

وہ جو اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی، گھبرا کر پلٹی..... بڑی، بڑی مونچھوں اور سر پر پگڑ باندھے دونوں آدمیوں کی پستول اس کی پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔ پیچھے کھڑا آدمی اسے گاڑی کے کھلے دروازے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، دور، دور تک کسی ٹریفک کانسٹیبل یا کسی آدم زاد کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔

آج لائبریری میں نوٹس بناتے ہوئے اس کو ٹائم گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے لائبریرین کا کہ اس نے آ کر اسے شام ہونے کا احساس دلایا..... آخری پوائنٹ بھی جا چکا تھا۔ اور اس وقت..... تنہا روڈ تھا۔ ہلکی، ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ اور تین مسلح فرد، اس نے چیخنا چاہا لیکن اسی لمحے اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا گیا اور پھر اس کو کچھ یاد نہ رہا۔

☆☆☆

''جلدی چلاؤ علی نواز.....'' تیمور نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

وڈیرا حاکم علی کو دل کا دورہ پڑا تھا جیسے ہی اسے اطلاع ملی کہ اس کے بابا سائیں کراچی کے ایک اسپتال

کی طرف آرہے ہیں، وہ بھی گھبرا کر اسپتال کی طرف چل دیا۔ اس کے ذہن سے بالکل نکل گیا کہ.....

☆☆☆

''نہیں بس اب انتہا ہوگئی.....'' تیمور علی نے اپنی ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار..... دو ٹکے کی لڑکی اور اس کی اتنی جرأت کے ہمارے دوست تیمور علی پر ہاتھ اٹھائے۔'' ذیشان اور حیدر نے اس کے غصے کو بڑھاوا دیا۔

''اپنے یار کو ذلیل کر دیا اس نے۔ عباس نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

''اب میں اسے بتاؤں گا ذلت کیا ہوتی ہے؟'' تیمور نے غصے سے ٹہلتے ہوئے رک کر دوستوں سے کہا۔ اور زور سے آواز دی۔ ''رب نواز.....!''

☆☆☆

''سائیں تو بڑے سائیں کے ساتھ ہیں انہیں اس وقت تنگ کرنا مناسب نہیں، غصے میں تو پہلے ہی تھے اب تو پریشان بھی بہت ہوں گے ایسا نہ ہو، ہماری ہی کھال اتار دیں۔''

رب نواز نے اس کے بے ہوش وجود کو کمرے میں پھینک کر دروازہ لاک کرتے ہوئے بشیرے سے کہا۔

''ابھی تو بے ہوش پڑی ہے، اب جو سائیں کا حکم ہوگا، ہم تو غلام ہیں، وہیں کریں گے۔'' رب نواز نے بند دروازے کو اچھی طرح چیک کرتے ہوئے کہا اور باہر نکل گیا اس کے پیچھے وہ دونوں بھی باہر نکل گئے۔

☆☆☆

''کیا مطلب؟ تم آبگینہ کو اغوا کراؤ گے.....؟'' مرتضیٰ جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا تیمور اور رب نواز کی گفتگو سن کر گھبرا کر بولا۔

''ہاں.....'' تیمور کا لہجہ قطعیت لیے ہوئے تھا۔

''کیوں یار.....؟ یہ غلط ہے.....'' مرتضیٰ نے روکنا چاہا۔

''ہاں تو صحیح کر رہا ہے تیمور، تم نے دیکھا نہیں مرتضیٰ کس طرح بھری کینٹین میں اس نے تیمور کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔'' ذیشان نے بات کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیا۔

''نہیں تیمور ایسا نہ کرو، آبگینہ کا سارا خاندان زہر کھالے گا..... بہنیں، بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں۔'' مرتضیٰ چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اس کا دل کانپا اور اس نے تیمور کو روکنے کی کوشش کی۔

''تم جاؤ رب نواز.....'' تیمور نے سوالیہ بنے کھڑے رب نواز کو ڈپٹا..... رب نواز جلدی سے کندھے پر لٹکتی گن کو سنبھالتے ہوئے باہر نکل گیا۔

''ارے یار پریشان نہ ہو، بس ایک دو گھنٹے قید میں رکھوں گا پھر چھوڑ دوں گا۔ لیکن کم از کم پیر پکڑ کر معافی تو مانگنی پڑے گی ناں اسے۔'' تیمور نے مرتضیٰ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

لیکن قسمت کیا کھیل کھیلنے جا رہی تھی۔ وقت کس طرف کروٹ لے رہا تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ کوئی بھی نہیں۔

☆☆☆

''اب بابا کیسے ہیں؟'' تیمور نے بے قراری سے ماں سے پوچھا۔

''بیٹا انجوگرافی ہو رہی ہے۔''

تیمور قریب رکھی کرسی پر ڈھے سا گیا۔ اس کے بابا لاکھ سخت گیر، اصول پسند، روایتی جاگیردار سہی لیکن انہوں نے اسے پھولوں کی طرح پالا تھا، آج بھی وہ اس کی ہر خواہش بنا کہے جان جاتے تھے۔ وہ بھی بچوں کی طرح ان سے فرمائشیں کرتا اور وہ خوشدلی سے پوری کرتے۔

اس کے بابا.....

''اللہ پاک میرے بابا کو زندگی دے دیں۔''

اس لمحے تیمور کو یاد تھا تو صرف اپنے بابا، ان کی محبتیں، عزیز تھی تو اُن کی زندگی باقی سب وہ بھول گیا تھا۔

بالکل بھول گیا تھا۔

☆☆☆

رات کے نہ جانے کس پہر اس کی آنکھ کھلی، کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، کھڑکی دروازے بند تھے، بس ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا، وہ چند لمحے بیٹھی

سوچتی رہی کہ کیا ہوا تھا اور پھر جیسے سب کچھ..... آہستہ، آہستہ اسے یاد آتا چلا گیا..... وہ گھبرا کر اٹھی لیکن پھر چکرا کر دوبارہ کارپٹ پر گر گئی۔ اسے شدید چکر آرہے تھے..... اس نے اپنے بیگ سے اپنا موبائل فون ڈھونڈنے کی کوشش کی تو وہ بیگ میں نہیں تھا۔

''یعنی فون نکال لیا گیا ہے.....'' اس کا دماغ گھوما۔ وہ ہمت کر کے اٹھی۔ دیوار کو ٹٹولتے ہوئے اس نے سوئچ بورڈ ڈھونڈا اور پھر لائٹ آن کر دی۔ یہ کوئی بہت وسیع و عریض بیڈ روم تھا۔ ویل ڈیکوریٹڈ دیوار پر لگی گھڑی میں اس نے ٹائم دیکھا، رات کے ڈھائی بج رہے تھے، رات کے ڈھائی..... اس کے تمام حواس یک دم بیدار ہو گئے۔

''اماں، ابا، بھائی اُف سب کس قدر پریشان ہوں گے۔'' اس کا جسم تو کیا روح لرز گئی۔

وہ دوڑ کر دروازے کی طرف لپکی اسے کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کچھ بند دروازے پورے خاندان کے خاندان بلکہ نسلوں کی عزت و ناموس کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ اس نے بے ساختہ دروازہ پیٹنا شروع کیا..... ساتھ، ساتھ وہ چلا رہی تھی۔

''کھولو، دروازہ کھولو..... اللہ کے واسطے مجھے یہاں سے نکالو..... بہت دیر ہو گئی، میرے گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے اگر رات گزر گئی..... تو میرا پورا گھر خودکشی کر لے گا، اللہ کے واسطے دروازہ کھولو..... تم کو اللہ رسول کا واسطہ.....''

☆☆☆

''آپ کو اللہ کا واسطہ..... آدھی رات گزر گئی ہے اب پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ لکھوا دیں۔'' شاہدہ بیگم نے جمیل احمد کے آگے روتے ہوئے ہاتھ جوڑے تھے۔

وہ خاموش رہے ان کی نظریں ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں، جہاں ایک خودکش دھماکے کی بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

☆☆☆

''ہمیں تم سے پیار کتنا یہ ہم نہیں جانتے
مگر جی نہیں سکتے تمہارے بنا.....

کہاں ہو؟ فون کیوں نہیں اٹھا رہیں۔'' جب سے منگنی ہوئی تھی، عادل اور نایاب کے درمیان پردہ کروا دیا گیا تھا، کبھی اچانک سامنا ہو جائے تو الگ بات..... ورنہ نایاب، عادل کے سامنے نہیں جاتی تھی..... لیکن تقریباً روزانہ دونوں کا فون پر رابطہ رہتا تھا..... اور آج بھی عادل رات گیارہ بجے سے مستقل نایاب کا نمبر ملا رہا تھا۔ لیکن پاور آف جا رہا تھا۔

''اچھا تو میری جان! اتنی ناراض ہو..... لیکن کس بات پر۔'' عادل نے خود سے سوال کر کے خود ہی سے پوچھا۔

''عادل آپ مجھ کو جان نہیں کہا کریں۔''

''کیوں.....؟''

''بس اچھا نہیں لگتا۔''

''کیوں اچھا نہیں لگتا۔''

''تم میری جان ہو، جانِ من ہو، زندگی ہو، سب کچھ ہو، میں تو کہوں گا۔''

''پھر میں آپ کا فون ہی ریسیو نہیں کروں گی۔'' نایاب نے شرمگیں لہجے میں دھمکی دی۔

عادل کو گزشتہ رات کی نایاب کی دھمکی یاد آئی تو بے ساختہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

''تم سے تو میں نمٹ لوں گا ہونے والی مسز عادل نایاب.....''

عادل نے اسکرین پر جگمگاتی نایاب کی تصویر کو دیکھتے ہوئے شرارتی لہجے میں کہا اور پھر فون بند کر کے کروٹ لے لی۔

☆☆☆

''ساری رات ایسے ہی گزر گئی، امی اب آپ آرام کریں میں بابا کے پاس ہوں۔'' تیمور نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر امی کو پرائیویٹ روم کی طرف جانے کا اشارہ کیا جو انہوں نے ریزرو کروایا ہوا تھا۔

حاکم علی کی اسنجوگرافی کی رپورٹ سے پتا چلا کہ دل کی دو شریانیں کام نہیں کر رہیں تو ساتھ ہی ان کی

انجیو پلاسٹی کی گئی..... یوں اس وقت وہ آئی سی یو میں تھے..... گو کہ خادمین اور ملازمین کی فوج ہاتھ باندھے کھڑی تھی لیکن تیمور تو ان کا بیٹا تھا ناں اس کے اندر کا ضدی وڈیرا اس وقت نہ جانے کہاں تھا، وہ اس وقت صرف ایک بیٹا تھا، جس کا باپ آئی سی یو میں پڑا تھا۔

باقی وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔

سب کچھ.....

☆☆☆

''ہیلو.....''

''کون عادل بھائی.....''

''جی..... آپ کون؟''

''عادل بھائی میں طیبہ بات کر رہی ہوں، نایاب کے گھر میں تو کوئی فون ریسیو ہی نہیں کر رہا، میں بہت پریشان ہوں، یہ بتایئے نایاب کی کوئی خبر ملی.....؟'' طیبہ نے حد درجہ پریشان لہجے میں عادل سے پوچھا۔

''نایاب کی خبر.....! کیا مطلب، کیا ہوا نایاب کو؟''

''وہ عادل بھائی، آپ کو تو معلوم ہوگا.....''

''کیا؟'' عادل کا لہجہ بے قرار ہوا۔

''نایاب کل شام سے.....''

☆☆☆

''آبگینہ نایاب آپ کو تیمور علی ولد حاکم علی سے نکاح بعوض مہر پانچ لاکھ روپے منظور ہے؟'' اس نے ایک نظر سامنے صوفے پر بیٹھے تیمور کو دیکھا اور پھر ان دو مسلح بردار مردوں کو جو اسے اٹھا کر لائے تھے اور آج اس نکاح کے گواہ بھی تھے..... پھر اس کی نظر سامنے لگے دیوار گیر آئینے پر ٹک سی گئی، سفید ملگجا سا لباس آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، پپڑی زدہ ہونٹ، زرد چہرہ، سوجی ہوئی آنکھیں..... پھر رو، رو کر سوجی آنکھوں سے دیکھا، پتھرائی ہوئی آنکھوں کے کونوں پر دو آنسو مچل گئے۔

☆☆☆

''کھانا کھالو.....'' ایک آدمی نے دروازہ کھول کر کھانے کی ٹرے اس کے آگے رکھی۔

''اللہ کے واسطے مجھے جانے دو، تمہاری تو بہنیں بیٹیاں ہوں گی، دو دن ہوگئے، میرے ماں، باپ پریشان ہوں گے۔'' وہ اس ملازم کے پیروں میں سر رکھ کر رونے لگی۔

''اٹھو بی بی صاب..... ہم ملازم لوگ ہیں، ہم تم کو بالکل نہیں آزاد کر سکتے کل سے بڑے سائیں کی طبیعت بہت خراب ہے، چھوٹا سائیں اسپتال میں ہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔'' ملازم نے نرم لہجے میں صاف گوئی سے کہا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

''اُف تم لوگوں نے اسے ابھی تک رکھا ہوا ہے۔''

اس وقت تیمور جب گھر آیا۔ رب نواز پر برس پڑا۔

''سائیں، میں اور میرے ماں، باپ آپ پر قربان، آپ کے حکم کے بغیر ہم کیا کر سکتے تھے۔'' رب نواز ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم چلی جاؤ.....'' تیمور نے دروازہ کھول کر وحشت زدہ سی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی آبگینہ سے کہا۔ لاکھ تیمور ضدی، خود سر سہی لیکن اس وقت آبگینہ نایاب کی حالت دیکھ کر اسے حقیقتاً دکھ ہوا..... اس کا یہ مقصد نہیں تھا۔

لیکن.....!

☆☆☆

اندھیری رات میں اس نے آہستگی سے دروازے کو دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا، اسے حقیقت میں اس بات پر حیرت ہوئی کیونکہ ان کے گھر کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ سارے گھر پر ایک عجیب سی اداسی طاری تھی۔

''کون.....؟''

ماں کی آواز سن کر اس نے آہستگی سے منہ پر سے چادر ہٹائی۔

''تم.....؟'' شاہدہ بیگم نے بے ساختہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی ایک تاریک کونے میں لے گئیں۔

''اب کیوں آئی ہو، جہاں دو راتیں رہی ہو، وہیں جاؤ..... ہم تم پر صبر کر چکے۔ برسوں ہونے والے خود کش دھماکے میں ہم نے تمہارا نام بھی ڈال دیا کہ تم

بھی اس دھماکے میں مر گئی ہو..... لیکن ہم تو جانتے ہیں ناں کہ تم مری نہیں ہو بلکہ ہمارے منہ پر کالک مل کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہو، تمہارے ابا کل شام کو دل کے دورے میں اللہ کے پاس چلے گئے۔ یہ جو تم باہر شامیانہ دیکھ رہی ہو ناں اس میں آج ہم نے تمہارے قل پڑھے ہیں اور تمہارے ابا کا جنازہ اٹھایا ہے۔"

"اماں....." نایاب کو لگ رہا تھا اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔

"چپ رہو..... اب زندگی میں کبھی مجھے اماں کہہ کر مت پکارنا۔ تم ڈائن ہو، تم میرے سہاگ کو کھا گئیں، تم نے ہماری عزت ملیامیٹ کر دی، ارے کمبخت، منحوس، ڈائن تجھے باپ کی سفید داڑھی کی بھی لاج نہ آئی، نکل یہاں سے وہیں جا، جہاں تو دوراتوں سے رنگ رلیاں منا رہی تھی۔" شاہدہ بیگم نے اسے گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر نکالا اور پھر بند دروازے سے ٹیک لگا کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دیں۔ وہ جانتی تھیں ان کی بیٹی ایسی نہیں ہے۔ لیکن کیا کرتیں انہیں اس معاشرے میں رہنا تھا، اپنی عزت سنبھالنی تھی اور وہ... خودکش دھماکا ان کی عزت کا ضامن بن گیا تھا۔

☆☆☆

"عادل.....!" عادل جو شاید اس وقت کسی کام سے گھر سے نکلا تھا۔ پیچھے کسی سرگوشی میں، ہلکی سی لرزتی سی، کپکپاتی سی، جانی پہچانی آواز..... وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

☆☆☆

"کیا کروں.....؟ عادل..... عادل تو میری بات سن لیں گے..... میری بات پر یقین کریں گے، میں بے قصور ہوں، میں ایسی نہیں ہوں، یہ بات..... یہ بات تو وہ اچھی طرح جانتے ہیں، مانتے ہیں، یقین کرتے ہیں لیکن جانتی تو اماں بھی تھیں۔"

رات کے اندھیرے میں چادر میں منہ چھپائے، عادل کے گھر کے باہر کھڑی وہ اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی..... یہ وہ گھر تھا، جہاں اسے بہت اہتمام سے آنا تھا، دلہن بن کر پھولوں سے سجی گاڑی میں بیٹھ کر آنا تھا..... آج اس گھر کے دروازے کو کھٹکھٹانے کے لیے اس کے اندر ہمت نہیں تھی۔

"اگر عادل نے بھی مجھے دھتکار دیا تو.....؟" اس کا وجود خوف سے کانپا۔

"کیوں ڈرتی ہو کہ وہ تمہیں چھوڑ دے گا، وہ تم کو کبھی نہیں چھوڑے گا..... اس نے کہا تھا۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو کر....." اندر سے کوئی آواز آئی۔

"اچھا چلو..... فرض کرو، اس نے تمہیں چھوڑ دیا، نقصان کس کا ہوگا.....؟" اندر سے کسی نے سوال کیا؟

"تمہارا یا اس کا.....؟"

"میرا صرف میرا۔" آبگینہ نایاب کے دل نے دہائی دی۔

"نہیں نقصان اس کا ہوگا..... کیونکہ وہ ایک ایسی ہستی کھو دے گا جو اس کے لیے جان بھی دے سکتی ہے۔"

محبت اور اعتبار ایک ہی رسی کے دو سرے ہیں..... محبت، اعتبار کے ساتھ پنپتی ہے۔

"تم بے فکر رہو..... عادل تم کو سنبھال لے گا..... ہمت کرو....." اس کے اندر سے کسی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر گویا ہمت دلائی اور پھر.....

☆☆☆

عادل کو ایسا لگا جیسے اس کے قدم من بھر کے ہو گئے ہوں، وہ آواز دینے والی کو پہچان گیا تھا لیکن اسے یقین تھا، وہ اگر پیچھے مڑ کر دیکھے گا تو پتھر کا ہو جائے گا۔

وہ ساکت تھا۔

پیچھے سے پھر لرزتی ہوئی، خوفزدہ سی، بھیک مانگتی ہوئی آواز آئی۔

"عا..... دل....."

"میں تم کو نہیں جانتا....." وہ پیچھے مڑے بغیر بولا۔

"کیوں عادل.....؟ ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔"

آبگینہ نایاب روتی ہوئی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ رو، رو کر سوجی ہوئی آنکھیں، سوکھے پپڑی زدہ

ہونٹ، سیاہ چادر میں لپٹا مجبور و بے بس وجود..... ایک لمحے کو عادل کا دل چاہا اس کی بات مان لے اور پھر وہ جو کچھ بھی کہے اس پر یقین کر لے..... اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لے۔ لیکن پھر بیچ میں دو لمبی راتیں، سیاہ راتیں آ کھڑی ہوئیں اور انہوں نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

''میں تم کو نہیں جانتا۔'' عادل کے لفظ تھے یا برچھی وہ تمیز نہیں کر سکی۔ ایک دم اس کے اور عادل کے درمیان بہت ساری ان دیکھی دیواریں آن کھڑی ہوئیں..... مضبوط دیواریں، جن کی موجودگی میں اس کا سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔

''میں تم کو نہیں جانتا، اور بہتر ہے کہ تم اب ہماری زندگیوں سے خاص کر میری زندگی سے نکل جاؤ، میں اب کبھی تم پر اعتبار نہیں کر سکتا ہوں۔ اور نہ ہی تم سے محبت کر سکتا ہوں..... ہم سب تم کو دفنا چکے..... تم جس کے ساتھ گئی تھیں، بہتر ہے اسی کے پاس چلی جاؤ..... اب چاہے اس کی داشتہ بن کر رہو یا پھر کسی کوٹھے پر جا بیٹھو..... میرا اس بات سے کوئی تعلق نہیں.....''

عادل کے لفظ تھے یا بم..... اسے لگا کہ اس کے سارے وجود پر پرخچے اڑ گئے ہوں، ساتوں آسمان دھڑ دھڑ اس کے سر پر آ گرے ہوں، آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی دھند نے اسے یہ بھی دیکھنے نہیں دیا کہ عادل وہاں ہے یا جا چکا ہے۔

''عادل.....'' اس کے دل نے دکھائی دی۔

محبت کا رشتہ اتنا نازک..... وعدے اتنے بودے.....

وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی، سورج کی کرنیں پھیلنا چاہتی تھیں..... اس نے جلدی سے اپنا چہرہ سیاہ چادر میں چھپایا اور.....

☆☆☆

''آبگینہ نایاب، آپ کو تیمور علی ولد حاکم علی سے نکاح بعوض پانچ لاکھ حق مہر قبول ہے۔'' اس کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے قاضی صاحب نے پھر پوچھا۔

تیمور نے نظریں اٹھا کر اس لڑکی کو دیکھا جو بولتی تھی تو ہال میں سناٹا چھا جاتا تھا۔ جو چلتی تھی تو اس کی باوقار شخصیت دیکھ کر لوگ راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ جو بڑی تمکنت سے اسے کہتی تھی۔

''وڈیرا تیمور علی ولد وڈیرا حاکم علی، اپنے باپ کے جوتے پہن کر اترایا مت کرو..... یہ بتاؤ تم کیا ہو.....''

سفید ملگجے جوڑے، سیاہ چادر میں لپٹی، سسکتے ہوئے نکاح نامے پر دستخط کر لی یہ وہ آبگینہ تو نہیں تھی۔

اب کوئی تیمور علی کو کیا بتاتا کہ آبگینہ اگر ٹوٹ جائے تو پھر جڑتا نہیں اور جو جڑ جائے تو آبگینہ پر پڑا بال ہمیشہ لوگوں کو یہ بتاتا ہے کہ یہ ٹوٹ چکا ہے اور وہ تو آبگینہ نایاب تھی۔ ہاں واقعی ''تھی''

☆☆☆

اب وہ مغویہ سے مالکن تھی۔

وہ اس کمرے میں کھڑی تھی جو اس کے لیے تیار کیا گیا تھا، خادمہ نے الماری کھول کر ایک ہلکے گلابی رنگ کا سوٹ نکالا اور ادب سے..... اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے کسی روبوٹ کی طرح ہاتھ میں کپڑے لیے اور شاور لینے چلی گئی۔

''چھوٹی بیگم!'' خادمہ نے اس کے الجھے بالوں کی گرہ سلجھاتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''چھوٹی بیگم تین دن ہو گئے آپ نے ایک دانہ منہ میں نہیں ڈالا ہے، آج کھانا کھا لیجیے.....'' اس نے ایک نظر اس اونچی لمبی چوڑی عورت کو دیکھا جو اس کے دیکھنے کے انداز پر سہم سی گئی۔

نصیباں اسے خاموش دیکھ کر خاموش ہو گئی..... اور خاموشی سے اس کے بالوں کی گرہیں سلجھانے لگی۔ بالوں کی گرہوں کی طرح شاید زندگی کی گرہیں بھی سلجھ سکتیں۔

اسے لگ رہا تھا جیسے، جیسے بال سلجھ رہے ہیں، ویسے، ویسے اس کی زندگی الجھ رہی ہے.....

کیا واقعی ایسا ہی تھا۔

☆☆☆

اُف..... وہ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ پسلیوں میں شدید درد کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی اس کی پسلیوں میں ناقابلِ برداشت درد ہو رہا تھا۔ اس

سے برداشت نہیں ہوسکا۔ وہ تقریباً درد سے دُہری ہوگئی۔

''ہائے میں قربان چھوٹی بیگم..... کیا ہوا.....؟''

نصیباں جو اس کے بیڈ سے ذرا قریب قالین پر سو رہی تھی گھبرا کر اٹھی..... اس کی حالت دیکھ کر وہ گھبرا کر باہر بھاگی اور پھر چند ہی منٹوں کے بعد ڈاکٹر اس کے کمرے میں موجود تھا۔

تیمور گاؤں جا چکا تھا۔ وڈیرا حاکم علی کا انتقال ہوگیا تھا اس کی گاؤں میں ضرورت تھی۔

پھر ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے کھانا کھلایا گیا۔

''چھوٹی بیگم کھانا کھالیں، کھانے سے کیا ناراضی..... ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ بھوک کی وجہ سے آپ کے درد ہو رہا ہے، کھانا کھا کر دوا کھا لیجیے گا۔''

نصیباں نے گرم دودھ کا گلاس اور بسکٹ ایک ٹرے میں رکھ کر اس کے آگے رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

وہ خاموشی سے دودھ پیتی رہتی واقعی بھوک بہت بری چیز ہے۔ زندگی اس کے لیے ایک جبرِ مسلسل ہوگئی تھی، تیمور نے کبھی اس پر اپنا حق نہیں جتایا۔

تیمور کو اس سے بہت محبت تھی وہ چاہتا تھا کہ وہ ڈھیروں آنسو جو اس کی آنکھوں میں تیرتے رہتے ہیں وہ آنسو تیمور کے سینے میں جذب ہو جائیں اور تیمور کی ندامت اس کے بالوں میں کہیں کھو جائے۔

ایک دفعہ تیمور نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی تھی، وہ اس کی منکوحہ تھی اس کی بیوی تھی، منع نہیں کر سکتی تھی لیکن اس کی آنکھوں کی بے بسی نے تیمور کو لرزا دیا تھا اور تیمور.....؟

☆☆☆

وہ وسیع و عریض گھر کی مالکن تھی، چھوٹی بیگم، تیمور سائیں کی دلہن..... اس کی الماری خوب صورت کپڑوں سے بھری رہتی..... اس کی آنکھ کے اشارے کی منتظر خادمائیں ہاتھ باندھے کھڑی رہتیں۔

لیکن کبھی اس نے گھوم کر پورا گھر بھی نہیں دیکھا تھا، نہ جانے کتنے سال ہوگئے تھے وہ صرف اپنے کمرے سے کچن کے علاوہ کہیں نہیں گئی تھی۔ وہ ہمیشہ سفید جوڑا پہنتی.....

تیمور کی ماں انتقال سے پہلے ایک دفعہ اس سے ملنے بھی آئی تھیں۔ اس کی سونی کلائیوں میں انہوں نے اپنے کنگن اتار کر پہنائے تھے، تیمور کو اس کی حرکت پر بہت بری طرح ڈانٹا تھا اور پھر بہت دیر تک اسے اپنے سینے سے لگا کر روتی رہی تھیں لیکن اس کی آنکھیں خشک اور ویران تھیں..... وہ بے حس سی، خاموش ان کے سینے سے لگی رہی اور پھر گاؤں جاتے ہوئے ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگئیں۔ تیمور کو لگا کیونکہ اس کی وجہ سے آبگینہ نایاب کے رشتے چھوٹ گئے تو اللہ پاک نے اس کے رشتے بھی واپس لے لیے۔

اس دن اس نے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگی اور اس نے معاف بھی کر دیا..... لیکن، لیکن.....! اللہ نے.....؟

وہ سارا، سارا دن مصلے پر بیٹھی رہتی، نمازیں پڑھتی، قرآن پڑھتی، گھر میں اچھے کھانے پکتے وہ ایک سادہ روٹی اور کوئی سبزی اپنے لیے بناتی اور خاموشی سے کچن کے فرش پر بیٹھ کر کھا لیتی۔

شام کو وہ سارے ملازمین کو ان کے کوارٹر میں بھیج دیتی پھر خالی گھر میں بیٹھ کر وہ اللہ سے باتیں کرتی اور اللہ کے سامنے بیٹھ کر بہت روتی۔

وہ جسے رنگوں سے، خوشبو سے پھولوں سے، زیورات سے عشق تھا، آج اس کے پاس سب کچھ تھا لیکن منہ پر لگی کالک یہ سب چیزیں استعمال کرنے سے روک دیتی۔

اکثر تیمور اس سے کہتا کہ وہ ہنستی کیوں نہیں..... پہلے کی طرح بولتی اور لڑتی کیوں نہیں ہے..... وہ آہستگی سے کہتی۔

''بخدا اب مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے، جب میرے گھر والوں نے مجھ پر اپنے گھر کے دروازے بند کیے تھے تو آپ نے مجھ پر اپنے نام کی چادر ڈالی، میں آپ کی شکر گزار ہوں اور احسان مند بھی.....''

تیمور کا دل اس کی پُر تکلف گفتگو پر بہت دکھتا، اسے احساس ہو گیا تھا، وہ اس کی ضد نہیں تھی..... اس کی محبت تھی۔

لیکن وہ سمجھتی تھی کہ وہ اس کی ضد تھی۔

وہ اسے کیسے سمجھائے..... لیکن وہ نہیں جانتا تھا وہ ایک عورت تھی ایک ایسی عورت جسے قدرت نے یہ وصف دیا ہے کہ وہ اپنی طرف اٹھنے والی ہر نظر کو پہچانتی ہے لیکن اگر وہ پہچاننا نہیں چاہے تو.....؟

☆☆☆

''جاوید بھائی اکثر تم کو پوچھتے ہیں، تمہارا فون نمبر مانگ رہے تھے..... میں نے منع کر دیا.....'' نزہت نے آہستگی سے اریبہ سے کہا۔

''کیوں، منع کیوں کر دیا..... دے دیتیں، میرا تو خود اکثر جاوید سے بات کرنے کو بہت دل چاہتا ہے، رات کو جب عادل سو جاتے ہیں تو اکثر جاوید کی یاد، اس کی محبت مجھے سونے نہیں دیتی..... میں نے تو اس سے کہا تھا کہ میرے ماں، باپ کبھی اس سے میری شادی نہیں کریں گے..... میں نے اسے اکسایا بھی تھا کہ ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں لیکن وہ مانا ہی نہیں، کہنے لگا، میری دو جوان بہنیں ہیں، میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا، میں نے تو بہت ضد کی مگر مانا ہی نہیں..... پتا ہے آج بھی جب عادل میرے قریب آتے ہیں تو میرے تصور میں جاوید ہی ہوتا ہے، ہائے یہ محبت، دل کا ناسور بن جاتی ہے۔'' عادل کی نئی نویلی دلہن نے رازدار سہیلی سے دل کا راز کہا۔

''پھر تو یقیناً تمہارے بچے جاوید کی شکل کے ہوں گے۔'' نزہت قہقہہ مار کر ہنسی اور اس کی ہنسی کو اریبہ کی ہنسی نے گونج دار بنا دیا۔

اور عادل جو اپنی نئی نویلی لاڈلی بیوی کی پیاری سہیلی کی خاطر داری کے لیے بیکری سے سامان لے کر ابھی آیا ہی تھا اندر سے آتی آوازوں نے جیسے اس کے قدم جکڑ لیے۔ اس کے پیر زمین میں جیسے دھنستے چلے گئے۔ کالی چادر میں خشک پپڑی زدہ چہرہ ہلکنے لگا۔ ''میں بے قصور ہوں، میں ان چھوئی ہوں۔'' یہ جملے ہچکیوں کے ساتھ اس کے آس پاس ناچنے لگے، رونے لگے، سسکنے لگے، اسے لگا کہ وہ چند لمحے یہاں کھڑا رہا تو جیسے پتھر کا ہو جائے گا۔ وہ خاموشی سے باہر جانے کے لیے پلٹا۔ اندر سے اس کی لاڈلی بیوی کے قہقہوں کی آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں، اسے جتا رہی تھیں..... اسے بتا رہی تھیں کہ وہ جھوٹا برتن ہے۔

لیکن اس لمحے جب اس نے لرزتے قدموں کے ساتھ گھر کے باہر قدم رکھا تو کسی کا لرزتا ہوا، کپکپاتا ہوا لہجہ، روتے ہوئے جیسے اسے پکارنے لگا، وہ جلدی سے پلٹا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

کوئی نہیں.....

☆☆☆

تیمور جب بھی آبگینہ ناباب کو دیکھتا تو اس کے دل کو ایک ٹھیس سی لگتی، وہ اپنی غلطی، اپنے غصے کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے آبگینہ سے محبت تھی۔ عشق تھا.....

لیکن وہ بس خاموش رہتی، ماں کے دھکے اسے چین سے سونے نہیں دیتے، جیتے جی اس کی رسم قل اسے آٹھ، آٹھ آنسو رُلاتی۔

تیمور کا دل چاہتا وہ اس کے ساتھ باہر جائے، گھومے پھرے، اچھے، اچھے کپڑے اور زیورات پہنے، سارے گھر میں مالکانہ حقوق کے ساتھ ملازمین کو ہدایات دیتی پھرے..... وہ کوئی شوخ جملہ کہے تو وہ زور سے ہنسے لیکن یہ سب تیمور کا خیال تھا..... اس کا ایک تصوراتی جمال تھا۔

آبگینہ ناباب کے ہونٹوں پر کوئی مسکراہٹ کبھی نہیں بکھری۔ گھر سے باہر جانا تو بہت دور کی بات..... وہ کبھی کھلے آسمان تلے، گھر کے لان میں بھی نہیں نکلتی تھی..... کتنے سال گزر چکے تھے، وہ بس گھر کے اندر ہی رہتی۔ خاموش..... پژمردہ..... افسردہ..... اس کی آنکھیں آج بھی سوال کرتیں۔ روتیں..... بلکتیں..... سسکتیں..... واویلا کرتیں..... اس کے ایک دوسرے میں پیوست ہونٹ ہلکتے ہوئے

کہتے مجھے جانے دو.....

''مجھے اللہ کے واسطے آزاد کردو.....''

''دیکھو شام ہوگئی ہے۔''

''بہت دیر ہوگئی..... میرے ابا پریشان ہورہے ہوں گے..... پلیز مجھے جانے دو..... پلیز مجھے آزاد کردو..... آزاد کردو.....''

☆☆☆

سارے گھر کے دروازے کھلے ہوئے تھے، ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کیے کھڑا تھا۔

''آبگینہ نایاب..... جاؤ چلی جاؤ..... تم آزاد ہو.....'' کمرے میں آواز گونج رہی تھی۔

سیاہ چادر میں لپٹے اس کے وجود نے پلٹ کر وڈیرا تیمور علی کو دیکھا..... جس کے کندھے جھکے ہوئے تھے جس کی آنکھوں میں ندامت اور شرمندگی تھی۔

''آپ..... اب..... اب نہیں'' اس کے دل نے کہا اور اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھڑکیاں بند کردیں اور دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر اکڑوں بیٹھ گئی، چند لمحے وہ تیمور کی طرف دیکھتی رہی اور پھر ہمیشہ کی طرح گھٹنوں میں منہ چھپا کر پھوٹ، پھوٹ کر روئے گئی۔ اس کی سسکیاں سارے گھر میں گونجنے لگیں۔

تیمور نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا..... لیکن اس کی سسکیاں سارے کمرے میں گونج رہی تھیں..... اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے.....

اسے لگا اس کے کندھے کسی انجانے بوجھ سے بھاری ہورہے ہیں۔

وہ بوجھ کیا تھا.....

آپ جانتے ہیں کیا تھا.....؟

نہیں ناں.....

میں بتاتی ہوں آپ کو ذرا ٹھہریے.....

☆☆☆

''عادل خدا کی قسم میں بالکل جھوٹ نہیں بول رہی..... اماں نے بھی مجھے گھر سے دھکے دے کر نکال دیا۔ تم تو میری محبت ہو، تم تو کہتے تھے ہماری محبت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے..... تم کو تو میرے کردار اور میری پاکیزگی پر ایسا ہی بھروسا تھا جیسے اس بات کا یقین کہ روز صبح سورج طلوع ہوتا ہے۔ عادل میری بات پر یقین کرو.....'' رو، رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں، آواز بیٹھ گئی تھی وہ عادل کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں ہاتھ جوڑے، رو، رو کر اپنی پاکیزگی اور بے گناہی کی قسمیں کھا رہی تھیں۔

''تو..... تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ دو دن اس لڑکے نے تمہیں اپنے گھر میں قید رکھا، جو کہ سات نسلوں سے وڈیرا ہے اور اس نے تم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، تم آج بھی دودھ کی دھلی ہوئی ہو..... تم جیسی تھیں..... ویسی ہی ہو..... مجھے کیا معلوم تمہارے اس کے ساتھ کیا تعلقات تھے؟ اور کیا ہیں؟ اور آئندہ کیا رہیں گے۔'' عادل کا لہجہ بہت کھردرا تھا۔

''عادل تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟'' اس کے لہجے کے ساتھ اس کا دل بھی رو پڑا۔

''بالکل نہیں، مجھے تم پر بالکل بھروسا نہیں..... میں ایک شریف انسان ہوں اور ایک شریف لڑکی سے ہی شادی کروں گا..... کیونکہ وہ میرے بچوں کی ماں ہوگی۔ تم جیسی مشکوک کردار کی لڑکی سے شادی کرنا تو بہت بڑی ہے، میں تم سے بات کرنا بھی پسند نہیں کروں گا..... اور اب میں چلتا ہوں کہ اگر کسی نے تم کو میرے ساتھ یا مجھ کو تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو میں کیا جواب دوں گا.....'' عادل نے کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے سفاکانہ لہجے میں کہا۔

''عا..... دل..... کیا کہہ رہے ہو، اس طرح کیوں کررہے ہو۔'' آبگینہ رو پڑی۔ ''میں کہاں جاؤں گی عادل اگر اماں کے بعد تم بھی مجھے دھتکار دو گے تو.....'' آبگینہ نایاب کو ایسا لگ رہا تھا جیسے سارے جسم سے اس کی روح کھینچ دی گئی ہو اور اس کی جان حلق میں پھنسی ہو۔

''وہیں جاؤ..... جہاں تم نے دو راتیں گزاری ہیں۔'' عادل نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور تیزی سے

باہر نکل گیا۔ چند لمحوں تک تو وہ بے یقینی سے اسے جاتا دیکھتی رہی اور پھر میز پر سر رکھ کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔

ارد گرد بیٹھے لوگ ہاتھ روک کر حیران ہو کر اس کو دیکھ رہے تھے لیکن اسے اب کسی بات کی پروا نہیں تھی..... جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا تھا اب اس سے زیادہ کیا ہوتا۔

زندگی میں بعض اوقات ہم ایک ایسے موڑ پر آ کھڑے ہوتے ہیں جب ہمارے آگے کنواں اور پیچھے کھائی ہوتی ہے..... ہم زمین پر کشش ثقل سے آزاد ہو کر ہوا میں تیر رہے ہوتے ہیں، کوئی کھونٹا، کوئی رکاوٹ ہمارے پیر زمین پر نہیں ٹکنے دیتی۔ ہم ہوا میں معلق ہاتھ پیر مار رہے ہوتے ہیں۔ آکسیجن کی کمی ہمیں سانس لینے نہیں دیتی..... لیکن پھر بھی..... ہم زندہ ہوتے ہیں۔ یا شاید زندہ لاش.....

وہ روتی رہی..... عادل نے ریسٹورنٹ کے باہر سے گلاس ونڈو سے اسے سسکتے ہوئے دیکھا..... اور گردن جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

''نہیں یار..... جاوید سے تو مجھے آج بھی محبت ہے، بے انتہا بے تحاشا محبت..... جب وہ میرا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر چومتا تھا ناں تو وہ لمحہ مجھ سے بھلایا نہیں جاتا۔''

عادل نے کروٹ بدل کر اپنے بستر پر برابر والے تکیے پر سر رکھے بے خبر سوتی اپنی بیوی کو دیکھا جس سے شادی اس نے اس لیے کی تھی کہ وہ پردہ کرتی تھی اور شادی سے پہلے اس کی ہزار کوشش کے باوجود اس کے سامنے نہیں آئی تھی..... آج عادل کو پردے اور پاکیزگی کا فرق سمجھ آیا..... تو دو آنسو اس کی دائیں آنکھ سے نکل کر تکیے میں جذب ہو گئے..... اب شاید ندامت کے یہ آنسو اس کی ساری زندگی کے ساتھی تھے۔

☆☆☆

''دے پیسے دے..... میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے، منحوس عورت کہاں چھپا کر رکھے ہیں؟'' شیدے نے گلابو کے بال پکڑ کر اس کا سر دیوار پر مارتے ہوئے کہا۔

''جو پیسے تھے شیدے میں نے دے دیے..... اب میرے پاس کچھ نہیں ہیں، وہ صاب جو بہت سارے پیسے دیتا ہے اور سارے پرندے آزاد کر دیتا ہے، وہ کئی دنوں سے نہیں آ رہا ہے۔''

شیدا، گلابو کو لاتوں، گھونسوں سے مار رہا تھا، اس کے بال پکڑ کر سر دیوار پر دے مار رہا تھا۔ اور گلابو کا

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

گلابی بدن جب تک نیلا کانچ نہیں ہو گیا اور شیدہ جب تک تھک نہ گیا وہ پٹتی رہی۔

''مجھے آزاد کر دے شیدے..... مجھے جانے دے..... میں اتنا ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔'' وہ رو رہی تھی، بلک رہی تھی اور پھر دروازے پر ہونے والی دستک..... بڑھتی چلی گئی۔

''دروازہ کھولو.....'' کوئی باہر سے بری طرح دہاڑا۔

☆☆☆

''صاب چھوٹی بیگم باہر جانا چاہتی ہیں۔'' تیمور جو بیٹھا کسی فائل میں سر کھپا رہا تھا نصیباں کی آواز پر چونک اٹھا۔

''کیا کہا تم نے.....؟'' وہ حیرانی سے بولا۔ نہ جانے کتنے برس بیت گئے تھے آبگینہ نایاب کو اس گھر میں رہتے ہوئے، گھر سے باہر تو بڑی بات وہ کبھی گھر کے لان میں بھی نہیں گئی تھی۔

آج اس کی یہ فرمائش جہاں تیمور کو عجیب سی لگی وہیں تیمور کو خوشی بھی ہوئی کہ شاید زندگی کی طرف یہ آبگینہ کا پہلا قدم ہو..... اسے حقیقتاً آبگینہ سے محبت تھی..... اس کی پاکیزگی اور نیکی پر ایمان کی حد تک یقین تھا، جتنے اس کے سجدے لمبے ہوتے اتنی ہی اسے احساسِ شرمندگی ہوتی..... وہ اتنا قرآن پڑھتی کہ کسی اور سے بات کرنے کا اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔

ساری دنیا چھوڑ کر..... اس نے بس اللہ پاک سے دوستی کر لی تھی..... اور تیمور جیسے بے پروا اور فلرٹی شخص کو اس کی پاکیزگی کی زنجیروں نے جکڑ لیا تھا، اسے صرف ہر طرف آبگینہ نایاب ہی نظر آتی چاہے وہ کبھی بلا ضرورت اس سے بات نہیں کرتی تھی بلکہ خود تو وہ کبھی تیمور کو مخاطب کرتی ہی نہیں تھی، تیمور کوئی بات کرتا تو انتہائی تکلف سے مختصر اجواب دے دیتی۔

☆☆☆

سفید کپڑوں میں سفید چادر میں لپٹی جب وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی..... تو تیمور نے پوچھا۔

''کہاں چلو گی.....؟''

''اماں کے پاس! اماں یاد آ رہی ہیں.....'' اس کا لہجہ مستحکم تھا۔

اور تیمور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

گھر کے باہر لگے شامیانے..... اور شامیانے کی اداسی نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

شامیانہ ویران تھا۔

☆☆☆

''باپ کے گھر کی غربت تجھے اس مقام پر کیسے لے آئی تھی کہ تو اس امیر زادے کے ساتھ بھاگ گئی۔ کمبخت باپ کی سفید داڑھی، ماں کے سفید چوندے اور بھائیوں کی عزت کا بھی تو نے پاس نہ رکھا..... تو..... تو..... بکاؤ مال نکلی۔''

شاہدہ بیگم بسترِ مرگ پر لیٹی اسے برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

''نہیں اماں خدا کی قسم..... تمہاری بیٹی نہ گھر سے بھاگی نہ بکی..... بس اماں تقدیر کا لکھا بھگت رہی ہوں..... میں نے اس امیر زادے کے گھر میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھایا۔ اماں میں بے قصور ہوں، مجھے معاف کر دو اماں.....'' وہ ہاتھ جوڑے اماں سے بلک، بلک کر معافی مانگ رہی تھی، ان کے پیروں میں اپنا چہرہ رگڑ رہی تھی۔

''میں آپ کے پاس آ رہی ہوں۔ پھر میں آپ کو حلفیہ بتاؤں گی، اماں ایک دفعہ صرف ایک دفعہ اپنی نایاب کی بات آپ سن تو لیں۔ پھر جو بھی سزا آپ دیں گی مجھے قبول ہو گی.....''

''جلدی آ..... پھر میرے پاس وقت نہیں رہے گا۔''

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی، وہ کبھی دوپہر کو نہیں سوتی تھی، آج ظہر پڑھ کر جائے نماز پر ہی سو گئی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پورے گھر میں سناٹا تھا، آج رمضان کا 26 واں روزہ تھا، ملازمین بھی دوپہر کو سونے کے لیے اپنے، اپنے کوارٹرز میں جا چکے تھے لیکن وہ اماں کے پاس جانا چاہتی تھی، آج ابھی اور اسی وقت.....

☆☆☆

''جنازہ مسجد چلا گیا ہے اگر آپ چہرہ دیکھنا

چاہتی ہیں تو مسجد چلی جائیں وہاں آخری بار چہرہ ان لوگوں کو دکھایا جارہا ہے۔ جو یہاں چہرہ نہیں دیکھ سکے۔'' کسی انجان سے لڑکے نے جو اسے نہیں جانتا تھا اسے بے قرار دیکھ کر بتایا۔ اور وہ سرپٹ گلی کے نکڑ پر واقعی مسجد کی طرف بھاگی.....

''اماں میری بات سنے بغیر کیسے منوں مٹی تلے سو سکتی ہیں، انہوں نے تو مجھے بلایا تھا.....'' مگر.....؟

☆☆☆

''نہیں، تم اماں کا چہرہ نہیں دیکھ سکتیں.....اماں کی یہ وصیت تھی کہ تمہیں ان کا مرا ہوا چہرہ بھی نہیں دکھایا جائے۔'' وہ جو سفید کپڑوں پر بہت بڑی سفید چادر میں لپٹی اور چہرے کو بھی چھپائے ہوئے تھی چند عورتوں کے ساتھ اماں کا چہرہ دیکھنے آگے بڑھی تو اس کے بھائی نے بازو سے پکڑ کر اسے پیچھے دھکا دے دیا.....عورتوں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''ارے یہ تو نایاب ہے.....وہی جو کسی امیر زادے کے ساتھ ماں، باپ کے منہ پر کالک مل کر بھاگ گئی تھی۔'' ایک عورت نے دوسری عورت کو کہنی مارتے ہوئے بہ آواز بلند سرگوشی کی۔ ''ارے یہ لوگ تو کہتے تھے یہ مر گئی؟'' ایک آدمی نے بہ آواز بلند کہا۔

''کیوں؟ میں اماں کا منہ کیوں نہیں دیکھ سکتی۔'' نایاب بلبلائی.....اس نے بھائی کا بازو پکڑنا چاہا۔

''اس لیے سن رہی ہو، لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟''

تیمور بے بس سا کھڑا تھا۔ اسے دلی افسوس تھا۔ اس کا غصہ.....اس کے انتقام نے ایک خاندان کو برباد کر دیا۔

''ارے بڑی بے غیرت ہے، باپ بھی اس کے غم میں مر گیا تھا اور آج ماں بھی.....اللہ ایسی اولاد کو تو پیدا ہوتے ہی اٹھا لے۔'' عورتیں اور مرد اسے دیکھ کر باتیں بنا رہے تھے، بھائی نے اسے دکھائے بغیر اماں کا چہرہ سفید کفن سے ڈھکا اور جنازہ اٹھا لیا۔

لوگ اس کی ذات پر تھو، تھو کر رہے تھے۔ آس پاس چند مرد اور بچے کھڑے اسے ترس بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور وہ جسے برسوں سے شاید سورج کی کرنوں اور چاند کی روشنی نے بھی نہیں دیکھا تھا وہ زمین پر بیٹھی ننگے سر، اپنے بال نوچ رہی تھی.....رو رہی تھی.....واویلا کر رہی تھی.....ذلت سی ذلت تھی.....اس کے چاروں طرف لوگوں کا رش لگ گیا تھا۔

''یہ کون ہے؟ یہ وہ آبگینہ تو نہیں جو یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتی تھی، جس نے میرے منہ پر طمانچہ مارا تھا، یہ وہ نایاب تو نہیں.....تھی۔ جس نے پلٹ کر کہا تھا مجھے اپنی اور اپنے خاندان کی عزت اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وڈیرا تیمور علی ولد وڈیرا حاکم علی ہر عورت بکاؤ نہیں ہوتی۔ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں.....میں بہت خاص ہوں میرے ابا مجھے نایاب کہتے ہیں.....نایاب.....!''

تیمور گرد میں اٹی ننگے سر بلک، بلک کر روتی اس شاندار لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو ایک انا کے مارے مرد کے غصے کا شکار ہو کر اس معاشرے میں لفظوں سے سنگسار کر دی گئی تھی۔

☆☆☆

سارے کمرے میں اندھیرا تھا آج اس نے نائٹ بلب بھی نہیں جلایا تھا اے سی کی خنک ہوا اس کے جسم کو جھلسا رہی تھی.....وہ خاموشی سے لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ پھر اسے ایسا لگا جیسے کسی انہونی کے خوف نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑا دی ہو.....اسے سینے میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔

اسے لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو.....اسے سانس لینے میں تکلیف سی محسوس ہونے لگی.....وہ آہستگی سے بستر سے اٹھا اور آگے بڑھ کر لائٹ کا سوئچ آن کیا۔

کمرا ایک دم جگمگانے لگا لیکن یہ جگمگاتا کمرا اسے اس وقت ایک تاریک سی قبر لگا.....وہ بے ساختہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اور بے ساختہ سامنے والے کمرے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا.....اندر سے سسکیوں کی آواز آرہی تھی.....بے ساختہ اس کے ہاتھ کا دباؤ ہینڈل پر بڑھتا چلا گیا اور پھر.....

☆☆☆

''تیمور صاحب بڑے نیک آدمی ہیں، ہمارے ادارے کی بہت ساری لڑکیوں کی شادیاں کروائی ہیں، کبھی ان کے دروازے پر کوئی سوالی گیا ہو تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ خالی ہاتھ واپس آیا ہو..... بے شمار بے گناہ قیدیوں کے مقدمات لڑے اور ان کو آزاد کرادیا۔ سارا سال غریبوں میں راشن اور کپڑا ان کے گھر سے تقسیم ہوتا ہے۔ بہت نیک، فرشتہ صفت اور جنتی آدمی ہیں..... مجھے نہیں لگتا کہ انہوں نے کبھی زندگی میں کوئی گناہ کیا ہوگا۔''

یہ ایک رفاہی ادارے کی راشن تقسیم کرنے کی تقریب تھی جہاں تیمور علی مدعو تھا، اس نے اپنے پیچھے بیٹھی بہت ماڈرن سی ان خواتین کو دیکھا جن کا تعلق کسی این جی او سے تھا۔ اور اس کے منہ سے نکلا۔ ''میں ہرگز بے گناہ نہیں.....''

اور پھر اس سے وہاں بیٹھا نہیں گیا اور وہ تیز، تیز قدموں سے باہر نکلتا چلا گیا کہ ضمیر کے کوڑے اس کی کمر کو لہولہان کر رہے تھے۔

☆☆☆

وہ اندر داخل ہوا سارے کمرے میں ایک عجیب نامانوس سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

شاید کافور کی..... اندھیرے کمرے میں نیلا جلتا نائٹ بلب عجیب پُراسراریت سی کیفیت پیدا کر رہا تھا سفید کپڑوں میں پورے وجود کو سفید چادر میں لپیٹے وہ جائے نماز پر سجدہ ریز تھی۔ شاید..... رو رہی تھی..... سسک رہی تھی..... آج کی ذلت اور بے عزتی اللہ پاک سے کہہ رہی تھی۔ برسوں کے بعد آج تیمور نے اسے روتے دیکھا تھا، یاد آتے ہی تیمور کی آنکھوں کے گوشے بھی گیلے ہوگئے۔ اس نے یہ سب تو نہیں چاہا تھا۔ یہ سب تو نہیں سوچا تھا۔ غصہ حرام ہے آج اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ اس کا دل چاہا، اپنے منہ پر خود تھپڑ مارے لیکن وہ ساکت دروازے کے ہینڈل کو تھامے کھڑا رہا۔

اس وقت تیمور کو سہارے کی ضرورت تھی۔ اور دروازے کا یہ ہینڈل اسے بہت بڑا سہارا لگ رہا تھا۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔

پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ..... تیس منٹ اس نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔

تیمور نے کسی انجانی کا احساس ہوا، وہ لپکا اور پھر اسے شانوں سے پکڑ کر ہلایا۔ اور وہ لڑھک کر ایک طرف گر گئی..... سارے کمرے میں کافور کی خوشبو پھیل گئی..... اور پھر ہر چیز نے جیسے سفید کفن اوڑھ لیا۔ اس کے ہاتھوں میں اس کی مردہ، ٹھنڈی انگلیاں تھیں وہ ٹھنڈی انگلیاں، اچانک سفید چادر سے نکل کر دوسرے ہاتھ کی ٹھنڈی انگلیوں سے جا ملیں ٹھنڈی یخ سرد انگلیوں میں دبا تیمور کا ہاتھ پھر جیسے وہ مردہ انگلیاں رونے لگیں، سسکنے لگیں، کہنے لگیں، ہاتھ جوڑنے لگیں۔

''پلیز مجھے جانے دو، مجھے بہت دیر ہو رہی ہے، شام ہوگئی..... تم کو اللہ کا واسطہ..... مجھے جانے دو۔''

اور آج وہ چلی گئی۔

اس کے چہرے پر ایک عجیب سا اطمینان اور نور تھا دوپہر والی ذلت، شرمندگی اور رسوائی کا کوئی نشان نہیں تھا، وہ چلی گئی، اس کے چہرے سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ پر جاتے، جاتے وہ تیمور علی کو شرمندگی اور ندامت کے دلدل میں دھکیل گئی۔

☆☆☆

''تیمور علی اب اگر تم مجھے آزاد بھی کر دو تو کوئی فائدہ نہیں، تمہاری وہ دو دن کی قید میری ساری زندگی پر محیط ہوگئی ہے، اب میں کبھی آزاد نہیں ہو سکتی کہ میری روح ذلت اور رسوائی کی دلدل میں قید ہوگئی ہے۔''

آج دوپہر کو کہا آبگینہ نایاب کا جملہ تیمور کو یاد آیا..... تو وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دیا۔

کون کہتا ہے مرد نہیں روتے..... مرد روتے ہیں اور بعض مرد تو ساری زندگی روتے ہیں جیسے کہ تیمور علی.....

☆☆☆

''وہ لڑکی جو یہاں پرندے لے کر کھڑی ہوتی تھی وہ کہاں ہے؟'' تیمور جو طبیعت خرابی کی وجہ سے کئی دن سے آفس نہیں جا رہا تھا، آج جب آفس جانے کے

لیے نکلا تو اسے گلابو کا خیال آیا۔

''نہ جانے اس کے پرندے کوئی آزاد بھی کر رہا ہوگا یا نہیں..... کہیں اس کا مرد اس کو مار پیٹ نہ رہا ہو۔'' وہ سب کام چھوڑ کر سگنل پر کھڑا ہوا۔

''بابو صاحب وہ تو روز آتی ہے ابھی گئی ہے دیہاڑی نہیں لگی۔ اب ہر کوئی تو آپ کی طرح حسن کا قدر دان نہیں ہوتا ناں.....'' سگنل پر کھڑے ایک فقیر نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے خبیث لہجے میں کہا۔

لیکن تیمور کی گھورتی آنکھوں نے اسے مزید کچھ نہیں بولنے دیا۔

''کوئی اس کا گھر جانتا ہے؟'' تیمور نے سگنل پر کھڑے ہونے والے مخصوص لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں جانتا ہوں سر..... وہ ہمارے ہی محلے میں رہتی ہے۔'' ایک پھول بیچنے والے صاف ستھرے لڑکے نے آگے بڑھ کر اس سے کہا۔

☆☆☆

''کمبخت..... ڈائن..... کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی یہ، یہ سو روپے لائی ہے، اس کا کیا میں تیرا کفن خریدوں یا تیرے باپ کا..... میرا نشہ کیسے پورا ہوگا۔ جا کپڑے اتار کر بازار میں کھڑی ہو جا..... مگر مجھے پیسے لا کر دے۔ وہ تیرا لنگڑا باپ..... 70,000 روپے لے گیا تیرے ارے میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے اور تجھ جیسی عورتیں تو مفت میں مل جاتی ہیں۔'' شیدا غصے میں پاگل ہاتھ میں جو چیز آ رہی تھی اس سے گلابو کو مار رہا تھا اور ساتھ، ساتھ مغلظات بھی بک رہا تھا۔

''کہاں ہے وہ تیرا ہمدرد..... پیسے لا پیسے۔'' شیدے نے مکا اس کے منہ پر اس قدر زور سے مارا اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔

''یا اللہ میری مدد کر.....'' گلابو نے سیدھے ہاتھ کی پشت سے منہ سے بہتا ہوا خون پونچھتے ہوئے دل ہی دل میں پکارا۔

اور جب بندہ سچے دل سے اللہ پاک کو پکارے تو وہ جو شہ رگ سے زیادہ قریب ہے وہ اپنے بندے کی پکار کا جواب ضرور دیتا ہے۔

☆☆☆

تیمور اپنی دانست میں سارے ہی نیک کام کرتا، غریبوں کو کھانا کھلانا، ضرورت مندوں کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، بیماروں کا علاج تو تنگدستوں کی مدد غریب لاچار بچیوں کی شادی کروانا غرضیکہ ہر وہ کام جو اس کا دامن دعاؤں سے بھر دے میں بالکل بدل گیا تھا لیکن وقت کے ساتھ، ساتھ اس کے ضمیر اور دل کا بوجھ بڑھتا چلا جا رہا تھا کوئی ایسا کام رہ گیا تھا جو اس کے کندھے ہلکے کرتا۔

آخر کون سا..... وہ کون سا عمل تھا..... جو تیمور علی کا اس ذہنی اذیت سے نجات دلا دیتا..... بھلا کون سا عمل.....؟

☆☆☆

''مجھے جانے دے مجھے چھوڑ دے، مجھے آزاد کر دے، تجھے اللہ کا واسطہ.....'' گلابو ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

''چھوڑ دو اسے..... کیا کر رہے ہو؟'' تیمور نے جو باہر ہی سے گلابو کی سسکیاں سنتا اندر آ رہا تھا۔ شیدے کو ایک ہاتھ سے دھکا دے کر گلابو کو چھڑاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''تو، تو کون ہے؟'' شیدہ جس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا مرعوب سے انداز میں لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''جنگلی جانور، وحشی، میں جو کوئی بھی ہوں، تجھ کو شرم نہیں آتی ایک بے بس عورت کو مارتے ہوئے۔'' تیمور دہاڑا۔

''آتی ہے صاب آتی ہے پر یہ سالی، یہ میرے نشے کے پیسے نہیں کما کر لاتی اس کے لنگڑے باپ نے 70,000 روپے لیے تھے 70,000 روپے کا خریدا تھا میں نے اسے سوچا چلو زندگی بھر روٹی کا بندوبست ہو جائے گا لیکن یہ سالی، یہ سالی تو 200,400 سے زیادہ لاتی ہی نہیں.....'' شیدے نے ہانپتے ہوئے مرعوب لہجے میں کہا۔

تیمور نے کونے میں زمین پر بیٹھی گلابو کو دیکھا جس کی ناک سے اور منہ سے مسلسل خون آرہا تھا۔

''70,000 نہیں تم ایک لاکھ رکھ لو لیکن ابھی اسی وقت گلابو کو طلاق دے دو میرے سامنے۔'' تیمور نے جیب سے ہزار کے نوٹوں کی گڈی نکال کر حقارت سے شیدے کے آگے پھینکی..... شیدے نے پہلے تو بہت بے یقینی سے تیمور اور پھر گلابو کی طرف دیکھا، گلابو بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر حیرت سے تیمور کو دیکھ رہی تھی۔

''چلو اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' محلے کے چند لوگ بھی گھر میں جمع ہو گئے تھے جب شیدے نے سب کے سامنے گلابو کو طلاق دی۔ تو کئی مردوں اور عورتوں نے تیمور کا شکریہ ادا کیا..... اور پھر محلے کے مردوں نے ہی شیدے کو دھکے مار کر گھر سے نکالا۔

''یہ لو میرا کارڈ اگر چاہو تو کل گھر آجانا..... میں تم کو کام دے دوں گا۔'' تیمور کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اور پیچھے گلابو بہ آواز بلند دعائیں دیتی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ گلی سے باہر نکل آیا تھا، اسے برسوں بعد ایسا لگا جیسے اس کے کندھوں پر لدا منوں وزن یکلخت اتر گیا ہو، اس کے کندھے ہلکے ہو گئے تھے، تیز تپتی، جھلستی، دھوپ ایک دم گھنی چھاؤں میں بدل گئی ہو۔ راستے میں ہر طرف پھول ہی بکھرے ہوں، اس کا وجود ایک پھول کے مانند ہلکا ہو گیا ہو، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

دو احسان مندانہ تشکر کے آنسو سے بھری آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں، وہ مسکرا دیا۔ اور وہ آنکھیں بھی روتے، روتے ہنس دیں۔

☆☆☆

آج وہ بہت عرصے بعد شاید برسوں بعد بغیر نیند کی گولی لیے سو رہا تھا گہری اور مطمئن نیند کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ سارے کمرے میں ہلکی نیلی روشنی اور گلاب کے تازہ پھولوں کی خوشبو مہک رہی تھی۔ نیلی روشنی سفید دودھیا روشنی میں تبدیل ہو گئی۔ سارا کمرا ایک عجیب سحر انگیز سا لگ رہا تھا، اس کو اپنے برابر میں کسی وجود کا احساس ہوا..... اس نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے دیکھا سفید لباس اور سفید چادر میں لپٹا گلاب کی خوشبو سے مہکتا وجود، اس کے برابر میں لیٹا مسکرا رہا تھا، ہر طرف جیسے روشنی سی پھوٹ رہی تھی..... وہ حیران نظروں سے اسے دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں وہ سب تھا جو ساری زندگی اس نے دیکھنا چاہا۔

محبت، اعتماد، اعتبار اور عشق..... اس سفید کپڑوں میں ملبوس وجود کی آنکھیں محبت سے چور تھیں۔ پھر وہ آہستگی سے اس کے قریب ہوئی۔ اور اس کے گلے میں اپنی معطر بانہیں ڈال کر آہستگی سے بولی۔

''تیمور مجھے تم سے محبت ہے۔ میں نے اور میرے اللہ نے تم کو معاف کیا۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ آئی لو یو تیمور.....'' وہ اس کے کانوں میں گنگنائی تیمور جیسے ہوش میں آگیا۔ اس نے جلدی سے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

لیکن.....

اس کی بانہوں میں سفید، نرم تکیہ تھا۔ گلاب کی خوشبو سے مہکتا تکیہ..... معطر، معطر سا نرم تکیہ اور اس تکیے پر گرا پانی احساس دلا رہا تھا کہ اس پر سر رکھ کر کوئی بہت دیر تک روتا رہا ہے۔ سارا کمرا گلاب کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور تیمور تکیے کو چومتے ہوئے زار و قطار روتے ہوئے صرف یہی کہے جا رہا تھا۔

''آخر میں نے تم کو جیت لیا، آ بگینہ تم میری آ بگینہ نایاب ہو..... آئی لو یو..... ٹو..... آ بگینہ نایاب آئی لو..... یو ٹو..... میں نے تم کو جیت ہی لیا میری، صرف میری آ بگینہ نایاب مجھے بھی تم سے محبت ہے، اعتبار ہے، اعتماد ہے اور عشق ہے.....''

تیمور سفید گلاب کی خوشبو سے معطر تکیے کو بانہوں میں لیے سرگوشیاں کر رہا تھا۔

کیا اس کی بانہوں میں واقعی سفید غلاف میں لپٹا نرم و ملائم پھولوں کی خوشبو سے مہکتا تکیہ تھا یا.....

❁❁❁

حاصلِ زندگی

خدیجہ میر

زندگی جب ''جینے'' سے ''گزارنے'' کے زوال تک آتی ہے تو سہل پسندی ایک خواب بن جاتی ہے۔

زندگی میں کوئی چاہے جیسا بھی ہو جس حال میں بھی ہو کسی نہ کسی پہلو میں ادھورا، تشنہ سا رہتا ہے.....اور یہی ادھورا پن جب احساسِ کمتری، خود ترسی اور مظلومیت کا لبادہ اوڑھتی ہے۔ تب زندگی کسی عفریت کی صورت ذات کے بخیے ادھیڑنے لگتی ہے۔

''میں سارہ۔ ریاض ایک نامور جرنلسٹ.....

دوسروں کی زندگی میں آئے سانحات اور ان کے واقعات کو سپردِ قلم کر کے سطحِ قرطاس پر سجا کر میڈیا کی نذر کرتی ہوں۔ دوسروں کی زندگی کی ٹریجڈی کو دل سے محسوس کر کے اسے پر درد تحریر بنا کر پیش کرنا میرا پروفیشن ہے اور میں اپنے پروفیشن سے ایسے مخلص ہوں جیسے کوئی مشرقی عورت اپنے اہل وعیال اور خانہ داری سے ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں درجنوں این جی اوز اور فنڈ ریزنگ آرگنائزیشن سے وابستہ ہوں جس سے میرا سوشل سرکل بلا مبالغہ اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ مصروفیت کا محتاج بن کر رہ گیا ہے۔ میں ان این جی اوز کے لیے معقول معاوضے کے بدلے..... اپنے لہو آگیں طرزِ تحریر اور سیمینارز میں پُرجوش تقاریر سے ان کی مقصدیت کو عروج بخشتی ہوں۔ یہ سچ ہے میں نے جہاں، جہاں اپنے قدم رکھے اس خاک کے ذرے سنہری ہو گئے۔

میں نے اپنے کیریئر کو دوام بخشنے کی خاطر اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس پر صرف کیا اور آٹھ سال کے مختصر عرصے میں میری شبانہ روز کی محنت کا صلہ میرا شاندار کیریئر ریکارڈ تھا۔ میں آج وہاں کھڑی تھی جہاں تک پہنچنے کے لیے لوگ پوری زندگی گزار دیتے ہیں تب جا کر ان کو وہ مقام ملتا ہے لیکن اس کے باوجود میری ذاتی زندگی انتشار کا شکار رہی۔

صبح چھ بجے اٹھ کر نماز کی تیاری کرتے، کرتے سورج طلوع ہو جاتا اور قضا نماز بڑے اہتمام سے ادا کر کے جیسے اپنے ایک اور فرض سے سبکدوش ہو جاتی۔ ملازماؤں کے ہوتے ہوئے زندگی گھر داری کے کاموں سے یکسر عاری رہی۔ اور میری نظر میں یہ کام میرے لیے نہیں بنے۔ ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا کرتے، کرتے میں مختلف اپ ڈیٹس اور دیگر حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے دی گئی بریفنگ کی ورق گردانی یا فون گردانی کرتی رہتی۔ کیا کروں پروفیشن کا تقاضا ہے کہ ملکی وغیر ملکی حالات سے الف تا ی باخبر رہنا پڑتا ہے۔ موبائل پر نظریں ٹکائے ای میل پڑھتے خاموشی سے ناشتا کرتے ہاتھ..... اور ٹکر، ٹکر دیکھتے میرے آنگن کی کلیاں رمشہ اور عمیر اپنی ماں کو دیکھتے رہتے، ریاض کو شاید عادت ہو گئی تھی البتہ وہ مزے سے ناشتا کرتے رہتے۔ ریاض بچوں کو اسکول چھوڑ کر اپنے آفس چلے جاتے۔ میری ایک خوش باش زندگی کا راز ان کی اور میرے بیچ کی انڈر سٹینڈنگ تھی۔

ہم بخوبی اپنے، اپنے حصے کے معمولات کو خاموشی سے پورے کیے جا رہے تھے۔ میں روزمرہ زندگی میں مصروفیات میں پستی رہی پستی رہی اور گھر سنبھالنے کے لیے قابلِ اعتماد ملازمین کافی تھے مجھے تو بس اپنے کیریئر کو وقت دینے کا جنون سوار تھا۔ آفس پہنچ کر ڈیسک پر معمول کی طرح ڈھیروں کام میرا منتظر ہوتا۔ روز کی انتھک محنت نے میرے اعصاب کو تھکا ڈالا تھا۔

جتنا کام سمیٹتی اتنا ہی بڑھتا چلا جاتا۔ کام کے بوجھ تلے زندگی کے خوب صورت آٹھ سال جسے میری ہم عمر دوستوں نے خوش گپیوں، سیر سپاٹوں، شاپنگ اور لوا سپاٹ پر اٹکھیلیاں کر کے گزارے ہیں میں نے اسے کیریئر بنانے کی جدوجہد میں گزار دیا۔

کیا خوب مقولہ ہے کہ "کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے ناں۔"

ہاں یہ واقعی سچ ہے ان آٹھ سالوں کی رنگینیوں کو گنوا کر میں نے اپنے گھر کی منقش دیواروں پر بہت سارے میڈلز، شیلڈز اور ایوارڈ سجا کر اپنی زندگی کو مقصدیت بخشی۔ میری اس لف روٹین کے باوجود میرا گھر بڑی سہولت سے چل رہا تھا۔ گھر کے دیگر ملازمین کے علاوہ شیریں میری خاص الخاص ملازمہ جس نے میرا ہر مشکل وقت میں اپنے فرائض سے بڑھ کر ساتھ دیا۔ وہ بخوبی میرے شوہر اور بچوں کو سنبھال رہی تھی۔ ریاض سے بہت چھوٹی ہونے کے باوجود اُن کا اسے آپا کہنا عورت کے فطری شک کو بھی میرے اندر دفن کر گیا تو میں مطمئن سی ہو گئی۔ گھر کا یہ تقدس بھرا ماحول میری تشفی کے لیے کافی تھا۔

لیکن جب زندگی حد سے زیادہ آسودہ حال ہو

جائے۔تو چوکنا ہو جانا چاہیے.....خوفزدہ ہو جانا چاہیے..... کہ مخمل کا بچھونا کہیں کانٹوں کی آماجگاہ نہ بن جائے۔

کیونکہ زندگی وہ قسائی ہے جو ہمیں ذبح کرنے سے پہلے ہمارے من پسند سبز خوشے کھلا، کھلا کر پیار سے چمکارتے ہوئے چھری تلے لٹا دیتی ہے.....اور ہم بے بس ہو کر ''حلال'' ہو جاتے ہیں۔

میں سارہ ریاض بال کی کھال اتارنے والی کہانیوں کو کرید، کرید کر سانحہ لکھنے والی.....لفظوں کے سحر سے رسی کو سانپ دکھانے والی.....نصیب کی بساط پر ایک مہرے سے ایسے پٹی کہ مکمل مات کھا گئی۔

ذہانت و فراست کی تفسیر سارہ ریاض قسمت کے ہاتھوں اس طرح شکست و ریخت کا شکار ہو گی میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔میری بنائی گئی دنیا کے ایک جھٹکے سے پرخچے اڑ گئے۔چلتی سانسوں کے بیچ قیامت کیا ہوتی ہے.....مجھے تب ہی پتا چلا۔

وہ دن واقعی قیامت تھا۔

''شادی کرنا چاہتا ہوں میں۔''

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ پتھرائی آنکھیں میرے ریاض کی تو نہیں تھی۔

چند دنوں کی سرد مہری سے قبل ان آنکھوں میں کتنے لطیف جذبات کا عکس لہراتا تھا.....مخمور غلافی آنکھیں۔ پر اب وہاں شرم نہ شرمندگی نہ اپنے لفظوں کی سنگینی کا احساس نہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے رسمی وعدوں کا پاس.....ایک لمحے میں بہت کچھ ٹوٹ کر گرا تھا۔

''کیا.....؟'' میری ذات کا غرور میرے مان کا پاس.....یا سات آسمان کا ملبہ.....میں نہیں جانتی..... کیا، کیا ڈھے گیا تھا۔

البتہ زمیں جیسے گھومتے، گھومتے میری رکتی دھڑکنوں کے بوجھ سے اپنی جگہ ساکت ضرور ہو گئی۔اندر سے امڈتا آنسوؤں کا ریلا.....آنکھوں میں اترنے سے قبل میرے ضبط کی باڑھ سے ٹکرا کر شانت ہو گیا۔

میں نے اپنی ان دیکھی آنکھوں میں درد کا.... بے کراں صحرا پھیلتے دیکھا۔یہ سچ ہے.....ان دیکھے درد بہت درد دیتے ہیں ضبط کا اگر کوئی دوسرا نام ہوتا تو.....تو شاید وہ پل صراط ہوتا.....تلوار کی دھار سے تیز، بال سے زیادہ باریک، رگوں کو چیر کر وجود میں اتر جانے والا درد۔

''کیوں.....کیوں کر رہے ہو تم ایسا.....؟'' میں نہیں جانتی ان الفاظ کا تاثر کیا تھا۔میں نے ریاض کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

ان کی پتھر آنکھیں گہری چپ لیے ہوئے تھیں۔

مہیب خاموشی.....قیامت آنے سے قبل والی خاموشی.....

میرا دل دہل گیا۔

''تمہارے اس کیوں کا جواب تم خود ہو.....'' وہ راستہ بدل کر جانے لگے.....میں پھر راستے میں استادہ ہو گئی۔

''تم میری بات کا جواب دیے بغیر نہیں جا سکتے.....'' میں چلائی۔

''میں جا سکتا ہوں اور جا کر دکھاؤں گا، مجھے راستے بدلنے آتے ہیں، جانے والوں کو راستے مل ہی جاتے ہیں..... پاگل عورت.....'' جواباً وہ بھی شدت سے دہاڑے۔

''اور.....اور تم اپنی دن بھر کی فرسٹریشن مجھ پر مت نکالو سمجھیں تم.....''

کب دیکھا تھا ان کا یہ لہجہ، یہ رویہ، الفاظ کے چابک دل پر پڑتے رہے لیکن آنسوؤں کو پھر بھی راستہ نہیں دیا۔میرا ضبط اپنی آخری حدوں کو چھونے لگا .....میری نظر میں عورت کو اس کے آنسو کمزور بناتے ہیں اور مرد کو اپنے مرد ہونے کا زعم دیتے ہیں.....نہ جانے کہاں سے میرے ہنستے بستے گھر کا تنکا اس دن طوفان کی نذر ہو گیا۔

''ریاض یہ فرسٹریشن نہیں.....میں آپ سے پوچھنے کا مکمل حق رکھتی ہوں۔''

میری بات پر وہ استہزائیہ ہنسے۔

''اگر تم اپنے حقوق کے بجائے اپنے فرائض کو بخوبی

انجام دیتیں تو شاید آج یہ دن دیکھنے کی نوبت ہی نہ آتی۔"

"تت..... تم گھٹیا آدمی اپنے آوارہ پن کو میری مصروفیات سے نتھی کر کے خود بری الذمہ نہیں ہو سکتے....." ریاض نے جیسے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا تو میں چیخ ہی اٹھی۔

"گھٹیا پن کی بات کی جائے ناں تو آپ کو سب پر سبقت حاصل ہے میڈم..... تم درد لکھتی ہو اپنی شہرت کے لیے..... تم مظالم دکھاتی ہو..... اپنی شان کے لیے۔ بڑے، بڑے سیمینارز میں تمہاری پرتکلف شرکت، شاہانہ آن بان اور لفظوں کے فسوں سے اچھے اچھوں کو متاثر کرنے والی پُر درد تقریر..... درد اور آنسوؤں کی چاشنی سے فنڈنگ بڑھانے والی، اسی فنڈ سے اپنے ان آنسوؤں کی قیمت وصول کرنے والی عورت کے منہ سے گھٹیا پن کے کچھ الزام معیوب لگتے ہیں۔"

اس نے مجھے چیخ کر گویا آئینہ دکھایا۔ میرا وجود جیسے بے جان مجسمہ بن گیا۔ گھڑی کی تیزی سے بھاگتی سوئیوں کے بیچ وہ خار دار لمحے اڑن چھو ہو گئے..... بالآخر ضبط کی باڑ سے ٹوٹتا وہ بے تاب آنسوؤں کا ریلا بہتا چلا گیا اور اس دن بہت عرصے بعد مجھے فرصت ملی اپنی بربادی کا ماتم کرنے اپنے لٹنے کا سوگ منانے کی..... اور یہ سوگ میں نے بڑی فرصت سے منایا۔ زندگی واقعی اتنی آسان نہیں ہوتی جتنا آسان سمجھ کر ہم اسے جی رہے ہوتے ہیں۔

میں نہیں جانتی یہ سب کب ہوا، کیسے ہوا، کیوں ہوا..... یا شاید میں نے حالات کے دھارے میں بہتے ہوئے اپنی بصارت سلب کر لی تھی۔ وقت کا سیلاب تھا جس کا کام گزرنا تھا سو گزر جائے گا۔

اتنا کہہ کر خود کو ڈھارس دی..... میرے گھر کا وہ تقدس بھرا ماحول..... آپا کے لبادے میں اپنی ملازمہ کو اپنی سوتن بنتے دیکھنا۔ اپنے ہی ہاتھوں سے پلتے سنپولیے کو ناگن بن کر ڈستے دیکھنا..... نہ جانے کہاں تھا میرا قصور..... میں چاہتے ہوئے بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

میں ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو حالات کے جبر و ستم کو گلے لگا کر عرصہ دراز تک صفِ ماتم بچھائے رہتی ہیں..... میں نے خود کو ذہنی تناؤ سے بچانے کے لیے کاموں کے انبار تلے دفنا دیا۔ درد کی بہت سی صورتوں سے شناسائی نے مجھے اپنے غم کو وقت کی گزرتی ٹرین کی کھڑکی میں سے بھاگتے منظر کی طرح دھندلا دیا تھا۔ لیکن جب کبھی ماضی کی گرد صاف ہوتی تو زخم پھر سے ہرے ہونے لگتے۔ بچے الگ سے حواس باختہ تھے۔ ماں سے قدرے مانوس ہونے کے باوجود انہیں اس چڑیل ملازمہ اور بے وفا باپ کی انسیت و محبت کی یاد کے دورے پڑتے تو آدھی رات کو جاگ، جاگ کر ان کے جذبات کو ٹھنڈا کرتے رات گزر جاتی۔

ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ اپنی اس نام نہاد آپا کے پلو سے بندھے میرے شوہرِ نامدار کو طلاق کی فکر ستانے لگی۔

میں ایک بار پھر گیلی لکڑی کی طرح سلگنے لگی۔

حسد و رشک کے جذبات تھے یا اپنی اس بے قدری کا ملال..... میں نے بچوں کو باپ سے ملنے تک نہ دیا..... یہ بات یہاں ختم نہ ہوئی۔ وہ پدرانہ شفقت لیے عدالت جا پہنچا..... اُدھر میڈیا میرے کیریئر کے پرخچے اڑانے کے لیے بے چین بیٹھا تھا..... وہی میڈیا جسے میری ہی خبروں نے بلندی پر پہنچایا تھا اور اب وہی مجھے بلندی سے پھینکنے کے درپے تھا۔ پھونک، پھونک کر چلنے کے باوجود بالآخر یہ خبر لیک ہو گئی..... اور تب مجھے اندازہ ہوا چرب زبان میڈیا کے نمائندے شکم سیری کے لیے کیسے، کیسے دال نما خبر کو تڑکا لگا کر پیش کرتے ہیں۔ اور اس مسالا گردی کی بابت مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔

اس سب سے جیسے تیسے نمٹ کر میں نے اپنی تازہ ترین انٹرنیشنل رپورٹ کی تیاری میں سر کھپانا مناسب سمجھا۔ میڈیا کو مطمئن کرنا بس وقت اور صلاحیتوں کی بربادی تھی۔

اس دن میں آفس سے گھر آنے کے بعد شام کو لیپ ٹاپ پر رپورٹ لکھ رہی تھی کہ جب ملازم نے آ کر

ایک خاکی لفافہ مجھے تھمایا۔

خاک اور خاکی رنگ مجھے زہر لگتے ہیں۔ مجھے خاکی رنگ سے بلا کی نفرت تھی۔ بچپن میں قرضوں کے بوجھ سے دیوالیہ ہوتے بابا کو عدالت کی طرف سے نوٹس ملا تھا۔ گھر کو گروی رکھنے کا آرڈر ملا تھا..... خاکی لفافہ پکڑے دل پر ہاتھ رکھ کر دُہرے ہوتے بابا کے چہرے پر رقم وہ شکستگی کا درد..... ہارے ہوئے انسان کا کرب میں نے بہت نزدیک سے دیکھا تھا۔ تب سے مجھے خاکی رنگ سے خوف آتا تھا۔

موت کا پیامبر وہ خاکی رنگ..... اب میرے لیے ایک نئے صدمے کا سندیسہ بن کر آیا تھا۔

دل یکا یک وحشت سے بھر گیا تھا۔ جیسے خاکی رنگ کھلتے ہی زندگی جیتے جی خاک میں مل جائے گی اور پھر کھلتے ہی زندگی واقعی خاک بن کر اڑنے لگی، آنکھوں میں گرد چبھنے لگی۔ سیاہ بختی کے سیاہ لفظوں کے چہرے اس دھندلاہٹ میں گم ہوتے چلے گئے۔ زمیں جیسے ڈولنے لگی۔ قدم، قدم کامیابیوں کے سنگ میل طے کرتے، کرتے جس بلندی پر میں کھڑی تھی۔ یک لخت قدم ڈگمگا جائیں اور وجود پستی میں گرتا چلا جائے تو شاید ایسا ہی درد ہوتا ہے۔ بلندی سے گرنے والوں کے درد کا پیمانہ بھی خاصا بلند ہوتا ہے۔

سارہ ریاض کا نام سمٹ گیا تھا۔ ان گنت ناموں کے بیچ سارہ ریاض اب صرف سارہ رہ گئی تھی۔ اس بلندی نے مجھ سے بہت خراج مانگا تھا۔ محبتوں کی زمین چھینی، ازدواجی زندگی کا سکون چھینا اور..... اور سارہ سے ریاض چھین لیا۔

روح کو قلب سے جدا کر کے
زمانہ خوش ہے الوداع کر کے

میری کہانی بہت پرانی تھی اسے زبردستی سانحے کا رنگ دے کر میں جتنا بھی رولوں اس کے رنگ میری زیست کے پنوں سے مٹ نہیں سکتے تھے بار، بار دُہرائی جانے والی کہانیاں جب خود پر بیتتی ہیں تو بالکل نئی لگتی ہیں۔ مجھے بھی شوہر کی بے وفائی اور بے اعتنائی والی

کہانیاں اکتا دیتی تھیں..... کیونکہ مجھے نئی کہانیوں کی جستجو تھی۔

لیکن جب خود سمندر کی لہروں میں پھنسی تو ڈوبنے کے ڈر اور خوف سے آشنائی ہوئی۔

شاید یہ ان کہانیوں کی بددعا تھی..... جنہیں میں ردی کی نذر کر دیا کرتی تھی..... ہاں میرے الفاظ، میرے جملے اب میرے لیے اجنبی تھے..... میرے سامنے بے شمار گالے، کالم، کہانیاں، فلم کی طرح چل رہی تھیں۔

14 جون کی 2015ء

''کیسا لگتا ہے جب اللہ کی زمین آپ سے چھن جائے اشرف المخلوقات کا تاج اتر جائے۔ انسانیت، حیوانیت میں بدل جائے..... ؟ جانوروں کو لگژری لائف..... انسانوں سے بڑھ کر حقوق دینے والی عالمی تنظیمیں ان کا سوشل ورک ان کو ہمدرد نہیں، بے درد ظاہر کرتے ہیں۔ جانوروں کے استحصال پر چیخ اٹھنے والے نام نہاد انسانیت کے پیروکار..... کیسے روھنگیا کے جیتے جاگتے انسانوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟ یہ صرف روہنگیا کے نہیں پوری دنیا کے لوگوں کا امتحان ہے۔ اللہ..... اپنے ''کن'' کو روکے..... اپنی ہنستی بستی زندگی گزارنے والی مخلوق کو دیکھ رہا ہے۔

کب وہ اشک بار ہوں، کب ان میں انسانیت کی روح تڑپ اٹھے۔ کب وہ ان کو آبی عذاب سے بچائیں گے۔

وہ سب دیکھ رہا ہے۔''

16 جون..... 2015ء

''انسانیت جب درندگی کی قبا اوڑھ لے تو نسل انسانی یوں ہی سسک، سسک کر مرتی ہے۔ وہ دنیا کے سب سے بدنصیب لوگ ہیں، سب سے استحصال زدہ قوم۔ ہم اپنی محرومیوں اور خودترسی سے قطع نظر اگر ایک بار خود کو بلندی سے نیچے دیکھ لیں تو اندازہ ہو کہ ہمارے نیچے کتنا درد ہے، کتنا کرب ہے۔ دکھوں کا ایک دوزخ ہے بھڑکتی آگ ہے۔

لیکن پھر بھی ہمیں خودترسی کے مرض اور احساس سے عاری وجود کا زعم ہے تو خدارا..... ہم خود کو انسانیت کے مفہوم سے نہ جوڑیں۔''

آج کی اس پُرزور تقریر نے میرے اعصاب کو بے حد تھکا دیا تھا..... ایسا لگا وہ روہنگیا پر کہے لفظ نہیں میرے نصیب پہ کیے گئے احتجاج کا حوالہ تھا۔

میں بہت روئی تھی سوجی آنکھوں میں چبھن کا احساس ہو رہا تھا۔ منتشر ذہن..... بس اپنی ذات کی بے ثباتی میں الجھا ہوا تھا۔ میرا درد بھی انہی مظلوموں کے درد جیسا تھا۔ میری بظاہر لگژری..... دنیا کی ہر آسائش سے بھرپور زندگی

وقت کے بے ہنگم سمندر پر ڈولتی کشتی جیسی تھی۔

ریاض بھی تو وقت کے سفاک حاکم کی طرح تھا۔ جس نے میری ذات کو بکھیر کے رکھ دیا۔ میرے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ ڈالا۔ خالی گھر کا آسیب اور طلاق یافتہ عورت کا کلنک۔ مجھے زندگی کی قبر میں دفنا دیا گیا۔

میں تھک گئی تھی۔ بہت تھک گئی تھی۔

میری مصروفیات اور ترجیحات کو مدِنظر رکھ کر عدالت نے میرے بچوں رمشہ اور عمیر کو باپ کے حوالے کرنے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ عدالت کے لیے یہ مؤقف کافی تھا کہ میں نے ہمیشہ شوہر اور بچوں کی نسبت اپنے کیریئر کو مقدم رکھا۔

اور پھر میری ڈوبتی امید کے تابوت پر آخری کیل بچوں کی باپ سے محبت وانسیت نے ٹھونک دی۔

میری آخری امید بھی جیسے دم توڑ گئی تھی۔

ہاں یہ سچ ہے میں نے واقعی اپنے کیریئر کو دوام بخشنے کے لیے اپنی ازدواجی زندگی کو تیاگ دیا۔ میرے بچے اور میرا محبوب شوہر ریاض میری ملازمہ کی محبتوں، خاطر داری کے عوض ان کے ہو گئے تھے..... اور میرے پاس ان سب کے بدلے میرا شاندار کیریئر تھا۔ سودا مہنگا نہیں تھا۔ لیکن ہر سودے ہر کسی کو راس نہیں آتے۔

شوہر کے بعد بچوں کی جدائی نے میری زندگی کی ہر چکا چوند کو مدھم کر دیا تھا۔ میں نے کہا تھا ناں خودترسی

اور نارسوائیوں کے عذاب جب نا امیدی اوڑھ لیں تو زندگی قبر بن جاتی ہے۔ ہاں ایک حبس زدہ قبر.....

☆☆☆

چلچلاتی دھوپ میں کرب سے سلگتے وجود کو لیے میں بے سمت راستوں پر گاڑی دوڑاتی رہی، ٹریفک کے اژدھام کو چیرتی فراٹے بھرتی گاڑیوں کے بیچ ٹریفک سگنل توڑتی..... لاشعوری طور پر میرا ذہن زندگی سے بہت دور جانے کی سوچ رہا تھا۔ وقت کے..... بے کراں سمندر سے وحشت زدہ ہوکر زندگی کی لہروں سے کنارہ ملنے کی امید کے ساتھ ذات کے شوریدہ لمحات سے نکلنے کے لیے۔

سڑک کے بیچ میں دوڑتی گاڑی کنارے لگے درختوں کی جانب تیزی سے مڑی یا شاید شعوری موڑ لی گئی قریب سے قریب تر ہوتے فاصلے نے مجھے آنکھیں بند ہونے پر مجبور کیا لیکن میں نے آنکھیں بند نہ کیں اور تب میں نے اچانک زور سے کسی کو اپنی گاڑی سے ٹکراتے دیکھا۔ اور جبھی پاؤں بریک پر گیا تھا۔

اپنی پریشانیوں اور خودکشی کی کوشش سے قطع نظر مجھے اس ٹکرا جانے والی بچی کا خیال آیا۔ میں نے حواس باختہ ہوکر گاڑی سے نکل کر دیکھا۔ میری رمشہ جیسی وہ ننھی کلی میری گاڑی کی زد میں آئی تھی۔ اس کا بھل، بھل کرتا خون اور میری جان ایک ساتھ نکل رہی تھی.....

فوری طبی امداد ملنے پر وہ بچ گئی تھی۔

لیکن اس واقعے نے مجھے اندر تک ہلا دیا تھا..... اگر خدانخواستہ اس دن وہ بھکاری بچی میری موت کے راستے میں آتی اور مر جاتی تو میں خود کے لیے ناسور بن جاتی۔

وہ بچی بھکاری تھی، لاوارث..... سے بھی لاوارث..... وہ بچے فرشتے ہوتے ہیں جن کے کوئی رشتے نہیں ہوتے۔

اس گمبھیر واقعے نے مجھے ہلا ڈالا تھا۔

اس دن نے میری آنکھوں میں پڑتی ہر گرد کو صاف کر دیا۔

میری زندگی یک لخت بدل گئی۔ میں نے سب چھوڑ چھاڑ کر اپنی این جی او بنائی، پسماندگی کے محاذ پر پہ تنہا لڑی، اپنی زندگی ان غریب طبقے پہ صرف کر دی۔

میں جو خود کو ریاض اور بچوں کے چھوڑ جانے پر تنہائی کے خوف سے موت کو گلے لگا رہی تھی اب ہزاروں انسانوں کی گھٹتی سانسوں کو نئی زندگی دینے کا باعث بنی۔

آج میری این جی او کو میری رمشہ اور عمیر کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ میری ڈھلتی عمر اور کمزور وجود کی آخری سانسیں پوری ہو رہی ہیں۔ وینٹی لیٹر پر پڑا میرا وجود اب آسودہ ہے۔ ایک کامیاب زندگی کا اختتام جس کی مجھے خواہش تھی۔

چالیس سال گزر گئے تھے طوفان گزر جانے کے بعد کے سکون میں گزرے چالیس سال.....

اب جب زندگی کی بہاروں کے گزرنے کے بعد طبعی موت ہاتھ باندھے کھڑی ہے تو زندگی کسی شفاف آئینے کی صورت مسکرا رہی ہے، عزت ہی عزت محبت ہی محبت کا بے کراں پُرسکون سمندر ہے..... میری بے چین روح کو جیسے کنارہ مل گیا۔

میرے بچے مجھ پر آج فخر کرتے ہیں۔

ریاض میری دل سے عزت کرتے ہیں جھکی نظروں کی پشیمانی ساتھ، ساتھ ہے..... کتنا کچھ تھا ان کی جھکی نظروں میں۔

بس.....

مجھے زندگی سے گلہ رہا نہ رشتوں سے۔

''آج شاندار ہو تو ماضی کی تلخیوں کو کھرچنے کی بھلا کیا تک؟ شاید یہی میری منزل تھی۔ بے سمت سفر کا انت۔ ایک منزل کا سنگ میل۔ بس یہی تو میرا حاصل زندگی ہے۔ اور جب منزل مل جائے تو سفر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور ہر سفر ہر کہانی کا اختتامیہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی خوشگوار اختتام کے ساتھ، طربیہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے میرا حاصل زندگی کا یہ سنہرا باب.....!''

❁ ❁ ❁

ناولٹ

انمول رشتے

افشین نعیم

''پرسوں شام کی فلائٹ سے شہنیلا وقار اپنے برخوردار ابتسام وقار کے ساتھ پاکستان پہنچی ہیں اور مہرن آپا کے گھر ٹھہری ہیں۔'' رفاقت بیگ نے یہ اطلاع گھر میں داخل ہوتے ہی پانی پینے کے فوراً بعد نشر کی۔

اُن کا خیال تھا کہ اس خبر سے گھر میں ایک کھلبلی سی مچ جائے گی۔ بتول آپا، بابو، گڑیا اور مینا سارے کام چھوڑ چھاڑ کر بھاگ، بھاگ کر آ کر ان کے گرد اکھٹے ہو جائیں گے۔

''اچھا.....؟ کیسے خبر ملی.....؟ تم سے ملاقات ہوئی۔ اور کچھ بتاؤ ناں.....'' وغیرہ..... وغیرہ..... جیسے سوالات کر کے ان کا سر کھالیا جائے گا۔ پر..... گھر والوں کا ردِعمل خاصا مایوس کن رہا۔

بتول آپا صحن میں لگے ہینڈ پمپ سے پانی لے کر باورچی خانے کی طرف بڑھتی گئیں۔ جاتے، جاتے سر بھی اونہہ والے انداز میں جھٹکا تھا یا شاید ان کا وہم ہو، رفاقت ٹھیک سے سمجھ نہیں پائے۔

گڑیا نے بابو کے کپڑوں پر جما، جما کر استری کرتے ہوئے اس خبر کو ایسے سنا تھا جیسے انسان موسم کا حال سنتا ہے۔

بابو نے موٹر سائیکل دھوتے، دھوتے پانی کا مگ زور سے ٹائر کے اوپر لگی کیچڑ پر ڈال کر پوری قوت سے پہیا گھمایا اور ماموں کی طرف دیکھ کر سر ہلایا گویا کہہ رہا ہو..... پھر کیا کریں.....؟

اور مینا..... اس نے تو حد ہی کر دی۔ روٹی کے ٹکڑوں کی آخری مٹھی مرغیوں کی طرف اچھالتی وہ ماموں کی طرف مڑی۔

''کون ہیں یہ شہنیلا وقار.....؟''

رفاقت بیگ کے منہ میں گویا کڑوے بادام کا ذائقہ گھل گیا۔ اب کیا بتائیں وہ کہ کون ہیں یہ ''شہنیلا وقار.....'' مزید موڈ خراب ہوا۔

''ہاہ.....'' بابو کے حلق سے ایک ٹھنڈی سی سانس خارج ہوئی جو اتنی ٹھنڈی تھی کہ گڑیا کو اگست کے جلس زدہ گرم ترین دن میں ٹھنڈی ٹھار سی کپکپی لگی اور اتنی اونچی تھی کہ ٹھیک ٹھاک فاصلے پر بیٹھے رفاقت بیگ تک بہ آسانی پہنچ گئی۔

''ناکام محبت کی ادھوری داستان.....'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا تھا یا گنگنایا تھا، کسی کو اندازہ نہیں ہو سکا۔ تب ہی رفاقت ماموں کے کان کھڑے ہوئے۔

''کیا بڑبڑ کی ہے تو نے بابو.....؟'' جب بولے تو لہجہ خاصا ناراض تھا۔

''کچھ نہیں ماموں دو کا پہاڑہ پڑھ کر دیکھ رہا تھا کہ کہیں بھول تو نہیں گیا۔'' بابو جھٹ سے بولا۔

گڑیا نے اپنی ہنسی دبائی۔

مینا کو اپنے سوال کا جواب چاہیے تھا۔

تب ہی باورچی خانے سے بتول کی آواز سنائی دی۔

''رفو..... شربت پیے گا یا چائے بناؤں.....؟''

''رہنے دو آپا..... شربت کے نام پر پھیکا گرم پانی اور چائے کے نام پر کاڑھے جیسا جوشاندہ..... کچھ نہیں چاہیے مجھے۔'' منہ کے زاویے آخری حد تک بگڑ گئے۔

''غصہ پئیں گے اور غم کھائیں گے۔'' بابو کی زبان میں دوبارہ کھجلی ہوئی۔ بتول باورچی خانے سے باہر نکل آئی تھیں۔

''بابو.....'' انہوں نے بیٹے کو پکارا..... لہجے میں چھپی تنبیہہ کو بابو بخوبی سمجھ گیا فوراً کان پکڑ لیے۔

''اس کے بجائے زبان پکڑ لو تو زیادہ بہتر ہے۔'' گڑیا نے بڑے وقت پر کمال کا مشورہ دیا تھا۔

''کون سی زبان.....؟'' بابو نے جھٹ سے منہ گڑیا کی طرف کیا۔

''بہت سی زبانیں ہیں کیا.....؟'' اس نے ترنت سوال کیا۔

''ہاں.....'' اس نے آنکھیں زور سے میچ کر کھولیں۔

''پانچ زبانیں بیک وقت موجود ہیں۔'' اس نے آنکھوں کے ڈیلے گھما، گھما کر ایک، ایک کو دیکھ کر گڑیا کو جواب دیا۔

''وہ زبان پکڑو جو سب سے زیادہ چلتی ہے۔'' آخر کار گڑیا زچ ہو ہی گئی۔

''توبہ، توبہ..... میرے اللہ..... معافی مانگو فوراً..... میں اور اپنی ماں کی زبان پکڑوں..... نہ..... مر کر بھی نہیں.....'' اس نے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ گڑیا کی ہنسی، بتول کی گھوریاں اور رفاقت کی تیوریاں سبھی کچھ بے ساختہ تھا۔

اور ہاں..... وہ مینا کا سوال.....

وہ تو وہیں کا وہیں رہا.....

☆☆☆

مین روڈ سے دو گلیاں اندر کر کے بڑے سے خالی گراؤنڈ کے عین سامنے بنی گھروں کی یہ قطار دور سے ہی دیکھنے والوں کی توجہ کھینچتی تھی۔ پانچ گھر تھے اس قطار میں بالکل ایک جیسے..... اگر کوئی معمولی سا فرق تھا بھی تو محض ایسا ہی تھا جیسے ایک ماں کے ایک ساتھ پیدا ہونے والے پانچ جڑواں بچوں میں.....

اچھے وقتوں میں سستی زمین خرید کر شاداب بیگ نے یہ پانچ گھر اپنے پانچوں بیٹوں کے لیے تعمیر کروائے تھے۔ کوٹھیوں کے سے انداز میں بنے سات، سات مرلے کے یہ گھر آج بھی اِک شانِ بے نیازی سے سر اٹھائے دیکھتے محسوس ہوتے تھے۔ ان میں سب سے دلکش اور خوب صورت گھر تھا عین بیچ والا..... سلطان بیگ کا گھر..... جن کو اس گھر میں رہنا نصیب ہی نہیں ہوا۔

بوگن ویلیا کی بیلوں سے ڈھکا یہ گھر مکینوں کی خوش ذوقی کا آئینہ دار تھا۔ سفید رنگ کے آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی کار پورچ، گیلری، کمروں کے درمیانی راستے سے لے کر گھر کے پچھواڑے تک رنگ برنگے گملوں کا ایک سلسلہ سا تھا۔

گھر والوں کا بس چلتا تو کمروں کے اندر اور باتھ روم تک میں گملے رکھ دیے جاتے۔ خیر..... اب جہاں بس نہ چلے وہاں کیا، کیا جا سکتا ہے۔ سو کار پورچ کے اندر سے ہی دائیں ہاتھ کو سیڑھیاں چھت تک جاتی تھیں۔ کل سترہ سیڑھیاں تھیں، ہر سیڑھی پر ایک گملا یوں سترہ گملے تو یہیں پورے ہو گئے۔ گن کر سترہ کا عدد پورا کرنے کے بعد جوں ہی چھت پر پہنچو گویا ایک پودوں کی نرسری کا سا منظر تھا۔"

"گرین ہی گرین ویری مچ گرین....." آنے والی نے ہونٹ گول کر کے ستائشی انداز میں اطراف کا جائزہ لیا۔

"ویری بیوٹی فل گرین کلر....." وہ دوبارہ بولیں۔

"یہ انگریزی میں پودوں کو کلر (colour) کہتے ہیں کیا.....؟ ابرام نے عائشہ کے کان سے منہ جوڑ کر پوچھا۔

"نہیں، plants..... کہتے ہیں۔" عائشہ نے جوابی سرگوشی کی۔

"تو پھر یہ گرین کلر کیوں کہہ رہی ہیں بار، بار..... ان کو پھول پودے نظر نہیں آ رہے کیا؟"

"نظر تو آ ہی رہے ہوں گے پھول، پودوں کی انگلش نہیں آتی ہوگی۔" عائشہ نے آہستہ سے بھائی کے کان میں کہا۔

"یہ، آپ دونوں سلولی، سلولی (slowly slowly) کیا ٹاک (take) کر رہے ہیں.....؟" نو وارد خاتون نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اچانک ہی ان دونوں کی سرگوشیاں (notice) نوٹس کیں تو بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے پوچھا۔

دونوں ہی ایک دم گڑبڑا سے گئے۔

"نہیں، کچھ نہیں....." ابرام ہکلایا۔

"وہ، اصل میں ہم ناں آپ کی انگلش کی تعریف کر رہے تھے۔" عائشہ نے جلدی سے بات سنبھالی۔

"جی، جی..... یہ عائشہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ دیکھو ماشاء اللہ کس قدر رواں انگلش میں بات کر رہی ہیں۔" ابرام نے بہن کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اوہ..... مائی گاڈ۔" انہوں نے ایک ادا سے بال پیچھے جھٹکتے ہوئے ایک مصنوعی سا قہقہہ لگایا۔

"اصل میں ناں....." کچھ شرماتے ہوئے انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"آج کل میں انگلش لینگویج کورس کر رہی ہوں۔"

"اچھا.....! تب ہی۔" ابرام اور عائشہ نے سر ہلایا۔

"وہ اصل میں ناں..... آں....." کچھ دیر رک کر سوچا۔

"ایکچوئلی..... آپ کے بھائی abrood بلا رہے ہیں ناں مجھے..... تو میں نے سوچا جانے سے پہلے، پہلے انگلش سیکھ لوں۔"

"ہمارے بھائی.....؟" عائشہ نے زیرِ لب دُہرایا۔

"سکندر بھائی ان کو باہر کیوں بلا رہے ہیں۔" اس نے ابرام سے استفسار کیا۔ ابرام محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"نہیں، نہیں ایکچوئلی....." وہ خاصا زور دے کر بولیں۔

''میں اپنے husband کی بات کر رہی ہوں۔''

''یہ، اپنے ہزبینڈ (husband) کو ہمارا بھائی کہہ رہی ہیں؟'' عائشہ نے حیران سوالیہ نگاہوں سے ابرام کو دیکھا۔

''بچو! نیچے آکر چائے پی لو.....'' تب ہی قیصرہ کی آواز ان لوگوں کی سماعت سے ٹکرائی۔

بات چیت وہیں ختم کر کے وہ لوگ نیچے آگئے۔ قیصرہ نے چائے کے ساتھ سموسے بھی تل رکھے تھے۔

''ہاں۔۔تو بھئی کیسا لگا تمہیں ہمارا غریب خانہ.....'' قیصرہ نے چائے کا کپ اپنی پڑوسن کی طرف کھسکاتے ہوئے پوچھا۔

''سچ بتاؤں آپی، جتنا lovely آپ کا گھر باہر سے لگتا تھا ناں.....اس سے کہیں زیادہ.....اندر سے لولی ہے۔' ہم تو جب یہ گھر (ہاتھ سے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا) دیکھنے آئے تھے ناں تب ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ neighbourhood میں سب سے پہلے اسی گھر میں کھانا لے کر جانا ہے۔''

ابرام اور عائشہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اپنی ہنسی دبائی۔

''ویسے ہم آپ کی انگلش سے بڑے متاثر ہوئے ہیں، کہاں سے کر رہی ہیں آپ انگلش لینگویج کورس؟'' ابرام نے دل ہی دل میں ہنستے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے انہیں دیکھ کر سوال کیا۔

''وہ جو ہمارا اولڈ ہوم تھا ناں اس کے برابر میں ایک سینٹر ہے وہاں سے۔'' عفیفہ نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے بتایا۔

اور عائشہ کی سوئی تو "old home" پر ہی اٹک گئی تھی۔

"old home" اس نے حیرت سے دُہرایا۔

''جی.....پرانا گھرانا.....جہاں سے ہم شفٹ ہو کر یہاں آئے ہیں۔'' عفیفہ نے وضاحت کی۔

عائشہ نے سمجھ جانے کے سے انداز میں سر ہلایا اور ابرام نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

''ویسے ایک بات بولوں آپی! اگر آپ برا نہ منائیں۔'' انہوں نے چائے کا آخری سپ لیتے ہوئے قیصرہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کہو.....'' قیصرہ نے اچنبھے سے ان کی طرف دیکھا۔

''کل آپ کے گھر سے بریانی کی بڑی ٹیسٹی خوشبو آرہی تھی۔''

''ٹیسٹی خوشبو.....!'' ابرام نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''ہاں بھئی.....مزیدار'' (بہت ہی خراب انگریزی ہے ان لوگوں کی تو.....توبہ.....) ان کے تاثرات یہی بتا رہے تھے۔ خیر انہوں نے بات جاری رکھی۔

''پورا دن میں ویٹ کرتی رہی بریانی کا۔ پھر دال ہی کھالی آخر میں.....انسان کوئی اچھی چیز کک کرے تو neighbourhood کا خیال تو کرنا چاہیے ناں.....'' وہ بات مکمل کر کے کھڑی ہوگئی تھیں۔

قیصرہ تو بس حیران ہی رہ گئیں ان کی بات پر.....لو، بھلا ایسے دھڑلے سے کون مانگتا ہے۔

ان کے جانے کے بعد قیصرہ دروازہ بند کر کے لوٹیں تو عائشہ اور ابرام ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

''اب تم دونوں کو کیا ہوا؟'' وہ ہاتھ کمر پر رکھ کر دونوں کو دیکھنے لگیں۔

''انگریزی ہوگئی ہے ہم دونوں کو۔'' عائشہ پیٹ پکڑ کر بولی۔

''ویری مچ گرین.....او میرے خدا۔'' ابرام کی آنکھوں میں پانی آگیا تھا ہنستے، ہنستے۔

''ٹیسٹی خوشبو.....'' عائشہ نے ٹکڑا لگایا۔

''اولڈ ہوم.....'' ابرام کو یاد آیا۔

اور قیصرہ.....وہ تو بس حیرت کا بت بنی دونوں بچوں کو دیکھتی رہیں۔

☆☆☆

رفاقت کے شاگرد آچکے تھے.....وہ گول کمرے میں ان کو لے کر بیٹھے تھے۔ بتول کمرے میں آرام

کرنے چلی گئیں۔ بابو، موٹر سائیکل لے کر کسی کام سے نکلا تھا۔ گڑیا اپنا کڑھائی والا فریم لیے باہر تخت پر بیٹھی پھول کاڑھ رہی تھی۔ جب سامنے نیم کے پیڑ پر بیٹھے کوّے .... نے زور، زور سے کائیں، کائیں شروع کر دی۔

مینا نے پتھر اٹھا کر زور سے کوّے کو مارا۔ پتھر کوّے کو لگنے کے بجائے نیم کی شاخ پر جا لگا۔ کوا پھر سے اڑ گیا۔ پیچھے شاخ ہلتی رہ گئی۔

''کیوں اڑا دیا کوّے کو.....'' گڑیا نے سوئی فریم میں لگے کپڑے سے گزار کر بہن کو دیکھا۔

''یوں ہی شور کر رہا تھا۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ اڑا دیا بس.....'' وہ تخت پر بیٹھ کر پاؤں جھلاتے ہوئے بولی۔

گڑیا نے دانت سے دھاگا توڑتے بہن کا چہرہ دیکھا۔ گورے چٹے سرخ و سفید چہرے پر بڑی، بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، لانبی اور اوپر کی طرف مڑی ہوئی پلکیں..... پشت پر جھولتی گھنے سیاہ بالوں کی چوٹی..... اس نے فٹافٹ بہن کے چہرے سے نظر ہٹائی مبادا اس کی اپنی ہی نظر لگ جائے۔

''گڑیا!'' مینا کی آواز پر گڑیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہوں.....''

''بتاؤ ناں یہ شہنیلا وقار کون ہیں اور رفو ماموں کا ان سے کیا تعلق ہے؟''

''اللہ نہ کرے..... جو رفو ماموں کا ان سے کوئی تعلق ہو۔'' گڑیا جھٹ سے بولی۔

''تو پھر بابو بھیا اس دن رفو ماموں سے اتنی معنی خیز قسم کی گفتگو کیوں..... کر رہے تھے۔ جیسے ان کو چھیڑ رہے ہوں۔''

''ہوں.....'' گڑیا نے ہنکارا بھرا..... خاموشی کا ایک مختصر وقفہ دونوں بہنوں کے درمیان آیا۔

''کوئی بارہ برس قبل جب ہم یہاں اس گھر میں شفٹ ہوئے تھے تو میں نے اور بابو نے امی اور ماموں کی کچھ باتیں سنی تھیں۔ تب میں دس برس کی اور بابو بارہ برس کا تھا۔''

''مطلب میں چار برس کی تھی تب.....؟'' مینا نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''ہاں.....'' گڑیا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ان باتوں سے ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ شہنیلا وقار نامی جو خاتون ہیں ماموں سے غالباً ان کی شادی ہونا قرار پائی تھی پھر جانے کیا ہوا..... ان کی شادی کہیں اور ہو گئی اور بیچارے ماموں نے جوگ ہی لے لیا.....''

''اور جوگی بن کر گلے میں مالائیں ڈال کر نگر، نگر گھومنے لگے۔'' بھاری مردانہ آواز پر دونوں کرنٹ کھا کر پلٹیں۔

رفو ماموں جانے کب سے ان لوگوں کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔

مینا، انگلیاں چٹخاتے ہوئے کھڑی ہو گئی..... گڑیا اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی۔ تب ہی موٹر بائیک رکنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ ہی دیر میں بابو چابی جھلاتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''اوہ..... گول میز کانفرنس ہو رہی ہے بغیر میز کے۔'' بابو نے ان تینوں کے سنجیدہ چہروں پر غور کیے بغیر کہا۔

''نہیں، چیف گیسٹ کا انتظار ہو رہا تھا کہ وہ آئیں تو کانفرنس شروع کی جائے۔'' رفو ماموں، بابو کو دیکھتے ہوئے بولے۔

اب بابو کو کچھ، کچھ اندازہ ہونا شروع ہوا تھا۔ صورتِ حال کی نزاکت کا۔

''کیا ہوا..... خیریت ہے؟'' اس نے تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی.....! بالکل خیریت ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔

''ایک معما تو حل ہوا آخر.....'' وہ تخت پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ گڑیا نے پاؤں سمیٹے۔

''کون سا معما حل ہو گیا؟'' بتول نے کمرے سے نکلتے ہوئے رفو کی بات سنی تو پوچھ بیٹھیں۔

''یہ آپ کے بچوں کو چھپ، چھپ کر باتیں سننے کی عادت ہے۔ کچھ آدھی پونی سی باتیں سن کر اپنی مرضی کے رنگ بھر کر ایک دوسرے سے ڈسکس کرتے ہیں۔''

رفو ماموں کی بات پر گڑیا اور مینا نے نظریں چرائیں۔ جبکہ بابو کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔

"ہم نے کون سی خفیہ باتیں سنی ہیں آپ لوگوں کی؟"

"شہیلا اور ہماری شادی نہ ہونے کی۔" رفاقت نے جھٹ سے بتا دیا۔

"پہلی بات، وہ باتیں ہم نے چھپ کر نہیں سنی تھیں۔ آپ لوگ ہمیں سوتا سمجھ کر وہ سب ہمارے سامنے دُہرا رہے تھے۔ دوسری بات، اب ہم لوگ بچے نہیں رہے، بڑے ہو گئے ہیں۔ لہٰذا مکمل داستان ہمیں خود ہی سنا دیجیے تاکہ ہمیں اپنی مرضی کی رنگ آمیزی نہ کرنی پڑے۔"

بابو کی بات پر رفاقت اور بتول نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گویا نظروں ہی نظروں میں طے کر رہے ہوں، بتانا چاہیے یا نہیں..... پھر رفاقت کسی نتیجے پر پہنچ کر گویا ہوئے۔

باقی تمام لوگ ہمہ تن گوش ہوئے۔

شاداب بیگ نے عمر کا کچھ عرصہ ملک سے باہر گزارہ..... گو مزدور آدمی تھے۔ پھر بھی اتنا جوڑ لیا کہ عزت سے عمر گزر جائے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔

اللہ نے پانچ بیٹے دیے۔ سب سے بڑے غفران بیگ پھر ارسلان بیگ، اس کے بعد شاہ نواز بیگ، چوتھے نمبر پر فیضان بیگ اور سب سے آخر میں سلطان بیگ۔ بیٹی کی بہت خواہش تھی مگر مقدر میں نہیں تھا سو رب کی رضا میں راضی رہے۔

محبوبہ خاتون، شاداب کی خالہ زاد اور محبوب بیوی، صابر، شاکر، قناعت پسند خاتون تھیں۔ شوہر کا پردیس میں جا کر نوکری کرنا مجبوری سہی پر وہ ان کے ساتھ کی متمنی تھیں چاہے روکھی سوکھی کھا کر ہی گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ لڑکے باپ کی عدم موجودگی کے باعث کو کسی بری صحبت کا شکار تو نہ ہوئے پر پڑھائی میں کامیابی کے کوئی خاص جھنڈے نہ گاڑ سکے۔

غفران، انٹر کر کے سوئی گیس کے محکمے میں بھرتی ہوئے۔ چار پیسے کمانے شروع کیے تو شادی کے لیے ماں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ بیٹے کی ضد سے مجبور ہو کر محبوبہ، محلے کی لڑکی، رقیہ جو کہ غفران کی پسند تھیں کو بہو بنا کر لے آئیں..... زبان دراز اور جھگڑالو رقیہ کو ساس نے اپنی نیک فطرت کے باعث جیسے تیسے برداشت کر لیا۔ پر ارسلان اور شاہ نواز کی بیویوں کے آنے کے بعد تو جیسے بات، بات پر تو، تکار معمول کا حصہ بن گئی۔

گھر، ہر وقت خانہ جنگی کا سا منظر پیش کرنے لگا۔ بھائی، بھائی کے منہ کو آنے لگا۔

بس، یہیں تک تھی محبوبہ خاتون کی ہمت، میاں آئے تو چھٹی کاٹنے تھے پر محبوبہ کی ضد نے واپس نہ جانے دیا۔

ساری زندگی جو کچھ بچایا، اس سے کوئی کاروبار شروع کرنے کا ارادہ تھا مگر گھر کے حالات اور بیٹوں اور ان کی بیویوں کے آپس کے تعلقات دیکھتے ہوئے انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

اس کے بجائے شہر سے خاصے فاصلے پر قریب، قریب مضافات میں سات، سات مرلے کے پانچ پلاٹ لیے اور ان پر مکانات کی تعمیر کا کام شروع کروا دیا۔ باقی گزر اوقات کے لیے تین دکانیں لے کر کرایے پر اٹھا دیں۔

اب تک تین بیٹے شادی شدہ تھے۔ غفران کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑی بتول پھر ناصر، اس کے بعد ساحر اور سب سے چھوٹا رفاقت۔ ارسلان اور عافیہ کا ایک ہی بیٹا تھا ماجد..... شاہ نواز اور مہتاب اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ جب تک مکانات تعمیر ہوئے تب تک چھوٹے دو بھی گھر بار والے اور بال بچے دار ہو چکے تھے۔

کئی برس میں یہ مکانات تعمیر ہوئے اور جب جا کر رہنے بسنے کا مرحلہ آیا تو دو ناخوشگوار واقعات ایسے پیش آئے جنہوں نے دونوں میاں بیوی کو ہلا کر رکھ دیا۔

فیضان بیگ ان کی چوتھی اولاد، جس کی شادی بڑی چاہ سے محبوبہ نے اپنی بچپن کی سہیلی کی بیٹی سے کی تھی۔ وہ شادی کے دو برس بعد گھر سے بھاگ گئی۔ چکر

شادی سے پہلے کا تھا۔ شادی کے بعد بھی میاں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے سابقہ عاشق سے ملتی جلتی رہی..... ایک بیٹا ہوا جو پیدائش کے دو گھنٹے بعد مر گیا۔ اس واقعے نے فیضان اور اس کے ماں، باپ کو کہیں منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔

دوسرا حادثہ جو اس سے کہیں بڑھ کر تھا وہ تھا شاداب کے سب سے چھوٹے بیٹے سلطان بیگ کی اچانک موت تھا۔ کم عمر جوان بیوہ، تین چھوٹے، چھوٹے بچے..... دو برس کا سکندر اور چار ماہ کے جڑواں بچے عائشہ اور ابرام..... مانو جیسے زندگی ختم ہی ہوگئی۔

بہر حال وقت کا کام گزرنا ہے، سو گزرتا گیا۔ سب لڑکے اپنے بال بچوں سمیت اپنے، اپنے گھروں میں شفٹ ہوگئے۔

سلطان بیگ کے گھر میں قیصرہ بچوں سمیت منتقل ہوگئیں..... جب تک سسر زندہ رہے خبر گیری بھی کرتے رہے اور خرچہ پانی بھی دیتے رہے۔ خود شاداب بیگ اور محبوبہ، شاہ نواز کے ساتھ اس کے گھر چلے آئے کہ اس کی بیوی مہتاب، خاصی نرم خو، صلح جو اور اچھی فطرت کی لڑکی تھی۔ فیضان کی بیوی کے بعد ان کے لیے دوسری بار لڑکیاں دیکھنے کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک رات وہ گھر آئے اور باپ کے پاؤں پکڑ لیے۔

"ابا جی! خدا کے لیے میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ لوگوں کی باتیں میرا سینہ چھلنی کرتی ہیں۔ یہاں رہا تو یا پاگل ہو جاؤں گا یا خود کو مار ڈالوں گا۔ پیسوں کا بندوبست ہو جائے تو میں باہر چلا جاؤں۔"

شاداب اور محبوبہ، فیضان کو خود سے دور جانے نہیں دینا چاہتے تھے مگر مجبور ہوگئے۔ اس کے نام پر بنا گھر بیچ کر اسے رقم دے دی۔ فیضان بیگ انگلینڈ سدھارے۔

وقت کچھ اور آگے سرکا..... غفران بیگ کے بچوں کی شادی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بتول اپنے ماموں زاد سے بیاہی گئیں۔ ناصر اور ساحر کی شادیاں رقیہ نے غیر خاندان میں کیں۔ ارسلان بیگ اور عافیہ اپنے بیٹے ماجد کو لے کر دبئی چلے گئے۔ مکان کرایے پر لگا گئے۔

شاداب اور محبوبہ کبھی بیٹھتے تو زندگی کے خسارے شمار کرتے۔ اتنی اولادیں پیدا کر، پال پوس آخر میں ان کے ہاتھ کیا آیا۔

فیضان بیگ جو پاکستان سے منہ موڑ کر گئے تو برسوں شکل نہ دکھائی۔ ایک حادثہ انہیں پاکستان سے دور لے گیا تھا۔ پھر برسوں بعد ایک حادثہ انہیں پاکستان واپس آنے پر مجبور کر گیا۔

☆☆☆

"ابتسام! آخر تم سنجیدہ کیوں نہیں ہو جاتے شادی کے معاملے میں.....؟" ابتسام نے ٹیلی ویژن اسکرین سے نظر ہٹا کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

"کس کی شادی کے معاملے میں مام.....؟"

"تمہارے باپ کی شادی کی بات کر رہی ہوں۔" انہوں نے غصے سے کہتے ہوئے کشن ایک طرف اچھالا۔

"dont tell me دو شادیاں تو کر چکے ہیں وہ.....؟ اب مزید کتنی کروائیں گی آپ؟"

"تمہیں مزہ آتا ہے ناں ماں کو تنگ کر کے....." شہنیلا اچھی خاصی زچ ہو چکی تھیں۔

"اور آپ کو اچھا لگتا ہے ناں یہ فضول قسم کا شادی والا موضوع چھیڑ کر۔" ابتسام دوبدو بولا۔

"ابتسام! تم میری اکلوتی اولاد ہو..... میری کتنی خواہش ہے تمہارے سر پر سہرا سجانے کی۔" اب کے شہنیلا روہانسی ہوئیں۔

"تو لے آیئے سہرا، میں سجا لیتا ہوں اپنے سر پر....."

"دیکھو ابتسام.....! تمہاری خواہش تھی پاکستان آنے کی..... میں نے پوری کر دی۔ اب تمہارا فرض ہے کہ تم ایک اچھے اور فرمانبردار بیٹے بن کر ماں کی بات مان لو..... اور چپ چاپ شادی کے لیے مان جاؤ....."

"آخر آپ کو جلدی کس بات کی ہے؟" ابتسام اکتا کر بولا۔

"میں ایک لگی بندھی روٹین سے تنگ آ چکی ہوں، تمہاری دلہن لے کر آؤں۔ تمہارے بچے گود میں

کھلاؤں۔ بس یہی خواہش رہ گئی ہے اب تو میری....."

"ایسا کریں پاپا کی ایک اور شادی کروا دیں۔ اس سے آپ کو بھی تھوڑا چینج مل جائے گا اور پاپا کو بھی۔" اتنا کہہ کر ماں کی شکل دیکھی جہاں ماں کا مزاج سوا نیزے پر پہنچا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"اچھا، سوری بابا....." اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر ماں کے ہاتھ تھام لیے۔

"تھوڑا وقت دیں مجھے۔ میں جس کام سے پاکستان آیا ہوں وہ کر لینے دیجیے.....اس کے بعد جو آپ چاہیں جیسے آپ چاہیں۔" کہہ کر اس نے ماں کے تاثرات دیکھے جہاں ناقابلِ فہم قسم کی تشویش نظر آئی۔

"کیا ہوا مام.....؟" وہ فکر مند ہوا۔

"تم کس کام سے آئے ہو پاکستان ابتسام.....؟ میں تو سمجھی تھی تم اپنے باپ کا آبائی ملک دیکھنا اور گھومنا، پھرنا چاہتے ہو، اس کے علاوہ کیا کام ہے تمہیں یہاں.....؟" شہنیلا کے لہجے اور آواز میں چھپی پریشانی کو اس نے شدت سے محسوس کیا۔

"جن سوالوں کے جواب آپ نے اور پاپا نے مجھے کبھی نہیں دیے مجھے ان کے جواب تلاش کرنے ہیں۔" ابتسام کے سرد لہجے نے شہنیلا کو ٹھٹھرا دیا۔

☆☆☆

قیصرہ نے ہرا مسالا آمیزے میں مکس کیا اور انڈے پیالے میں توڑ کر پھینٹنے لگیں۔

"لائیں..... مجھے دیں..... میں فارغ ہو گئی ہوں۔" عائشہ بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتی باورچی خانے میں داخل ہوئی۔

"اونہہ جاؤ تم آرام کرو تھوڑی دیر، صبح سے صفائیوں میں لگی ہوئی ہو تھوڑا ہی کام باقی ہے۔ میں کر لیتی ہوں۔"

"بہت ضدی ہیں آپ، کچھ علاج کرنا پڑے گا آپ کا....." عائشہ نے کہتے ہوئے ماں کے ہاتھ سے کبابوں کا آمیزہ لیا.....دوسرے ہاتھ سے انڈوں کا پیالہ اٹھایا اور چھپاک سے کمرے میں جا کر غائب ہو گئی۔

"بس نکیاں بنانی رہ گی ہیں، لاؤ ناں بنا لیتی ہوں فٹافٹ....." قیصرہ سنک میں لگے نلکے سے ہاتھ دھوتی اس کے پیچھے کمرے میں آئیں۔

"چہرہ ٹھیک کیجیے آپ اپنا اور کپڑے چینج کریں....."

"بیٹا، ابرام کے دوست کمبائن اسٹڈی کے لیے آ رہے ہیں، میرے رشتے والے نہیں آ رہے، جو میں کپڑے چینج کر کے چہرہ ٹھیک کروں....."

"ویسے امی.....آپ اس عمر میں اتنی خوب صورت ہیں تو میری عمر میں کیا غضب ڈھاتی ہوں گی ایمان سے۔" عائشہ نے کباب کی ٹکی گول کر کے ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتیں ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔

عائشہ دوڑ کر مین گیٹ کی جانب بھاگی۔

"ارے، ارے رکو.....تم کہاں جا رہی ہو، میں دیکھتی ہوں۔" قیصرہ چپل پاؤں میں اڑستی، دوپٹا سنبھالتی عائشہ کے پیچھے لپکیں۔

تب تک عائشہ گیٹ کھول چکی تھی۔ ابرام کا ہنستا مسکراتا چہرہ گیٹ سے نمودار ہوا۔

"ارے بھئی، عائشہ پیچھے ہٹو.....غیر لڑکے ہوں گے..... میں ڈرائنگ روم کھولتی ہوں۔" قیصرہ بوکھلائی ہوئی واپس ڈرائنگ روم کی جانب مڑیں.....وہ عائشہ کی حرکت پر حیران تھیں۔ وہ کیوں ایسا پھدک، پھدک کر گیٹ کھول رہی تھی ابرام کے دوستوں کے لیے.....تب ہی دو مضبوط بازوؤں نے پیچھے سے آ کر پکڑا۔ "ارے..... ابرام.....!" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

لیکن ابرام تو ان کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا..... تو پھر کون.....؟

"لڑکے تو ہیں مگر غیر نہیں.....اپنے....." ان کے کان سے منہ جوڑ کر آنے والے نے سرگوشی کی۔

قیصرہ جہاں کھڑی تھیں، وہیں ساکت ہو گئیں۔

"سکندر....." انہوں نے پلٹنے کی کوشش کی..... تو سر جا کر اس کے کندھے سے ٹکرایا۔

''سکندر میرے بچے.....'' ان کی آنکھوں میں ایک دم ہی ڈھیر سارا پانی آ گیا۔

''ٹیں، ٹیں، ٹیں..... سرپرائز.....''

ابرام نے دونوں ہاتھ کھول کر سر کو ہلکا سا جھکایا۔

عائشہ ایک طرف کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ساتھ ہی آنکھوں میں آیا پانی بھی صاف کرتی جا رہی تھی۔

''بتایا کیوں نہیں.....'' وہ اسے اپنے ساتھ لگائے رو رہی تھیں۔ ''ماں کا دل بند ہو جاتا تو.....؟''

''تو ہم دوسرا دل لگوا لیتے..... ذرا مضبوط والا..... جو ذرا، ذرا سی بات پر بند نہ ہوتا۔'' جواب ابرام کی طرف ..... سے آیا۔

سکندر ایک ہاتھ سے ماں کو ساتھ لگائے دوسرے سے بہن کو پکڑ کر اندر کی طرف بڑھا۔ ابرام سامان لے کر پیچھے، پیچھے آیا۔

''میں نے منع کیا تھا کہ امی کو بالکل آخر میں بتانا۔'' سکندر ان کو اپنے برابر بٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اور میں نے عائشہ کو منع کیا تھا کہ امی کو آخر میں بھی نہیں بتانا جب سکندر پہنچ جائے گا تو خود ہی پتا چل جائے گا۔'' ابرام نے فخر سے اپنا کارنامہ بیان کیا۔

''اور میں نے اچھی بچی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے امی کو آخر تک بھنک نہیں پڑنے دی۔'' عائشہ ہنس کر بولی تو باقی سب بھی ہنس دیے۔

''ایسے ڈرامے باز ہیں ناں یہ دونوں..... مجھے کہتے رہے کہ ابرام کے دوستوں نے پڑھنے کے لیے آنا ہے۔ ذرا اہتمامی کھانا بنانا ہوگا..... اور مجھے دیکھو، میں بھی کیسی کم عقل ہوں، سوچا ہی نہیں کہ ابرام کے دوستوں کو تو ڈرائنگ روم میں بیٹھنا ہے، یہ عائشہ کی بچی صبح سے گھر کی تفصیلی صفائی کس سلسلے میں کر رہی ہے۔'' قیصرہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔

''سکندر! بس میرا بچہ..... دو سال بہت ہوتے ہیں۔ اب میں تمہیں واپس نہیں جانے دوں گی۔'' قیصرہ بیٹے کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''جی، بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں امی..... اب تم یہاں پاکستان میں رہ کر ہی کرو..... جو کرنا ہے۔'' عائشہ، بھائی کو دیکھتے ہوئے لاڈ سے بولی۔

''آپ دونوں خواتین کا حکم سر آنکھوں پر.....'' سکندر کورنش بجالانے کے سے انداز میں جھکا۔

''ویسے..... اب میرا واپس جانے کا کوئی ارادہ ہے بھی نہیں..... میں نے خود آپ لوگوں کے بغیر یہ دو سال بہت مشکل سے کاٹے ہیں۔'' سکندر نے بیڈ پر بیٹھ کر تکیے کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے سکون سے کہا۔

''عائشہ، چلو بیٹا، کھانا لگائیں، بھائی کو بھوک لگ رہی ہوگی۔'' قیصرہ کو خیال آیا تو دونوں ماں، بیٹی کچن کی طرف بھاگیں۔

☆☆☆

فیضان بیگ اور محبوبہ کتنی ہی دیر ایک دوسرے کے گلے لگے روتے رہے۔

''بہت دیر کر دی میں نے اماں..... بہت دیر کر دی۔'' وہ بچوں کی طرح بلک رہی تھے۔

''تو بتا، تو نے ماں، باپ کو کس جرم کی سزا دی۔ ہمیں کیوں ترسا دیا اپنی شکل کے لیے۔'' محبوبہ کا بوڑھا چہرہ غم سے نڈھال تھا۔

''وہ آخری تین دن، کسی کو پہچان نہیں رہے تھے۔ اس وقت بھی ان کی زبان سے آخری نام تیرا ہی نکلا تھا۔'' وہ روتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

''کیسا بدنصیب ہوں میں اماں..... اپنے ابا میاں کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا، ان کے جنازے کو کاندھا تک دینا نصیب نہیں ہوا۔'' آنسو، فیضان بیگ کا پورا چہرہ بھگو چکے تھے۔

چودہ سال کی شہیلا ٹکر ٹکر ایک، ایک کی شکل دیکھ رہی تھی۔ آج وہ اور اس کے بابا فیضان بیگ دادا کے انتقال کے دس دن بعد یہاں پہنچے تھے۔

''بابا نے بہت کوشش کی لیکن وہ وقت پر نہ پہنچ سکے.....'' شہیلا کو بہت عجیب لگ رہا تھا سب..... یہ اس کے ددھیال والے تھے۔ جن کا اس نے صرف ذکر سنا تھا باپ کے منہ سے۔

کچھ دن لگے تھے فیضان بیگ کو سنبھلنے میں اور اتنے دن میں شہنیلا یہاں موجود سبھی لوگوں سے گھل مل چکی تھی۔ پاکستان آنا اگر اسے اچھا نہیں لگا تھا تو کچھ ایسا برا بھی نہیں تھا یہ تجربہ..... دادی، مہتاب آنٹی، شاہ نواز انکل سبھی بہت اچھے تھے۔ باقی سب لوگ بھی آتے جاتے رہتے تھے۔

وہ کافی دیر کے اٹھ کر کمرے سے باہر آنے ہی والی تھی کہ دادی اور بابا کی آوازوں نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔

''فیضان، کم سے کم دوسری بار تو... تو کچھ عقل کے ناخن لیتا..... کوئی خاندانی عورت دیکھ کر اس سے شادی کرتا۔ تیری دوسری بیوی بھی گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔''

شہنیلا کو لگا کسی نے گرم ابلتا ہوا پانی اس کے اوپر انڈیل دیا ہے۔ اتنی تذلیل اس کی ماں کی، کیا حق پہنچتا تھا اس کی دادی کو..... اس طرح کی بات کرنے کا۔

''وہ گھر چھوڑ کر نہیں بھاگی اماں..... ہم نے مل بیٹھ کر ایک دوسرے سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ بچی کو میری خواہش پر میرے پاس چھوڑ کر گئی ہے۔''

فیضان بیگ کی آواز میں زمانوں کی تھکن تھی۔

''ناں کیوں..... الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ بچی کا بھی نہ سوچا تم لوگوں نے..... ایسی کانچ کی گڑیا جیسی نازک بچی..... اس پر کیا بیتی ہوگی بھلا..... ماں، باپ کی علیحدگی سے۔'' دادی کی بات نے جیسے اس کے جلتے بلتے وجود پر ٹھنڈی سی پھوار گرائی تھی۔

''وہاں پر یہ سب عام سی بات ہے..... بچے عادی ہوتے ہیں ان سب باتوں کے۔ دوسرے وہ مصری تھی۔ اپنے وطن جا کر رہنا بسنا چاہتی تھی۔ مجھے کہتی رہی ساتھ چلو..... میں تیار نہ ہوا تو بس..... چلی گئی وہ.....'' فیضان بیگ نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''اب آگے کا کیا سوچا ہے فیضان؟'' دادی اس کے باپ سے پوچھ رہی تھیں۔

''اگلے ماہ کی 23 تاریخ کی سیٹیں ہیں اماں، واپس جانا ہے، شہنیلا کی پڑھائی کا بہت حرج ہو رہا ہے۔''

''اب جائے گا..... تو پھر میرے مرنے پر آئے گا واپس.....!'' دادی کا لہجہ اتنا افسردہ تھا کہ شہنیلا کے دل کے اندر تک غم اتر گیا۔

''اللہ نہ کرے اماں..... کیسی باتیں کرتی ہیں، اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔ اللہ نے چاہا تو ہر سال پاکستان آؤں گا اب.....''

''وعدہ کر.....'' دادی نے اس کے باپ کا ہاتھ تھاما تھا غالباً۔

''وعدہ.....!''

فیضان بیگ نے وعدہ کر لیا تھا ماں سے..... وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ وعدہ وہ کبھی پورا نہیں کر پائیں گے کیونکہ تقدیر ان کے لیے کچھ اور طے کیے بیٹھی تھی۔

☆☆☆

''کن سوالوں کے جواب چاہئیں تمہیں.....؟'' شہنیلا نے تھکے، تھکے سے لہجے میں پوچھا۔

''آپ نے خود سے دوگنا بڑے آدمی سے شادی کی جو شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ بھی تھا۔ وہ بھی اس وقت جب آپ کی شادی کے دن، تاریخ تک طے کیے جا چکے تھے کیوں.....؟''

''یہ کس انداز میں بات کر رہے ہو تم اپنے باپ کے لیے..... کس نے بھرا ہے یہ خناس تمہارے دماغ میں.....؟'' شہنیلا بہ مشکل خود کو کمپوز کر پائیں..... ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایک دن ابتسام اس سب کے لیے جواب طلبی کرنے کھڑا ہو جائے گا۔

''مام! آپ کو معلوم ہے کہ انسان سوال کے جواب میں سوال کب کرتا ہے؟'' ابتسام نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ شہنیلا تو بس اس کی آنکھوں میں اترے بغاوت کے رنگ دیکھتی رہ گئیں..... ان کی زبان کچھ بھی کہنے سے انکاری ہو چکی تھی۔

''تب.....'' وہ سرد لہجے میں بولتا، کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ''کہ جب اس کے دل میں چور ہوتا ہے۔''

''نکاح کیا تھا، کوئی جرم نہیں کیا تھا، چوری نہیں کی تھی۔'' وہ واپس حواسوں میں آنا شروع ہوئیں۔

''جب جرم نہیں کیا تھا، چوری نہیں کی تھی تو سب تعلق توڑ کیوں لیے..... ہم برسوں بعد پاکستان آئے ہیں اور آپ میری سگی پھپو کے گھر نہیں ٹھہریں..... یہاں پاپا کے رشتے کی بہن کے گھر ٹھہری ہوئی ہیں۔ ٹھہرنا تو دور کی بات، آپ اور پاپا ان سے ملنے تک کے روادار نہیں ہیں..... کیوں آخر.....؟ مام کیوں؟''

''جا کر پوچھ لو..... اپنی پھپو سے وہ بھی تم سے ملنا چاہتی ہیں یا نہیں.....'' شہنیلا سلگتے ہوئے لہجے میں بیٹے سے مخاطب ہوئیں۔

''اسی بات کا تو جواب چاہیے مجھے..... کیوں، نہیں ملنا چاہتا کوئی ہم سے..... ایسا کیا ہے ہمارے ماضی میں..... جو ہم یوں اچھوت بن کر رہ گئے ہیں۔'' وہ غصے سے کہتا کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

شہنیلا گم صم بیٹھی رہ گئیں۔

ان کے اور وقار کے علاوہ تو کوئی ایسا نہیں تھا جو ماضی کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتا تو پھر کیا وقار نے..... کچھ کہا تھا، ابتسام کو؟ یہ کیسے ممکن تھا..... وقار اپنی زندگی کا اتنا بڑا راز بیٹے کو کیسے بتا سکتے تھے۔

تو پھر.....؟

گتھی سلجھ نہیں رہی تھی۔ جتنا سوچتی، اتنا الجھتیں۔

☆☆☆

''پھر کیا ہوا.....؟'' ابرام، سکندر کی بات سن کر لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ہونا کیا تھا؟'' سکندر ٹھنڈی سانس بھر کر سیدھا ہوا۔ ''وہ کندھے اچکاتا ہوا سیدھا ہوا، اس نے اپنے کالر کھڑے کیے۔ ٹیبل سے سن گلاسز اٹھا کر لگائے اور میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

''جنٹل مین..... تمہاری اسٹوری خاصی فضول اور بوگس ہے، بالکل تمہاری پرسنلٹی کی طرح..... مجھے ان میں سے کسی ایک بات پر بھی اعتبار نہیں ہے، تم نے میرا وقت برباد کیا اس کے لیے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ امید ہے کہ ہم دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے۔ اس کے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کیفے سے نکلتا چلا گیا۔''

سکندر نے بات مکمل کر کے بھائی کی شکل دیکھی۔

''اور تم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے..... ہے ناں؟''

ابرام نے اختتامی نوٹ پڑھا۔

''ظاہر ہے اپنا سا منہ ہی لے کر رہنا تھا ناں یا کسی اور کا منہ منگوا لیتا۔'' سکندر تپ کر بولا۔

''اچھا تو مجھ پر کس بات کا غصہ اتار رہے ہو۔'' ابرام کچھ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''تمہارا آئیڈیا تھا یہ سارا۔ تم نے مجھے کہا تھا کہ مجھے ان کے بیٹے سے مل کر سارا کچا چٹھا اس کے سامنے کھولنا چاہیے..... صرف وہی ہے جو اپنے ماں، باپ سے حقیقت اگلوا سکتا ہے۔'' سکندر نے پٹاخ سے جواب بھائی کے منہ پر مارا اور جذبات میں آواز بھی اس قدر اونچی ہوگئی کہ برابر کے کمرے میں عائشہ کے ساتھ سوئی ہوئی قیصرہ کی آنکھ کھل گئی..... وہ آنکھیں ملتی ہوئی ان کے کمرے میں آگئیں۔

''تم لوگ سوئے نہیں اب تک؟'' قیصرہ نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بیٹوں کو مخاطب کیا جو دو کا ہندسہ عبور کر رہی تھی۔

ماں کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر دونوں ہی ہڑبڑا گئے۔

''ہاں، وہ، بس سونے ہی والے تھے۔'' ابرام جلدی سے بولا۔

''کیا بحث ہو رہی تھی یہاں.....؟'' قیصرہ آ کر سکندر کے بیڈ پر پائنتی کی طرف بیٹھ گئیں۔

''آں..... وہ..... وہ دراصل..... سکندر مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ بیکری کے لیے جگہ فائنل کر لی۔'' ابرام نے فوراً بات بنائی۔

سلطان کے انتقال کے بعد قیصرہ مختلف بیکریوں کے لیے کیک بیک کرتی تھیں۔ وقت کے ساتھ، ساتھ انہوں نے کئی ایک دوسری بیکری کی اشیا کی تیاری میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ سرمائے کا مسئلہ

آڑے نہ آتا تو وہ کبھی کی اپنی بیکری کھول چکی ہوتیں۔ ان کے بچے ان کی اس خواہش سے آگاہ تھے، سکندر کا باہر جانا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ دو سال میں اتنے روپے وہ بھجوا چکا تھا کہ دونوں بھائی اور ماں مل کر ایک اچھی لوکیشن پر بیکری کھولنے کی پوزیشن میں تھے۔

''ماں کو بیوقوف سمجھتے ہو تم لوگ؟'' انہوں نے پہلے ابرام اور پھر سکندر کو دیکھا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ۔'' ابرام نظریں چراتا ہوا بولا۔

''مجھے بتاؤ، سچ، سچ، کیا بات کر رہے تھے تم دونوں.....؟ کس سے حقیقت اگلوانے اور کس کا کچا چٹھا کھولنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔'' دونوں بھائیوں کی نظریں ملیں اور پھر جھک گئیں۔

☆☆☆

ایسی ناگہانی، اتنا بڑا صدمہ، محبوبہ خاتون تو تقدیر کے اس امتحان پر حیران پریشان ہی رہ گئیں۔

روانگی سے دو دن قبل فیضان بیگ لقمۂ اجل بن گئے..... بھلے چنگے گھر سے نکلے، کچھ ضروری خریداری وغیرہ کرنا تھی کہ سامنے سے آتے تیز رفتار ٹرالر کی زد میں آ کر موقع پر ہی دم توڑ گئے۔

شہنیلا کی تو دنیا ہی اجڑ گئی۔ اس کی زندگی کی تو کل کائنات ہی اس کا باپ تھا۔ وہ سات برس کی تھی جب ماں، باپ کے مابین علیحدگی ہوئی۔ شروع، شروع میں ماں، گاہے بگاہے فون کر کے اس سے بات کر لیا کرتی تھی..... پھر سنا کہ مصر میں ہی اس نے دوسری شادی کر لی تھی۔

ہوتے، ہوتے یہ بات چیت بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی اور اب تو دو، تین برس سے اس کا ماں سے کوئی رابطہ ہی نہیں تھا۔ سو وہ تو بالکل ہی بے سائبان ہو گئی۔

چودہ برس کی اس گم صم بچی کو دادی نے اپنے پروں میں چھپا لیا تھا۔ مہتاب اور شاہ نواز بھی جس حد تک دلجوئی کر سکتے تھے کر رہے تھے۔

ارسلان بیگ اور عافیہ جو آئے تو سسر کی وفات پر تھے..... پھر ادھر بھائی کی وجہ سے مزید چند دن رکنا پڑا۔ آخر وہ بھی واپس دبئی سدھارے۔

کئی ماہ لگ گئے شہنیلا کو زندگی کی طرف واپس آتے، آتے..... آہستہ، آہستہ وہ یہاں کے ماحول اور لوگوں سے مانوس ہوتی چلی گئی۔ دوسرا کوئی آپشن اس کے پاس نہیں تھا۔ اگرچہ وہ ملک، وہ لوگ اس کے اسکول کے ساتھی، وہ جگہ جہاں اس نے اپنی عمر کے چودہ برس گزارے تھے رہ، رہ کر اسے یاد آتے، کبھی، کبھی اس کا دل کرتا وہ اڑ کر واپس چلی جائے۔ تب اس پر بے طرح اداسی کا دورہ پڑتا۔ وقت کے ساتھ، ساتھ وہ رشتوں کو، رویوں کو، لوگوں کو پہچاننے لگی۔ شاہ نواز تایا، مہتاب تائی، دادی سب لوگ بہت پیار کرنے والے تھے، ان کے علاوہ دو اور خاندان تھے جہاں دادی کے ساتھ وہ جاتی تھی یا پھر وہ لوگ دادی سے ملنے آیا کرتے تھے۔

ایک تو اس کے بڑے تایا غفران بیگ اور ان کے گھر والے تھے، دوسرے اس کے مرحوم چچا سلطان بیگ کی فیملی تھی۔ دونوں ہی خاندان بالکل ایک دوسرے کی ضد تھے۔

جس قدر پُرسکون، نرم مزاج، اور منسوڑ قیصرہ چچی اور ان کے بچے سکندر، ابرام اور عائشہ تھے۔ اسی قدر بدمزاج، اکھڑ اور بدتمیز غفران تایا کے گھر والے تھے۔ ان کا گھر، گھر کم اکھاڑا زیادہ لگتا تھا۔ اس میں زیادہ حصہ رقیہ تائی کا لگتا تھا۔ جس وقت بھی جاؤ خانہ جنگی کا سا منظر ملتا۔ بتول آپا سب سے بڑی تھیں۔ ان کی تین اولادیں تھیں بابو، گڑیا اور مینا۔ بتول آپا کے بعد ناصر بھائی اور فرح بھابی تھیں۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی..... پھر ساحر بھائی اور دیبا بھابی تھے، خیر سے اور ماشاءاللہ سے ان کے پانچ بچے تھے۔ غفران تایا کے سب سے چھوٹے صاحبزادے رفاقت تھے جن کو عرفِ عام میں رفو کہا جاتا تھا۔ ان کے گھر کے ماحول کے بگاڑ میں زیادہ ہاتھ شہنیلا کو رقیہ تائی کے مزاج کا لگتا تھا، کبھی تائی کی ساس سے بنی نہ بہوؤں سے۔

ان کے ہاں اگر کوئی معقول شخص شہنیلا کو دکھتا تھا تو وہ تھے رفاقت یا پھر میکے کے ماحول سے بیزار کبھی کبھار آنے والی بتول آپا تھیں۔

ایک اور بات جو یہاں رچ بس جانے کے بعد شہنیلا نے محسوس کی تھی۔ وہ تھی غفران تایا اور قیصرہ چچی کے گھرانوں کی آپس کی سرد مہری..... ان دونوں گھرانوں کا آپس میں آنا جانا بالکل بھی نہیں تھا۔ کبھی جو اتفاقاً دادی سے ملنے دونوں ایک ہی وقت پہنچ جاتے تو بھی حتی الامکان ایک دوسرے سے بات چیت سے گریز کرتے۔

''دادی! یہ غفران تایا لوگ، قیصرہ چچی سے اتنے کھنچے، کھنچے سے کیوں رہتے ہیں؟'' تجسس کے مارے ایک دن شہنیلا نے پوچھ ہی لیا۔

''ہاہ.....!'' ایک ٹھنڈی سانس محبوبہ خاتون کے لبوں سے خارج ہوئی۔ ''سب مایا کا کھیل ہے بیٹا۔''

''یہ، مایا کون ہے دادی.....؟ اور یہ کیوں لڑائی کرواتی ہے.....؟'' شہنیلا پہلی دفعہ مایا نامی لڑکی کے بارے میں سن رہی تھی سو حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ وہ مایا نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔'' پاس بیٹھی مہتاب تائی بے ساختہ ہی ہنسیں.....

''تو پھر.....؟'' شہنیلا نے اپنی بڑی، بڑی آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

''پیسے کو کہتے ہیں مایا.....'' مہتاب تائی نے ہی مسکراتے ہوئے وضاحت دی۔

''ارے بیٹا..... تمہارے دادا نے بنوائے تھے یہ پانچ گھر، اپنے پانچوں بیٹوں کے لیے کہ اپنے، اپنے گھروں میں رہیں، خوشی، خوشی ایک دوسرے سے ملنا ملانا رکھیں۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''پھر دادی.....؟'' شہنیلا کو بات جاننے کی بے چینی تھی۔

''تمہارا باپ اپنا مکان بیچ کر باہر چلا گیا۔ ارسلان اور عافیہ، مکان کرایے پر اٹھا کر چلے گئے۔ باقی غفران اور شاہ نواز تو اپنے، اپنے گھر منتقل ہو گئے۔ ہائے سلطان، غریب کو اپنے گھر میں رہنا، بسنا نصیب ہی نہ ہوا۔ وہ اس سے پہلے ہی چل بسا۔'' دادی آبدیدہ ہو گئیں۔

شہنیلا کو تاسف نے گھیر لیا۔ یونہی بات چھیڑی۔ دادی کو بھی پریشان کیا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ دادی دوبارہ گویا ہوئیں۔

''سلطان کے مکان میں ان کی بیوہ قیصرہ آباد ہو گئیں.....'' شہنیلا کو اب بھی جھگڑے کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''غفران کے گھر یکے بعد دیگرے دو بہوؤں کی آمد نے حالات خاصے مخدوش کر دیے تھے۔ سارا دن فرح اور دیبا کبھی آپس میں لڑتیں کبھی ساس کے ساتھ منہ ماری کرتیں۔''

''جیسی کرنی ویسی بھرنی.....'' مہتاب تائی آہستگی سے گویا ہوئیں۔

''ہاں بیٹا، دنیا میں ہی بھگت لیتا ہے انسان اپنا کیا۔'' دادی یاسیت سے بولیں۔ ''تب گھر کے حالات سے تنگ آ کر غفران نے ایک نیا شوشا چھوڑا کہ سلطان کا انتقال چونکہ تمہارے دادا کی زندگی میں ہوا تھا، اس لیے اس گھر پر قیصرہ اور اس کے بچوں کا کوئی حق نہیں ہے شرعاً لہٰذا وہ گھر خالی کروا کر غفران کو دے دیا جائے تاکہ فرح اور ناصر کو وہ اُدھر شفٹ کر دیں۔''

''اوہ.....!'' شہنیلا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''تو قیصرہ چچی اور بچے وہ کہاں جاتے؟''

اس کے لیے تمہارے زرخیز دماغ کے تایا نے مشورہ دیا تھا کہ انہیں ہمارے والے پورشن میں شفٹ کر دیا جائے۔'' مہتاب سر جھٹکتے ہوئے بولیں۔

''وہ تو شکر ہے..... تب ابا جی زندہ تھے، وہ تو ہتھے سے اکھڑ گئے۔ غفران بھائی کی بات سن کر کہ تم لوگوں کے لیے جو کر سکتا تھا کر دیا۔ اب تمہاری اولادوں کا ٹھیکا میں نے نہیں لے رکھا۔ بس پھر ہفتہ دس دن کے اندر، اندر انہوں نے گھر قیصرہ کے نام کر دیا تاکہ ان کے بعد بھی کوئی قیصرہ اور بچوں کو شرع کے نام پر گھر سے بے دخل نہ کر سکے۔ ابا جی سے تو جو

ناراض ہوئے سو ہوئے غفران بھائی، بھائی کی بیوہ سے تو دشمنی ہی لگالی..... بس پھر ہوتے، ہوتے دونوں کا ملنا، ملانا بھی ختم ہی ہوگیا تقریباً۔'' مہتاب نے بات مکمل کر کے خاموشی اختیار کی۔

''توبہ..... کتنے خود غرض ہیں، غفران تایا۔'' جو اس نے سوچا فوراً کہہ بھی دیا۔

''قیصرہ اور بچوں کے لیے دل بڑا پریشان رہتا ہے۔ جب تو یہ زندہ تھے تو کچھ مدد امداد کر دیا کرتے تھے اب.....'' دادی، مہتاب تائی سے مخاطب تھیں۔

''سوچتی ہوں کہ خالی بیکری کے لیے سامان تیار کر، کر کے تو گزارہ نہیں ہوگا۔ میرا جو زیور پڑا ہے وہ دے دوں قیصرہ کو، اس کی بڑی خواہش ہے اپنی بیکری کھولنے کی۔ سرمایہ ہوگا تو ہی کچھ بنے گا۔'' دادی نے مہتاب تائی سے جانے مشورہ مانگا تھا یا یونہی بات کی تھی۔ شہنیلا سمجھ نہیں پائی۔

''اگر آپ نے سوچا ہے اماں تو بس عمل بھی کر ڈالیے..... غفران بھائی سے کچھ بعید نہیں کہ دکانیں بھی بیچ باچ کر ڈکار جائیں اور پھر زیور پر بھی حق جتانے آ پہنچیں۔'' مہتاب سادہ سے لہجے میں بولیں کہ آج کل غفران میاں دکانیں ہتھیانے کے چکر میں تھے۔

محبوبہ خاتون نے افسردگی سے سر ہلایا۔

خیر وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ محبوبہ خاتون جانے کیوں زیور، قیصرہ کے حوالے نہ کر پائیں۔ شہنیلا کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کروایا گیا۔ باقی سب تو ٹھیک تھا مگر اردو اس کے سمجھ نہ آ کر دیتی تھی۔ دادی کے حکم پر رفاقت اسے اردو پڑھانے آنے لگے۔ جو کہ خود بھی تب اردو ادب میں ماسٹرز کر رہے تھے۔

رفاقت جو کہ باقی سب کے لیے رفو تھے، شہنیلا کے لیے سر ہوگئے..... حالانکہ دادی اور تائی نے دو ایک بار ٹوکا بھی کہ رفو بھائی بلایا کرو، پر شہنیلا نے یہ مشورہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا۔

اس قدر خوبرو، بانکا، سجیلا، چھ فٹ سے نکلتے قد کا تایا زاد، جو شہنیلا کو دیکھنے میں ہی انگلش فلموں کے ہیرو جیسا دکھتا تھا اسے بھائی کہنا کم سے کم شہنیلا کو گوارا نہیں تھا۔

''رفاقت سر.....'' کی آواز، ان کا انداز، لب و لہجہ پھر اس پر اردو شاعری، محبوبہ کے تذکرے، فراق و وصال کی باتیں، عاشق و معشوق کے ناز نخرے کب دل اٹھارہ برس کی شہنیلا کے ہاتھوں سے نکلا اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔ مضمون سے زیادہ استاد میں دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔

سارا دن دل ہتھیلی پر دھرے وہ رفو کی آمد کا انتظار کرتی اور ان کے آنے کے بعد ٹیوشن کے دو گھنٹے، دو منٹ میں گزر جاتے، ابھی تو وہ جی بھر کر انہیں دیکھ بھی نہیں پاتی تھی۔

محبت کی ہلکی، ہلکی آنچ رفو تک پہنچنا شروع ہوئی تو وہ گھبرا گئے۔ کئی بار جی میں آئی کہ ڈپٹ کر ٹوک دیں ''مجھے گھورنے کے بجائے کتاب پر نظر رکھو۔'' مگر یہ نازک کانچ سا دل توڑنے کی ہمت نہ کر سکے سو انجان بنے رہے۔

پھر ایک دن غزل سمجھتے ہوئے شہنیلا نے محبوبہ لفظ پر انگلی رکھ دی۔

''سر، آپ کا دل نہیں کیا کبھی کہ آپ کی بھی کوئی محبوبہ ہو جس کو آپ اپنے ہاتھوں سے گجرے پہنائیں.....؟'' انداز گو، سادہ ہی تھا پر بات اتنی کھلی ڈلی تھی کہ مضبوط مرد ہونے کے باوجود رفو کی ہتھیلیوں میں پسینہ آ گیا۔

''ہاں، محبوبہ تو ہے پر گجرے پہنانے کا خیال کبھی نہیں آیا۔ چلو اچھا ہے..... تم نے اس طرف توجہ مبذول کروا دی۔ اب کل گجرے پہناؤں گا، ان شاء اللہ.....!'' رفو نے جواب دیتے ہوئے انداز سرسری ہی رکھا۔

اور شہنیلا، اس کا تو دل ہی جیسے ایک دم بجھ کر رہ گیا۔ ''مطلب، کوئی ہے ان کی زندگی میں۔'' ایک جذبہ رقابت تھا جس نے آناً فاناً شہنیلا کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ بھوک، پیاس، نیند سب ہی اڑ گئی۔

کس مشکل سے چوبیس گھنٹے گزارے..... اور جب سر آئے تو ان کے ہاتھوں میں گجرے دیکھ کر ایک دم ہی وہ جی اٹھی۔

مطلب، رفو کی محبوبہ یہاں ہے یعنی کہ میری

محبت یک طرفہ نہیں ہے، لمحوں میں اس نے اپنی کلائی، رفو کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں دیکھی۔ وہ اسے گجرے پہنا رہے تھے اور وہ شرم سے دُہری ہوئی جاتی تھی۔ لیکن جب وہ ہوش وحواس کی دنیا میں واپس آئی تو رفو سر دادی کا ہاتھ تھامے انہیں گجرے پہنا رہے تھے۔ دادی ہائے، ہائے کر رہی تھیں اور مہتاب تائی پاس کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

''اے رفو، باؤلا ہوا ہے کیا..... یہ کیا کر رہا ہے.....؟'' دادی کی آواز اس کے کان میں پڑی۔

''جی، دادی باؤلا ہو گیا ہوں..... کل کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ سر آپ کا دل نہیں کرتا اپنی محبوبہ کو گجرے پہنانے کو..... سو آج اسے بتانا ہے کہ گجرے پہنا دیے میں نے اپنی محبوبہ کو.....''

دادی کو گجرے پہنانے کی مہم سے فارغ ہو کر وہ اندر پڑھانے داخل ہوئے تو شہنیلا خفا، خفا چہرہ لیے رخ موڑے بیٹھی تھی۔ رفاقت نے مسکراہٹ دبائی۔

''لاؤ کتاب کھولو.....'' بظاہر سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

شہنیلا نے رخ موڑے..... موڑے ہی کتاب ان کی طرف کھسکائی۔

''یہ کتاب کیا خود پڑھے گی آج.....؟'' وہ مسلسل مسکراہٹ دبا رہے تھے۔ جواب ندارد.....

''یہ اتنا غصہ کس لیے.....؟'' وہ شرارت سے بولے۔

ایک دم ہی وہ رخ تبدیل کر کے ان کے بالکل سامنے ہو گئی۔ خفگی کا تاثر لیے چہرہ اور آنکھوں میں بلکورے لیتا ہوا شکوہ۔

''آپ واقعی نہیں جانتے یا میرے منہ سے سننا چاہتے ہیں؟'' وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تو وہ نظر ہٹا ہی نہیں پائے۔ بس ان جھیل سی گہری آنکھوں میں ڈوبتے چلے گئے۔

''یہ ہے اس کا جواب.....'' انہوں نے جیب سے کچھ نکال کر میز پر رکھا۔

شہنیلا نے دیکھا وہ گلاب کی ادھ کھلی کلی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ ننھی سی کلی اپنی مٹھی میں قید کی۔

''گجرے بھی پہناؤں گا اپنے ہاتھوں سے لیکن وقت آنے پر.....'' انہوں نے سرگوشی سے ذرا بلند آواز میں کہا۔ اور وہ وقت کبھی آیا ہی نہیں.....

☆☆☆

''دماغ خراب ہے تمہارا..... میں کیوں ایسی باتیں کروں گا ابتسام سے۔'' وقار انتہائی درشتی سے فون پر گرج برس رہے تھے۔ شہنیلا اس وقت کو کوس رہی تھیں جب انہوں نے ابتسام کی گفتگو کی بابت وقار کو فون کیا تھا۔

''میں نے منع کیا تھا ناں تمہیں کہ اسے ساتھ لے کر پاکستان مت جاؤ..... الٹی سیدھی باتیں کر کر کے لوگ دماغ خراب کر دیں گے اس کا۔ مگر تمہیں تو ہر بات میں اپنی من مانی کی عادت ہے۔'' وہ اپنی کہے جا رہے تھے، اسے بولنے کا موقع دیے بغیر.....

شہنیلا انہیں بتانا چاہ رہی تھیں کہ یہاں پر وہ ابھی تک کسی رشتے دار سے نہیں ملا..... رہ گئیں، مہرن آپا تو ان کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی..... جو کچھ ہوا ہے وہ وہیں انگلینڈ میں ہوا ہے پر وقار کچھ سنتے تب ناں، انہوں نے اچھی خاصی جھاڑ شہنیلا کو پلا کر فون بند کر دیا۔

وہ خاموشی سے فون کی بند اسکرین کو گھورتی رہ گئیں۔ کاش یہ شخص تھوڑی دیر زبان بند کر کے کان کھول لیتا تو اسے سمجھ آ جاتی کہ وہ ابتسام کے ساتھ اس لیے آئی تھیں کیونکہ وہ اسے اکیلے پاکستان نہیں آنے دینا چاہتی تھیں۔

ابتسام کو جانے کیوں اچانک ہی پاکستان جانے کا دورہ پڑا تھا۔ ان کے لاکھ سمجھانے بجھانے اور منع کرنے کے باوجود وہ باز آنے کو تیار نہیں تھا۔ سو مجبوراً ان کو بھی آنا پڑا۔ اس دیار جسے وہ برسوں پہلے اپنے تئیں خیر آباد کہہ گئی تھیں ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے۔

فون بیڈ پر اچھال کر وہ کھڑکی کے سامنے آ کھڑی ہوئیں..... چنبیلی کی خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔

نیچے مہرن آپا تھال میں چنبیلی کے پھول لیے بیٹھی تھیں۔ ایک ہاتھ میں سوئی دھاگا تھا، شہنیلا بے دھیانی

میں انہیں دیکھے گئیں۔

تب ہی مہرن آپا کی نظر پڑی شہنیلا پر.....

''اری بڑو رانی نیچے آجاؤ، دیکھو گجرے بنا رہی ہوں میں.....آؤ تمہیں بھی پہناتی ہوں۔'' شہنیلا کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئیں۔

بہت کچھ یاد آیا تھا انہیں.....دو آنسو ان کی پلکوں سے ٹوٹ کر گرے اور رخسار میں جذب ہو گئے۔

☆☆☆

رفاقت نے سب سے پہلے دادی کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ماں کی فطرت سے وہ واقف تھے۔ جانے وہ بات کو کیا رنگ دیتیں سو کچھ گھبراتے، کچھ شرماتے ہوئے انہوں نے دادی کے سامنے مدعا پیش کیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ یہ معاملہ دو طرفہ ہے۔

دادی تو سن کر خوشی سے نہال ہو گئیں..... پھر سب کچھ اتنا سہل طریقے سے ہوتا چلا گیا کہ رفاقت کو یقین نہیں آتا تھا کہ قدرت اس قدر ان پر مہربان ہے، محبوبہ خاتون نے شاہ نواز سے بات کی، شاہ نواز نے غفران بیگ سے بڑے بھاؤ سے بات کی۔ حیرت انگیز طور پر رقیہ کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سو دسمبر کی ایک سہانی سی شام میں شہنیلا نے رفاقت کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔

شادی اگلے برس طے پائی۔

منگنی کے بعد سے شہنیلا کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتی۔

دادی نے شہنیلا پر رفو کے سامنے آنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ رفو، دادی کے لیے گجرے لاتے، ایک گجرا ہمیشہ ہی غلطی سے چوکھٹ پر گرا رہ جاتا۔

وہ گجرا دو دن شہنیلا کے تکیے کے نیچے جانے اس سے کون سے راز و نیاز کرتا رہتا پھر سوکھ کر مرجھانے لگتا تو شہنیلا اسے اپنی اردو کی کتاب میں قید کر لیتی۔ چھ ماہ یونہی ہنستے کھیلتے گزر گئے۔

پھر ایک واقعے نے زندگی کی پُرسکون جھیل میں گویا پتھر کھینچ مارا۔ بتول آپا کے میاں ایک موذی مرض کا شکار ہو کر دو ماہ کے اندر، اندر ختم ہو گئے۔ غفران تایا کے گھر تو گویا کہرام برپا ہو گیا۔

بتول آپا تین چھوٹے، چھوٹے بچے لیے ماں، باپ کی دہلیز پر آ گئیں۔ ساس، سسر تھے نہیں اور میاں کے بہن، بھائی سب شادی شدہ، اپنے، اپنے گھر بار والے..... سو ان کی اور بچوں کی ذمے داری کون اٹھاتا۔ ایسے میں ماں، باپ کے گھر کی چھت ہی غنیمت لگتی ہے۔ رفو کو سرکاری نوکری مل گئی، کس دور افتادہ گاؤں میں اردو کے استاد کی ویکنسی خالی تھی، رفاقت بیگ کو وہاں تعینات کر دیا گیا۔

وہ بوریا بستر اسمیٹ کر گاؤں سدھارے۔ گاؤں والوں نے بغیر کرایے کے ایک گھر بھی فراہم کر دیا۔ وہ گھر، بجلی اور گیس جیسی بنیادی سہولیات سے محروم تھا۔ پھر بھی گزارہ اچھے سے ہو جاتا تھا کہ ان کے کھانے پینے کی ضروریات شاگردوں کے گھر سے پوری ہو جاتیں۔ بدلے میں وہ مفت ٹیوشن فراہم کرتے۔

کبھی پندرہ دن، کبھی مہینے بعد گھر آتے تو گھر کا ماحول عجیب سا پاتے، ساحر اور ناصر کی بیویاں بتول آپا اور ان کے بچوں کو برداشت کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ خاص طور پر ساحر کی بیوی دیبا، جس کے اپنے بھی پانچ بچے تھے، اس کا علیحدہ گھر کا مطالبہ اور گھر چھوڑنے کی دھمکی روز بروز زور پکڑتی جا رہی تھی۔

ایسے میں رقیہ بجائے بیٹی کا حوصلہ بڑھانے اور تسلی دلاسے دینے کے الٹا بتول آپا اور ان کے بچوں کو کوستیں اور وہ بیچاری گھنٹوں روتیں، پہروں کڑھتیں، بچے الگ سہمے، سہمے رہتے۔

دوسری طرف دادی بہت بیمار رہنے لگی تھیں۔ طبیعت کبھی، کبھی اتنی بگڑ جاتی کہ جان کے لالے پڑ جاتے۔ ایسے میں انہیں شہنیلا کی فکر رہتی، وہ اپنی زندگی میں اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔

ایک دن رفاقت، دادی سے ملنے آئے تو شہنیلا سے کافی دیر بات چیت ہوئی کہ مہتاب تائی گھر پر نہیں تھیں۔ اور دادی دوا کھا کر سو رہی تھیں۔

''شہنیلا! بتول آپا کی عدت ختم ہونے والی ہے، میں ان کو اور بچوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہا ہوں، یہاں دیبا بھابی اور امی نے تو مل کر بچوں اور آپا دونوں کو نفسیاتی مریض بنا دینا ہے۔'' رفاقت ہونے والی شریکِ حیات سے دل کا بوجھ بانٹ رہے تھے۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ ان معاملات میں شہنیلا کے خیالات بھی دیبا بھابی سے مختلف نہیں تھے۔

شہنیلا تو خود سے بھی یہ طے کیے بیٹھی تھی کہ شادی کے بعد اس جنجال پورہ سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر کے رفاقت کو لے کر الگ ہو جائے گی۔ کجا یہ کہ نند اپنے تین بچوں سمیت ساری عمر سر پر مسلط رہے گی۔

''میں، آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' ناگواری کو دل میں دباتی وہ، وہاں سے اٹھ گئی کہ کہیں چہرے کے تاثرات سے رفاقت دل کا حال نہ پا جائیں۔

اگلا ایک ماہ خاصا ہنگامہ خیز رہا۔ بتول آپا بچوں سمیت رفاقت کے ساتھ سدھاریں، جہاں فرح اور دیبا نے نند اور اس کے بچوں سے جان چھوٹنے پر خدا کا شکر ادا کیا وہیں شہنیلا بس دل ہی دل میں تلملاتی رہ گئی۔ اس سے زیادہ کچھ اس کے اختیار میں تھا بھی نہیں۔

دادی کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی تو ایک دن غفران اور رقیہ کو بلوا کر شادی کی بابت ان کا ارادہ دریافت کیا۔ یوں تھوڑے سے بحث و مباحثے کے بعد ٹھیک ایک ماہ بعد کی تاریخ طے کر دی گئی۔

دونوں گھروں میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے پھر وہ ہوا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

''یہ لیجیے اماں، یہ زیور میں لاکر سے نکلوا کر لے آیا ہوں۔'' شاہ نواز نے ڈبے ماں کے سامنے رکھے۔ تب ہی مہتاب دوا لے کر آ گئیں۔

''اماں پہلے آپ دوا لے لیں۔'' انہوں نے پانی کا گلاس ساس کے ہاتھ میں دیا۔ محبوبہ خاتون نے دوائی لی۔

''شکر ہے اماں..... آپ کی طبیعت کچھ سنبھلی ورنہ آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔'' شاہ نواز زیور کا آخری ڈبا شاپنگ بیگ سے نکال کر ماں کے سامنے رکھتے ہوئے بولے۔

''بس بیٹا، اب تو چل چلاؤ ہے، جانے کس وقت بلاوا آ جائے۔'' محبوبہ خاتون نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ایسی باتیں نہ کیا کریں اماں.....'' شاہ نواز نے خفگی سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ شہنیلا نظر نہیں آ رہی، کدھر ہے؟'' اچانک ہی شاہ نواز کو خیال آیا۔

''رقیہ بھابی کے ساتھ گئی ہے، کچھ چیزیں وغیرہ لینی تھیں۔'' مہتاب نے جواب دیا۔

''کب سے سوچا ہوا تھا کہ یہ زیور قیصرہ کو دوں گی، وہ ان کو بیچ کر اپنی بیکری کا کچھ کر لے..... معلوم نہیں کیوں، ہمت نہیں پڑی۔ انسان کا بس چلے تو سارا جمع جتھا، زیور، ہر چیز قبر تک میں اپنے ساتھ لے جائے۔'' کہتے، کہتے ایک تلخ سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آئی۔

''جب سلطان اس دنیا سے گیا اس وقت ہی اگر دے دیا ہوتا زیور تو آج ان کا کاروبار کس قدر پھل پھول رہا ہوتا۔'' کیا کچھ نہیں تھا ان کے لہجے میں حسرت، افسوس، پشیمانی، ندامت.....

''آہ.....!'' انہوں نے تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

''اماں..... آپ کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہیں، اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ میں قیصرہ بھابی کو بلا لاتا ہوں۔ آپ یہ ان کے حوالے کر دیجیے.....'' شاہ نواز، اٹھتے ہوئے بولے۔

''ابھی نہیں.....'' محبوبہ خاتون کی آواز نے ان کے بڑھتے قدم روکے۔

''جہاں اتنی دیر ہوئی وہاں کچھ اور سہی..... مجھے لگتا ہے کہ اس زیور کے کچھ اور حقدار بھی ہیں۔'' وہ نحیف سی آواز میں بولیں۔

''کن حقداروں کی بات کر رہی ہیں اماں.....؟'' مہتاب اچنبھے سے بولیں۔

''بس بیٹا، میری زندگی تک تو پھر بھی کچھ مروت م

۔ لحاظ قائم ہے۔ میری آنکھیں بند ہونے کی دیر ہے، دکانوں کا بٹوارا بھی ہو جائے گا پھر وہ لوگ جن کو شرعاً دکانوں سے حصہ نہیں ملے گا ان کا کم سے کم زیور پر تو حق بنتا ہے ناں.....''

شاہ نواز تو نماز کے لیے اٹھ چکے تھے، قبل اس کے کہ مہتاب، اماں سے مزید تفصیل پوچھتیں۔ شہنیلا اور رقیہ بھابی آ گئیں۔ یوں یہ بات ادھوری رہ گئی۔

☆☆☆

''ایک دن کیفے سے گھر آتے ہوئے شہنیلا دکھائی دے گئیں مجھے۔ میں ان کا پیچھے کرتے ہوئے ان کے گھر تک جا پہنچا۔'' سکندر نظریں نیچی کیے بول رہا تھا۔ قیصرہ حیرت سے اس کا چہرہ تک رہی تھیں۔

''دو، چار دن کی مزید جاسوسی کے بعد، مزید کچھ معلومات ملیں..... اولاد ان کی کوئی نہیں تھی۔ ان کے میاں کا جو بیٹا پہلی بیوی سے تھا وہی ان دونوں کی واحد اولاد ہے، میں نے ابرام سے ذکر کیا تو اس نے مشورہ دیا کہ مجھے ان کے بیٹے سے ملنا چاہیے اور ان کی ساری حقیقت اس کے گوش گزار کرنی چاہیے۔'' قیصرہ نے گردن گھما کر ابرام کو دیکھا تو ابرام نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جمائیاں لینی شروع کر دیں ''پھر میں ان کے بیٹے سے ملا تھا۔ ابتسام وقار نام ہے اس کا۔''

''تو، کوئی فائدہ ہوا.....؟'' قیصرہ کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔ سکندر نے انکار میں گردن ہلائی۔

''اول تو اس نے یہ ماننے سے ہی انکار کر دیا کہ اس کے والد اور سوتیلی والدہ یعنی شہنیلا (step mother) کسی بھی قسم کی مجرمانہ ایکٹویٹی میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ دوسرے، اس نے الٹا مجھ پر الزام دھر دیا کہ میں بھی یقیناً ان لوگوں میں شامل تھا جو اس کی ماں کو زبردستی اپنے ہاں رکھ کر دوسرے لفظوں میں یرغمال بنا کر زبردستی ان کا نکاح کروانا چاہتے تھے۔''

''کیا.....؟'' مارے حیرت کے قیصرہ کا منہ کھل گیا۔

''جی! ان دونوں نے یہی اسٹوری سنائی ہوئی ہے اپنے لختِ جگر، نورِ نظر کو کہ والد کے انتقال کے بعد چونکہ شہنیلا بھری دنیا میں تنہا رہ گئی تھیں سو ان کے والد کے رشتے داروں مطلب کہ ہم لوگوں نے'' اس نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا'' ان کو کام کاج کے لیے نوکرانی بنا کر رکھ لیا اور پھر زبردستی ان کا نکاح کروانے لگے تھے کہ اچانک وقار صاحب نیکی کا فرشتہ بن کر ان کی زندگی میں آ گئے اور یوں اس مظلوم، معصوم، شہزادی کو ظالم رشتے داروں کی قید سے نجات دلوادی۔'' قیصرہ نے افسوس سے سر جھٹکا۔

''ضرورت ہی کیا تھی آخر تمہیں، گڑے مردے اکھیڑنے کی۔ نظر آ ہی گئی تھی وہ تو نظر انداز کر دیتے۔ کیا ضرورت تھی اتنی جاسوسیاں کرنے کی۔'' قیصرہ تاسف میں گھری بول رہی تھیں۔

''اتنا بڑا الزام لگایا تھا انہوں نے آپ پر..... بس نہیں رہا گیا مجھ سے۔'' سکندر، ماں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''بھول جاؤ سب۔'' قیصرہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''جی اور آپ بھی ایک بات بھول رہی ہیں، جان کی امان پاؤں تو یاد دلا دوں۔'' بڑی دیر سے خاموش بیٹھے ابرام نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مطلب، اجازت ہے'' اس نے ماں کی طرف دیکھ کر ابرو اچکائی۔

''بولو گے.....؟ یا اتاروں چپل.....'' وہ نیچے جھکیں..... چپل دیکھنے کو۔

''بتاتا ہوں..... بتاتا ہوں.....'' وہ ایک دم سیدھا ہوا۔

''آپ نے عائشہ سے متعلق کوئی مشورہ کرنا تھا غالباً سکندر سے۔'' ابرام کے کہنے پر قیصرہ کو ایک دم یاد آیا۔

''ہاں سکندر، کچھ دن پہلے بتول آئی تھی۔ رفاقت اور عائشہ کے رشتے کی بات کر رہی تھی۔ میں نے کچھ وقت لیا تھا کہ سکندر آ جائے تو مشورہ کر کے جواب دوں گی۔'' قیصرہ نے ایک ہی سانس میں بات مکمل کی۔

''رفاقت بھائی، مان گئے شادی کے لیے۔'' سکندر نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

''بتول کہہ رہی تھی کہ رفو سے ابھی بات نہیں کی، پہلے ہماری رائے جاننا چاہ رہی ہے وہ۔''

''آپ کا کیا خیال ہے.....؟'' سکندر نے گیند ماں کے کورٹ میں لڑھکائی۔

''میرا خیال.....'' قیصرہ سوچ میں پڑ گئیں۔

''ایک تو اتنا دور دراز گاؤں کا علاقہ.. پھر بتول اور بچے بھی ساتھ ہیں۔'' قیصرہ نے اپنے خدشات بیان کیے۔

''غالباً اسی قسم کے خیالات شہنیلا بی بی کے بھی تھے ناں، جب انہوں نے شادی سے انکار کیا تھا۔'' ابرام سر کھجاتے ہوئے بولا۔

''بس، رہنے دو..... سب جانتے ہیں اس نے کیوں کیا تھا شادی سے انکار۔'' قیصرہ نے نفرت سے سر جھٹکا۔

''ہم عائشہ کے رشتے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔'' سکندر نے کھنکھار کر یاد دلایا۔

''ویسے رفاقت بھائی جیسا شاندار انسان چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔'' سکندر بولا۔

''وہ ایک ناکام عاشق بھی ہیں جو کہ شادی ہوتے، ہوتے نہ ہونے سے دل برداشتہ ہو کر پچھلے بارہ سال سے شادی کے نام سے بھی بدکتے ہیں۔'' ابرام نے یاد دلایا۔

''کوئی عشق وشق کا سوگ نہیں منا رہا وہ..... بتول اور بچوں کی وجہ سے شادی نہیں کرتا کہ کل کو بیوی آ کر بہن، بھانجے، بھانجیوں پر چیخے چلائے گی۔ دیبا اور فرح کی طرح.....'' قیصرہ نے بتول کی کہی ہوئی بات دُہرائی۔

''ویسے ایک بھانجی کا مسئلہ تو میں حل کر سکتا ہوں۔'' ابرام بولا۔

''بھانجی کا کون سا مسئلہ ہے؟'' قیصرہ حیران ہوئیں۔

''مینا کو آپ بیاہ کر یہاں لے آئیں، میری بیوی بنا کر تو کم سے کم عائشہ اس پر چیخ چلا نہیں سکے گی۔'' ابرام نے بات مکمل کرتے ہی تکیہ اٹھا کر اپنے منہ پر رکھ لیا۔ قیصرہ کی ہنسی بڑی بے ساختہ تھی۔

''اچھا، تکیہ تو ہٹاؤ منہ پر سے۔'' وہ ہنستے، ہنستے بولیں۔

''میں شرما رہا ہوں۔''

''یہاں پر شرمانا نہیں، شرم سے ڈوب مرنا بنتا ہے، ہماری تایا زاد بہن کی بیٹی ہے، اس لحاظ سے بھانجی ہوئی وہ ہماری.....'' سکندر نے بھائی کو غیرت دلانے کی کوشش کی۔

''اب اگر بتول آپا اور ہمارے والدِ محترم کی شادی کچھ سال کے فرق سے آگے پیچھے ہوئی ہے اور ان کے بچے ہماری ایج کے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔'' ابرام نے تکیہ ہٹا کر سخت جذباتی انداز میں تقریر کرنے کی کوشش کی۔

''خیر، اسلام میں تو ایسی کوئی ممانعت نہیں ہے اور کوئی حرج بھی نہیں ہے، سوچا جا سکتا ہے اس بارے میں۔'' قیصرہ پُرخیال انداز میں بولیں۔

''اگر ایسا ہے تو پھر میرے اور گڑیا کے رشتے پر بھی تھوڑا غور وخوض فرما لیں۔ اس سے مینا یہاں تنہائی محسوس نہیں کرے گی۔'' سکندر سر کھجاتے ہوئے بولا۔

''یہ تکیہ لے لو.....'' ابرام نے تکیہ سکندر کی جانب اچھالا۔ ''یہاں پر بھی شرم سے ڈوب مرنا ہی بنتا ہے کیونکہ گڑیا بھی رشتے میں ہماری بھانجی ہی لگتی ہے۔'' ابرام نے خوب، خوب بدلہ لیا۔

''اچھا، بس بحث سمیٹو اب..... کافی رات ہو گئی ہے، سو جاؤ تم لوگ..... میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر بات کرتی ہوں بتول سے۔'' قیصرہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

فقط دس دن باقی تھے رفو اور شہنیلا کی شادی میں..... شاہ نواز اور مہتاب بازار گئے تھے کچھ خریداری وغیرہ کرنے دادی کو کھانسی کا بہت شدید دورہ پڑا تھا، چند سیکنڈ وہ ان کی کمر سہلاتی رہی مگر حالت مزید بگڑتی گئی۔ شہنیلا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، موبائل اٹھایا کسی کو کال ملانے کے لیے تو بیٹری لو اور موبائل تقریباً آف تھا۔

گھبراہٹ میں دوپٹا سر پر رکھ کر غفران تایا کے گھر کی طرف دوڑی..... اندر داخل ہوتے ہی دیبا بھابی سے ٹاکرا ہوا۔

''کیا ہوا شہنیلا خیریت ہے، اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟'' دیبا بھابی کو اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں کسی انہونی کا پیش خیمہ لگیں۔

''بھابی! دادی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے ایک دم ہی سے تایا، تائی بھی گھر پر نہیں ہیں پلیز..... ساحر یا ناصر بھائی یا تایا جان میں سے کسی کو بلا دیں۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''گھر پر تو صرف میں ہوں اس وقت، ساحر بھی بچوں کو لے کر پارک تک گئے ہیں۔ باقی سب بھی شاپنگ وغیرہ کے لیے گئے ہوئے ہیں۔'' دیبا بھابی پریشانی سے بولیں۔

''کیا ہوا دیبا.....؟'' آواز پر وہ دونوں چونک کر پلٹیں..... سینتیس، اڑتیس برس کا گھٹے ہوئے قد کا آدمی ڈرائنگ روم سے باہر نکلا۔

''اوہ..... شکر ہے وقار بھائی آپ ادھر ہیں، مجھے تو آپ کا خیال ہی نہیں رہا، گھبراہٹ میں۔'' دیبا بولیں۔

''وہ ساحر کی دادی کی طبیعت خراب ہوگئی ہے، آیئے ذرا دیکھتے ہیں چل کر۔''

''چلو.....'' ایک گہری اندر تک اترتی نگاہ سے شہنیلا کا سراپا جانچا اور وہ شخص آگے بڑھا۔

شہنیلا، دیبا اور دیبا کا بھائی وقار جس وقت دادی کے پاس پہنچے، وہ تقریباً بے دم سی ایک طرف کو سر ڈھلکائے پڑی تھیں۔

''دادی.....!'' شہنیلا تڑپ کر ان کی طرف بڑھی۔ ''آنکھیں کھولیں۔'' دیبا بھی قریب آ کر ان کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔

البتہ، دیبا کے بھائی وقار کا سارا دھیان شہنیلا میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے تو اس بزرگ خاتون پر ایک کے بعد دوسری نظر بھی ڈالنا گوارا نہیں کیا تھا۔ تب ہی دادی کے نحیف و نزار وجود میں جنبش ہوئی۔ وہ اشارے کی مدد سے شہنیلا اور دیبا کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''وقار بھائی! آپ ایمبولینس منگوایئے..... دادی کو اسپتال لے کر جانا ہوگا۔'' دیبا نے بھائی کو مخاطب کرنے کے ساتھ ہی نمبر نوٹ کروایا جس پر کال کر کے ایمبولینس منگوانی تھی۔

وقار، سر ہلاتے باہر صحن میں چلے گئے، ایمبولینس کال کر کے جس وقت وہ واپس کمرے میں آئے تو زیور کے کئی ڈبے سامنے کھلے پڑے تھے۔ بزرگ خاتون، دیبا اور شہنیلا کو ان کے متعلق کچھ ہدایات دے رہی تھیں۔

''یہ اس وقت کیا کر رہی ہو تم لوگ..... گھر لاک کرو..... ایمبولینس کے ساتھ جانا ہوگا۔'' وقار نے کہتے ہوئے زیور کی جانب نگاہ کی جس کی چکاچوند ان کی آنکھیں خیرہ کر رہی تھیں۔

''وہ، دادی زیور کے متعلق وصیت کر رہی تھیں.....'' دیبا ڈبے بند کرتے ہوئے بولی۔

وقار نے بزرگ خاتون کی جانب دیکھا جو اب تکیے پر نیم بے ہوشی کی سی حالت میں تھیں، دوسری نظر میں..... شہنیلا کا سراپا تھا جسے اپنی نگاہوں میں جذب کرتے، کرتے زیور پر جا کر ٹک گئی۔

☆☆☆

ایک بھونچال تھا جس نے گھر کے در و دیوار کو لپیٹ میں لیا تھا جس نے سنا وہ حیران رہ گیا۔

دادی کے قل سے اگلے دن اور اپنی شادی سے محض چھ روز قبل شہنیلا نے یہ کہہ کر شادی سے انکار کر دیا کہ وہ یہ شادی محض دادی کی خوشی کی خاطر کر رہی تھی۔ اب چونکہ وہ اس دنیا میں نہیں رہیں لہٰذا وہ ان سے کیے وعدے کو نبھانے کی پابند نہیں رہی۔

رفاقت بیگ یہ سب کچھ شہنیلا کے منہ سے سننا چاہتے تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ یہ انکار کس دباؤ کے تحت کر رہی ہے لیکن شہنیلا نے ان سے ملنے یا ان کے سامنے آنے سے سختی سے منع کر دیا۔

ان دنوں دیبا کی آمد و رفت شہنیلا کے پاس بہت

بڑھ گئی تھی۔ دو چار مرتبہ وہ شہنیلا کو لے کر بازار بھی گئیں۔

سوئم تک تو مہتاب گھر داری، مہمان داری اور میاں کی غم خواری میں مصروف رہیں..... چوتھے دن انہیں ساس کی چیزیں دیکھنے کا خیال آیا۔ تب ان پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ اماں نے زیورات کے جو ڈبے الماری میں رکھوائے تھے وہ وہاں موجود نہیں ہیں۔

ان کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی کیونکہ جس روز اماں کا انتقال ہوا، اس روز صبح سویرے وہ زیور کے ڈبے انہوں نے خود ترتیب سے الماری میں رکھے تھے۔ اس کے بعد دن میں وہ اور شاہ نواز بازار چلے گئے۔ تب تک اماں سے ملنے کوئی آیا نہ ہی ان کے کمرے میں گیا پھر بازار میں ہی انہیں اطلاع ملی کہ اماں اسپتال میں ہیں وہ لوگ سیدھے اسپتال پہنچے تھے۔

اس رات اماں کی میت واپس آئی تھی اور تب سے اماں کا کمرا مستقل لاک تھا۔ مطلب زیور اس دوران غائب ہوئے جب وہ اور شاہ نواز گھر سے نکلے اور تب گھر میں شہنیلا کے علاوہ کوئی دوسرا ذی روح نہیں تھا۔

کچھ دیر مہتاب اور شاہ نواز اماں کے کمرے میں بند کچھ بات چیت کرتے رہے پھر انہوں نے شہنیلا کو وہاں بلوایا اور یہ وہ لمحہ تھا جس سے وہ خوف زدہ تھی۔ اسے معلوم تھا اس سے زیور کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔ بات چالیس تولے سونے کی تھی سو پولیس کو بھی درمیان میں انوالو کیا جا سکتا تھا۔

وہ پانی، پی کر پسینے کے قطرے پیشانی سے پونچھ کر ہر ممکن حد تک اپنے چہرے کے تاثرات نارمل کیے، ان دونوں کے سامنے موجود تھی۔

''بیٹا! زیور، وہاں موجود نہیں ہے جہاں اماں نے رکھوایا تھا۔ ہمارے جانے کے بعد اماں نے تمہیں تو زیور کی جگہ تبدیل کرنے کے لیے نہیں کہا تھا؟'' شاہ نواز بہت دھیمے لہجے میں رسان سے اس سے مخاطب تھے۔ اس سوال کے جواب میں اسے کیا کہنا ہے۔ اس کی پریکٹس وہ کافی مرتبہ کر چکی تھی۔ سو تھوک نگل کر ہمت مجتمع کی۔

''نہیں تایا ابو مجھ سے تو دادی نے ایسا کچھ نہیں کہا..... شاید.....'' ایک مرتبہ پھر اس نے رک کر اپنا حلق تر کیا۔

''شاید..... قیصرہ چچی کو کہا ہو۔''

''قیصرہ.....؟'' اس نام پر شاہ نواز اور مہتاب دونوں چونکے تھے۔

''ان کا یہاں کیا ذکر.....؟'' مہتاب کا لہجہ از حد حیرت سموئے ہوئے تھا۔

''آپ کے جانے کے بعد وہ آئی تھیں دادی کی طبیعت معلوم کرنے تو میں تھوڑی بے فکر ہو کر نہانے چلی گئی تھی۔ میں باہر نکلی تو وہ جا چکی تھیں۔'' اس نے لہجے کا اعتماد متزلزل نہیں ہونے دیا۔

''میں دادی کے کمرے میں گئی تو وہ سو چکی تھیں۔ میری کوئی بات نہیں ہوئی ان سے..... پھر ان کی طبیعت بگڑنے لگی تو میں ان کو اسپتال لے گئی۔'' مہتاب نے الجھ کر میاں کو دیکھا۔

''قیصرہ بھابی نے تو ان تین دنوں میں ایسا کوئی ذکر نہیں کیا کہ وہ آخری دن بلکہ آخری وقت میں اماں کے پاس تھیں۔'' شاہ نواز کے چہرے پر بھی تفکر کے سائے تھے۔ شہنیلا وہاں سے ہٹ چکی تھی۔

اب وہ اپنے کمرے میں بیٹھی، ایک کتاب کھول کر اس میں سے مرجھائے ہوئے گجرے نکال کر ان کے سوکھے ہوئے پھولوں کو ہاتھوں سے مسل رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ پھول اس کا دل ہے جس کو اس نے اپنے ہاتھوں سے مسل دیا ہے۔

☆☆☆

ابتسام صبح سے جانے کدھر تھا، شہنیلا کے دل کو دھکے لگے ہوئے تھے..... مہرن آپا دو مرتبہ کھانے کے لیے بلانے آ چکی تھیں۔

وہ طبیعت کی خراب کا بہانہ بنا کر کمرے میں پڑی ہوئی تھیں۔

ذہن کے پردے پر کبھی ایک منظر ابھرتا، کبھی دوسرا..... وہ ایک منظر میں ڈوبتی تو دوسرا منظر سرک، سرک کر ان کے قریب آتا اور ان سے لپٹ جاتا۔ ذہن پر دباؤ اور ضمیر پر بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اب وہ بارہ سال پہلے کے منظر میں سانس لے رہی تھیں۔

دادی کی میت اٹھائی جا چکی تھی سب شدتِ غم سے نڈھال تھے۔ باپ کی موت کے بعد یہ پہلا صدمہ تھا جس نے اندر تک شہنیلا کو ہلا ڈالا تھا۔ وہ سن بیٹھی خواب کی سی کیفیت میں سب کو چلتا پھرتا دیکھ رہی تھی۔ تب ہی دیبا بھابی اس کے پاس آئی تھیں۔ مہتاب تائی سے اجازت لے کر وہ اسے اپنے پورشن میں لے آئی تھیں کہ چائے کے ساتھ دو گولی کھلا دوں گی تو طبیعت کچھ بہتر ہو جائے گی۔

سب لوگ شاہ نواز تایا کے ہاں تھے، دیبا بھابی کے گھر سناٹا پڑا ہوا تھا۔ اس سناٹے کو دو لوگوں کی آواز توڑ رہی تھی۔ شہنیلا کو لگ رہا تھا کہ ابھی اس کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی۔

وقار اور دیبا کی باتیں سن کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔

''کیسی باتیں کر رہی ہیں بھابی آپ.....؟ ابھی تو دادی کو رخصت ہوئے ایک پہر بھی پورا نہیں گزرا۔ اتنا خون سفید ہو گیا ہے آپ کا۔'' وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی۔

''دیکھو بنی.....!'' وقار نے اپنا مکروہ ہاتھ شہنیلا کے کندھے پر رکھا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

''تم اس بات کو کبھی ثابت نہیں کر سکو گی کہ میں اور دیبا تمہاری دادی کی موت کے وقت وہاں موجود تھے۔ نہ ہی زیور کبھی ہمارے پاس سے برآمد ہو پائے گا پہلا شک تم پر ہی جائے گا۔ ماں، باپ تمہارے سر پر نہیں ہیں۔ دادی کو آج سب نے دفنا دیا۔ پیچھے ہے ہی کون..... جس کے پیچھے تم اتنا مر رہی ہو.....'' شہنیلا نے تڑپ کر اس منحوس آدمی کو دیکھا۔

''یہی رشتے دار کل تمہیں پولیس کے حوالے کر آئیں گے پھر ساری زندگی جیل میں چکی پیستے گزار دو گی..... کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا کہ زیور

تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"دیکھو شہنیلا اس سے بہتر موقع تمہیں زندگی میں دوبارہ نہیں ملے گا۔" دیبا بھابی بولیں..... "وقار بھائی تمہیں اپنے نکاح میں لینا چاہتے ہیں، تمہیں اپنے ساتھ باہر لے جائیں گے۔ یہ کنگلا اسکول ماسٹر رفو، بہن اور اس کے بچوں کی ذمے داریوں کا بوجھ ڈھوتے، ڈھوتے خود بھی ختم ہو جائے گا، تمہیں بھی گہنا دے گا۔ کچھ نہیں ملے گا تمہیں یہاں رہ کر۔"

شہنیلا کا دل کر رہا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ کر کہیں دور چلی جائے۔

"دیکھو..... اس زیور میں ہم تینوں برابر کے پارٹنر ہیں۔" اب کے اس گھاگ انسان نے پینترا بدلا۔

"دیبا کو اس کا حصہ مل جائے گا۔ تمہیں تمہارا، تم رفو سے شادی سے انکار کر دو..... میں تمہیں اپنے نکاح میں لے لوں گا۔" وقار اپنے مکروہ عزائم سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔

"اور رہی بات زیور کی، تم سے کوئی پوچھے تو لاعلمی کا اظہار کر دینا یا کسی کے بھی سر پر ڈال کر اپنی جان چھڑا لو....." اس سے زیادہ سننے کی سکت اس میں نہیں تھی۔ وہ اٹھی اور بھاگتی ہوئی داخلی دروازہ پار کر گئی۔

☆☆☆

"اپنے باپ سے نہیں پوچھا کبھی.....؟" دیبا، خوبرو اور دراز قد بھتیجے کو اپنے سامنے پا کر کچھ نرم پڑی تھیں۔

"کئی بار پوچھا.....؟" ابتسام دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنساتے ہوئے بولا۔

"مگر.....؟" وہ رک گیا۔

"مگر کیا.....؟" دیبا نے استفسار کیا۔

"مگر انہوں نے سچ کبھی نہیں بتایا۔ وہ بتا دیتے تو مجھے اتنی دور آپ کے پاس نہ آنا پڑتا۔"

"جو گزر گیا، سو گزر گیا۔ کچھ حاصل نہیں ہوگا تمہیں سچ جان کر..... اس لیے چھوڑ دو....."

"پلیز پھپھو..... کم سے کم آپ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں..... مجھے شروع سے آخر تک ساری بات بتائیں۔" وہ لجاجت سے کہتا ہوا ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

چند لمحے وہ خاموش رہیں گویا فیصلہ کر رہی ہوں بتانا چاہیے یا نہیں پھر دماغ نے سچ بولنے کا فیصلہ سنا دیا۔ ویسے بھی ان کے ہاتھ کیا آیا تھا شریکِ جرم بن کر انہوں نے بھائی کا پورا، پورا ساتھ دیا۔ شہنیلا کو نکاح کے لیے راضی کرنا..... پھر مہرن آپا کے ہاں خاموشی سے اس کا نکاح وقار سے کروانا۔ بدلے میں ان کو کیا ملا.....؟ بھائی، دلہن لے کر ان کے حصے کا زیور لے کر چلا گیا اور ایسا گیا کہ پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ ان کے ہاتھ تو خسارہ ہی آیا تھا۔ سو انہوں نے سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

"گھن آ رہی ہے مجھے آپ کے وجود سے..... نفرت محسوس ہو رہی ہے۔" وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا رو رہا تھا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس عورت کو میں اپنی سگی ماں سے بڑھ کر مان دیتا رہا اس کا ماضی اتنا داغ دار ہوگا کیوں کیا آپ نے ایسا.....؟ کیوں، آپ نے اپنوں کو اتنا بڑا دھوکا دیا.....؟ بتائیں مجھے۔" اب وہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

"جب، قیصرہ آنٹی کا بیٹا مجھے لندن میں ملا..... اور اس نے مجھے آپ کی حقیقت بتائی تھی تو میں اس کو ذلیل کر کے وہاں سے آ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہوگا..... میری ماں ایسی نہیں ہو سکتی کیونکہ..... کیونکہ مجھے آپ پر بھروسا تھا..... مگر..... آپ نے میرے بھروسے کا، میرے اعتبار کا خون کر دیا ماما۔" وہ بلک رہا تھا۔

"جھوٹ بول رہے ہیں وہ....." ایک دم ہی شہنیلا کے بے جان پڑتے وجود میں جنبش ہوئی۔

"کچھ نہیں کیا میں نے..... قیصرہ چاچی نے چرائے تھے زیور۔" وہ چلائی۔

"بس کر جائیں ماما..... بس کر جائیں کون، کون جھوٹ بول رہا ہے۔ میں الگ، الگ سب سے مل کر آ رہا ہوں، شاہ نواز انکل، مہتاب آنٹی دیبا پھپھو، قیصرہ آنٹی اور....."

"اور.....؟" وہ منتظر نظروں سے اسے دیکھتے

ہوئے بولیں۔

''اور رفاقت انکل.....''

ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔اس نام پر دل میں.....

''بقول آپ کے.....آپ کی دادی کی وفات کے دن قیصرہ آنٹی ان سے ملنے آئی تھیں؟''

''ہاں، تو اس میں جھوٹ کیا ہے۔آئی تھیں وہ دادی سے ملنے۔''

''اس روز آپ کی شادی کے سلسلے میں بتول آنٹی اور رفاقت انکل، قیصرہ آنٹی کے گھر آئے ہوئے تھے۔رفاقت انکل سارا وقت قیصرہ آنٹی کے بچوں کے ساتھ ان کے گھر پر تھے۔اور قیصرہ آنٹی، بتول آنٹی کے ساتھ سارا وقت بازار میں تھیں۔وہ ہرگز وہاں نہیں گئی تھیں۔''

شہنیلا کا رنگ لٹھے کی طرح سفید پڑا اس بات پر.....

''آپ کے تمام ددھیال والے یہ بات جانتے تھے۔آپ کے اچانک اور خفیہ نکاح سے ان کو ساری گیم سمجھ آگئی تھی مگر وہ آپ کی عزت کی خاطر خاموش رہے اور معاملہ پولیس تک نہیں لے کر گئے۔''

شہنیلا کے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے۔

''میں.....؟ مجھے.....بلیک میل کیا تھا وقار نے.....'' الفاظ ٹوٹ، ٹوٹ کر اس کے لبوں سے ادا ہو رہے تھے۔

''میں مجبور تھی۔مجھے مجبور کیا تھا دیبا اور وقار نے.....'' وہ بستر پر گر سی گئیں، بولتے، بولتے۔

''it's too late mama'' اب آپ کی کوئی بات قابلِ اعتبار نہیں رہی۔'' وہ الٹے قدموں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

شہنیلا اسے آوازیں دیتی رہ گئیں۔

☆☆☆

''یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔'' ابرام نے فخر سے کالر کھڑے کیے۔''میں نے کہا تھا، ان کے بیٹے سے ملو جا کر۔'' ابرام ہاتھ میں پکڑا خط سب کو سنانے کے بعد بولا۔

''ویسے ان دونوں سے تو ان کا بیٹا ہی بہتر نکلا۔ جس نے حقیقت جاننے کے بعد ماں، باپ کی طرف سے معافی مانگ لی۔'' سکندر، عائشہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہمیں کیا فرق پڑتا ہے، اب ان کی معافیوں، تلافیوں سے۔'' قیصرہ یاسیت سے بولیں۔

''اچھا آپ پریشان نہ ہوں۔ آج آپ کے تین بچوں کے دن تاریخ طے ہوئے ہیں آج خوشی کا دن ہے۔''

''ہاں.....آج تو واقعی خوشی کا دن ہے۔'' قیصرہ، عائشہ کو ساتھ لپٹاتے ہوئے بولیں۔سکندر ان کو دیکھ کر مسکرایا۔

☆☆☆

تنہائی کیا ہوتی ہے، اس کا اندازہ شہنیلا کو آج ہو رہا تھا۔وہ تہی داماں، بے سروساماں اس شیلٹر ہوم میں بیٹھی اپنی گزشتہ زندگی کو سوچ رہی تھی۔وہ رشتے جن کو وہ دھوکا دے کر آگئی تھی۔یہ دیبا اور وقار کی بلیک میلنگ نہیں تھی جس نے اس کو اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔

یہ اس کا لالچ اور کم ظرفی تھی۔وہ گاؤں کی تکالیف پر لندن کی زندگی کو ترجیح دیتے ہوئے ان رشتوں کو بالکل فراموش کر گئی جنہوں نے ماں، باپ سے بڑھ کر اس کا خیال رکھا تھا۔

اب وہ طلاق نامہ اس کی گود میں پڑا تھا جو دے کر وقار نے اسے گھر سے نکالا تھا۔اس کے آخری الفاظ سیسے کی طرح اس کے کانوں میں پگھل رہے تھے۔

''منحوس عورت! تیری وجہ سے میرا بیٹا مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔اب تو بھی یہاں نہیں رہ سکتی۔''

اور آج وہ یہاں بے مول ہوئی بیٹھی، اپنی زندگی کے انمول رشتوں کو یاد کر کے رو رہی تھی۔

وہ انمول رشتے جو اب زندگی میں اسے دوبارہ کبھی نہیں ملنے تھے۔

❁❁❁

تریا چلتر ۲

سعدیہ ہما شیخ

"کملیا ہر بات بیوی کو بتانے والی نہیں ہوتی۔ مجھے دیکھ..... میں اپنے کسی معاملے کی بھنک اپنی بیویوں کو پڑنے نہیں دیتا۔ یہ عورتوں کا شغل ہوتا ہے کہ جب تک ہر بات مردوں کو نہ بتا دیں ان کی روٹی ہضم نہیں ہوتی..... مرد بن مرد اور اپنے جھمیلوں سے بیوی کو دور رکھ۔ یاد رکھ... عورت ذات پیٹ کی بہت ہلکی ہوتی ہے۔ راز اپنے سینے میں نہیں رکھ سکتی۔" چوہدری جلال بڑے سے احاطے میں حقہ گڑگڑاتے ہوئے اپنے چچا زاد بھائی طارق کو فخر سے گردن اکڑاتے ہوئے صلاح دے رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ازلی رعونت اور تکبر بول رہا تھا۔ ویسا ہی جیسے وہ عورت کو پیر کی جوتی سمجھ کے دھتکار دیتا تھا۔ پسند آئی تو ٹھیک نہ آئی تو بدل دی۔

دس سال پہلے چاٹی میں ہاتھ والی مدھانی لگاتے ہوئے میں نے اپنے شوہر کا رعونت بھرا لہجہ اور انداز دیکھا تھا۔ مجھے آج بھی یہی لگتا تھا کہ چوہدری بڑے احاطے میں چارپائی پر پاؤں پسارے حقہ گڑگڑاتے رعونت کے

ساتھ بولتے ہوئے دیکھ تو طارق کو رہا ہے اور سنا مجھے اور اپنی باقی تین بیویوں کو رہا ہے۔ جو ساری زندگی سے عبادت کی طرح چوہدری کی جی حضوری میں لگی ہوئی تھیں اور جن کی طرف دیکھنا بھی چوہدری کو گوارا نہ تھا۔ وہ انہیں نہایت حقارت سے دیکھتا اور سر جھٹک دیتا تھا۔

"بدبخت، بانجھ عورتیں۔" اس کے لہجے میں ایسی حقارت ہوتی کہ اکثر نیلگوں آسمان بھی غصے میں سیاہ پڑ جاتا۔ آندھیوں کو جلال آجاتا اور بدلیوں کی اوٹ میں بجلی کڑکنے لگتی، بارش دھڑ، دھڑ برسنے لگتی تھی اور چوہدری کی مربعوں پر پھیلی زمین پر ہری بھری فصلیں تباہ ہو جاتی تھیں۔

☆☆☆

مجھے لگتا تھا وقت آج بھی دس سال پیچھے ہی کھڑا۔ جب میں نے اپنے شوہر کے الفاظ سن کر پلو سے باندھ لیے تھے... وہی حویلی کا وسیع احاطہ تھا۔ وہی ملازمین کی بھنبھناہٹیں تھیں۔ وہی حویلی کے معاملات تھے... وہی چوہدری کی پہلی تین خاموش، خاندانی اور عبادت گزار بیویوں کے معمول تھے۔ دس سال پہلے وہ کبھی کبھار حویلی کے معاملات میں پھر بھی حصہ لے لیتی تھیں۔ مگر میرے آنے کے بعد اُن کی حیثیت پرانے بدرنگ فرنیچر سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ میری تینوں سوتنیں چوہدری کی رشتے دار تھیں۔ بڑے گھروں کی خاندانی عورتیں..... جو اپنے ساتھ جہیز میں لمبی چوڑی جائدادیں لائی تھیں۔ ٹرک بھر بھر کے سامان اور سو، سو تولہ زیورات لائی تھیں۔ آج ان مہارانیوں کے وقت کا سورج بالکل غروب ہو چکا تھا۔ ان کا دن ڈھل چکا تھا اور ان پر وقتِ شام کا پہرا آچکا تھا۔

اور میں جو ایک غریب کم حیثیت خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ جو حویلی میں کسی تیسرے درجے کی ملازمہ سے ایک دم چوہدری کی منظورِ نظر ٹھہر گئی تھی۔

اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا میں نے اسی لمحے سوچ لیا تھا کہ مجھے بھی اپنے معاملات کو راز رکھنا ہوگا اور اسی وجہ سے معمولی گھر سے تعلق رکھنے کے باوجود کامیاب عورت ہوں اور شوہر کے ساتھ، ساتھ سوتنوں پر بھی پلہ بھاری ہے۔ یہ سارا کمال میری تین اولادوں کا تھا۔ جو چوہدری کے دل کا چین اور اس کی ساری جائداد کے حقیقی وارث تھے۔ جو نعمتیں چوہدری کی خاندانی بیویاں اسے دینے سے قاصر تھیں۔ وہ میرے وجود سے اسے میسر تھیں۔ میں اچانک ہی ایک کم ذات عورت سے حویلی کی مالکن و مختار ہو گئی تھی۔

میں دیکھا کرتی تھی کہ چوہدری کی بیویوں کے چہروں پر حسد و رشک کے تاثرات امڈ آتے تھے۔ ہر دفعہ جب میں حاملہ ہوتی تو چوہدری کی بیویاں گوشہ نشین ہو جاتی تھیں۔ ان کی عبادت میں اور خشوع آجاتا تھا۔ اور وہ اپنے حجروں سے باہر نہیں آتی تھیں۔ مجھے پورا یقین تھا۔ حسد ان کو گوشہ نشینی پر مجبور کر دیتا ہے۔ چوہدری کے تین بچے پیدا کرنے کے بعد میری حیثیت مستحکم ہو چکی تھی۔ اب کوئی بھی دوسری عورت مجھے چیلنج نہیں کر سکتی تھی۔ پوری حویلی پر میرا راج تھا اور چوہدری میرا عمر بھر کے لیے ممنون بھی تھا۔

ہاں میری وجہ سے وہ اپنی برادری اور پوری دنیا کے سامنے سینہ تان کے چل سکتا تھا۔ اس کے تین بچے اس کا غرور تھے۔ اس کا مان تھے۔ اس کا فخر تھے۔

آج بھی وہی دالان تھا۔ وہ ہی حویلی تھی... وہی غلام گردشیں تھیں۔ جن میں چکرا، چکرا کر میری تینوں سوتنیں ہمیشہ کے لیے اپنے حجروں میں محصور ہو گئی تھیں۔

"روٹی ٹکر ہی کھانا ہے ناں کھاتی رہیں۔ چوہدری بن پھل کے درختوں کو کاٹ دیتا ہے۔ میرا شکر ادا کریں۔ کاٹ کے پھینکا نہیں۔" چوہدری ان کو حقارت سے دیکھتا اور سر جھٹک دیتا تھا۔

چوہدری کا غرور اکثر میرے اندر ٹھنڈی پھریری بھر دیتا تھا۔ مجھے سرما کی شدید ٹھنڈ میں بھی پسینہ آجاتا۔

"میری اصل شہزادی تو، تو ہے میری جان۔ میرے دل کا سکون اور میرے وارثوں کی ماں۔" وہ ہر سال میرے لیے نئے کنگن بنواتا۔ نئے، نئے طلائی زیورات لاتا اور اکثر میں دل سے خوش نہیں ہو پاتی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرے اندر سے حقیقی خوشی ہجرت کر چکی تھی۔

اب مجھے یہ سونے کے گہنے اور ریشمی پوشاک

چبھنے لگی تھیں اور چوہدری کی سالوں پہلے کہی باتیں میری سماعتوں پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھیں۔

''عورت ذات پیٹ کی ہلکی ہوتی ہے۔ کوئی راز، راز نہیں رکھ سکتی۔''

اور تب ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چوہدری کے اس فرمان کو جھٹلا کے دکھانا ہے۔ میرے اندر جیسے ایک خیال پکتا رہا، ابلتا رہا۔

یہ انہی دنوں کی بات تھی جب چوہدری مجھ پر بھی سوکن لانے کا سوچ رہا تھا۔ سال گزرنے کے بعد بھی گود ہری نہ ہونے پر میری نیندیں حرام ہو گئیں۔ میں جو نیچ، کم ذات اور غریب گھر سے تھی۔ چوہدری مجھے بھی اپنی خاندانی بیویوں کی طرح ایک حجرہ نہ بنا کے دیتا بلکہ مجھے طلاق دے کر گھر بدر کر دیا جاتا۔

حویلی میں سجانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

میں نے اڑتی، اڑتی یہ ہوائیاں اور شورشیں سن رکھی تھیں۔ اور اب فیصلہ کر چکی تھی کہ چوہدری کا کوئی داؤ چلنے نہیں دوں گی۔ چوہدری جو میرے سمیت اپنی ہر بیوی کو کم عقل اور جاہل کہتا تھا۔ اسے ہم ان پڑھ عورتوں کو طعنے مارنے کا بہت جلد موقع مل جاتا تھا۔ وہ ہمیں بے عقل، دماغ سے خالی، بانجھ عورتیں کہتا۔

ایک سال بعد میں بھی ان پہلی تین بانجھ عورتوں میں شامل ہو چکی تھی۔ اب چوہدری نئی بیوی لانے کا سوچ رہا تھا۔

اور میرے سر پر خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ میں چوہدری کو کیسے قائل کروں؟ اسے کیسے سمجھاؤں یا کسی طرح میڈیکلی علاج معالجے کی طرف راغب کروں؟ آج کل تو ہزاروں علاج اور سیکڑوں طریقۂ کار تھے۔ چوہدری مہنگے سے مہنگا ڈاکٹر بھی افورڈ کر سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ چوہدری کو کیسے تیار کیا جاتا؟

خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ چوہدری موسمی بخار میں مبتلا ہو کر لمبا بیمار پڑ گیا تھا۔

گاؤں کے حکیم سب فلاپ ہوئے تو شہر کی طرف

حدیث نبویؐ

نماز کے لیے سکون کے ساتھ جانا چاہیے

حدیث نبویؐ۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''نماز کے لیے دوڑتے ہوئے مت آیا کرو بلکہ اطمینان اور سکون کے ساتھ آیا کرو، جتنی نماز مل جائے وہ پڑھ لیا کرو اور جو رہ جائے اسے مکمل کر لیا کرو......''

(مسند احمد، جلد چہارم حدیث 3606)

بے بسی

ایک آدمی کو ساگ بہت پسند تھا وہ روزانہ گھر میں ساگ پکواتا۔ جب کھانے بیٹھتے تو وہ ہمیشہ اپنے بیٹے سے کہتا۔ ''کھانا بسم اللہ سے شروع کیا کرو ورنہ شیطان کھانے میں شامل ہو جاتا ہے۔'' لیکن بیٹا ہر بار بسم اللہ کہنا بھول جاتا ہے۔

ایک دن وہ بسم اللہ کہے بغیر ساگ کھانے ہی والا تھا کہ شیطان خود آ گیا اور روتے ہوئے بولا۔ ''ٹریں کدی تے بسم اللہ کہہ لیا کر، ساگ کھا، کھا کے میں مرن والا ہو گیا واں......''

از: ثمینہ کوکب، جہلم

رجوع ہوا۔ میں نے اپنی اس عقل کو جو چوہدری کے نزدیک کسی کھوتے کے دماغ سے مشابہ تھی کو استعمال کرتے ہوئے چوہدری کو جیسے تیسے گائنا کالوجسٹ کے پاس جانے کے لیے رضامند کر لیا جس نے ہم دونوں کو ٹیسٹ لکھ دیے نہ جانے چوہدری کس رو میں تھا کہ بلا چون و چرا ٹیسٹ کروا لیے رپورٹ کلیئر آنے کی خوش خبری میں نے چوہدری کو دی تو وہ غرور سے بولا ''جا کے ان بانجھ عورتوں کو بتا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل ہی نہیں''۔

اب دعا کی ضرورت تھی۔

چوہدری کچھ بہتر ہوا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے پیر مرشد جن کی دعا سے وہ ٹھیک ہوا ہے ان کے آستانے پر حاضری دے اور سلام کر آئے۔ اس ضمن میں چوہدری مجھے بھی اپنے ساتھ دعا کے لیے لے گیا تھا۔ اور میرے

لیے پیر صاحب نے خصوصی دعا اور چلوں کے اہتمام کا ارادہ کرلیا تھا... اور جلد ہی پیر صاحب کی کرامات اور دعا سے میری گود ہری ہوگئی تھی۔

اِدھر چوہدری کے صحت یاب ہوتے ہی حویلی میں ایک مرتبہ پھر اس کی نئی شادی کا چرچا سنائی دینے لگا تھا۔ اور جس دن چوہدری نے ایک اور نکاح کرنے حویلی سے نکلنا تھا عین اسی روز میں نے چوہدری کو ایک بڑی خوش خبری دی تھی۔ چوہدری یہ سن کر حیرت و خوشی اور بے یقینی سے دم بخود رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے سہرے کے پھول نوچ کر اچھال دیے اور خوشی سے دیوانہ وار چلانے لگا۔

''ان بدبخت بانجھ عورتوں کو بتاؤ۔ چوہدری جلال کا وارث آنے والا ہے۔'' چوہدری پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا اور اپنی پہلی بیویوں کو حقارت سے کہہ رہا تھا۔

پھر پوری حویلی میں مٹھائیاں بانٹی گئی تھیں اور دس دن غریبوں میں کھانا تقسیم کیا گیا۔ حویلی میں جشن کا سماں تھا چوہدری ہر روز میرے نام پر ایک بکرا صدقہ کرتا۔

اور ایک بکرا پیر صاحب کو بھیج دیا جاتا تھا۔

اور یوں میں نے چوہدری کو اوپر تلے تین اولادوں کا تحفہ دیا۔ ہر بچے کی پیدائش کے بعد میں پیر صاحب سے دعا لینے جاتی تھی اور کچھ ہی دنوں بعد نئی خوش خبری ہماری منتظر ہوتی اور وہ جو بیویوں کو باتیں بتانے کے حق میں نہ تھا اپنے سارے معاملات میرے سپرد کر بیٹھا۔

یوں وقت گزرتا رہا۔ چوہدری کی نیک، پاک باز بیویاں مجھے حسرت و رشک سے دیکھ، دیکھ کر ایک، ایک کر کے آنکھیں بند کرتی چلی گئی تھیں۔ اب میں تھی اور میرا راج پاٹ تھا۔

پوری حویلی میں میرا سکہ چلتا تھا اور چوہدری میرے سامنے پر بھی نہیں مار سکتا تھا۔ سارے اختیارات میرے ہاتھ میں تھے۔ چوہدری اپنی ساری زمین جائداد میرے اور میرے بچوں کے نام منتقل کر چکا تھا۔ اب اس کی حیثیت کسی فالتو پرزے سے زیادہ نہیں تھی۔

مجھے چوہدری کی متکبر آواز کبھی، کبھی اچانک ... بے چین کر دیتی تھی۔

''جاؤ ان بانجھ عورتوں کو بتاؤ۔ چوہدری جلال کا وارث آرہا ہے۔''

یوں ہی وقت گزرتا رہا۔ بچے بڑے ہوتے گئے۔

چوہدری کی آوازیں میرا پیچھا کرتی رہیں۔

''جاہل، ان پڑھ اور کم عقل عورتیں۔ جتنی بھی چالاک بن جائیں۔ عقل ان کی گٹوں میں ہی رہتی ہے۔''

اور تب میری آنکھوں میں تمسخر خاک کی طرح اڑنے لگتا تھا۔ آنکھوں میں ریت بھر جاتی تھی اور سارے منظر دھندلے پڑ جاتے تھے۔ خوشیوں کے جھولے میں جھولتے میں چوہدری جلال... کو بچوں پر محبت لٹاتے دیکھتی اور اکثر بے حس و حرکت اور بے سانس ہو جاتی تھی۔ میرے اندر ٹیس سی اٹھنے لگتی تھی۔

مجھے لگتا تھا.....

عورت کمزور ہے نہ بے عقل۔ بس عورت چوہدری جیسے مردوں کے ہاتھوں مجبور ہے۔

جو گھر سے بے گھر ہونے اور بے سائبان ہونے سے ڈر جاتی ہے۔ جو ہر صدی میں مرد کی حاکمیت اور ظلم کا شکار ہے۔

مجھے لگتا۔ میں چوہدری کی پہلی بیویوں سے زیادہ مجبور اور بے بس تھی۔ مجھے لگتا تھا اگر چوہدری مجھے طلاق دے دیتا تو میں اپنے اصل کی طرف لوٹ جاتی۔ جہاں میری ماں مجھے اپنے دائمی پیشے پر لگا دیتی یا کسی وڈیرے کے ہاتھ فروخت کر دیتی۔ یا میں کسی دلال کے کاروبار کی رونق بن جاتی۔

میرے سامنے میرا خوفناک مستقبل کھڑا تھا۔ جو بہت بھیانک اور تکلیف دہ تھا۔ اسی لیے وہ دن دردِ دل بن گیا۔

جن ڈاکٹری رپورٹس کو جلانے کے بعد اس کی راکھ بھی فلش میں ہمیشہ کے لیے بہادی تھی جس پر واضح لفظوں میں لکھا تھا کہ ''چوہدری قدرتی طور پر باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہے۔''

❁ ❁ ❁

''اگلے ماہ خرم اور فائقہ کی فیس کے ساتھ فنڈ بھی جمع کروانے ہیں۔ یونیفارم کا کلر بدل دیا ہے اسکول والوں نے، وہ بھی نئے لینے پڑیں گے۔ آپ ذہن میں رکھیے گا۔'' گرم، گرم پراٹھے مرتضیٰ کے سامنے رکھتے ہوئے شہرین نے کہا تو رغبت سے ناشتا کرتے مرتضیٰ کا ہاتھ ایک پل کو رکا تھا۔

''یار! ایک تو مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں اسکول والے فیس کے ساتھ یہ فنڈ، ڈونیشن اور آئے روز یونیفارم کا کلر تبدیل کر کے نئی آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔ یعنی غریب انسان کا بچوں کو اچھے اسکول میں پڑھانا بھی ایک برے خواب کا سا ہے۔'' وہ جیسے کراہ کر رہ گیا۔ دکھی لہجے میں کہتے اس نے پانی کا گلاس اٹھا کے منہ سے لگایا۔

''اچھا آپ ناشتا تو ٹھیک سے کریں۔ اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا، آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔'' شہرین نے اس کی خالی ہوتی کٹوری دال سے بھر

مسبب الاسباب

کنیز زہرا

دی۔ وہ کھانا اتنے مزے کا بناتی تھی کہ کھانے والا انگلیاں چاٹ کے رہ جاتا۔ اب بھی وہ شہرین کو پریشانی سے نکالنے کی نیت سے خوشبودار، خوش ذائقہ سی دال کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ رات کی پکی دال صبح گرما گرم پراٹھے سے بہت مزیدار لگتی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ سفید پوش لوگوں کا سب سے بڑا مددگار اللہ ہی تو ہے۔ میرے سینئر عمیر صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔ میں ان سے قرض لے لوں گا۔ دکھ تو یہ ہے کہ عائشہ کی شادی کا قرض اسی ماہ میں چکایا تھا۔ میں پھر قرض کا تقاضا کرنے پہنچ جاؤں۔ وہ کیا سوچیں گے۔'' افسردگی سے پُر لہجہ دل کی پکڑ دھکڑ کا شکار تھا۔

''عائشہ آپ کی بہن ہے، آپ کا فرض تھا اس کی شادی پر پیسہ لگاتے..... اور فرض نبھا کر جتایا نہیں کرتے۔ ویسے بھی میں نے تو آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے جاب کی اجازت دے دیں۔ میں نے بی کام کیا ہے کیا فائدہ اس تعلیم کا اگر یہ میرے بچوں کے یا آپ کے کام نہ آئے۔'' شہرین کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح اصرار تھا، احساس تھا۔ وہ اسے دیکھ کے رہ گیا۔

''تم اپنے والدین کی اکلوتی اور لاڈلی ہو، کیا چچا نے کبھی تمہیں جاب کی اجازت دی؟ رفیق چچا کی بیٹی بیوہ ہیں۔ پانچ بچوں کا بھی ساتھ ہے کیا انہوں نے کبھی جاب کرنے کا سوچا؟'' دبے، دبے غصے میں اسے باز رکھتا مرتضیٰ پراٹھا ویسے ہی چھوڑ کر بیڈ سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

''آپ ہر بات پر جذباتی کیوں ہو جاتے ہیں۔ جاب کرنا کوئی گناہ تو نہیں۔ ویسے بھی ابا ہم سب کو اپنی آمدن پر پال سکتے تھے اس لیے انہوں نے ہمیں جاب کے جھنجٹ میں پڑنے سے روکا۔ فرحانہ باجی پڑھی لکھی نہیں پھر بھی وہ لوگوں کے کپڑے سی کر اپنے بچوں کی تعلیم کا خرچ اٹھاتی ہیں۔ میں کیا پڑھی لکھی ہو کے بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھی رہوں، کیا میرا فرض نہیں کہ مشکل میں آپ کا ساتھ دوں؟'' ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں نظر آتے مرتضیٰ کے عکس پر نظر جمائے بولتی شہرین کے اداس لہجے میں بدستور اصرار پنہاں تھا۔

''مشکلات تمام عمر نہیں رہتیں مگر احساس ٹھہر جاتا ہے۔ تم جب بھی جاب کی بات کرتی ہو، مجھے دکھ ہوتا ہے کہ میں بچوں کو اور تمہیں بہتر زندگی نہیں دے سکتا۔ مجھے یہ احساس بڑی شدت سے کچوکے لگاتا ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ جلد پارٹ ٹائم جاب مل جائے پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' دراز میں رکھی گھڑی کلائی پر باندھ کر اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''میں بس آپ کا ساتھ دینا چاہتی تھی مرتضیٰ! جاب میری ترجیحات میں شامل نہیں، آپ کی خوشی میرے لیے سب سے اہم ہے۔'' روہانسے لہجے میں وضاحت دیتی شہرین کے چہرے پر سچائی کے رنگ نمایاں طور پر ثبت تھے۔ مرتضیٰ کا دل پل میں پگھلا تھا۔

''شہرین! میرا بس اتنا سا ساتھ دے دو کہ تھوڑا سا صبر کر لو۔ میرا وعدہ ہے کہ میں جلد حالات کو بہتر بنا لوں گا۔ میں نے بہت جگہ سی وی دے رکھی ہے، مجھے امید ہے کہ بہت جلد کوئی اچھی جاب مل جائے گی۔ میں عورت کے جاب کرنے کے خلاف نہیں ہوں مگر میں اپنے ہوتے ہوئے تمہیں جاب کی زحمت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ میرا وعدہ ہے کہ میں جلد تمہیں بہتر نہیں بہترین زندگی دوں گا۔ ان شاء اللہ تمہاری یہ جاب کی رٹ میری ہمت توڑ دیتی ہے۔ اگر تم واقعی میرا ساتھ دینا چاہتی ہو تو جاب کا خیال دل سے نکال دو۔'' آفس بیگ اٹھا کر مرتضیٰ نے نرم لہجے میں تفصیل سے سمجھاتے ہوئے جیسے التجا کی تھی۔

''مجھے معاف کر دیں مرتضیٰ! میں انجانے میں آپ کا دل دکھا... دیتی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو دنیا کی ان خوش قسمت ترین عورتوں میں شمار کرتی ہوں جنہیں رزق کے حصول کے لیے دھکے نہیں کھانے پڑتے۔ آئندہ میں جاب کا کبھی نہیں کہوں گی۔ اچھا رکیں، میں لنچ باکس لے کر آتی ہوں۔'' وہ مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چل دی۔ اس نے شوہر کی بات مان کر اس کا مان بڑھا دیا تھا۔ اور مرتضیٰ کو اس کا مان لینا اور درگزر کر دینا ہی تو پسند تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شہرین بچوں کی

خاطر جاب کرنا چاہتی ہے صرف اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے۔ وہ یہ کیسے گوارا کرتا کہ اس کی بیوی چند ہزار کے لیے دفتروں کے دھکے کھاتی پھرے۔ وہ گریجویٹ تھا مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھا کیونکہ پڑھائی میں اس کا انٹرسٹ صفر تھا۔ مشکل سے بی اے کیا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں کلرک کی جاب کر رہا تھا۔ شہرین اس کی چچا زاد تھی۔ دونوں کا سارا خاندان گاؤں میں آباد تھا۔ شہرین چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ گاؤں میں زیادہ تر لوگوں کا ذریعۂ معاش اپنی زمینوں پر اگنے والا اناج ہی تھا۔ مگر شہر سے پڑھ کے آنے والے مرتضیٰ نے گاؤں میں رہ کے زمیندار بننے سے بہتر شہر میں جاب کرنے کو جانا۔ مرتضیٰ چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بیٹے کے شہر سیٹ ہونے پر چوہدری دین محمد نے اپنی زمینیں بھتیجوں کے حوالے کیں اور خود اوپر کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ زمینیں اتنی تھیں کہ دونوں گھروں کا خرچ بہ آسانی چل جاتا۔ دین محمد سب بیٹیاں بیاہ چکے تھے۔ سب سے چھوٹی بیٹی عائشہ کی شادی انہوں نے شہرین سے چھوٹے سکندر سے کی تھی۔ گو یوسف چچا نے جہیز لینے سے انکار کر دیا تھا پھر بھی ان باپ بیٹے سے جو بن پڑا انہوں نے کیا تھا۔

☆☆☆

اگلا دن بہت خوشگوار تھا۔ بچوں کے اسکول اور مرتضیٰ کے آفس جاتے ہی اس نے گھر کی صفائی شروع کر دی۔ وہ صفائی کر کے فارغ ہوئی تو کچن میں گھس گئی۔ آج ٹھنڈ معمول سے زیادہ تھی۔ کچن کی کھڑکی سے آتی یخ بستہ ہوائیں جیسے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کے سب سے پہلے کھڑکی بند کی۔ رات کو شامی کباب، دال اور روٹی بنی تھی جو صبح اس نے بچوں کو اور مرتضیٰ کو ناشتے اور لنچ میں دے دیا۔ اب کیا پکاؤں جیسا مشکل ترین سوال برتن دھوتے ہوئے بھی اس کے دماغ میں چل رہا تھا۔ بے شک اس نے آج تک جو بھی بنایا تھا بچے بنا چوں وچرا کھا لیتے تھے ویسے ہی اس کے ہاتھ میں ذائقہ تھا یا شاید بچے ہی بڑے صابر تھے کہ لبوں پر حرفِ شکایت تک نہ لانے۔ برتن دھل چکے تھے اب بھی وہ یہی سوچتی فریج کھول کے کھڑی ہو گئی۔ وہ کل ہی سبزی لائی تھی۔ فریج میں پڑے ٹنڈے اور آلوؤں کو دیکھ کر پتا نہیں اس کے من میں کیا سمائی کہ دونوں ہی نکال لیے۔ بچے کچھ کہتے نہیں تھے مگر وہ جانتی تھی وہ دونوں ٹینڈے نہیں کھاتے تھے۔ اس نے جلدی سے وہی آلو ٹنڈے مکس کر کے چٹ پٹے سے بنا دیے۔ بچوں کے آنے میں اب بھی وقت تھا۔ وہ چادر اوڑھ کے گھر کو لاک لگاتی ایمان کی طرف چلی آئی۔ جو اس کی دور پرے کی رشتے دار تھی اور اس کی دوست بھی۔ وہ گرم شال اور سوئیٹر پہن کے نکلی تھی پھر بھی گھر سے نکلتے ہی ایک سرد لہر جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی تھی۔ ان کا گھر روڈ پر تھا یہ چھوٹا سا تین کمروں کا گھر مرتضیٰ نے تب کرایے پر لیا تھا جب وہ شہر میں پڑھتا تھا۔ پڑھائی کے بعد نوکری اور پھر شادی۔

وہ جب گاؤں سے یہاں آئی تو شروع میں شہر کی گہما گہمی سے بہت تنگ ہوتی تھی کہاں گاؤں کی پُرسکون فضا، لہلہاتے کھیت، کنویں سے نکلا صاف پانی..... کہاں شہر کی گہما گہمی، اس کا شور سے دل گھبراتا تھا۔ اب بھی ریڑھی والے کی پاٹ دار آواز سے وہ چونک گئی۔ تب ہی پاس سے گزرتی سائلنسر اتری بائیک کی بھیانک آواز سے تو کانپ ہی گئی۔ جلدی سے چادر سر سے کھینچ کر ماتھے تک کرتی وہ تیز قدموں سے چلتی ایمان کے گھر گھس گئی۔ دروازہ کھلا تھا کہ ایمان کا بیٹا ریڑھی والے کو روک کے سبزی لے رہا تھا۔ ایمان سامنے ہی چھوٹے سے صحن میں ایک جانب رکھی واشنگ مشین کی طرف متوجہ تھی۔ اس کا گھر بہت کشادہ تھا۔ ایمان کے شوہر بس دو بھائی تھے کشادہ زمین پر بنے چھ کمروں کو ساس نے اپنی زندگی میں ہی دونوں بہوؤں میں بانٹ دیا تھا۔ ایمان کی جیٹھانی سے بھی اس کی اچھی سلام دعا تھی۔ وہ ایک اسپتال میں ریسپشن پر ہوتی تھیں۔

''السلام علیکم! کیسی ہو؟ اتنی ٹھنڈ میں مشین لگا کے بیٹھی ہو۔ دھوپ کا انتظار کر لیتیں پھر کسی اجلے دن دھو لیتیں کپڑے۔'' سلام کرتے ہی وہ اسے موسم کی سختی کی طرف متوجہ کرتی بولی تو ایمان مسکرا دی۔

''نہیں یار! کئی دنوں سے ٹال ہی تو رہی تھی۔ موسم تو جانے کب ٹھیک ہوگا۔ اشعر آج جلدی اسکول سے آ گیا ہے سوچا اسے بھی ساتھ لگا لوں گی۔ بھئی اب بڑے ہو گئے ہیں ماں کا ساتھ دیں کچھ۔'' مسکرا کر کہتے ہوئے وہ اسے اندر کمرے میں لے گئی۔

''اصل میں مجھے ایک کام تھا تم سے۔'' کمرے میں آ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے شہرین نے قدرے جھجک کر کہا۔

''میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے شہرین کہ ہم دوستیں نہیں بہنیں ہیں۔ بچپن سے ہماری دوستی ہے اتفاق سے تم بھی اکلوتی میں بھی اکلوتی ہوں۔ اس پر مستزاد شادی بھی ایک شہر میں ہوگئی۔ ہم بہنیں ہیں۔ کیا تم اپنی بہن سے بات کرنے میں بھی جھجکو گی۔'' ایمان نے نروٹھے انداز میں منہ پھلا لیا۔ وہ اس کے بچوں کی طرح ٹھنکنے پر مسکرا دی۔ ایمان نے ہر مشکل میں ہمیشہ اس کا ساتھ دیا تھا۔

''یار وہ فائقہ اور خرم کی اس بار فیس کے ساتھ سالانہ فنڈ بھی دینا ہوگا۔ اوپر سے یونیفارم کا رنگ بھی بدل دیا ہے اسکول والوں نے، تم تو جانتی ہو عائشہ کی شادی پر ہی اچھا خاصا قرض چڑھ گیا تھا۔ اسی ماہ وہ قرض اتارا ہے۔ اب مزید قرض مانگنا ممکن نہیں اس لیے دل کچھ اداس تھا۔ سوچا تمہاری طرف چکر لگا لوں۔''

''ارے بس اتنی سی بات، مجھے بتاؤ کتنے پیسے چاہئیں۔ میرے پاس کچھ جمع شدہ رقم پڑی ہے۔'' بات کو چٹکیوں میں اڑاتے ہوئے وہ اٹھنے لگی تو شہرین نے اس کا ہاتھ پکڑ کے واپس بٹھا دیا۔

''تم جانتی ہو ناں میں تم سے پیسے نہیں لوں گی۔ مجھے عادت ہے میں شروع سے اپنا ہر مسئلہ تم سے کہتی آئی ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ مجھے تم سے مدد بھی چاہیے۔ ہمارا مددگار وہ واحد رب ہے۔ جس کے پاس دو جہانوں کے خزانے ہیں۔'' رقت آمیز لہجے میں وہ پورے یقین کے ساتھ بولی تھی۔

''تو اللہ نے ہی انسان کو انسان کے لیے وسیلہ بنا کے بھیجا ہے۔ تمہاری یہ ہی انا مجھے دکھی کرتی ہے۔ کیا میں تمہاری بہن نہیں؟'' رنجیدہ لہجے میں کہتے ہوئے ایمان نے اپنی شکوے سے پر بڑی، بڑی آنکھیں اس پر ٹکا دیں۔

''اگر قرض ہی لینا ہوتا تو میں اپنے ابا یا بھائیوں سے نہ مانگ لیتی؟ تمہیں بہن نہ سمجھتی تو تمہیں کبھی اپنے مسائل بتاتی ہی نہیں۔ تم بس اتنا کر دو کہ اگر تمہارے پاس کوئی سلائی کا کام آئے تو مجھے ضرور بھیج دینا، اس ماہ میں سلائی کروں گی۔'' ایمان لوگوں کے کپڑوں پر کڑھائی کرتی تھی۔ سارے محلے کو پتا تھا اس لیے اس کے پاس اکثر عورتیں سلائی کا کام بھی لاتی تھیں۔ ایمان کو سلائی کا کام نہیں آتا تھا اس لیے وہ انکار کر دیتی تھی۔ جبکہ شہرین بہترین سلائی کر لیتی تھی۔ ایمان اکثر اسے سلائی کا کام کرنے کو کہتی مگر وہ انکار کر دیتی تھی۔ سلائی کے کام میں محنت زیادہ اور معاوضہ بہت کم ہوتا تھا۔ اس ماہ اس نے سلائی کرنے کا سوچ لیا تھا۔

''ٹھیک ہے، ابھی کل ہی ایک عورت میرے پاس سلائی کے لیے کپڑے لے کے آئی تھی۔ میں صبح ہی پتا کروا کے اسے تمہاری طرف بھیج دوں گی۔ اب تو مسکرا دو۔'' ایمان نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اپنی دونوں انگلیاں شہرین کے گالوں پر رکھ کر اس کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں پھیلا دیئے۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔

''بچ..... بچ صرف اسی لیے میں کہتی ہوں جاب کر لو۔ مگر لڑکی تم نے اتنا پڑھ لکھ کے گنوایا ہے۔ ذہن سے تمہارے غلامی نہیں جاتی۔'' جانے کب سے دروازے پر کھڑی ان کی باتیں سنتی فوزیہ بھابی اندر آتے ہوئے افسوس سے بولیں۔ شہرین اپنی پریشانی سن لیے جانے پر شرمسار سی ہوگئی۔

''ارے بھابی آپ آج جلدی آ گئیں آفس سے، آئیں ناں بیٹھیں۔'' ایمان نے انہیں اصل بات سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے موضوع بدلنا چاہا۔ وہ جانتی تھی اب بھابی موضوع بدلنے نہیں دیں گی۔

''طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے جلدی گھر آ گئی اور تم نے کیا چھوٹے سے بچے کو مشین پر لگایا ہوا ہے اور خود یہاں باتیں بگھار رہی ہو، جاؤ جا کے دیکھو اسے کہیں کرنٹ ہی نہ لگوا لے۔'' رعب سے بھرپور لہجے میں

کہتی فوزیہ بھابی نے اسے لتاڑ کر رکھ دیا، ایمان دہل کر باہر بھاگی۔

''ایمان تو پڑھی لکھی نہیں اس لیے لوگوں کی قمیص پر کڑھائی کرتی پھرتی ہے۔ بھئی ظاہر ہے اب وہ دور تو رہا نہیں کہ ایک کماتا تھا اور سارا گھر بیٹھ کے کھاتا تھا۔ اب تو گھر کے ہر فرد کو محنت کرنی پڑتی ہے۔ میں نے تو ایمان سے کہا تھا اسپتال میں آیا.... کی جگہ لگوا دیتی ہوں تمہیں یہ کڑھائیوں سے تو اتنی کمائی نہیں ہوتی ناں۔ مگر نہ جی آیا کی نوکری تو میڈم کی شان کے خلاف ہے۔ اب اتنی تعلیم میں اتنا ہی ہوتا ہے ناں گورنر جنرل تو کوئی لگنے سے رہا۔ تم تو خاصی پڑھی لکھی ہو تم چاہو تو میں تمہیں ریسپشنسٹ لگوا سکتی ہوں۔'' بیڈ کے پاس رکھے موڑھوں میں سے ایک پر ٹکتے ہوئے انہوں نے تفصیل سے بتا کر آخر میں لہجے میں شہد سموتے ہوئے ہر بار کی طرح وہ اسے اکسانے لگیں۔

''نہیں بھابی، مرتضیٰ! مجھے جاب کی اجازت نہیں دیتے اور ان کی اجازت کے بنا میں جاب نہیں کروں گی۔'' نپے تلے انداز میں کہتی وہ سنبھل کے بیٹھ گئی۔

''ایک تو تم جیسی عورتوں کا یہی المیہ ہے جتنا مرضی پڑھ لکھ جائیں مگر ذہن سے مرد ذات کی غلامی نہیں نکلے گی۔ آدھی زندگی باپ اور بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتی رہیں گی، آدھی زندگی شوہر کے اشاروں پر ناچتی رہیں گی۔ اپنی کوئی زندگی ہی نہیں ہے یار! کیوں پڑھا لکھا تھا اتنا، ہانڈی چولھا کرنے کے لیے؟'' ناصحانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے آخر میں انہوں نے اس سے پوچھا تو جانے کیوں اسے ہر بار سے زیادہ ان کی باتیں آج بری لگیں۔

''ایسی بات نہیں ہے بھابی! نہ میرے ابا کی سوچ ایسی تھی ناں مرتضیٰ کی سوچ ایسی ہے۔ وہ بس مجھے جاب کے جھنجٹ میں نہیں ڈالنا چاہتے۔'' اس نے نرمی سے بات کلیئر کرنا چاہی تو فوزیہ کھلکھلا کے ہنس دیں۔ سلیٹی رنگ کے برانڈڈ سوٹ میں میک اپ میں چہرے کو ڈبوئے، طرح دار سی فوزیہ اس قدر فٹ رکھتی تھیں خود کو کہ اپنی عمر سے دس سال چھوٹی لگتیں۔ ان کی کاندھوں تک آتی دو بیٹیاں ان کے آنے سے پہلے سلیقے سے گھر سمیٹ چکی

یادوں کی آمد

جب یاد تمہاری آتی ہے
میرے دل کی بنجر دھرتی پر
ہریالی سی چھا جاتی ہے
جب یاد تمہاری آتی ہے
خوابوں کی صورت آنکھوں میں
ہر بار ہماری سانسوں میں
خوشبو کی طرح بس جاتی ہے
جب یاد تمہاری آتی ہے
اشکوں کی برسات اے ساجن
آنکھوں میں بس جاتی ہے
جب یاد تمہاری آتی ہے

از: شہناز فضل، سندھ

ہوتی تھیں۔ کم آمدنی والے دبو قسم کے شوہر کو جب وہ خرچ میں مدد کے نام پر آدھی سیکری دیتی تھیں تو وہ بیچارے اتنے ممنون ہو جاتے کہ فوزیہ کا غرور آسمان سے باتیں کرنے لگتا۔

''یہ سب حربے ہوتے ہیں مردوں کے۔ وہ تمہیں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تم ان کے لیے بہت اہم ہو۔ تمہارا شوہر بھی یہ نہیں چاہتا کہ تم جاب کر کے اس سے آگے نکل جاؤ۔ اصل میں وہ تمہاری قابلیت سے جلتا ہے۔ مجھے تو حیرت تمہارے ماں باپ پر ہوتی ہے بی کام کروا کے ایک کمپل گریجویٹ کے پلے باندھ دیا۔'' ہمدردی کی آڑ میں وہ اس کے سامنے اس کی فیملی کی برائیاں کر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے شہرین کا دل کیا وہ انہیں کوئی سخت جواب دے مگر بدتمیزی اس کی سرشت میں نہیں تھی۔

''بھابی میں خود بھی جاب نہیں کرنا چاہتی۔ میری نظر میں وہ عورت خوش نصیب ہے جسے رزق کے حصول کے لیے دنیا میں دھکے نہیں کھانے پڑتے۔ دین میں بھی جاب کی اجازت ہے مگر از حد مجبوری کے عالم میں اور اگر مرتضیٰ مجھ سے مخلص نہ ہوتے تو مجھے جاب کی اجازت

دے کر خود کو کئی مشکلات سے آزاد کر لیتے۔ مرد کا تحفظ عورت کی قید نہیں اس کی پناہ گاہ ہوتا ہے۔ میں اتنی نادان نہیں کہ مجھے رویوں کی گہرائی سمجھ میں نہ آئے۔ وہ میرے ساتھ کتنے مخلص ہیں میں خوب جانتی ہوں۔ بہرحال آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرے لیے اتنا سوچا۔ میں ذرا ایمان کو دیکھوں کہاں رہ گئی ہے۔'' دوٹوک انداز اپناتے ہوئے وہ تفصیل سے مدلل جواب دیتی اٹھ کے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

'' اونہوں غلام روح کہیں کی۔ آزادی اور خود مختاری جیسی نعمتیں تمہارے نصیب میں ہیں ہی نہیں..... دفع دور۔'' وہ بھنا کر اپنے پورشن کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

اس دن گھر آ کے بھی فوزیہ بھابی کی باتیں اس کے دماغ میں گھومتی رہیں۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ اب وہاں نہیں جائے گی۔ ایمان کو اپنے گھر بلوا لیا کرے گی۔ گھر آ کر بھی اس کا دماغ کھولتا ہی رہا۔ وہ جب بھی وہاں جاتی تھی وہ ایسی ہی باتیں کرتی تھی پہلے تو وہ انہیں اپنا مخلص سمجھی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ جاب اور خود مختاری کے زعم میں مبتلا ان کا تھکا ہوا ذہن عام لڑکیوں کو کمتر سمجھ کے خود کو مطمئن کرتا ہے۔ درحقیقت وہ کئی سال کی اس مسلسل محنت سے اکتا چکی تھیں۔ وہ چاہتیں تو یہ سب چھوڑ دیتیں، بے انتہا اکتانے کے باوجود نہ چھوڑنے کے پیچھے جو نفسیاتی گرہ تھی وہ کوئی ماہرِ نفسیات ہی کھول سکتا تھا۔ وہ خود مختاری کے دھوکے میں جس مسلسل مشقت میں خود مبتلا تھیں اس میں اسے بھی کرنا چاہتی تھیں۔ اس سے ان کے بیمار ذہن کو کیا تسکین پہنچنی تھی اس بات سے شہرین لاعلم تھی۔ لیکن ان کی باتوں میں آ کر شہرین کبھی اپنے گھر کی جنت کا سکون نہیں کھوئے گی یہ طے تھا۔

مرتضیٰ آج کچھ لیٹ آیا تھا آتے ہی بھوک، بھوک چلانے لگا۔ بچے بھی ہوم ورک کر کے فارغ ہو چکے تھے۔ شہرین نے جلدی سے چپاتیاں ڈالی صبح کا بنا آلو، ٹنڈے کا سالن گرم کیا اور کمرے میں بیڈ پر پلاسٹک شیٹ بچھاتے ہوئے کھانا چن دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے نوٹ کیا کہ مرتضیٰ کھانا بہت تیزی سے کھا رہا تھا جیسے سارے دن کا بھوکا ہو۔ آج کیا وہ کئی دن سے یہ نوٹ کر رہی تھی۔ دفعتاً مرتضیٰ کو پھندا لگا تھا۔ خرم نے جلدی سے گلاس بھر کے پانی دیا مگر جلدی، جلدی میں بھی کھانس، کھانس کے اس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔

'' کیا کر رہے ہیں مرتضیٰ! آرام سے کھائیں ناں، آپ کے پیچھے کون سی پولیس لگی ہے۔ ایسے ندیدوں کی طرح کھا رہے ہیں جیسے سارے دن سے بھوکے ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے اس کی تیزی پر طنز کیا۔

'' ہاں تو سارا دن سے ہی تو بھوکا ہوں۔'' بالکل بے دھیانی میں اس کے منہ سے نکلا تھا پھر یکلخت وہ خاموش ہو گیا۔ مگر شہرین سن چکی تھی۔

'' یہ کیا بات ہوئی؟ روز آپ کا لنچ باکس بھی خالی آتا ہے اور آپ بھی بھوکے واپس آتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے وہ پوچھنے لگی تو مرتضیٰ پھر مخمصے میں پڑ گیا۔ شہرین کو بتائے یا نہ بتائے۔

'' اصل میں میرے سینئر ہیں عامر صاحب وہ دوسرے شہر سے جاب کے سلسلے میں یہاں منتقل ہوئے ہیں۔ ان کی فیملی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ بیچارے جب بھی بازار کا کھانا کھاتے ہیں بیمار ہو جاتے ہیں۔ انہیں باہر کا کھانا بالکل بھی راس نہیں آتا۔ میں کبھی، کبھی انہیں لنچ میں ساتھ بٹھا لیتا ہوں۔ آج بھی اتنا کام تھا مجھے کھانا کھانے کا ٹائم ہی نہیں ملا۔ میں نے انہیں دے دیا اکثر ایسا ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ حالات کی وجہ سے تم کہیں ناراض نہ ہو جاؤ۔'' تھوڑا جھجکتے ہوئے اس نے سارا سچ اگل دیا اور اب سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دونوں بچے منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنس رہے تھے۔

'' اور آپ نے سمجھا کہ میں اتنی کم ظرف ہوں کہ آپ کو اس نیکی سے روکوں گی۔ حالات جیسے بھی ہوں مرتضیٰ! انسان میں احساس نہیں مرنا چاہیے۔'' بچوں کو ڈانٹ کے چپ کرواتے ہوئے اس نے شوہر کو رسان سے سمجھایا تو مرتضیٰ نے ایک ممنون سی نظر اس پر ڈالی۔

''اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ آپ بنا کچھ کھائے پیے سارا دن کام کرتے رہیں۔ ٹائم ہو نہ ہو آپ کھانا وقت پر کھائیں گے اوکے۔'' دھونس بھرے انداز میں کہتی شہرین نے آخری نوالہ منہ میں رکھا اور چیزیں سمیٹنے لگی۔ سب کھانا کھا چکے تھے۔ بچے قلانچیں بھرتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''اوکے باس جیسے آپ کہیں گی ویسا ہی ہوگا۔ کل سے ہم آدھا، آدھا لنچ شیئر کر لیا کریں گے۔'' کمرے سے ملحقہ واش روم میں ہاتھ دھوتے ہوئے وہ خوشگوار لہجے میں سرِ تسلیم خم کرتا کہنے لگا تو شہرین مسکرا کر چیزیں اٹھائے کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ فجر پڑھ کے حسبِ معمول کچن میں آ گئی۔ آج اس کا ارادہ بچوں کے لیے کچھ اچھا لنچ بنانے کا تھا۔ مسالا جات ڈال کر قیمہ ابلنے کے لیے رکھ کر وہ دوبارہ کمرے میں آ گئی۔ مرتضیٰ چونکہ لیٹ آفس جاتا تھا اس لیے وہ بچوں کو بھیج کے انہیں اٹھاتی تھی۔ اب بھی ایک نظر سوئے ہوئے شوہر پر ڈالتی وہ قرآن پڑھنے بیٹھ گئی۔ وہ آہستہ، آہستہ تلاوت کر رہی تھی۔ سکون روح میں اتر رہا تھا۔ قرآن پڑھتے اسے ایسا لگتا جیسے اسے کوئی پریشانی، کوئی دکھ، کوئی غم نہیں۔ اب بھی قرآن کے پاکیزہ کلام کو روح کا مرہم کرتے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ احساس ہونے پر جلدی سے قرآن پاک کو اس کی جگہ پر رکھتے ہوئے وہ جلدی سے کچن میں آ گئی۔ قیمہ گل چکا تھا گندھا ہوا آٹا فریج سے نکال کے شیلف پر رکھتی وہ بچوں کے کمرے میں آ گئی۔ دونوں کو جگا کر وہ پھر کچن میں آ گئی۔ جلدی، جلدی پراٹھے بیل کر ان میں قیمہ بھرتی وہ پراٹھے بنانے لگی۔ اتنی دیر میں دونوں بچے ریڈی ہو کے آ گئے۔ اسے ان کی یہی فرمانبرداری تو پسند تھی۔ وہ خود تیار ہوتے تھے، اسکول نزدیک تھا اس لیے وہ اسکول بھی خود آتے جاتے تھے۔ اس نے بچوں کو ناشتا دیا پھر ان کے لنچ باکس میں ایک، ایک پراٹھا رکھتے ہوئے اوپر اچار کی پھانک رکھی اور لنچ باکس بند کر کے انہیں گرم دودھ کے دو گلاس دیے جنہیں پی کر اور برش کر کے ماں کو خدا حافظ کرتے اسکول چلے گئے۔ اس نے مرتضیٰ کا لنچ تیار کر کے اسے بھی روانہ کیا تب ہی ایمان کا بیٹا شاپر میں ایک کھلا سوٹ اور ناپ لے کر آ گیا۔ وہ کچھ مطمئن ہو گئی۔ اگلے ماہ کی ٹینشن مکمل نہیں تو کچھ تو کم ہوئی تھی۔ وہ ناشتا کرتے ہی کام میں جت گئی۔ اسے شوہر کے آنے سے پہلے کام مکمل کرنا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مرتضیٰ اسے یہ محنت کرتے دیکھ کے دکھی ہو۔

مرتضیٰ جب آفس پہنچا تب ڈھیروں کے حساب سے کام اس کا منتظر تھا۔ وہ سر جھکائے کام میں ایسا جتا کہ دوپہر کی خبر لایا۔ دوپہر ہوتے ہی عامر صاحب اس کے کیبن کی طرف چلے آئے۔ وہ مسکرا دیا، آج وہ عامر صاحب کے ساتھ آدھا لنچ شیئر کرنے کا وعدہ نبھانے والا تھا۔ شہادت کی انگلی اٹھائے وارننگ دیتی شہرین کو سوچ کے وہ مسکرا دیا۔

''واہ جی واہ! کام کی اتنی ٹینشن میں بھی مسکرا لیتے ہو کمال ہی کرتے ہو۔ ویسے سچ کہوں جب سے شکیل صاحب کے بیٹے نے آفس کا چارج سنبھالا ہے کام کا اتنا بوجھ ہے کہ خواب میں بھی بس آفس میں ہی خود کو پاتا ہوں۔'' عامر صاحب بہت باتونی تھے اب بھی انہوں نے مسکرا کے کہا تو وہ جیسے اپنے دھیان سے چونکا تھا۔

''کام ہی تو کرنے آتے ہیں عامر بھائی! کام نہیں کریں گے تو کھائیں گے کہاں سے۔'' اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے اس نے کہا، تھک تو وہ بھی جاتا تھا۔

''کھانے سے یاد آیا یار! آج، نہیں شیئر کرو گے لنچ! تم تو جانتے ہو باہر کا کھانا کھاتے ہی پیٹ میں وہ درد اٹھتا ہے کہ الامان الحفیظ۔'' عامر صاحب پھر قہقہہ لگا کے ہنسے تھے۔

''کیوں نہیں عامر بھائی! آج آپ کی بھابی نے قیمے والا پراٹھا اچار کے ساتھ دیا ہے دونوں بھائی کھاتے ہیں۔'' اس نے آفس بیگ سے لنچ باکس نکالتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

''کیا سنا میں نے، واہ بھئی مرتضیٰ صاحب! قیمے والے پراٹھے تو میرے بھی بہت فیورٹ ہیں۔ کھولیں بھئی لنچ انتظار کس بات کا۔'' وہ لنچ کھولنے ہی والا تھا جب اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کے اسد صاحب آ دھمکے۔ مرتضیٰ تھوک نگل کے رہ گیا۔ آج پھر خالی پیٹ گھر جانا پڑے گا۔ دوسرے ہی لمحے وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔

''کیوں نہیں اسد صاحب! مہمان تو رب کی رحمت ہوتے ہیں۔ آپ تو بھائی ہیں ہمارے۔'' خندہ پیشانی سے کہتے ہوئے اس نے لنچ باکس کھولنا شروع کیا۔

''شکریہ یار! اصل میں آج میری بیگم کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس لیے وہ کچھ نہ بنا سکی۔ میں تو باہر جا رہا تھا، آپ کی قیمے والے پراٹھے والی صدا سنی تو رہا نہیں گیا۔ بھئی بھابی کھانا بہت زبردست بناتی ہیں کیوں عامر بھائی۔'' اسد نے مسکراتے ہوئے کہا تو عامر بھی سر دھننے لگا۔ اور مرتضیٰ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے باکس کھولا جس میں میں چار پراٹھے رکھے تھے اور ان میں الگ، الگ اچار کی پھانکیں تھیں۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے ایک، ایک پراٹھا دونوں کو پیش کیا۔ جسے انہوں نے بے انتہا تعریف کر کر کے کھایا۔ اس نے بچے ہوئے پراٹھے کے تین حصے کیے اور ان دونوں کے ساتھ مل کے کھانے لگا۔ گھر آ کے بھی وہ بار، بار شہرین سے شکریہ کہتا رہا۔ اس دن کے بعد شہرین نے معمول بنا لیا۔ وہ اس کے لنچ میں روز چار روٹیاں رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ کبھی رات کا بچا خوش ذائقہ سالن اور کبھی اچار ہوتا۔ جسے وہ اور عامر صاحب بہت خوشی دلی سے کھاتے۔ مہینہ آدھا گزر چکا تھا اس کے پاس ایک اور سوٹ سلنے کے لیے آیا تھا۔ وہ مطمئن تھی، مہینہ ختم ہونے تک وہ کچھ نہ کچھ جمع کر ہی لے گی۔ اب بھی اسی ادھیڑ بن میں وہ بچوں کے کمرے کے سامنے سے گزری تو ٹھٹک گئی۔

''فائقہ آج ہماری کلاس میں ایک لڑکا ٹیبلٹ لے کر آیا تھا۔ شوخا سا سب کے ساتھ سیلفی لے رہا تھا۔ میرا بہت دل کیا کہ وہ مجھے ایک بار ہاتھ میں پکڑنے دے مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ ٹوٹ جائے گا، ٹوٹ جائے گا۔ کاش میرے پاس اپنا ٹیبلٹ ہوتا میں بھی اسے ہاتھ نہ لگانے دیتا۔'' آٹھویں جماعت کے طالب علم خرم کی آنکھوں میں حسرت کا جہان آباد تھا۔ شہرین دل مسوس کے رہ گئی۔ اتنی محنت اور کوشش کے باوجود وہ بچوں کی خواہشات پوری کرنے سے قاصر تھے۔

''اب تم یہ سب ماما کے سامنے مت کہہ دینا، وہ پہلے ہی فنڈز اور نئے یونیفارم کی وجہ سے پریشان ہیں۔'' خرم سے ایک سال چھوٹی ساتویں کی طالبہ فائقہ نے بردباری سے کہا تو باہر کھڑی شہرین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ دونوں بچے کتنے صابر تھے۔

''میں کوئی پاگل ہوں، میں تو ایسے ہی بس تمہیں بتا رہا تھا کہ اس کے پاس بہت خوب صورت ٹیبلٹ تھا۔ اس نے میرے ساتھ بھی سیلفی لی تھی بہت اچھی آئی تھی۔ کاش میں وہ تصویر ہی لے سکتا اس سے مگر میرے پاس تو موبائل ہی نہیں۔'' اپنی استعمال شدہ کاپی کا گتا پھاڑ کر پھٹے ہوئے جوتے کے اندر سیٹ کرتے ہوئے کہا تو لہجے میں محسوس کی جانے والی محرومی تھی۔

''ویسے بھی ٹیچر ثمرین کہتی ہیں کہ چھوٹے بچوں کو ٹیبلٹ نہیں دینا چاہیے۔ اس طرح کی چیزیں استعمال کرنے کے لیے پہلے بچوں کو بڑے ہو لینے دینا چاہیے۔'' بک کے پھٹے ہوئے صفحات کو اسکاچ ٹیپ سے جوڑتے ہوئے وہ پھر اسے سمجھانے لگی۔ باہر کھڑی شہرین کو لگا وہ اپنی جگہ سے کبھی ہل بھی نہیں پائے گی۔

''اچھا دادی اماں! اب بس کرو، ایک بات کیا بتا بیٹھا ہوں پیچھے ہی پڑ گئی ہوں۔ تمہیں کیا لگتا ہے ماما پاپا سے بس تم پیار کرتی ہو۔ میں بھی ان سے بہت پیار کرتا ہوں۔ مجھے بھی ان کا تم سے زیادہ خیال ہے۔'' تفاخر سے کہتے ہوئے اس کی نظر شہرین پر پڑی۔

''ماما..... آئیں ناں باہر کیوں کھڑی ہیں۔'' جوتے بیڈ کے نیچے رکھتا وہ بھاگ کے اس تک آیا تھا جبکہ فائقہ نے عجلت بھرے انداز میں قینچی اور ٹیپ اپنے پیچھے چھپائی تھی۔ وہ دیکھ کے انجان بن گئی۔

''نہیں، میں بس یہ دیکھنے آئی تھی کہ تم لوگ سوئے ہو کہ نہیں۔ سو جاؤ صبح اسکول بھی جانا ہے۔'' پاتال سے آتی آواز میں کہہ کر وہ خرم کے سر پر ہاتھ پھیرتی اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

☆☆☆

اگلا مہینہ آ گیا تھا۔ اس نے دو سوٹ سلائی کیے تھے۔ اب اس کے پاس کچھ رقم تھی باقی وہ اسے مہینے کے خرچ میں ....ڈال کے فنڈ فیس اور یونیفارم کے جھنجٹ سے نجات حاصل کر لینے کے خیال سے سرشار تھی۔ انتظار تھا تو بس مرتضیٰ کی تنخواہ کا۔ آج اسے تنخواہ ملنا تھی آج وہ کافی دیر سے گھر آیا تھا۔ شہرین پریشان ہو اٹھی۔ بچے محلے کے ہی ایک گھر میں ٹیوشن پڑھنے گئے ہوئے تھے۔

''خیریت آج اتنی دیر سے گھر آئے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے مرتضیٰ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلاتے ہوئے متفکر انداز میں پوچھا۔ تو وہ جو ابھی تک بیڈ پر بیٹھا سکتے میں تھا پھوٹ، پھوٹ کر رو دیا۔

''ارے رو کیوں رہے ہیں کچھ تو بتائیں، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔'' شہرین نے اس کے اس طرح رونے پر پریشان ہوتے ہوئے پوچھا تو وہ ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں پونچھتے ہوئے گویا ہوا۔

''میں مسجد میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس قدر اور اس راہ سے نوازا ہے کہ جتنا اور جہاں سے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' اس کی آنکھوں میں اب بھی نمی کی چمک تھی مگر وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔

''کیا مطلب، میں سمجھی نہیں؟'' شہرین ناسمجھی سے پوچھنے لگی تو وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرا دیا۔

''آج میں تنخواہ لے کے گھر آ رہا تھا تو مجھے میرے سینئر عامر بھائی نے روک لیا۔ انہوں نے مجھے تین ہزار دیے وہ بولے کہ میں اسی طرح اپنے لنچ کے ساتھ الگ سے ان کا لنچ لے کے جایا کروں۔ وہ ہر ماہ تنخواہ ملتے ہی تین ہزار دیا کریں گے۔ اور تو اور اسد صاحب بھی کہنے لگے کہ ان کی بیگم سے صبح اٹھ کے ناشتا بنانا ممکن نہیں اس لیے میں ان کا بھی لنچ لے جایا کروں۔'' متشکر سے لہجے میں بتاتے ہوئے جیسے وہ حیران ہوا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ! یعنی فیس اور فنڈ دونوں کا انتظام اللہ تعالیٰ نے کر دیا ہے۔ وہ بھی بنا ہمارے قرض کی لعنت میں ڈوبے؟'' شہرین اس طرح اچانک غیبی امداد پر جیسے دنگ تھی۔

''تم جانتی ہو اگلے ماہ سے تنخواہ میں چھ ہزار شامل ہوں گے۔ چھ ہزار جن سے ہمارے کئی مسائل حل ہو جائیں گے۔'' نم آنکھوں سے مسکرا کر اسے بتاتے ہوئے مرتضیٰ بہت پُرجوش تھا۔

''بچوں کی کئی خواہشات بھی ہم پوری کر سکیں گے۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ بے شک ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔'' جذب سے کہتے ہوئے شہرین کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ بے اختیار اسے اس آیت کا ترجمہ یاد آیا تھا۔

وہ اب دو کے بجائے تین لنچ بناتی تھی۔ وہ جو رات کو اپنے سب کے لیے بناتی وہ ہی صبح لنچ میں مرتضیٰ کے ساتھ بھیج دیتی۔ عامر صاحب اور اسد صاحب بھی دفتر کی کینٹین کا کھانا کھا، کھا کر اکتا چکے تھے۔ اب انہیں گھر کا بنا صاف ستھرا اور خوش ذائقہ کھانا نصیب ہوتا تھا۔ رفتہ، رفتہ اس کے کھانوں کی خوشبو کئی اور لوگوں کو لنچ بنوانے پر مجبور کر گئی تھی۔ اب وہ کئی لنچ تیار کرتی تھی۔ مرتضیٰ بھی آفس سے آ کے اس کی مدد کرتا، ساری تیاری وہ کر کے سوتے۔ فجر کے وقت شہرین جھٹ پٹ کھانا بناتی، مرتضیٰ لنچ باکسز میں پیک کرتا رہتا۔ پھر مرتضیٰ کو آفس بھیج کے شہرین سو جاتی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں مرتضیٰ موٹر سائیکل پر جانے کے بجائے رکشے پر سب لنچ باکسز کے ہمراہ جانے لگا تھا۔ اب ان کے بچے شہر کے سب سے اچھے اسکول میں پڑھتے تھے۔ مرتضیٰ تک سک سے تیار ہو کر آفس جاتا تھا۔ شہرین سجدۂ شکر ادا کرتے نہیں تھکتی تھی۔ اکثر بیٹھے، بیٹھے اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

''بے شک میرے مالک تو مسبب الاسباب ہے تو اس راہ سے دیتا ہے جہاں سے رزق ملنے کا انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔''

❁ ❁ ❁

مکمل ناول

وہ تو

نگہت سیما

محبت کی کہانیاں لکھتے، لکھتے جانے کب اس کے دل میں خیال آیا کہ کوئی اس سے محبت کرے ایسی ہی محبت جیسی اس کی کہانیوں کے ہیرو اس کی ہیروئنوں سے کرتے ہیں۔ جیسی اسفند یار نے گل زریں سے کی تھی۔

جیسی ہارون شاہ نے ماہ نور سے اور جیسی شہریار نے عینا سے کی تھی۔ اور کوئی اسے اتنی ہی شدت سے چاہے جتنی شدت سے علی حیدر نے فاطمہ بتین کو چاہا تھا۔

ہاں کوئی اسے ایسا ہی چاہے جیسے سبط علی نے عُمیر

شاہ کو چاہا تھا۔ اتنی ہی شدتوں سے اتنی ہی دیوانگی سے کوئی اس کا خیال ایسے ہی رکھے جیسے زارون مراد نے زارا حسن کا رکھا تھا یوں جیسے وہ کانچ کی نازک سی گڑیا ہو جو ذرا سی ٹھیس سی ٹوٹ جائے گی۔

کوئی اس کے راستوں میں ایسے ہی دیے جلاتا چلا جائے جیسے فیصل لاشاری نے بینش لاشاری کے راستوں میں جلائے تھے یوں کہ وہ اندھیرے راستوں کا سفر ان دیوں کی روشنی میں طے کرتی چلی جائے۔ کوئی اس کی راہ میں ایسے ہی پلکیں بچھائے جیسے ثاقب انصاری نے حورین کے راستے میں بچھائی تھیں۔ اور کوئی اس کی راہ کے کانٹے ایسے ہی چن لے جیسے عباد الحسن نے ماہم ملک کے راستے کے کانٹے چنے تھے۔ یوں کہ اس کی اپنی انگلیاں لہولہان ہوگئی تھیں لیکن حسن نے ماہم ملک کو اپنے درد کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

کوئی اس کی زندگی میں بھی خلدون عباسی جیسا آئے جو سیمل مصطفیٰ کی پیشانی کے ایک بل کو دور کرنے کے لیے جان سے گزرنے کا حوصلہ رکھتا تھا جو صرف اس لیے چاہنے کے باوجود نظر بھر کر اس کی طرف نہیں دیکھتا تھا کہ کہیں اس کی نظروں کی تپش سیمل مصطفیٰ کو ڈسٹرب نہ کر دے۔

ہاں کوئی تو ہو جو عباس سید کی طرح ایک گھٹنا اس کے سامنے ٹیک کر کہے۔

''تم کون سے سیارے سے اتری ہو... سینوریٹا۔ اگر میں رومن بادشاہ ہوتا تو تمہارے لیے بگھیوں کی ایک ریس منعقد کراتا۔ اگر فرانسیسی ہوتا تو خود سے ہی ڈوئل لڑتا۔''

ہاں ایسا ہی تو کہا تھا عباس سید نے مونا حیدر سے تو کوئی تو ہو ایسا جو اسے ٹوٹ کر چاہے اور وہ خود وہاں وہ خود..... ہاں وہ اس کی چاہت میں خود کو مٹا دے، راکھ ہو جائے۔

ہاں کوئی تو ہو.....

پہلے یہ خیال تھا پھر خواہش ہوا، تمنا بنا اور پھر تڑپ میں ڈھل گیا..... ہاں کوئی تو.....

اور اس کی نظریں آس پاس اِدھر اُدھر اسے کھوجنے لگیں۔ وہ جو اس کے دردِ دل پر دستک دے اور جو.....

☆.....☆

وہ ایشال تھی۔ ایشال زہرا بنت انور کمال۔ انور کمال اور نشاط کمال کی اکلوتی بیٹی، سعدون کمال کی لاڈلی اور چہیتی بہن..... زندگی ایشال زہرا کے لیے بہت خوب صورت تھی۔ یہ نہیں کہ اس کے سامنے آسائشوں کے ڈھیر لگے تھے لیکن اسے جو کچھ میسر تھا وہ اس میں کسی شہزادی ہی کی طرح خوش تھی اور زندگی جی رہی تھی وہ کسی کروڑ پتی ارب پتی باپ کی بیٹی نہیں تھی لیکن اس کے گرد محبتوں کا حصار تھا۔ ایسی محبتیں جنہوں نے اسے ایسا اعتماد دیا تھا کہ وہ اپنے اسکول، کالج اور پھر یونیورسٹی میں سب سے منفرد دکھتی تھی۔ اس کا لباس، اس کا اعتماد، اس کی گفتگو اس کی ذہانت سب اس کے بابا اور اماں کے بخشے ہوئے اعتماد کی وجہ سے تھی۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی کو انور کمال اور نشاط فاطمہ نے سراہا تھا جو اس کے اعتماد کو بڑھا دیتا تھا۔ ہاں سعدون کچھ بے پروا اور اپنی ذات میں مگن رہنے والا تھا۔ اسے بہن کی کامیابیوں اور کامرانیوں سے کچھ دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ خود ٹاپر تھا اور ہر جماعت میں بورڈ میں پہلی پوزیشن تو جیسے اس کے لیے مخصوص ہو چکی تھی۔ سو سعدون کمال کو اس کی کامیابی اور جیت حیران نہ کرتی بس وہ مسکرا دیتا یا کبھی کبھار ایک جملہ کہہ دیتا۔

''بہن کس کی ہو..... سعدون کمال کی ناں تو کمال تو کرو گی۔'' اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اسے ایشال کا خیال نہیں تھا یا وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے سے سات سال چھوٹی اپنی اس پیاری بہن سے بے حد محبت کرتا تھا۔ ہاں وہ انور کمال اور نشاط کمال کی طرح اس کی ہر کامیابی پر اس طرح اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا جس طرح وہ دونوں کرتے تھے۔ زندگی ایشال کے لیے بے حد خوب صورت تھی۔ وہ جو مضمون نویسی کے ہر مقابلے میں اول آتی تھی اس نے ساتویں یا شاید آٹھویں جماعت میں ہی بچوں کے لیے کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ بابا اور اماں تو اس

کی کہانیاں بچوں کے رسالوں میں چھپی دیکھ کر خوش ہوتے ہی تھے۔ سعدون کمال بھی دل کھول کر تعریف کرتا تھا۔ اور صرف سعدون کی تعریف سننے کے لیے وہ لکھتی رہی اور تعریفیں بٹورتی رہی..... اور فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لینے کے صرف تین ماہ بعد وہ ایک افسانہ لیے اردو روم میں مسز ربانی کے سامنے کھڑی تھی۔

''میم یہ کالج میگزین کے لیے میرا افسانہ.....''

مسز ربانی نے اس سے پیپرز لے لیے، پہلی نظر اس کی خوب صورت ہینڈ رائٹنگ (لکھائی) پر پڑی تھی۔ اور دوسری نظر نطشے کے ناول کے ایک جملے پر جس سے کہانی کا آغاز کیا گیا تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر وہ کہانی پڑھنے لگی تھیں..... اور جوں، جوں کہانی آگے بڑھتی گئی مسز ربانی کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ صفحات سے نظر ہٹا کر وہ بار، بار اس کی طرف دیکھتی تھیں۔ پھر ہاتھ سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ ہاتھ میں پکڑے کاغذوں پر نظریں جمائے جیسے اردگرد سے بے خبر تحریر میں کھو گئی تھیں..... کہانی کوئی بہت طویل نہیں تھی..... پندرہ بیس منٹ بعد کہانی ختم کر کے انہوں نے اس کی طرف دیکھا ان کے گول چہرے پر بچوں ایسی معصوم آنکھیں حیرت، جوش اور خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''یہ کیا لکھ ڈالا ہے لڑکی.....'' وہ بے ساختہ بولی تھیں۔ ''یہ کہانی..... یہ تو کسی بڑے ادبی پرچے میں چھپنے کے لائق ہے اور تم کہہ رہی ہو یہ میری پہلی کہانی ہے۔''

''یس میم، اس سے پہلے میں نے صرف بچوں کے لیے کہانیاں لکھی ہیں۔'' اس نے بس ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''اور تم اسے کالج میگزین میں چھپنے کے لیے دینے آئی ہو۔''

''یس میم.....'' اس نے اب کے نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔

''لیکن مجھے افسوس ہے یہ کہانی کالج میگزین میں نہیں چھپ سکتی۔'' ان کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔

''لیکن کیوں میم.....؟'' اس کی چمکتی آنکھوں کی لو یک دم مدھم ہوئی تھی..... اور چہرہ مرجھا سا گیا تھا۔

''لیکن میم آپ تو کہہ رہی تھیں یہ کسی ادبی پرچے میں.....''

''ہاں تو یہ کہانی کسی ادبی پرچے میں چھپوا دوں گی۔ کچھ اور بھی لکھ رکھا ہے تو مجھے دکھانا۔''

اور یوں ادب کی دنیا میں یہ اس کی پہلی دستک تھی۔ اور پہلی دستک کے جواب میں ہی اس کے لیے دروازہ کھول دیا گیا تھا اور پھر وہ مسز ربانی کا ہاتھ تھامے آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ بابا اور اماں بے حد خوش تھے۔ سعدون بھی اپنی مصروفیات سے نکل کر اس کی تعریف کر دیتا تھا۔ اماں، بابا اور چاہنے والے بھائی کو اس پر فخر تھا اور سترہ سالہ ایشال زہرا کے لیے زندگی پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔ جب کالج میں لڑکیاں اس کی طرف رشک سے دیکھتیں، جب اس کی ٹیچرز تعریف کرتیں تو جیسے اس کے چاروں اور رنگ بکھر جاتے لیکن کبھی، کبھی زندگی کے رنگ پھیکے بھی ہو جاتے ہیں۔ روشنیاں مدھم بھی پڑ جاتی ہیں..... زندگی ہمیشہ گل رنگ اور خوب صورت نہیں رہتی تو ایشال زہرا کی زندگی کے رنگ پہلی بار تب مدھم پڑے تھے۔ جب سعدون کمال اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ چلا گیا۔

وہ تب ایف ایس سی کا امتحان دے کر فارغ تھی اور بے تحاشا لکھ رہی تھی جب بھائی نے اسے بتایا کہ اسے اسکالرشپ مل گئی ہے اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جا رہا ہے۔ اس سے پہلے وہ دو بار اسکالرشپ چھوڑ چکا تھا اور جاب کر رہا تھا..... بابا بیٹے کی کامیابیوں پر خوش ہوتے تھے اب بھی خوش تھے لیکن اس کے جانے سے گھر جیسے خالی، خالی سا ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ کم گو تھا۔ سب کے ساتھ مل کر کم، کم ہی بیٹھتا زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتا تھا..... پھر بھی گھر ویران سا ہو گیا تھا۔ اور اس کا دل کبھی، کبھی رونے کو چاہتا تھا۔ اسے بھائی بہت یاد آتا، اماں تو ہر وقت آنکھیں پونچھتی نظر آتی تھیں تو وہ انہیں تسلی دیتی۔

''وہ تعلیم مکمل کر کے آجائیں گے اور وقت تو یوں گزر جائے گا..... پتا بھی نہیں چلے گا۔''

اسے یقین تھا کہ جب سعدون بھائی لوٹ آئیں گے تو زندگی پھر پہلے جیسی ہو جائے گی خوب صورت اور گل رنگ..... لیکن ابھی وہ اس ہجر کے عادی بھی نہیں ہوئے تھے کہ سعدون نے ایک طویل ہجر کا سندیسہ بھیج دیا..... اس نے نہ صرف یہ کہ وہاں جاب کر لی تھی بلکہ وہاں کی نیشنلٹی حاصل کرنے کے لیے وہاں کی ہی ایک لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی۔ گو اس نے ساتھ میں امید اور انتظار کے پھول بھی نتھی کر دیے تھے یہ کہہ کر کہ سیٹ ہونے کے بعد وہ چکر لگائے گا بلکہ نمیرا کو بھی لے کر آئے گا۔ نمیرا کے والدین کا تعلق پاکستان سے تھا لیکن اس کی پیدائش سے بھی پہلے وہ وہاں ہی سیٹل ہو گئے تھے۔ اماں کی آنکھیں تو اب ہر وقت گیلی رہنے لگی تھیں۔ انہیں رونے کے لیے اب چھپنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بھی کالج سے گھر آ کر بولائی، بولائی پھرتی۔

ہاں اب زندگی اتنی خوب صورت نہیں تھی جتنی اسے لگتی تھی۔ پھر ہولے، ہولے سمجھوتا کر لیا گیا..... اماں نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ ابا دفتر سے آتے تو ٹی وی لگا کر بیٹھ جاتے یا اماں کی طرح کسی کتاب میں سر گھسا لیتے اور اس نے خود کو اپنی پڑھائی اور پھر لکھنے میں گم کر دیا۔ ان دنوں اس نے بے تحاشا لکھا..... یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے سے پہلے ہی اس کی ایک کتاب چھپ چکی تھی ادبی حلقوں میں بہت پزیرائی بھی حاصل کر چکی تھی لیکن اس نے جتنا لکھا تھا وہ سب چھپ نہیں سکا تھا کہ مسز ربانی نے اسے جن ادبی پرچوں سے متعارف کروایا تھا وہ سال یا چھ مہینے بعد چھپتے تھے تب وہ ڈائجسٹوں کی طرف متوجہ ہوئی..... اور ادبی کہانیاں لکھنے والی ایشال زہرا پاپولر فکشن کی طرف متوجہ ہوئی تو ایک دم ہی مقبول ہو گئی۔

محبت کی کہانیاں۔

ہجر و وصال کے قصے۔

ایثار و قربانی کے جذبے۔

وہ کہانی نہیں لکھتی تھی بلکہ کردار آنکھوں کے سامنے مجسم ہو جاتے تھے مہینوں اس کے قاری اس کے تراشے کرداروں کے طلسم سے باہر نہ آ پاتے تھے۔

یونیورسٹی میں لڑکیاں اس کے گرد پروانوں کی طرح چکراتی پھرتیں۔ اس سے بات کرنے کو بے چین رہتیں۔ لڑکیاں ہی نہیں ادبی ذوق رکھنے والے لڑکے بھی اس کی تحریر پسند کرتے تھے..... ایک روز اس کی ایک یونیورسٹی فیلو نے اس سے پوچھا تھا۔

''ایشال آپ جو اتنی شدید محبت کی کہانیاں لکھتی ہیں، کیا دنیا میں ایسی شدید محبتیں ہوتی ہیں؟ کیا آپ نے ایسی محبتیں دیکھی ہیں۔'' وہ حیران ہوئی تھی۔ بھلا اس نے کہاں دیکھی تھیں۔ ایسی شدید محبتیں، اس نے تو اماں، بابا کی محبتیں دیکھی تھیں دھیمی، دھیمی لو دیتی چاندنی جیسی..... یا پھر اظہار سے بے پروا اپنے پیارے بھائی کی محبت اس کا سر بے اختیار نفی میں ہل گیا۔ اس کی زندگی میں اماں، بابا اور بھائی کے سوا اور تھا ہی کون.....

''تو پھر کیسے لکھ لیتی ہیں ایسی محبتوں کے متعلق.....؟''

اس کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

تو پھر..... ہاں پھر واقعی وہ کیسے لکھ لیتی ہے، اتنی شدید محبتوں کے متعلق.....

''کیا دنیا میں ایسے لوگ ہوتے ہیں اتنے مخلص اتنا چاہنے والے، اسفندیار اور زارون کی طرح.....''

''ہاں ہوتے ہوں گے..... ہوتے ہی ہوں گے۔'' وہ خود متذبذب سی تھی لیکن اس روز اس نے گھر آ کر اماں سے پوچھا تھا۔

''آپ کو بابا سے کب محبت ہوئی تھی۔ پہلی بار کب اور کہاں ملے تھے وہ آپ کو.....؟''

''لو میں نے تو تمہارے بابا کو شادی کے بعد ہی پہلی بار دیکھا تھا۔''

''تو بابا کو دیکھ کر کیا مایوسی ہوئی تھی یا.....''

''لو بھلا مایوسی کیسی.....؟'' اماں نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''اماں باوا نے جس کھونٹے سے باندھ دیا بندھ گئے اور اسی سے بندھے عمر گزار دی۔ شوہر نے دن کو رات اور رات کو دن کہا تو مجال تھی کہ اسے جھٹلا سکتے۔''

''لیکن اماں میں تو محبت کے متعلق پوچھ رہی ہوں۔'' اسے اماں کی بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔

''تو بچے محبت کا رشتہ تو نکاح کے دھاگے میں پرویا ہوتا ہے، کب اور کیسے، کیوں ہوجاتی ہے تو خود بخود..... اور وقت اسے گہرا سے گہرا کرتا جاتا ہے۔'' پھر اس کی تحریر میں تھوڑی سی تبدیلی آئی اور ان دنوں اس کی کہانیوں میں محبت شادی کے بعد جنم لیتی تھی پر لکھتی تو وہ محبت کی کہانیاں ہی تھی..... وہی شدتیں، وہی چاہتیں..... ثمر حیات کی اپنی بیوی ایلیا کے لیے..... اس کی جان لیوا بیماری سے جنگ کرتے ہوئے۔

اور وہ خود ہی کبھی، کبھی حیران رہ جاتی تھی۔ محبتوں کی ان شدتوں کو لکھتے ہوئے بھلا کون یقین کرے گا اتنی شدید محبتوں کا..... لیکن وہ لکھتی تھی محبتوں کی کہانیاں کہ کہیں تو اس دنیا میں کہیں تو ایسے محبت کرنے والے ہوتے ہوں گے۔ آخر ہیر رانجھا، سسی پنوں، شیریں فرہاد، سوہنی ماہیوال کی کہانیاں یوں ہی تو نہیں لکھی گئی تھیں کہیں تو لکھنے والوں نے دیکھی ہوں گی ایسی محبتیں، ایسی شدتیں۔

اور وہ لکھتی رہی..... تعلیم ختم ہوئی تو جاب شروع ہوگئی..... پبلک سروس کمیشن کا امتحان دے کر وہ کالج میں لیکچرار ہوگئی۔ اماں اس کی جاب کے خلاف تھیں لیکن بابا نے کہا جب تک کوئی اچھا رشتہ نہیں ملتا جاب کرنے دو، مصروفیت اچھی ہوتی ہے۔

اماں خاموش ہوگئی تھیں لیکن اس کی شادی کے لیے پریشان تھیں۔ کئی رشتے آئے کچھ کو وہ پسند نہ آئی اور کچھ اماں، بابا کو پسند نہیں آئے۔ اماں پریشان ہوتیں تو وہ ہنس دیتی۔

''آپ یوں ہی فکر کرتی ہیں اماں..... مجھے ہمیشہ آپ کے اور بابا کے پاس رہنا ہے، میں آپ کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتی، کبھی نہیں.....''

''ہم اکیلے نہیں ہوں گے ایشو..... تمہاری شادی کے بعد سعد ون کے پاس چلے جائیں گے۔''

''اتنے سالوں میں بھائی کو آپ کی یاد نہیں آئی، پلٹ کر نہیں آئے تو.....''

''نہیں آسکا اس کی مجبوری..... پر فون تو کرتا ہے ناں..... بلاتا بھی ہے۔''

اور وہ دل ہی دل میں اماں کی خوش فہمی پر دکھی ہوجاتی لیکن اماں کو کچھ نہ کہتی..... وہ پہلے ہی اس کی شادی کے لیے پریشان تھیں... کہ خاندان میں کوئی اس کے جوڑ کا نہ تھا۔ کوئی عمر میں بہت چھوٹے اور کوئی بہت بڑے تھے سو خاندان سے تو رشتہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خاندان کے بعد برادری تھی لیکن برادری میں سے بھی کسی نے رشتہ نہ بھیجا تھا۔ شاید اماں زیادہ سوشل نہ تھیں یا پھر نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ بہت حسین نہ سہی لیکن خوش شکل ضرور تھی مناسب قد و قامت، خوب صورت آنکھیں، گندمی رنگ، لانبے گھنے بال، دلکش نقوش، پڑھی لکھی، کڑھائی سلائی، کلنگ سب میں ماہر..... اماں نے سب کچھ سکھایا تھا اسے..... پھر بھی پتا نہیں کیوں جو بھی رشتے آئے غیر برادری سے ہی آئے تھے کہ اماں نے جو میرج بیورو اور رشتے کروانے والیوں کو پسند نہیں کرتی تھیں مجبور ہو کر ان سے رجوع کر ہی لیا تھا۔ تو یہ تھا کہ بقول اماں کے وہ لاکھوں میں ایک تھی پھر بھی اس کا جوڑ کہیں نہیں تھا۔ اماں کے برعکس اسے کوئی پریشانی نہیں تھی، وہ اپنی دنیا میں مگن تھی جو گھر اور کالج تک محدود تھی۔ اس کی دوستوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ گھر آکر وہ کہیں نہیں جاتی تھی۔ یونیورسٹی میں..... کالج میں کبھی کسی لڑکے سے اس کی دوستی نہیں رہی تھی حالانکہ اس کی تحریر پسند کرنے والے دو تین مرد رائٹرز نے جو اسی کی طرح young تھے اس سے رابطہ رکھنا چاہا لیکن اس نے معذرت کر لی تھی کہ بابا نے بہت شروع میں ہی جب وہ ادبی حلقوں میں پہچانی جانے لگی تھی سمجھایا تھا۔

''یہ ادیب، شاعر..... زیادہ تر یہ لوگ تمہارے سامنے تو تمہاری بڑی عزت کریں گے نگاہیں جھکا کر بات کریں گے لیکن اپنے دوستوں کی محفل میں تمہارے حوالے سے فضول باتیں کریں گے۔ تم بہت کم عمر ہو اور سادہ بھی، تمہیں دنیا کے ہتھکنڈوں کا علم نہیں ہے۔''

اور اس نے بابا کی ساری باتیں ذہن میں بٹھالی تھیں۔ نہ وہ کبھی کسی سیمینار میں شریک ہوئی تھی نہ کسی ادبی حلقے میں۔ چند بار کچھ لوگوں نے اس کے ساتھ ایک شام

منانے کی درخواست بھی کی تھی لیکن اس نے معذرت کر لی تھی۔ تو یہ تھی ایشال زہرا..... جو انتیس سال کی عمر میں بھی بے حد صاف شفاف سوچ رکھتی تھی۔ وہ اپنے کالج میں بہت ہر دلعزیز تھی اور سب ہی لڑکیوں کی سب سے پسندیدہ ٹیچر تھی۔ فرسٹ ایئر، سیکنڈ ایئر، تھرڈ ایئر کی اکثر لڑکیاں ہر روز اس کے لیے پھول لے کر آتیں۔ اسے مختلف مواقع پر وش کارڈز دیتیں اور وہ لڑکیوں کی اس معصوم محبت پر مسکرا دیتی۔ وہ خود بھی اپنی اسٹوڈنٹس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ ان کے چھوٹے، چھوٹے مسئلوں کو بہت توجہ سے سنتی۔ وہ مسئلے بھی جن کا ان کی اسٹڈی سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔

اور اس روز بھی جب وہ روسٹرم پر کہنیاں رکھے لڑکیوں کی طرف دیکھ رہی تھی، اس کی عادت تھی کہ لیکچر شروع کرنے سے پہلے وہ اِدھر اُدھر کی چند باتیں ضرور کرتی تھی تاکہ لڑکیاں اس کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ابھی وہ کلاس میں موجود لڑکیوں کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ ایک شاگردہ ثنا حیدر نے ہاتھ کھڑا کر کے کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔

''ہاں کیا بات ہے ثنا؟''

''میم آج ہم نے نہیں پڑھنا۔ باتیں کریں گے..... یوں بھی آج ہمارا آخری دن ہے کل سے ہم نہیں آئیں گے بس فیئر ویل پارٹی پر ہی آئیں گے۔''

یہ فورتھ ایئر تھی اگرچہ باضابطہ طور پر انہیں فری نہیں کیا گیا تھا لیکن لڑکیاں پیپرز کی تیاری کے لیے گھر بیٹھ جاتی تھیں۔ پرنسپل نے دس دن بعد فری کرنے کے لیے کہا تھا لیکن آج بھی جماعت میں چالیس میں سے صرف پچیس لڑکیاں حاضر تھیں۔

''اوکے۔'' وہ روسٹرم کے پیچھے سے ہٹ کر چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔

''کریں باتیں.....''

''ہمیں آپ سے کچھ پوچھنا ہے، آپ کے متعلق کچھ جاننا ہے۔'' اب کے بھی ثنا نے ہی کہا تھا۔

''تو پوچھیں؟'' وہ مسکرا کر انہیں دیکھنے لگی۔

پیچھے والی لڑکیاں بھی اگلی سیٹوں پر آ گئیں۔ مختلف سوال کیے جانے لگے۔ فیملی، بہن بھائی، کہاں سے پڑھا، کب لکھنا شروع کیا۔ کیسے لکھتی ہیں اور کب۔ خیال کہاں سے آتے ہیں..... سچ ہوتا ہے یا جھوٹ وغیرہ، وغیرہ.....

''میم آپ نے کبھی محبت کی؟''

ثنا جماعت کی ان تین لڑکیوں میں ایک تھی جنہیں کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اور وہ اس کی کہانیاں بھی پڑھتی تھی۔ چالیس میں سے صرف تین لڑکیاں پڑھنے کا شوق رکھتی تھیں۔

''محبت تو ایک بہت لافانی اور لامحدود جذبہ ہے اور مجھے بھی اپنے بابا سے اماں سے سعدوق بھائی سے اپنے وطن اور تم سب سے محبت ہے۔''

''تو میم میں اس محبت کی بات کر رہی ہو جس کا ذکر آپ اپنی کہانیوں میں کرتی ہیں، میری آپا کہتی ہیں محبت کے موضوع پر آپ سے زیادہ خوب صورت کسی نے نہیں لکھا۔''

ثنا کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''وہ محبت جو ایک مرد کو ایک عورت سے اور ایک عورت کو مرد سے ہوتی ہے۔''

ثنا کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ بہت دلفریب تھی اور اس کی آنکھیں کسی انہونی محبت کی روشنی سے دمک رہی تھیں۔

''میم جب سے اس کی منگنی ہوئی ہے اسے محبت، محبت ہی سوجھتا رہتا ہے۔ اس کا بس چلے تو گلی میں پھرنے والی بلیوں کو بھی پکڑ، پکڑ کر پوچھتی پھرے کہ کیا تم نے محبت کی ہے۔'' ماہا کلاس کی سب سے شریر لڑکی تھی۔

''بکو مت!'' ثنا نے اسے گھورا۔

''میم یہ تو بس ایسے ہی فضول بولتی رہتی ہے۔'' ثنا کے رخساروں پر یک دم ہی شفق اتر آئی اور پلکیں لرزنے لگی تھیں۔ اس نے بے حد دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اپنی کہانیوں میں بارہا اس نے ایسے ہی کسی لمحے کی منظر نگاری کی تھی لیکن اپنے روبرو پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

''تو میم آپ نے بتایا نہیں کہ آپ نے کبھی ایسی محبت کی یا نہیں؟'' ثنا نے خود کو سنبھال لیا تھا گو اس کی آنکھیں اب بھی دمک رہی تھیں اور ہونٹوں پر وہی

دلفریب سی مسکراہٹ تھی۔

''نہیں۔'' اس کا سر نفی میں ہل گیا تھا۔

''ان معنوں میں نہیں جن میں آپ پوچھ رہی ہیں۔''

''تو پھر آپ.....!'' اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

''کیسے، کس طرح ان جذبوں کی عکاسی کرتی ہیں جو دل کی گہرائیوں سے اٹھتے ہیں اور پورے وجود کو اسیر کر لیتے ہیں۔''

''پتا نہیں۔'' اس نے کندھے اچکائے تھے۔

''شاید مطالعہ، شاید مشاہدہ۔''

''لیکن آپ تو دل میں چھپا سب کچھ کھول کر رکھ دیتی ہیں اور یہ صرف مطالعہ اور مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے ضرور محبت کی ہو گی کسی سے.....'' اس کی آنکھوں میں یقین تھا اور اسے ثنا حیدر کے یقین پر ہنسی آئی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''تو آپ کا دل بھی کبھی نہیں چاہا کہ کوئی آپ سے محبت کرے یا آپ کسی سے محبت کریں..... ایسی ہی محبت جو آپ کی کہانیوں میں ہوتی ہے الوہی سی آفاقی سی؟'' یہ فارحہ تھی کلاس کی وہ دوسری لڑکی جسے کہانیاں اور افسانے پڑھنے کا جنون تھا۔

''دل کا کیا ہے بھئی دل تو بچہ ہے۔''

ماہا نے بلند آواز سے کہا تو چند لڑکیوں نے یک آواز ہو کر تان لگائی۔

''دل تو بچہ ہے..... ہاں دل تو بچہ ہے.....''

''میم، ماہا سے گانا سنتے ہیں۔ اس کی آواز بہت پیاری ہے۔''

کسی نے فرمائش کی تو سب نے ڈیسک بجا کر تائید کی اور یوں موضوع بدل گیا۔ ماہا کی آواز واقعی بہت مسحور کن تھی اور اس روز اس نے کئی غزلیں اور گانے سنائے تھے اور پھر اگلے کئی روز تک اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ثنا کی بات یاد آتی تو لبوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔

''ضروری تو نہیں کہ جو محبت کی کہانیاں لکھتا ہو اس نے خود بھی کبھی محبت کی ہو۔ کہانیاں تو بس کہانیاں ہوتی ہیں۔'' پھر اچانک ہی اس کی اماں بیمار ہو گئیں تو وہ سب کچھ بھلا کر ان کی تیمارداری میں لگ گئی۔ کالج سے بھی اس نے دو ہفتے کی چھٹیاں لے لیں۔ اماں ایک ہفتہ اسپتال میں رہیں اور گھر آ کر وہ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔

''یا اللہ میرے اماں بابا کو کچھ نہ ہو..... میں ان کے بغیر کیسے جی پاؤں گی.....'' وہ دعائیں مانگتی۔

سعدون نے تو پہلے ہی اپنی الگ دنیا بسا لی تھی۔ اماں ٹھیک ہو گئیں تو بھی وہ اماں کے متعلق ہی سوچتی رہتی۔ ثنا کی بات اس کے ذہن سے بالکل نکل گئی تھی۔ گھر آتے ہی وہ اماں کے ساتھ مصروف ہو جاتی۔ ان کے چھوٹے، چھوٹے کام کرتا۔ انہیں بالکل کچن میں گھسنے نہیں دیتی تھی۔ بابا دفتر سے آتے تو انہیں کھانا دینا، ان کے لیے چائے بنانا سب کام اس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ ہاں رات اس کی اپنی تھی۔ وہ ہوتی اور اس کا قلم جانے کہاں سے خیالات ذہن میں آتے اور کاغذ پر بکھرتے جاتے۔ وہ اس وقت تک لکھتی رہتی جب تک تھک نہ جاتی اور آنکھیں نیند سے بند نہ ہونے لگتیں۔

اماں ایک بار پھر اس کے رشتے کے لیے ہر ایک سے کہنے لگی تھیں۔ زندگی ایسے ہی گزر رہی تھی۔ اماں کی اپنی فکریں تھیں اس کی اور بابا کی اپنی مصروفیات لیکن اس روز کیا ہوا تھا۔ ہاں کیا ہوا تھا..... کچھ بھی نہیں..... کچھ خاص نہیں۔ اماں، بابا سے کسی رشتے کا ذکر کر رہی تھیں۔ وہ بابا اور اماں کو چائے دے کر جانے لگی تھی کہ اس نے سنا اماں، بابا سے کہہ رہی تھیں۔

''ثریا آپا نے بتایا ہے، اپنی برادری تو نہیں ہے لیکن اچھا لڑکا ہے۔ آرمی میں کرنل ہے۔ کچھ عرصہ پہلے شادی ہوئی تھی لیکن دو سال بعد ہی طلاق ہو گئی تھی پھر شادی نہیں کی اس نے۔ کرنل سمیر نام ہے۔''

''لیکن طلاق کیوں ہوئی؟'' بابا پوچھ رہے تھے۔

''یہ تو ثریا آپا نے نہیں بتایا لیکن تعریف بہت کر رہی تھیں، آپ ایک بار اس سے مل تو لیں۔''

''عمر بھی زیادہ ہو گی؟'' بابا نے اماں کی بات کو سرسری سا لیا اور اخبار اٹھا لیا۔

''اپنی ایشو بھی تو تیس سال کی ہونے والی ہے..... مجھے تو ہر وقت یہ فکر رہتی ہے کہ ہمارے بعد اس

کا کیا ہوگا؟ بھائی کو ہماری زندگی میں رتی بھر پروا نہیں بہن کی تو ہمارے بعد کیا حاک پروا کرے گا۔ بس اللہ کا نام لے کر انہیں بلا لیتے ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے بلالو، دیکھ لیتے ہیں۔'' انور کمال پھر اخبار کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

اور زندگی میں پہلی بار اس کا دل عجیب طرح سے دھڑکا تھا۔ ''کرنل سمیر۔'' اس نے بند لبوں کے ساتھ اس کا نام دُہرایا۔ اس کی اپنی ہی کہانیوں میں کتنی ہی لڑکیوں کا کرش آرمی مین تھے۔

''اگر بابا کو وہ پسند آجائے، اگر ایسا ہو جائے تو.....'' دل کے اندر کہیں بہت دور ایک خواہش کی کونپل پھوٹ پڑی تھی۔ کسی ساتھی کی ہمراہی کی خواہش اور اپنی اس انتیس، تیس سالہ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی اجنبی کے متعلق سوچا تھا اور کرنل سمیر کا ایک خاکہ سا اس کے ذہن میں بنتا بگڑتا رہا۔ کبھی وہ اس کی کہانی کے ہیرو کیپٹن خرم کی شکل اختیار کر لیتا اور کبھی میجر حبیب کی۔

''اُف..... ف..... ف..... میرا دماغ خراب ہو رہا ہے بلاوجہ ہی.....''

اس نے قلم رکھ دیا لیکن کرنل سمیر کی بہن کو وہ پسند نہیں آئی تھی جبکہ سمیر کی آنکھوں میں اس نے اپنے لیے پسندیدگی کی جھلک دیکھی تھی۔ دو تین دن بعد ہی ثریا خالہ کرنل سمیر اور ان کی آپا کے ساتھ آئی تھیں۔

''جاب کرنے والی لڑکیاں تو بڑی خرانٹ ہوتی ہیں ثریا بہن آپ نے پہلے نہیں بتایا کہ ایشال جاب کرتی ہے۔'' وہ وہاں ہی ثریا خالہ سے باز پرس کرنے لگی تھیں۔ ثریا خالہ شرمندہ سی ہوگئیں۔

''میں نے تو حماد سے کہا تھا کہ سمیر کو سب بتا دے۔''

''جی بالکل بتایا تھا حماد نے اور مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔''

''لیکن مجھے تو اعتراض ہے۔ تمہیں بیوی چاہیے یا استانی؟'' کرنل سمیر کی بہن اب ان سے مخاطب تھیں۔ کرنل سمیر نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا اور ان کی بہن کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''یہ فارغ تھی تو جاب کر لی ورنہ شادی کے بعد تو ارادہ نہیں ہے اس کا جاب کرنے کا.....'' اماں نے ہلکی آواز میں کہا۔

''مجھے بالکل بھی اعتراض نہیں ہے بعد میں بھی کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں۔'' کرنل سمیر اپنی بہن کی طرف دیکھنے کے بجائے براہ راست انور کمال کی طرف دیکھ کر اب اسے دیکھ رہے تھے۔

اس نے بس ایک نظر ہی ان کی طرف دیکھا تھا اچھی بارعب پرسنالٹی تھی۔ اپنی عمر سے کافی چھوٹے نظر آرہے تھے۔

''حماد نے بتایا تھا آپ لکھتی بھی ہیں۔'' ان کی نظروں میں ستائش تھی۔

''جی!''

وہ کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ آئی تھی اور کرنل سمیر کی وہ نظریں کتنے ہی دن تک اس ڈسٹرب کرتی رہیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اماں سے پوچھے کہ ان لوگوں نے کیا کہا لیکن ایک لحاظ تھا کہ وہ اماں سے کچھ نہ پوچھ سکی تھی۔ پھر کئی دن گزر گئے وہ تقریباً بھول ہی چکی تھی کہ ایک روز اس نے اماں کو کہتے سنا۔ وہ شوہر کو بتا رہی تھیں۔

''انہیں ہماری بیٹی کی عمر، جاب اور لکھنے پر اعتراض ہے۔ خود تو جیسے ننھا چوچا تھا ناں..... ایک بیوی بھگتا چکا ہے۔'' اماں شاید غصے میں تھیں لیکن انور کمال ہمیشہ کی طرح ہی پُرسکون تھے۔

''چلو اچھا ہوا بعد میں پھر مسئلہ ہوتا۔ وہ خاتون تو طعنے دے، دے کر ایشو کا جینا عذاب کر دیتیں۔ خاصی ناخوش نظر آتی تھیں۔''

''ہاں، ثریا آپا بھی کہہ رہی تھیں۔ اولاد نہیں تھی میاں نے طلاق دے دی، بھائی کے ساتھ ہی رہتی ہیں اور شاید وہ بھائی کی شادی کرنا ہی نہیں چاہتیں۔'' اماں نے بھی تبصرہ کیا۔

''تم فکر نہ کیا کرو ایشال کی۔'' انہوں نے بیوی کو تسلی دی تھی۔ ''جہاں اس کا نصیب اللہ نے لکھا ہوگا وہاں خود ہی ہو جائے گا۔'' بابا نے تسلی دی تھی لیکن اماں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تو نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ سو آس پاس عزیز و اقارب میں سب کو ہی کہہ رکھا تھا اور ان کی یہ کوشش

رنگ لائی تھی۔ بڑے ماموں یو کے سے چھٹیاں گزارنے آئے تو ساتھ میں احمد حسن کا رشتہ بھی لائے۔

''میرے دوست کا بیٹا ہے..... ماں نہیں ہے، اس کے والد نے مجھ سے اس کے رشتے کے لیے کہا تو میں نے ایشال کے لیے بات کی۔ اس کا ہم عمر ہی ہوگا تقریباً..... اکلوتا ہے، ڈاکٹر ہے۔'' انہوں نے احمد حسن کی تصویر دکھائی اور ایشال کی تصویر انہیں whatsapp کر دی۔ اِدھر سے اوکے ہوا تو اماں تو یوں خوش ہو گئیں جیسے ایشال زہرا کی شادی ہو گئی ہو۔ اس نے بھی تصویر دیکھی۔ عام سی شکل صورت کا عام سا بندہ..... جیسے بہت سارے لوگ ہوتے ہیں جنہیں کوئی خاص طور پر نوٹس نہیں کرتا تو وہ بھی ایسا ہی تھا۔ ہوتے ہیں ناں ایسے لوگ، ستر اسی فیصد تو ایسے ہی ہوتے ہوں گے تو کیا وہ محبت نہیں کرتے یا ان سے محبت نہیں کی جاتی۔ کی جاتی ہے ناں اور وہ بھی تو محبت کرتے ہیں، ٹوٹ کر، اس کے ناول کے ایک ہیرو حامد علی کی طرح جو عام سی شکل صورت کا دیکھنے میں بے حد... عام سا بندہ تھا لیکن جس نے ایمن فاطمہ سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ ایسی ہی ٹوٹ کر محبت جس میں اس نے خود کو بھی بھلا دیا تھا۔ دن رات سب اس کے لیے بے معنی ہو گئے تھے۔ وہ دن رات کومے میں پڑی ایمن کے بیڈ کے پاس بیٹھا رہتا اور ایمن فاطمہ بھی تو اس سے اتنی ہی محبت کرتی تھی۔ اتنی ہی شدید کہ اس کی زندگی بچاتے ہوئے خود زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی۔

تو..... ہاں تو وہ بھی احمد حسن سے اتنی ہی محبت کرے گی جتنی ایمن نے حامد علی سے کی تھی اور احمد حسن بھی اسے اسی طرح چاہے گا جیسے حامد علی نے ایمن کو چاہا تھا..... تو دسمبر میں احمد حسن اور اس کے والد نے پاکستان آنا تھا اور شادی بھی تب ہی طے پائی تھی۔ اماں شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ وقت ہی کتنا تھا صرف چھ ماہ اور اس کی وہی روٹین..... کالج، گھر اور پھر لکھنا پڑھنا..... اسے تو پتا بھی نہ چلا کہ دسمبر آ کر گزر گیا..... پھر جنوری بھی اختتام پزیر تھا اور آنے والے نہیں آئے تھے تب اماں نے گھبرا کر بھائی کو فون کیا تو وہ حیران سے ہوئے۔

''تمہیں سعدون نے نہیں بتایا؟''

''نہیں تو.....'' اماں ان کی زیادہ حیران تھیں۔

''احمد حسن تو دسمبر میں ہی.....'' وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئے تھے۔

''احمد کی شادی تمہاری بہو نمیرا کی بھانجی سے ہو گئی ہے..... نمیرا بھی تو کراچی گئی ہوئی تھی میں نے سمجھا.....''

تو کہانی یوں تھی کہ اماں نے سعدون سے کہا تھا کہ تمہارے ماموں نے تو بہت تسلی دی ہے تم بھی ایک بار مل لو احمد حسن سے تو سعدون نہ صرف اس سے ملا بلکہ کھانے پر گھر بھی بلایا اور جب حسن صاحب کے اصرار پر وہ دونوں میاں بیوی ان کے گھر گئے تو نمیرا کی تو آنکھیں ہی کھل گئیں۔

''اتنا شاندار گھر..... اتنے امیر لوگ..... ایشال کی تو قسمت ہی بدل جائے گی وہ یہاں ان کے نزدیک آ جائے گی۔'' نمیرا نے سوچا تھا۔

''لیکن یہ سب کیسے ہوا نمیرا کی بھانجی تو صرف سولہ سال کی ہے۔'' کچھ دیر بعد اماں کے منہ سے نکلا تھا۔

''یہ تو آپ اپنی بہو سے پوچھیں۔ پتا نہیں کیسے احمد کو جال میں پھنسایا مجھے نہ حسن کو خبر ہوئی..... skipe پر بھانجی سے بات بھی کرواتی رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی بہو احمد حسن کا گھر اور دولت دیکھ کر.....'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''خیر سب نصیب کی بات ہے، آپ فکر نہ کریں ان شاء اللہ ہماری ایشال کے نصیب میں اس سے بھی اچھا لکھا ہوگا۔''

اور اماں تو دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''پریشان کیوں ہوتی ہو۔ اس کے نصیب میں نہیں تھا۔'' انور کمال نے تسلی دی تھی۔

''اور ہاں تو احمد حسن اس کا نصیب نہیں تھا۔ صحیح تو کہتے ہیں بابا..... ساری بات نصیبوں کی ہے۔'' اور وہ احمد حسن کا خیال جھٹک کر پھر سے اپنی دنیا میں مگن ہو گئی۔ پر اماں تو چارپائی پر ہی پڑ گئی تھیں اور ابھی سنبھلی بھی نہ تھیں کہ انور کمال اچانک ہی چل بسے۔ وہ تو بیمار تھیں لیکن وہ تو ٹھیک ٹھاک تھے اور صرف چند دن پہلے ہی ریٹائر ہوئے تھے اور ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب بھی مل گئی تھی انہیں..... 60 سال کے ہی تو تھے وہ۔ بابا

کی اچانک موت..... اماں کی بیماری..... اسے تو یاد بھی نہیں رہا تھا کہ کبھی کسی احمد حسن کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہوا تھا لیکن اماں کبھی، کبھی ٹھنڈی سانس بھرتیں۔

''کیا تھا جو نمیرا اس طرح تمہارا رشتہ نہ تڑواتی تم آج اپنے گھر میں ہوتیں تو میں سکون سے مرجاتی۔ اب تو مرنے سے بھی خوف آتا ہے کہ میرے بعد تم اکیلی کیسے رہو گی؟''

''فضول مت سوچا کریں..... بس پرامس، اب آپ میری شادی کا چیپٹر کلوز ہی کر دیں..... مجھے شادی نہیں کرنی..... مجھے ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے۔''

پتا نہیں انہوں نے اس کی شادی کا چیپٹر کلوز کیا تھا یا نہیں لیکن ملنے جلنے والے کولیگز اکثر حیران ہو کر پوچھتیں۔

''آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟'' اور پھر فوراً ہی مشورہ.....

''کر لیں بھئی ایسے تو زندگی نہیں گزرتی ناں.....''

وہی اماں والی تشویش۔ وہ مسکرا دیتی۔ لیکن اس روز مس مونا اس کی نئی کولیگ نے اسے گھیر لیا۔

''کیوں نہیں کی آپ نے شادی، مجھے تو آپ وجہ ضرور بتائیں گی..... آپ کو پتا ہے ناں میں آپ کی فین ہوں اور اسکول کے زمانے سے آپ کی کہانیاں شوق سے پڑھتی آ رہی ہوں اور اس شوق کی وجہ سے کئی بار اماں سے مار بھی کھائی۔''

''نہیں کی کیا مطلب..... ہوئی ہی نہیں!'' اس نے اپنی جھنجلاہٹ کو مسکراہٹ میں چھپایا تھا۔

''ہوئی ہی نہیں.....؟ یہ کیا بات ہوئی۔ آپ اتنی پیاری ہیں..... کیا کوئی ان سیاہ آنکھوں کی جھیلوں میں نہیں ڈوبا، کسی کا دل ان گھنیری زلفوں میں نہیں الجھا..... کوئی تو ہو گا ناں مس ایشال زہرا..... جس کو آپ نے چاہا ہو گا؟'' اس کی آنکھوں میں سب کچھ جان لینے کا تجسس تھا۔

''نہیں بھئی کوئی نہیں، ایسا تو کوئی نہیں تھا۔'' وہ پریشان سی ہو گئی۔

''اوں..... ہوں..... میں نہیں مانتی مس ایشال کہ آپ نے کبھی محبت نہیں کی۔ کبھی کوئی آپ کو اچھا نہیں لگا یا آپ کسی کے دل کو نہیں بھائیں..... کوئی تو ہو گا ناں!''

مس مونا کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی لیکن اس کا سر پھر نفی میں ہل گیا تھا۔

''تو پھر..... پھر یہ اتنی گہری محبتوں کی کہانیاں کیسے لکھ لیتی ہیں آپ؟ اتنے سچے اور شدید جذبے.....'' اس کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور رشک بھی۔ اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''آپ بالکل بچوں جیسی بات کر رہی ہیں ضروری نہیں کہ جو محبت کی کہانیاں لکھتا ہو اس نے محبت بھی کی ہو۔ اتنے سارے لوگوں نے محبتوں کی کہانیاں لکھیں، مردوں نے بھی عورتوں نے بھی لیکن ضروری تو نہیں ان سب نے محبت کی ہو۔''

''ہاں، ضروری تو نہیں لیکن جس طرح آپ کے ہاں محبت کی شدتیں ملتی ہیں ایسی تو مجھے کسی کی تحریر میں نظر نہیں آئیں۔'' اس کی نظریں اب بھی اسے ٹٹولتی تھیں اور جیسے کہتی تھیں کہیں کچھ ہے تو جو چھپا ہوا ہے۔ اس نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔

''اب میں کیا کہہ سکتی ہوں مونا۔''

اس نے دو مردوں کرنل سمیر اور احمد حسن کے متعلق سوچا تو تھا لیکن محبت..... ہاں محبت تو کہیں نہیں تھی بس..... چند دنوں تک خیال سا رہا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا شریک بننے والا ہے اور یہ اسی رات کی بات تھی کہ اماں کے سونے کے بعد جب اس نے قلم اٹھایا اور ابھی چند جملے ہی لکھے تھے کہ اسے اچانک خیال آیا تھا کہ کوئی تو ہو، ہاں کوئی تو جو اس سے محبت کرے اتنی شدید محبت جتنی میجر حسیب نے سونیا سلام سے کی تھی اور اسے پانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ اور اس رات تیس سال کی عمر میں ایشال زہرا کے دل میں ایسا خیال آیا تھا کوئی تو ہو..... ہاں کوئی تو جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ سب کچھ بھول جائے۔ جو اس کے دکھ پر دکھی ہو اور اس کی خوشی میں خوش ہو۔ وہ روئے تو اس کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن لے۔ وہ ہنسے تو اس کی ہنسی میں شریک ہو جائے۔ اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر چلے تو اسے لگے ایک دنیا اس کے ساتھ ہے..... اور یہ چاہے جانے کا خیال جو اس رات اچانک دل میں پیدا

ہوا تھا اکثر اسے ڈسٹرب کرنے لگا تھا۔ وہ لکھتے، لکھتے کہانی ادھوری چھوڑ دیتی۔

ہاں کوئی تو ہوتا
جو میری راہوں میں
پھول رکھتا
میں گرنے لگتا تو
تھام لیتا
کوئی تو ہوتا

اور پھر اسے ناصر جبار ملا۔ ناصر جبار سے اس کی پہلی ملاقات پرنسپل کے آفس میں ہوئی تھی۔ وہ اپنی بہن حنا جبار کے سلسلے میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ حنا جبار فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی اور وہ اس کی کلاس کو فزکس اور میتھس پڑھاتی تھی۔

''یہ ناصر جبار ہیں حنا جبار کے بھائی۔'' پرنسپل نے تعارف کروایا تھا۔

''اور یہ حنا کے سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی فرمائیے!'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تو پرنسپل آفس سے چلی گئیں۔ یہ ان کا راؤنڈ ٹائم تھا۔

''حنا میری سسٹر ہے اور.....''

اس نے سر اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔ بلاشبہ وہ ایک وجیہہ شخص تھا۔ آنکھوں میں سنجیدگی، چہرے کے نقوش سے مغرور سا لگنے والا وہ شخص بالکل فیصل لاشاری جیسا تھا۔

''تو آپ ہیں حنا کی پسندیدہ ٹیچر مس ایشال زہرا۔'' وہ بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''جی، میں اسے فزکس اور میتھس پڑھاتی ہوں۔''

''دراصل یہ ہے تو کچھ عجیب سی بات لیکن میں آپ سے مل کر اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ آپ کس..... مطلب.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس پر ایک گہری نظر ڈالی۔

''دراصل حنا ہر وقت آپ کی تعریف کرتی رہتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی غلط..... میرا مطلب.....''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس کا رنگ سرخ ہوا تھا۔

عاشقی کیا ہے

بھیگ جائے جب آنکھ کسی کی یاد میں
مجھے بتائے تو سہی اور عشق کیا ہے
بے وفا کہوں اسے یا اک مجبور
سچ ہے اگر پھر بے بسی کیا ہے
جدائی ہی ہے پہچان محبت کی
مل جائے وہ ایاز پھر عاشقی کیا ہے

شاعر: امتیاز احمد
پسند: گل نور بانو..... گوجرانوالہ

نظم

اداسیوں کے سفر میں چلتے
تمہی کو سوچوں کی نذر کرنا
کہ جیسے سردی میں دھوپ چمکے
کہیں درختوں پہ بڑھتے سائے
تیرے ہجر کے ہی گیت گائیں
میرے تصور پہ عکس تیرا
ہمیشہ آ کے ہی گنگنائے

کاوش: نبیلہ خان، ڈیرہ اسماعیل خان

''سوری میم، آپ مائنڈ مت کیجیے گا۔ میں دراصل حنا کے متعلق بہت حساس ہوں اور میں حنا کی ہر بات اس کی پسندیدگی، ناپسندیدگی سب پر گہری نظر رکھتا ہوں۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو تعلیم دینا بالکل ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ حنا میری بہت لاڈلی ہے میں اس کی کوئی بات رد نہیں کر پاتا سو اپنی ذمے داری پر میں اسے تعلیم دلوا رہا ہوں تو اس کے ہر اچھے برے کا ذمے دار مجھے ہی ٹھہرایا جائے گا تو میں اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں کہ میرے علم میں ہو کہ وہ جسے اس نے اپنا رول ماڈل بنا رکھا ہے..... جس کے متعلق باتیں کرتی وہ تھکتی نہیں، اس کا کردار کیسا ہے وہ کس خاندان سے.....''

''بس مسٹر ناصر.....'' وہ یک دم کھڑی ہو گئی تھی اور اس نے بہ مشکل خود کو کمپوز کیا۔

''آپ کو اپنی بہن اور اپنی تربیت پر بھروسا ہونا چاہیے تھا اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر بہتر تھا کہ آپ اسے

کالج بھیجنے کے بجائے گھر کی چاردیواری میں ہی قید رکھتے۔ باقی مجھے آپ کو اپنی یا اپنے کردار کی کوئی صفائی نہیں دینی۔'' اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

''مس ایشال پلیز! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا..... بس میں آپ کو.....''

لیکن وہ وہاں رکی نہیں تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اسی وقت پرنسپل راؤنڈ سے واپس آگئی تھیں۔ سو وہ تیزی سے چلتی ہوئی آفس سے باہر آگئی تھی۔ اس روز خواہ مخواہ ہی اسے ناصر جبار پر غصہ آتا رہا لیکن جب رات کو وہ بیڈ پر لیٹی تو یہ غصہ کسی حد تک کم ہو چکا تھا کہ اس کے متعلق اس نے جو بھی سوچا صرف اپنی بہن کے خیال سے..... وہ یقیناً ایک اچھا بھائی تھا۔ ایک سعدون تھا اس کا بھائی جسے اس کا خیال تک نہ تھا۔ دوسرے دن کالج میں اس نے حنا کو اگنور کرنا چاہا تھا لیکن نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے روتی رہی ہو، نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے حنا کو روک لیا تھا۔

''کیا ہوا حنا؟''

''کچھ نہیں میم، وہ بھائی کل آئے تھے ناں کالج، آئی ایم سوری میم۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے تھے۔ ''پتا نہیں انہوں نے کیا، کیا کہا ہوگا آپ سے.....''

''ارے نہیں کچھ نہیں کہا..... آپ یوں ہی پریشان ہو رہی ہیں.....'' اس نے اسے تسلی دی۔

''ریئلی میم انہوں نے کچھ نہیں کہا؟'' وہ یک دم خوش ہوگئی تھی۔

''مجھے اتنا ڈر لگ رہا تھا کہ پتا نہیں انہوں نے کیا کہا ہوگا، گھر میں بہت ڈانٹتے تھے کہ میں کیوں ہر وقت آپ کا ذکر کرتی رہتی ہوں۔ دراصل اُن کا مزاج بہت سخت ہے اور انہیں بہت جلد غصہ آجاتا ہے لیکن میم وہ دل کے برے نہیں ہیں، مجھ سے تو بہت پیار کرتے ہیں۔''

''اٹس او کے حنا، اب آپ جائیں اور اگر میرے ذکر سے انہیں غصہ آتا ہے تو میرا ذکر نہ کیا کریں گھر میں.....''

''صرف آپ کی بات نہیں ہے میم، وہ تو میری فرینڈز کے ذکر پر بھی ناراض ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی سے زیادہ تعلق مت رکھو، کسی کے متعلق کچھ پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیسے ہیں۔'' اس کی آنکھیں پھر ہلکی سی نم ہوئی تھیں لیکن اس نے خود پر قابو کر لیا تھا۔

''وہ آپ کی بہتری کے لیے کہتے ہیں ناں..... تو آپ کو اچھا نہ بھی لگے تب بھی ان کی بات مان لیا کریں۔''

''جی میم!''

وہ بہت معصوم سی تھی اور بہت پیاری بھی۔ شاید اسی لیے اس کا بھائی اس کے لیے ڈرتا تھا۔ اس رات وہ پھر بہت دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اور صرف تین دن بعد وہ پھر وزیٹرز روم میں اس کا منتظر تھا۔

''آپ سے کوئی ملنے آیا ہے میم.....'' بابا نور زمان نے آکر بتایا تو اس نے سوچا کہ چند دن پہلے ہی فرسٹ ٹرم کے رزلٹ کے بعد پیرنٹس میٹنگ تھی۔ کچھ بچیوں کے گھر سے کوئی نہیں آیا تھا اور وہ پڑھائی میں بھی کافی کمزور تھیں تو اس نے سوچا کہ شاید کسی دوسری لڑکی کے گھر سے کوئی آیا ہوگا۔

''ٹھیک ہے بابا جی، ان سے کہیں ویٹ کریں میں آتی ہوں۔''

اور وہاں ناصر جبار کو بیٹھا دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

''اب کیا پرابلم ہے آپ کو؟''

''پرابلم تو ہے میم، آپ سے سوری کرنے آیا ہوں، نیند نہیں آتی اس خیال سے کہ میں نے آپ کو بلاوجہ ناراض کر دیا۔''

آج اس کی آنکھوں میں نرم سا تاثر تھا اور چہرے کے نقوش میں ملائمت سی تھی۔

''کوئی بات نہیں..... مجھے یاد بھی نہیں رہا۔''

''لیکن میں تو نہیں بھول سکا مس..... شاید میں اپنی بات کی صحیح طرح سے وضاحت نہیں کر سکا تھا۔ آپ نہیں جانتیں میں نے پورے خاندان سے لڑ کر حنا کو کالج میں ایڈمیشن دلوایا ہے تو میں اس کے متعلق کچھ زیادہ ہی حساس ہوں..... میری بات سے آپ کو تکلیف پہنچی تھی، میں اس کے لیے دل سے معذرت

خواہ ہوں۔'' وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں نے آپ کی بات سمجھ لی ہے، بھائیوں کو بہنوں کے لیے اتنا ہی محتاط ہونا چاہیے۔'' اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی بات سن کر یک دم ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور وہ بے حد خوش نظر آنے لگا تھا۔

''تو آپ کے دل میں اب میری طرف سے کوئی ملال تو نہیں ہے ناں.....''

''نہیں.....'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے مڑی ہی تھی کہ اس نے یک دم کھڑا ہوتے ہوئے اسے روکا۔

''مس پلیز ایک منٹ.....''

''جی.....'' وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

''آپ سے ایک درخواست ہے اگر آپ مجھے حنا کے متعلق کبھی کبھار فون کر کے بتا دیا کریں کہ وہ پڑھائی میں کیسی جا رہی ہے اس کا behaviour (رویہ) کیسا ہے۔ کیسی لڑکیوں سے زیادہ دوستی ہے تو میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔''

''آپ بے فکر رہیں.....'' وہ مدھم سا مسکرائی۔

''حنا پڑھائی میں بہت اچھی ہے اور اس کی کسی خاص لڑکی سے دوستی نہیں ہے، کلاس میں سب کے ساتھ اور ٹیچر کے ساتھ اس کا رویہ بہت اچھا ہے۔''

''تھینک یو..... مس پھر بھی اگر کوئی بات ہو تو مجھے آپ.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کے ہاتھ میں پکڑے فون کی طرف دیکھا۔

''یہ میرا نمبر اگر آپ نوٹ کر لیں تو..... لائیں میں سیو کر دوں.....''

''جی.....'' اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا فون لے لیا اور اپنا فون نمبر اس میں سیو کر کے اپنے فون پر بیل دی۔ اور اس کا فون اس کے حوالے کر دیا..... اور وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ایک بار پھر آپ کا بہت شکریہ.....''

وہ مسکراتا ہوا وزیٹرز روم سے باہر نکل گیا۔ وہ لمحہ بھر ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھتی رہی۔ جو ادھر آتے ہوئے اس نے اماں کو کال کرنے کے لیے اپنے بیگ سے نکالا تھا اس کی عادت تھی کہ بابا کے بعد دو تین بار کالج سے انہیں فون ضرور کرتی تھی تاکہ ان کی خیریت معلوم ہوتی رہے۔ اس وقت اس کے ذہن میں بالکل نہیں آیا تھا کہ کس طرح چالاکی سے ناصر جبار نے اس کا نمبر لے لیا ہے۔ پھر کئی دن گزر گئے تھے، شاید ایک ہفتہ یا شاید دس دن وہ اماں کے سونے کے بعد باہر لاؤنج میں آ گئی تھی کہ اس کا موڈ پڑھنے کا تھا اور اماں روشنی سے ڈسٹرب ہوتی تھیں۔ بابا کے بعد وہ اماں کے کمرے میں ہی سونے لگی تھی۔ تو اس رات جب وہ لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز اپنے پسندیدہ رائٹر کی کتاب میں گم تھی تو اچانک اس کے فون کی بیل بجی۔ لمحہ بھر تو وہ حیران سی پاس پڑے فون کو دیکھتی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر فون اٹھا لیا بھلا اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے۔ شاید سعدون بھائی کا ہو..... گو وہ بھی کبھار ہی مہینوں بعد فون کرتے تھے وہ بھی اماں کو..... اسکرین پر ناصر جبار کا نام دیکھ کر وہ چونکی..... لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے کال اٹینڈ کر لی۔

''میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا..... کیا کر رہی تھیں آپ.....؟'' اس کی آواز فون پر بہت خوب صورت محسوس ہوئی تھی اور لہجے میں بلا کی نرمی اور ملائمت تھی۔ وہ جو دیکھنے میں بہت اکھڑا اور مغرور سا لگا تھا اسے۔

''جی میں پڑھ رہی تھی، آپ نے اس وقت کیوں فون کیا خیریت.....!''

''جی..... خیریت ہی ہے بس آپ سے بات کرنے کو جی چاہ رہا تھا، آپ نے تو کبھی فون ہی نہیں کیا۔''

''جی.....!'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''لیکن میں بلاوجہ فون کیوں کرتی، کوئی بات ہی نہیں تھی اور پھر حنا تو ایک ہفتے سے چھٹی پر ہے۔''

''ہاں وہ گاؤں گئی ہوئی ہے..... میں نے سوچا شاید آپ پوچھیں کہ حنا کیوں نہیں آ رہی.....''

''حنا دو ہفتے کی چھٹی لے کر گئی تھی پرنسپل سے تو ایسے میں مجھے بھلا کس لیے فون کرنا تھا۔'' اس نے صاف لہجے میں کہا تو ناصر جبار اس کی بات پر لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔

''آپ شاید میرے فون کرنے پر ناراض ہوگئی ہیں۔'' چند لمحے توقف کے بعد اس نے کہا۔

''نہیں لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ آپ نے فون کیوں کیا ہے؟'' وہ ابھی تک الجھی ہوئی سی تھی۔

''ہاں سمجھ تو مجھے بھی نہیں آرہا کہ میں نے آپ کو فون کیوں کیا ہے..... بس جی چاہا آپ سے بات کرنے کو..... میں حنا سے کہتا تھا کہ آخر کیا ہے تمہاری میم میں جو تم ہر وقت ان کی باتیں کرتی رہتی ہو لیکن مجھے لگتا ہے جیسے میں بھی آپ سے متاثر ہوگیا ہوں۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''میں تو ایک بہت عام سی، سادہ سی لڑکی ہوں مجھ میں بھلا ایسی کیا خاص بات ہے متاثر ہونے والی اس نے بے حد سادگی سے کہا۔

''بعض عام لوگ بھی کسی کے لیے بہت خاص ہوتے ہیں۔ مس ایشال اور آپ بھی بہت خاص ہیں، بہت خالص.....''

اس کا لہجہ معنی خیز تھا، کچھ کہتا ہوا، کچھ جتاتا ہوا، اسے باتیں کرنے کا فن آتا تھا، وہ حیران سی اس کی باتیں سنتی رہی اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ باتیں کرتے ایک گھنٹا گزر گیا..... اور یوں یہ آخری اور پہلی کال نہ تھی وہ اکثر فون کرنے لگا تھا۔ بظاہر چھوٹی، چھوٹی باتیں..... اپنی، اپنے دوستوں کی اپنے خاندان کی..... اسے جاگیرداری نظام پسند نہیں تھا سو اس نے ایم بی اے کیا تھا اور یہاں جاب کر رہا تھا۔ ان ہی چھوٹی، چھوٹی باتوں کے درمیان وہ کوئی ایک معنی خیز سی بات کر دیتا اور یہ ایک بات اس پر سحر سا طاری کر دیتی۔ وہ گھنٹوں اس ایک بات کو لے کر سوچتی رہتی۔ اور دل میں ہلچل سی مچ جاتی۔

''سنو ایشال زہرا، مجھے لگتا ہے میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

پتا نہیں کب مگر صرف تین ماہ میں وہ آپ سے تم پر آگیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ جیسے دل کی کئی دھڑکنیں ایک ساتھ مس ہوئی ہوں اور دل یک دم ہی ڈوب کر ابھرا تھا۔

''تو کوئی اس سے بھی محبت کر سکتا ہے۔'' اس سے..... ایشال زہرا سے..... بے حد عام سی سادہ سی ایشال زہر.....

فیصل لاشاری، اسفند یار، زارون کتنے ہی کردار اس کی آنکھوں کے سامنے آگئے۔ انہوں نے بھی بہت عام سی لڑکیوں سے محبت کی تھی تو..... اس نے بھی ایک دن سوچا تھا۔ کوئی تو ہو جو اس سے بھی محبت کرے..... اس کے ساتھ کی چاہ کرے۔

''آپ ناراض ہوگئیں ایشال؟'' دوسری طرف سے وہ پوچھ رہا تھا۔

''ہاں، نہیں تو.....'' وہ چونکی۔

''I believe me I am fell in love with you ناراض نہیں ہو تو میری محبت کو قبول کر لو پلیز..... مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔''

اور اس نے بھی یہی تو چاہا تھا۔ اس ایک رات اچانک یہ خیال اس کے دل میں آیا تھا کہ کوئی تو ہو اور ناصر جبار اسے چاہتا تھا اس سے محبت کر رہا تھا۔ اور اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی، چھوٹی باتیں اس سے شیئر کرنے لگی تھی اور وہ بھی بہت اشتیاق سے پوچھتا۔

''اچھا بتاؤ آج کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں؟ کون سا کلر ہے؟'' تین چار ماہ میں ہی اس نے اس کے متعلق سب کچھ جان لیا تھا۔ اس کی پسند ناپسند، اس کے خیالات، سوچ وہ جیسے سب پر قابض ہوتا جا رہا تھا۔

''سنو تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی، کیا کوئی محبت کی ٹریجڈی۔ اس شام ادھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد وہ وہی اسٹوپڈ سوال کر رہا تھا جو اس کی کئی جاننے والیاں اس سے کر چکی تھیں۔

"no not at all" وہ ہولے سے ہنسی۔ ''میں آپ سے اس سوال کی توقع ہرگز نہیں کر رہی تھی۔''

''چلو اب سوال کر لیا ہے جواب تو بنتا ہے ناں.....''

''کیا کہوں میری دنیا بس اماں، بابا، بھیا انہی تک محدود رہی..... اور گھر سے کالج..... کالج سے گھر..... اپنی پڑھائی لکھائی میں مگن رہی..... بھیا کے یو کے جانے کے بعد اماں کو میری شادی کی فکر ہوئی۔''

''پھر..... شادی کیوں نہ ہوئی.....؟'' اس سے وہ

اسے بے حد سنجیدہ سا لگا۔

''پتا نہیں..... دو تین رشتے آئے تو لیکن بات نہ بن سکی، کسی کو میری عمر پر اعتراض تھا تو کسی کو جاب پر اور کسی کو میری رنگت کالی لگی۔''

''تو تم نے کوئی فیئر نس کریم کیوں استعمال نہیں کی۔'' وہ شوخ ہوا۔

''خیال ہی نہیں آیا۔'' وہ بھی ہنس دی۔

''لیکن اگر آپ کہتے ہیں تو اب کر لیتی ہوں۔''

''ارے نہیں، ہمیں تو آپ کی اس گندمی رنگت نے ہی لوٹ لیا ہے۔''

اس نے بے اختیار کہا تھا..... وہ یک دم چپ کر گئی..... دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی تھی کہ وہ خود سن سکتی تھی۔

''چپ کیوں ہو گئی ہو ایشی.....'' لمحے بھر کے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

''نہیں تو... بول تو رہی ہوں۔''

''اچھا.....'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''اگر کسی کو تمہاری جاب پر اعتراض ہو نہ عمر پر نہ رنگت پر اور وہ تمہیں پروپوز کرے تو کیا اس کا پروپوزل قبول کر لوں گی۔''

''میری زندگی کا فیصلہ تو اماں نے کرنا ہے اگر انہیں قبول ہوا تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''اور اگر تمہاری اماں نے انکار کر دیا تو.....''

''تو وہ بہتر سمجھتی ہوں گی۔''

''سنو..... میں تمہیں پروپوز کرنا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں اگر تمہاری اماں نے انکار کر دیا تو..... تو کیا تم میرے ساتھ کورٹ میرج کرو گی؟''

''نہیں.....'' اس نے فوراً کہا تھا۔

''کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں.....؟''

''میرے لیے میرے والدین کی عزت اور وقار آپ کی محبت سے زیادہ قیمتی ہے۔''

''مجھے فخر ہے ایشال کہ میں نے تم سے محبت کی ہے، مجھے کسی ایسی ہی شریکِ زندگی کی چاہ تھی۔ سچ بتاؤں تمہیں، مجھے بے باک، شوخ اور بولڈ لڑکیاں پسند نہیں ہیں، مجھے تمہاری سادگی اور معصومیت نے اسیر کر لیا ہے، میں بہت جلد تمہاری اماں سے ملنے آؤں گا۔'' لیکن بہت سارے دن گزر گئے..... اس نے اس بات کا ذکر نہ کیا۔ ہاں دو تین بار اس نے اسے باہر ملنے اور کھانے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

''ہمارے ہاں اسے معیوب سمجھا جاتا ہے، پلیز آپ ناراض نہ ہونا۔''

''میں ناراض نہیں ہوں، تمہاری ایسی باتیں تمہاری قدر اور محبت بڑھا دیتی ہیں..... بے خودی میں فرمائش کر دیتا ہوں۔''

اماں کی طبیعت ان دنوں پھر خراب رہنے لگی تھی اور وہ اس کی اماں کے لیے اتنا ہی پریشان ہوتا جتنا وہ ہوتی تھی..... تو بالآخر وہ ایک شخص اس کی زندگی میں آ گیا تھا۔ ان دنوں اماں ایک بار پھر اس کے رشتے کے لیے کوشاں رہنے لگی تھیں..... حتیٰ کہ ایک بار پھر ایک رشتہ کروانے والی سی رابطہ کیا تھا۔

''لیکن کیوں اماں.....؟'' اس نے احتجاج کیا۔ ''پہلے ان رشتہ کروانے والیوں نے چھوٹی خالہ اور پھر میرے سلسلے میں کتنا خوار کیا ہے، بھول گئیں.....''

''نہیں..... لیکن اور کیا کروں، ثریا آپا نے ان کی بہت تعریف کی ہے..... پیسے زیادہ لیتی ہیں لیکن دھوکا نہیں کرتیں.....''

''کتنے پیسے اماں.....؟''

''ایک لاکھ پہلے لیں گی اور پھر پچاس ہزار.....''

اور وہ حیرت سے اماں کو تکتی رہ گئی تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں۔ بس منع کر دیں۔''

''ضرورت ہے ایشال..... اکیلی اور تنہا لڑکی کو لوگ کھا جاتے ہیں، جینے نہیں دیتے۔'' بے بسی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''اماں پلیز..... ایسا مت کریں.....'' اس نے انہیں ساتھ لگا کر ان کے آنسو پونچھے۔

''سعد ون یہاں ہوتا اس گھر میں تو مجھے اتنی فکر نہ ہوتی تمہاری..... جیسا بھی ہوتا..... بھائی تھا..... تمہارا سائبان..... لوگ انگلی نہ اٹھا سکتے پر اب تو.....''

''اور میرے بعد آپ جو اکیلی رہ گئیں تو مجھے

فکر نہیں ہوگی کیا؟'' وہ ناراض سی روٹھی، روٹھی سی بولی۔

''اللہ تمہیں ایک بار اپنے گھر کا کر دے تو میری فکر نہ کر..... میں ثریا آپا کو اپنے پاس رکھ لوں گی۔'' اور اس رات جب اس نے ناصر جبار کو اماں کی یہ فکر بتائی تو وہ پریشان ہو گیا تھا۔

''نہیں ایشال..... تمہیں صرف میری زندگی کا ساتھی ہونا ہے..... منع کر دو اماں کو..... میں کل اپنے ایک دوست اور اس کی مسز کو تمہاری اماں کی طرف بھیجتا ہوں، تم بس اماں سے میرا ذکر کر دینا۔'' اور اس نے جھجکتے، جھجکتے اماں سے کہا تھا۔

''اماں وہ میری ایک اسٹوڈنٹ ہے۔ وہ اپنے بھائی کے لیے..... میں نے بھی ایک دو بار اسے دیکھا ہے، وہ اپنی بہن کے سلسلے میں کالج آیا تھا ملنے.....''

''ٹھیک ہے تم اس سے کہو وہ لوگ آ جائیں.....''

اور ناصر جبار اپنے دوست اور اس کی بیگم کے ساتھ خود بھی آیا تھا۔ اماں کو وہ بہت پسند آیا تھا۔ اتنا وجیہہ اور شاندار نظر آنے والا ناصر جبار کتنی عاجزی سے ان سے بات کر رہا تھا۔ لیکن انہیں اور ثریا خالہ کو اصرار تھا کہ ایک بار اس کے گھر سے بھی کوئی آئے..... لیکن اس نے صاف، صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتا ہے..... اس وقت کسی کا آنا ممکن نہیں ہے، ہاں شادی پر سب آئیں گے..... اور ثریا خالہ کے کہنے پر اماں نے ہاں کر دی تھی..... اور سعدون کو بھی بتا دیا تھا..... اور درخواست کی تھی کہ باپ سر پر نہیں ہے اور اگر ماں یا بہن کا ذرا سا بھی خیال ہے دل میں تو رخصتی پر آ جانا۔ سر پر ہاتھ رکھ کر رخصت کرو گے تو سسرال میں اس کا بھی مان بڑھ جائے گا۔

اور سعدون، نمیرا اور بچوں کے ساتھ اس کی شادی میں شرکت کے لیے آ گئے تھے۔ یہ خوشی اماں سے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔

''کسی روپے پیسے کی ضرورت نہیں ہے سعدون، تم آ گئے ہو تو..... میں نے اپنے سارے حقوق معاف کیے تمہیں.....''

وہ رونے لگی تھیں اور سعدون نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا تھا..... البتہ نمیرا بھابی کا موڈ خراب تھا۔ وہ دو دن رہ کر اپنی بہن کی طرف چلی گئی تھیں اور بارات والے دن سیدھی ہال میں آئی تھیں۔ سعدون نے البتہ سب سنبھال لیا تھا۔ ہال کی بکنگ وغیرہ سے لے کر سب کام حماد بھائی بھی اس کے ساتھ تھے۔ اور ثریا خالہ، اماں کی مددگار..... کبھی نہ میک اپ کرنے والی اور ہمیشہ سادہ سی رہنے والی ایشال زہرا جب ایک بڑے بیوٹی پارلر سے تیار ہوئی تو آئینے میں دیکھ کر خود بھی ایک لمحہ کے لیے حیران رہ گئی۔ یہ وہ تھی ایشال اور ناصر جبار بھی تو کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ نمو بھابی جو پہلے بڑی، بڑی قیمتی گاڑیوں پر آئی بارات کو دیکھ کر حیران سی بیٹھی تھیں..... دولھا کو دیکھ کر تو جیسے سکتے میں آ گئی تھیں۔ کیسا شاندار مرد تھا اور پھر اتنا دولت مند..... بری کا زیور دیکھ کر ہی اُن کی آنکھیں کھل گئی تھیں جو تین چار ملازمائیں، اسٹیج پر کھڑی ہو کر سب کو دکھا رہی تھیں اور انہیں ایک دم احمد حسن کا خیال آیا تھا۔ اور وہ احمد حسن کالا بھجنگ (اس کا ہلکا سا سانولا رنگ ناصر جبار کے سامنے انہیں کالا لگ رہا تھا) اور ان کا بس چلتا تو وہ احمد حسن کو ناصر جبار سے بدل لیتیں۔ عینا کے ساتھ تو ناصر ہی سجتا تھا اور وہ احمد حسن، وہ تو عینا کا غلام ہی لگتا تھا۔ بلاوجہ کا حسد دل میں چھپائے وہ ناصر کی بھابیوں اور دوسرے رشتے دار خواتین سے ملتی رہیں۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ آخر اتنے امیر اور جاگیردار لوگوں کا رشتہ ایشال زہرا کے لیے کیسے آ گیا لیکن کچھ نہ جان سکی تھیں..... ناصر نے جیسا کہا تھا ویسے ہی اس کی شادی میں اس کی بھابیاں، بھائی، چچا، تایا، ماموں سب کے ہی خاندان شریک ہوئے تھے۔ اماں مطمئن اور وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھ رہی تھی۔ جس کا شریکِ حیات اس کی محبت میں پور، پور ڈوبا ہوا تھا۔

''پہلی تو نہیں لیکن دوسری نظر میں ہی تم میرے دل میں اتر گئی تھیں۔'' ہیرے کا خوب صورت سیٹ اسے رونمائی میں دیتے ہوئے اس نے اعتراف کیا تھا۔

''مجھے تمہاری سادگی، تمہارا مجھے اہمیت نہ دینا

اٹریکٹ کر گیا تھا۔ مجھے کسی ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی...... لیکن لڑکیاں...... اُف......او......اب کیا کہوں خوب صورت......اور دولت مند لڑکوں کے گرد ایسے منڈلاتی ہیں جیسے مکھیاں گٹر پر......" اور اسے ہنسی آ گئی تھی۔

اور وہ بات نامکمل چھوڑ کر مبہوت سا ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

"تمہاری ہنسی کتنی ظالم ہے یار، سیدھا دل کو چھوتی ہے اور تم کتنی خوب صورت ہو...... ہمیشہ ہنستی رہا کرو......" اور اس رات ناصر جبار نے کتنے ہی خوب صورت پیمان اور وعدے اس کی ہتھیلی پر رکھے تھے اور اس نے خود پر رشک کیا تھا۔

ناصر جبار کے گھر والے ہال سے ہی ہوٹل چلے گئے تھے۔ جہاں ناصر نے ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ گھر میں ... ایک ملازمہ ہی تھی۔ اس کے دل میں بس ایک لمحے کے لیے خیال آیا تھا کہ گھر میں کوئی تو ہوتا اس کا استقبال کرنے کے لیے......کوئی نند، بھاوج، ساس کوئی تو لیکن پھر ناصر کی وارفتگیاں، اس کی چاہتیں، یہ خیال اس کے ذہن سے نکل گیا اور وہ گلہ نہ کر سکی۔

ولیمے کی تقریب بھی شاندار تھی۔ ایک بہت مہنگے مارکی میں انتظام کیا گیا تھا...... بہترین کھانا، شاندار ارینج منٹ سیاہ ڈنر سوٹ میں ناصر جبار پر سب کی نظریں تھیں اور وہ جب تیار ہو کر آئی تو.... ثمیرا بھابی نے حیران ہو کر سوچا۔ "ارے یہ ایشال ہے بدھوسی۔" وہ کل کے مقابلے آج زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی...... سب نے ہی دولھا، دلہن کی دل کھول کر تعریف کی۔ آتے جاتے مہمانوں کا استقبال کرتے جب ناصر مسکرا کر والہانہ نظروں سے اسے دیکھتا تو اس کے لبوں پر بھی مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو جاتی۔

"دیر آید درست آید......" اس کی ایک کولیگ نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی......وہ کوئی اس کی زندگی میں آ گیا تھا، جس کا خیال ایک رات اچانک ہی اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ بھابی اور سعدون بھائی اس کے پاس فوٹو بنوانے کے لیے آئے تو اپنے مہمانوں کو ریسیو کرتے ناصر جبار کو بھی آنا پڑا۔ دائیں طرف بھابی اور بائیں طرف ناصر تھا اور ناصر کے ساتھ سعدون اور ان کی گود میں سلمان تھا جبکہ ساتھ ہی عثمان کھڑا تھا، اس سے زندگی کتنی مکمل تھی۔

"وہ احمد حسن تو ناصر کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہے۔ چلو اچھا ہوا تمہارے لیے احمد حسن نہ ملا تو اس سے اچھا مل گیا۔" بھابی نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے سوچا اسی میں بہتری ہوگی جو احمد حسن کے ساتھ اس کا رشتہ نہ ہو سکا تھا اور اماں کو تب کتنا دکھ ہوا تھا۔ اس نے مدھم سا مسکرا کر کن انکھیوں سے ناصر کی طرف دیکھا تھا۔ جو سلمان کی طرف متوجہ تھا۔

اور یہ ولیمے والی رات کی بات تھی...... ناصر کے عزیز و اقارب وہاں سے ہی واپس گاؤں چلے گئے تھے۔ حنا اس کے پاس ملنے آئی تو اس سے ملتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"حنا...... آپ بھی گاؤں جا رہی ہیں؟"

"جی......!" حنا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"آپ کی پڑھائی کا حرج ہو گا گڑیا......" لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"جلدی واپس آنا، اکیلے میں میرا دل بہت گھبرائے گا۔" اس نے اس کا رخسار تھپتھپایا تھا اور ناصر جمال کے ساتھ اکیلی گھر آ گئی تھی۔ یہ تین بیڈ رومز کا اچھا خاصا لگژری فلیٹ تھا۔ ناصر جمال اسے لاؤنج میں ہی چھوڑ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ کچن میں موجود ادھیڑ عمر ملازمہ کو کچھ ہدایات دے کر وہ لاؤنج میں آیا تو اسے ابھی تک لاؤنج میں کھڑے دیکھ کر حیران ہوا۔

"تم ابھی تک یہاں کھڑی ہو ایشال...... جاؤ چینج کر لو...... میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں اور مجھے آرام کرنا ہے۔ پلیز تم میرا انتظار نہ کرنا سو جانا۔ میں نے اماں صالحہ کو چائے کے لیے کہا ہے...... پی کر آتا ہوں......"

بے حد پتھریلا سا لہجہ......وہ جو منتظر تھی کہ ابھی وہ اس کی تعریف کرے گا۔ سب نے اس کی کتنی تعریفیں کی تھیں اور وہ جس کے ستائش بھرے جملے سننے کی وہ منتظر تھی اس نے ایک لفظ تک نہ کہا تھا۔ وہ چپ سی کپڑے

تبدیل کر کے لپٹ گئی تھی لیکن آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔
کچھ دیر بعد وہ آیا تو لائٹ آف کر کے ایک لفظ بھی کہے بغیر لپٹ گیا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناصر؟''

اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس نے سختی سے اس کا ہاتھ اپنی پیشانی سے ہٹا دیا۔ وہ حیران ہوئی لیکن نہیں جانتی تھی کہ آگے چل کر بہت سی حیرتیں اس کی منتظر تھیں۔ رات بہت بے چین نیند تھی اس کی پھر بھی وہ عادتاً جلدی اٹھ گئی تھی..... ناصر سو رہا تھا۔

وہ نماز پڑھ کر باہر لاؤنج میں آ گئی تھی..... دل پتا نہیں کیوں گھبرا رہا تھا۔ شاید رات کے ناصر کے رویے کی وجہ سے..... وہ تھی ہی اتنی حساس کہ ناصر کے اس طرح اگنور کرنے کو بے حد محسوس کیا تھا اس نے اور ابھی تک اس کا دل اس دکھ سے نکل نہیں سکا تھا۔ اس وقت اسے چائے کی بے حد طلب محسوس ہو رہی تھی لیکن پتا نہیں اماں صالحہ کہاں تھیں۔ کاش حنا ہی گاؤں نہ جاتی تو..... اسے تو ابھی گھر کے متعلق کچھ بھی علم نہیں تھا۔ کل صبح ناشتا اماں صالحہ نے انہیں کمرے میں ہی دے دیا تھا اور پھر ناصر کے ساتھ وہ پارلر چلی گئی تھی اور..... ''کیا میں کچن میں جاؤں.....'' جو سامنے ہی تھا۔ ''لیکن مجھے کیا پتا چائے وغیرہ کا سامان کہاں ہے۔'' وہ سوچتی ہوئی لاؤنج میں ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اماں کے خیال سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں..... وہ تو اس وقت نماز سے فارغ ہو کر قرآن پڑھ رہی ہوں گی۔ وہ انہیں اس وقت چائے بنا کر دیتی تھی اور ساتھ کچھ بسکٹ یا رسک دے دیتی تھی کہ وہ تہجد کے وقت سے اٹھی ہوئی ہوتی تھیں اور انہیں چائے کی ضرورت ہوتی تھی..... اور پتا نہیں نمیرا بھابی نے انہیں چائے دی ہو گی یا نہیں..... ان کے واپس جانے کے بعد تو ثریا خالہ آ جائیں گی اماں سے کہوں گی کوئی مستقل ملازم لڑکی بھی رکھ لیں۔ اس نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی نم پلکیں پونچھیں۔

''صبح صبح کس کو یاد کر کے آنسو بہائے جا رہے ہیں؟'' جانے کب ناصر لاؤنج میں آیا تھا اسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔

''یونہی اماں کا خیال آ گیا تھا۔'' وہ ناصر کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''اماں کا یا کسی اور کا.....؟''

اس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بے حد چبھتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا مطلب.....؟'' اس کے لبوں سے نکلا۔

''مطلب تو تم خود بہتر سمجھتی ہو گی..... یہ احمد حسن کون ہے؟'' اس کی نظریں اس کے وجود میں کبھی جا رہی تھیں۔

''کون احمد حسن.....؟'' اس نے زیر لب کہا..... وہ تو کسی احمد حسن کو نہیں جانتی تھی۔

''وہی جس کا ذکر تمہاری بھابی تم سے کر رہی تھیں۔''

''اچھا..... وہ.....'' اس کے ذہن میں تو اس کا تصور تک نہیں تھا۔

''میرے ماموں جان نے اماں سے احمد حسن کی بات کی تھی..... میرے رشتے کے سلسلے میں لیکن پھر یہ رشتہ نہیں ہو سکا۔ دراصل اس کو بھابی کی بھانجی پسند آ گئی تھی۔'' اس کا وہی سادہ اور بے ریا انداز تھا۔

''تم کتنی پارٹی ہوا احمد حسن سے؟'' وہ اب بھی تیز نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

''آپ کو کیا ہو گیا ہے؟'' وہ جھلا گئی۔

''میں نے کہاں ملنا تھا اس سے..... وہ یو کے میں تھا۔ ماموں نے اماں سے بات کی تھی اور تصویر دکھائی تھی..... بس پھر بات ختم ہو گئی.....'' یک دم اس کے سر میں درد کی شدید لہر اٹھی تو اس نے بائیں ہاتھ سے سر دبایا۔

''درد ہو رہا ہے کیا؟'' یکا یک اس کے لہجے میں شہد سا گھل گیا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں چائے بنواتا ہوں.....'' اس نے وہاں سے ہی اماں صالحہ کو آواز دی۔ وہ شاید کچن میں ہی تھیں کہ فوراً سامنے آئیں۔

''جی چھوٹے سائیں.....''

''پہلے چائے لاؤ..... اور پھر ناشتا تیار کرو.....''

اور وہ سر جھکا کر جی کہتی ہوئی واپس کچن میں چلی گئیں تو وہ

اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور وارفتہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''سوری..... یار رات کو میری طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی تو.....؟'' وہ اب معذرت کر رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں.....'' اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔

''ناراض ہو.....!'' وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''رات تم اتنی خوب صورت لگ رہی تھیں کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تمہیں میری نظر نہ لگ جائے..... وہاں تمہیں جی بھر کر دیکھا بھی نہیں سوچا تھا گھر جا کر جی بھر کے اپنی جان کو دیکھوں گا..... لیکن میری طبیعت اتنی خراب تھی کہ..... پتا ہے جب میری طبیعت ذرا سی بھی خراب ہو تو میں بہت چڑچڑا ہو جاتا ہوں.....''

وہ لکھاری تھی قطرے میں دجلہ دیکھنے والی..... بظاہر وہ مسکرا دی تھی لیکن اندر کہیں کچھ چبھ رہا تھا۔ اس کا رات کا رویہ اور اس وقت کے سوال۔

''ناشتا کر کے تیار ہو جاؤ..... اماں سے ملنے چلتے ہیں.....'' وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ یک دم خوش ہوگئی اور اس نے سوچا.....

''دراصل میں ضرورت سے زیادہ حساس ہوں تو ورنہ ناصر بھی انسان ہی ہیں۔ ان کی بھی طبیعت خراب ہو سکتی ہے اور وہ بھی چڑچڑے ہو سکتے ہیں۔''

اماں انہیں دیکھ کر خوش ہوگئی تھیں۔

''خوش رہو..... جیتے رہو.....'' اماں نے انہیں دعا دی تھی۔

''بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔'' ناصر ان کے سامنے جھک گیا تھا اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''آپ میرے لیے اتنی ہی محترم ہیں جتنی میری اپنی سگی ماں.....'' ناصر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا اور بہت عقیدت سے ان کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگایا تھا۔

''مجھے موت سے صرف اس لیے ڈر لگتا تھا کہ میرے بعد میری ایشال اکیلی رہ جائے گی لیکن اب میں اسے تمہیں سونپ کر بہت خوش ہوں، میری بیٹی بہت نازک دل اور حساس ہے۔ بچپن میں کسی کی اونچی آواز سن کر دہل جاتی تھی۔ کسی کی سخت بات اسے گھنٹوں رُلاتی تھی۔ اس کے بابا سعدون کو ڈانٹتے تو یہ رو، رو کر برا حال کر لیتی تھی۔ اس کے دل کا آئینہ بہت نازک ہے۔ بیٹا اس کا خیال رکھنا۔ اگر اس کی کوئی بات اچھی نہیں لگے تو اسے معاف کر دینا۔ عورت کے معاملے میں مرد کو اپنا دل بڑا کرنا پڑتا ہے۔ تم بھی اپنا دل بڑا کرنا۔''

''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں خود سے بڑھ کر اس کا خیال رکھوں گا۔'' وہ اماں سے وعدے کر رہا تھا یقین دلا رہا تھا اور وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اونچی بہت اونچی..... ہاں بھابی نمیرا صحیح کہتی تھیں کہ وہ خوش قسمت ہے..... لیکن کیا وہ واقعی خوش قسمت تھی اس روز کے بعد کتنی ہی بار اس نے خود سے پوچھا تھا۔ اور ہر بار جیسے اندر سے آنسوؤں کے سمندر ابل پڑے تھے۔ اماں کتنی خوش تھیں اور سعدون بھائی نے بھی جانے سے پہلے ناصر جبار کی بہت تعریفیں کی تھیں۔ اور اماں مزید مطمئن ہوگئی تھیں..... اور وہ بھی اماں کی طرف سے مطمئن ہوگئی تھی کہ ان کے پاس ثریا خالہ آ گئی تھیں اور ثریا خالہ ایک تیرہ، چودہ سال کی لڑکی ڈھونڈنے میں بھی کامیاب ہوگئی تھیں اور کمال یہ تھا کہ وہ لڑکی کھانا پکانا اور سرو کرنا سب کام بہت سلیقے سے کرتی تھی۔ اور پھر فارغ ہو کر زبردستی ضد کر کے اماں کی ٹانگیں دبانے لگتی تھی..... اماں اس کے آنے سے بہت خوش تھیں۔

''بس اب تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے میاں کی فکر کرو..... اس کی ہر چیز کا خیال رکھنا اب تمہارا فرض ہے۔'' اماں نے اسے ڈھیروں نصیحتیں کی تھیں اور اماں کے کہے بغیر ہی اس نے ناصر کے سب کام سنبھال لیے تھے۔ وہ اس کے کپڑے استری کر کے ہینگ کر دیتی تھی۔ اس کے ناشتے، کھانے سب کا خیال رکھتی تھی۔ ابھی اس نے ایک ماہ کی چھٹیاں لی تھیں۔ اور اس نے سوچ رکھا تھا کہ جب کالج جانے لگے گی تو پھر کیسے اس نے کام کرنا ہوگا..... ناصر تین دن کے لیے اسے مری، اسلام آباد..... بھی گھمانے لے گیا تھا۔ یہ

دن اس کی زندگی کے بہترین دن تھے۔
شادی کے بارھویں دن جب ناصر آفس جانے کے لیے تیار ہوا تو وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔
''آپ نے اتنی کم چھٹیاں کیوں لیں؟''
''نہیں، کم تو نہیں لی تھیں بس ہفتہ بھر شادی سے پہلے گاؤں میں رہنا پڑا بہت سے مسئلے مسائل تھے تو.....''
''واپسی کب ہوگی.....'' اس نے پھر پوچھا۔
اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔
''پانچ بجے تک.....''
''اتنی دیر.....اور میں کیا کروں گی تب تک.....؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''تم اماں صالحہ سے باتیں کرنا اور مجھے یاد کرنا.....'' اس نے مسکرا کر دو انگلیوں سے اس کے رخسار کو چھوا اور اسے یک دم حنا کا خیال آیا۔ وہ ہوتی تو کالج سے جلدی آجاتی اور پھر اس کے ساتھ وقت اچھا گزر جاتا۔
''حنا کب تک آئے گی.....؟''
''حنا اب نہیں آئے گی.....'' وہ رخ موڑ کر پھر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگا۔
''کیوں.....؟'' اسے حیرت ہوئی۔ ''چند ماہ ہی تو رہ گئے ہیں اس کے فائنل ایگزیم میں.....''
''سو واٹ.....؟'' اس نے کندھے اچکائے۔
''اسے اب مزید نہیں پڑھنا.....''
''لیکن کیوں.....آپ نے تو خود اسے سارے خاندان سے لڑ کر ایڈمیشن دلوایا تھا پھر یوں بیچ راہ میں.....''
''بس.....'' اس نے ہاتھ اٹھایا۔ ''مجھے بحث کرنے والی عورتیں پسند نہیں ہیں۔''
''لیکن ناصر اسے پڑھائی کا جنون ہے، وہ تو اپنی جماعت کی سب سے ذہین لڑکی ہے.....اور اس کے خواب تو.....''
''تو حنا نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا.....'' اس نے اس کی بات کاٹی اور اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
''میں کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن تم سننا چاہتی ہو تو سنو.....تاکہ تم دوبارہ مجھ سے حنا کے متعلق سوال نہ کرو.....'' وہ لمحہ بھر خاموش یونہی اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔
''ہم اپنی لڑکیوں کو ہاسٹل میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتے اور میں نہیں چاہتا کہ میری معصوم بہن یہاں تمہاری صحبت میں رہے.....میں ایک ایسی عورت پر کیسے اعتبار کر سکتا ہوں جو ایک نامحرم مرد سے فون پر باتیں کرتی رہی ہو۔ تم تو اس کی آئیڈیل ہو اور جب کبھی تم اسے بتاؤ گی کہ تم اس کے بھائی سے فون پر بات کرتی تھیں اور یوں اس کے بھائی کو تم سے محبت ہوگئی اور وہ تم جیسی لڑکی کو بیاہ کر لے آیا تو کل کو وہ بھی شاید یہی کرے.....تو میری جان یہاں ہم تم اکیلے رہیں گے۔'' وہ ایک بار پھر اس کے رخسار کو چھو کر چلا گیا لیکن وہ وہاں ہی ہاتھ گود میں رکھے ساکت بیٹھی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں لیکن اس کے آنسو اندر ہی کہیں خشک ہو گئے تھے۔
''تم جیسی لڑکی.....جو فون پر غیر محرم سے باتیں کرے وہ کیسے قابلِ اعتبار ہو سکتی ہے.....'' یہ لفظ نہیں تھے انگارے تھے جس نے اس کے دل کی زمین پر آبلے ڈال دیے تھے۔ ہاں اس نے غلطی کی تھی اتنی میچور ہو کر اس نے کیوں نہ پہلی بار ہی ناصر کو منع کر دیا کہ وہ آئندہ اسے فون نہ کرے.....وہ کون تھا، اس کا کیا لگتا تھا کیوں.....ہاں کیوں اس سے غلطی ہوئی تھی اور اب اس نے ساری عمر اس کی سزا بھگتنا تھی۔ کتنی صاف شفاف زندگی گزاری تھی اس نے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو کہیں کچھ ایسا نہ تھا جس پر اسے شرمندگی ہوتی..... پھر.....پھر کیا محبت پانے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ ...اس نے کچھ نہ سوچا.....ہاں کیوں نہ سوچا کچھ.....اور اب اس کی غلطی کی سزا حنا کو بھی ملی تھی..... کتنا شوق تھا اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا.....اور جب وہ اپنی پڑھائی اور خوابوں کی بات کرتی تو کیسے اس کی آنکھیں جگر، جگر کرتی تھیں۔ ان لودیتی آنکھوں کے سارے خواب بے تعبیر رہ گئے تھے۔ سارے راستے بند ہو گئے تھے۔ اور وہ حنا کی بھی مجرم تھی۔ ہاں اس کی وجہ سے ہی تو ناصر جبار نے اس پر

تعلیم کے دروازے بند کردیے تھے۔ ایک بار، ہاں ایک بار تو ضرور وہ حنا کے لیے کوشش کرے گی کہ وہ اس کی غلطی کی سزا حنا کو نہ دے لیکن نہیں جانتی تھی کہ اس کی یہ کوشش اسے کتنی مہنگی پڑے گی۔ وہ سارا دن کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اماں صالحہ کے اصرار پر بھی اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

''سائیں تو ایسے ہی ہیں بی بی سائیں..... اماں اور بہنوں کا خون خشک کیے رکھتے تھے اور آپ تو.....''

اماں صالحہ کے منہ سے جانے کیسے نکل گیا تھا لیکن ڈر کر انہوں نے فوراً ہی اپنی زبان دانتوں تلے دبالی تھی۔

''مرد تو ایسا ہی ہوتا ہے ناں بی بی سائیٹر..... کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں..... مارے گا تو پیار بھی کرے گا۔ تم روز، روز کیا بھوکی پیاسی بیٹھی رہو گی۔''

اور اس نے حیرت سے اماں صالحہ کو دیکھا تھا۔

''نہیں، انہوں نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا..... بس ایسے ہی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

اماں صالحہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتی ہوئی باہر چلی گئی تھیں..... تو کیا اماں صالحہ کو الہام ہوا تھا۔ ناصر نے اسے مارا تھا نہ بلند آواز میں بات کی تھی بس سرد لہجے میں ان کے لبوں سے نکلے وہ انگاروں جیسے لفظ اس کے وجود کو جھلسا گئے تھے..... تو کیا اب زندگی ایسے ہی گزرے گی..... اس کی خشک آنکھیں پہلے نم ہوئیں اور پھر ان میں برسات اتر آئی تھی، پتا نہیں وہ کتنی دیر روتی رہی تھی۔ پھر اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر ناصر کا انتظار کرنے لگی تھی۔ اسے حنا کے لیے بات کرنی تھی..... ایک بار تو اسے کوشش کرنی چاہیے۔ اس پیاری سی لڑکی کے لیے جسے پڑھائی کا جنون تھا۔ ناصر آفس سے آیا تو اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ چائے کی ٹیبل پر وہ بہت خوش دلی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ صبح اس نے کس طرح اس کا دل دکھایا تھا۔ کمرے میں آکر بھی اس کا موڈ اتنا ہی خوشگوار تھا۔

''کیا خیال ہے، آج ڈنر پر نہ جائیں باہر کہیں؟''

''ٹھیک ہے لیکن مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔'' وہ جھجکتے ہوئے بیڈ کے سامنے ہی موجود چیئر پر بیٹھ گئی۔

''ہاں کہو جان جاں..... ایک نہیں دس باتیں کہو.....''

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بہت محبت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''وہ حنا کی پڑھائی.....؟''

''حنا کی پڑھائی ہمارا ذاتی مسئلہ ہے تمہیں اس سے کیا؟'' اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور مسکراتے ہوئے ہونٹ بھینچ گئے۔

''میں گلٹی ہو رہی ہوں میری وجہ سے آپ نے اس کی پڑھائی ختم کروادی..... میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں اس سے کوئی ایسی بات نہیں کروں گی کہ.....''

''تو ہوتی رہو گلٹی.....'' اس نے اس کی بات کاٹی۔ ''اب میں صرف اس لیے تم جیسی عورت کے پاس اپنی بہن کو رکھنے کا رسک تو نہیں لے سکتا کہ تم گلٹی.....''

''مجھ جیسی عورت..... کیا مطلب ہے آپ کا..... کیسی عورت ہوں میں.....؟'' اس نے بھی اس کی بات کاٹی۔ ''کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے.....؟''

''وہی جو تم ہو.....'' اس کے لبوں پر ایک تمسخرانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''آدھی، آدھی رات تک ایک غیر مرد سے باتیں کرنے والی..... اپنی نرم اور خوب صورت آواز سے اس غیر مرد کو لبھانے والی..... ایسے ہی تو نہیں میں تمہارے جال میں پھنسا تھا۔ نرم لہجے میں میٹھی، میٹھی باتیں کر کے تم نے مجھے اپنے جال میں پھنسایا۔''

''میں.....؟'' وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''میں اتنی ہی بری تھی، ایسی ہی خراب تھی تو کیوں کی شادی مجھ سے..... ہاں کیوں کی؟''

''ہاں کیوں کی تم سے شادی.....'' وہ اسے گھورنے لگا۔ ''میں تمہاری خوب صورت باتوں کے جال میں پھنس گیا تھا۔ اور تمہارا یہ سادہ سا بہروپ اس نے دھوکا دیا مجھے ورنہ میں..... کیا تم میرے لائق تھیں، ہرگز نہیں.....''

''میں آپ کے لائق نہیں ہوں تو ٹھیک ہے، میں اپنے گھر جا رہی ہوں، آپ کسی ایسی لڑکی سے شادی

کرلیں جو آپ کے لائق ہو......" وہ اٹھی تو وہ بھی تیزی سے اٹھا اور اس کا بازو پکڑا۔

"خبردار ایک قدم بھی جو باہر نکالا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ تم اب کبھی مجھ سے جان چھڑا سکوگی...... تم ایک بار ہمارے خاندان کی عزت بن کر اس گھر میں آئی ہو تو میں عزت پر جان دینے اور لینے والا ہوں بے غیرت نہیں ہوں......"

وہ کیسی عزت تھی اس کی جس کی وہ بے عزتی کررہا تھا۔ اس نے بازو چھڑانے کی کوشش کی لیکن نہ چھڑا سکی۔

"لیکن مجھے آپ جیسی سوچ رکھنے والے شخص کے ساتھ نہیں رہنا۔"

شادی کے بارھویں دن وہ اس شخص سے کہہ رہی تھی۔ جس نے اس سے محبت کا دعویٰ کیا تھا اور جس سے اس نے بھی محبت کی تھی۔ ہاں محبت ہی تو تھی......

"کیا کہا؟" اس کا تھپڑ اس زور سے اس کے رخسار پر پڑا کہ اسے لگا جیسے کھال پھٹ گئی ہو۔

"تمہارے نام کے ساتھ جو میرا نام جڑا ہے تو یہ اب مر کر ہی تم سے جدا ہوگا۔ اچھی طرح سمجھ لو...... آج کے بعد یہ بات زبان سے مت نکالنا...... ورنہ......"

ایک اور تھپڑ پھر نہ جانے کتنے تھپڑ...... لاتیں، مکے وہ ساری رات لاؤنج کے صوفے پر لیٹی سسکتی رہی...... اور اماں صالحہ تاسف سے اسے دیکھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں...... صبح وہ تیار ہو کر باہر آیا تو اس نے اپنا بازو ہٹایا۔

"سوری ایشال، مجھے غصے میں کچھ ہوش نہیں رہتا آئندہ مجھے غصہ مت دلانا۔" وہ خاموشی سے لیٹی رہی تو اس نے اسے اٹھاتے ہوئے تاسف سے اسے دیکھا۔ اس کے سوجے ہوئے ہونٹ کو، اس کے رخساروں کے نیلوں کو وہ یونہی نگاہیں جھکائے اب ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔

"ادھر دیکھو ناں میری جان......" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"معاف کردو ناں یار غلطی ہوگئی۔" وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ اس کی پلکیں بھیگ گئیں...... اس کے وجود پر لگے زخم تو بھر جائیں گے لیکن کیا وہ زخم بھی کبھی بھر سکیں گے جو اس نے اپنے لفظوں سے اس کی روح پر لگائے تھے۔

وہ ایک بازو اس کے گرد حمائل کیے اسے اپنے ساتھ لگائے کتنی ہی دیر تک محبت بھرے لفظوں سے اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ جو اس کے ایک جملے سے پگھل جاتی تھی یونہی بے حس سی بیٹھی رہی تھی۔ اسے آفس سے دیر ہو رہی تھی اس لیے وہ صرف ایک کپ چائے پی کر آفس چلا گیا تھا۔ لیکن جانے سے پہلے تاکید کر گیا تھا کہ وہ جب آفس سے آئے تو اسے فریش موڈ میں ملے بلکہ اس کے آنے سے پہلے تیار رہے کہیں گھومنے چلیں گے اور اس نے سر ہلا دیا تھا۔

"گڈ گرل......!" وہ اس کے رخسار کو دو انگلیوں سے سہلاتا ہوا چلا گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد اماں صالحہ نے اس کی چوٹوں پر گرم کپڑے سے ٹکور کرتے ہوئے کہا تھا۔

"بہت پہلے جب میں گاؤں میں رہتی تھی تو سوچتی تھی کہ ہم غریب ماڑی عورتیں ہی مجبور ہوتی ہیں...... پر جب بیوہ ہوئی اور حویلی میں آئی تو پتا چلا کہ حویلی میں رہنے والی عورتیں تو ہم سے بھی زیادہ مجبور ہیں، بے بس ہیں...... ہم تو آزاد ہیں پر وہ قیدی ہیں...... نت نئے کپڑے بھاری، بھاری زیور، گہنے، بھر، بھر ہاتھ چوڑیاں باہر سے کتنی بھی بھاری دکھیں اندر سے تو بالکل خالی ہوتی ہیں۔"

وہ بنا کسی تاثر کے اماں صالحہ کی باتیں سنتی رہی۔

"حویلی میں رہی تو پھر شہری عورتوں پر رشک آنے لگا کہ وہ بڑی خوش قسمت ہوتی ہیں...... اپنے مرد کے برابر کھڑی برابری کی باتیں کرتی شہری عورت تو بڑے نصیبے والی ہوتی ہے پر اب جانا کہ شہری عورت بھی ہم جیسی ہی بے بس اور مظلوم ہوتی ہے، خیر ایک بار پھر ٹکور کروں گی تو مزید فرق پڑے گا۔" اماں صالحہ اپنا سامان اٹھا کر کھڑی ہوگئیں۔

"وجود پر لگے زخم تو بھر ہی جاتے ہیں بی بی ٹینٹر

پر دل پر لگے زخم کبھی نہیں بھرتے۔''

''صحیح تو کہتی ہیں اماں صالحہ، وجود کے زخم تو بھر ہی جائیں گے پر دل کے زخم ساری عمر رستے رہیں گے۔'' لیکن اس کے تو وجود کے زخم بھی کبھی نہیں بھرتے تھے..... ابھی پرانے زخموں پر کھرنڈ جمتا تھا جسم پر پڑے نیل ہلکے ہوتے تھے کہ نئے زخم مل جاتے تھے۔ وہ نرم و نازک احساسات رکھنے والی محبت کی کومل، کومل کہانیاں لکھنے والی ایشال زہرا نے کب سوچا تھا کہ زندگی ایسی بھی ہوتی ہے کہ آدمی پل، پل جیے اور پل پل مرے لیکن موت دور کھڑی ہنستی رہے۔

''کیا محبت کبھی اتنی بھی بدصورت ہو سکتی ہے ایسی ہی بدشکل؟'' ایک روز اس نے خود سے پوچھا تھا اور پھر خود ہی جواب دیا تھا کہ ''نہیں یہ جو بدصورت اور... بدشکل ہے، یہ محبت نہیں ہے یہ تو کچھ اور ہے نفرت کی کوئی شکل..... فریب، دھوکا، سراب کچھ بھی لیکن محبت ہرگز نہیں ہے..... محبت تو وہ تھی جو اماں اور بابا ایک دوسرے کرتے تھے۔ بابا اور اماں کیسے ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ بابا کتنی عزت کرتے تھے اماں کی کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی انہوں نے کہ لگے کہ اماں ان کی نظروں میں کمتر ہیں..... کبھی ان کا دل نہیں دکھایا۔

''ہاں تو محبت تو یہ بھی ناں.....''

اور وہ جسے محبت سمجھتی تھی وہ تو بس اس کی ایک غلطی تھی کاش لڑکیاں یہ غلطی نہ کیا کریں اور وہ کوئی ٹین ایجر نہیں تھی، اچھی خاصی سمجھدار تھی پھر بھی اس نے غلطی کی..... اور شادی کے ایک ماہ بعد وہ کالج جانے کے لیے تیار ہوتے ہوئے خود سے اعتراف کر رہی تھی۔

''یہ صبح، صبح کہاں کی تیاری ہے؟'' وہ واش روم سے باہر نکلا تو اسے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے تیار ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''ایک ماہ کی چھٹی لی تھی ناں تو ختم ہو گئی ہے۔'' اس نے لپ اسٹک نیچے رکھ کر ہیئر برش اٹھایا۔

''کیا مطلب.....؟'' اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔

''کیا میں نے تمہیں شادی سے پہلے نہیں کہا تھا کہ ریزائن دے دو..... ہمارے خاندان کی عورتیں جاب نہیں کرتیں.....'' تو اسے کون سا شوق تھا جب کرنے کا وہ تو ہمیشہ سوچتی تھی کہ شادی کے بعد وہ جاب نہیں کرے گی۔ ایک مکمل ہاؤس وائف کے کریکٹر کو انجوائے کرے گی..... اماں بھی تو یہی کہتی تھیں کہ شادی کے بعد جاب چھوڑ دینا خواہ مخواہ شوہر سے ضد نہ لگا کر بیٹھ جانا کہ ضرور جاب کرنی ہے۔ اس طرح گھر کا سکون برباد ہو جاتا ہے اور کبھی، کبھی گھر بھی۔ بڑی خوش قسمت ہوتی ہے وہ عورت جسے اپنے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کے لیے تگ و دو نہیں کرنی پڑتی جس کی کفالت اس کا شوہر کرتا ہے اور اس کا تو بالکل بھی ارادہ نہیں تھا شادی کے بعد جاب کرنے کا لیکن کولیگز نے مشورہ دیا تھا کہ اس کی اتنی زیادہ چھٹیاں ڈیو ہیں، ایک ماہ کی چھٹی آرام سے کر لے پھر ون منتھ نوٹس دے دے اور.....

''میری بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی تمہاری نظر میں.....؟'' اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلی تھیں اس نے چونک کر اسے دیکھا اور ساری بات بتا دی سوائے پرنسپل کے مشورے کے جنہوں نے کہا تھا۔

''اجنبی لوگ، اجنبی ماحول ہوگا..... ریزائن دینے میں جلدی نہ کرو..... چند ماہ بعد دے دینا جب انہیں جان لو، رچ بس جاؤ تو.....''

''تو تمہاری کولیگز تمہارے لیے مجھ سے زیادہ اہم تھیں اور میری کہی بات اتنی غیر اہم کہ تم نے ایک ماہ میں مجھ سے ذکر تک نہیں کیا'' اس نے بالوں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا وہ غیر ارادی طور پر کھڑی ہو گئی اور بال چھڑانے کی کوشش کی۔

''چلو ابھی ریزائن لکھ کر مجھے دو..... جن چند ٹکوں کی خاطر تم نے میری بات رد کی، اتنے تو ہم یونہی پھینک دیتے ہیں۔'' اس نے ایک جھٹکا دے کر اس کے بال چھوڑے تو تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں..... اگر وہ بیڈ کی پٹی پر ہاتھ نہ رکھ لیتی تو اس کا چہرہ بیڈ سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتا۔

اماں صالحہ نے صحیح ہی تو کہا تھا کہ وہ دھوپ چھاؤں جیسا ہے..... نہیں بلکہ وہ تو تپتا ہوا سورج تھا۔ جو جلا کر راکھ کر دیتا ہے اور جلی ہوئی راکھ زمین پر کتنی ہی

بارش برسے وہ زندہ نہیں ہوتی..... وہ بھی اب زندہ نہیں تھی اس کے روتیوں کی دھوپ نے اسے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ اب اس کی محبتوں کی بارش بھی اسے زندہ کر پائی تھی۔ تین ماہ بعد اماں رخصت ہو گئیں اور ان تین ماہ میں صرف دو بار وہ اس کے ساتھ اماں سے ملنے گئی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اسے اماں کی طرف لے کر نہیں گیا تھا بلکہ اس لیے کہ اسے ڈر لگتا تھا کہ وہ زیادہ دیر اماں کے سامنے رہی تو ضبط کھو بیٹھے گی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اماں کی گود میں سر رکھ کر اتنا روئے کہ سارے دکھ ان آنسوؤں میں بہہ جائیں لیکن اماں جو اس کی شادی کر کے اتنی مطمئن اور خوش تھیں کہ وہ ان کے بعد اکیلی نہیں ہے، وہ ان کے اطمینان اور خوشی کو ختم نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے چاہنے کے باوجود ان کی طرف نہ جا پاتی تھی۔ اور شاید اماں نے اس کی طرف سے مطمئن ہو کر ہی جانے کی جلدی کی تھی اور پھر اماں کے سرد ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر وہ اتنا روئی تھی کہ خالہ ثریا کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ سعدون دوسرے دن پہنچا تھا..... اور چوتھے دن صبح، صبح ہی ناصر اسے لینے آ گیا تھا۔ خالہ ثریا نے اسے روکا بھی تھا۔

''جتنے دن سعدون اِدھر ہے تم بھی رہ لو..... آٹھ دس دن بعد تو وہ چلا ہی جائے گا پھر کون جانے زندگی میں کبھی ملاقات ہو یا نہ ہو.....'' حماد کہہ رہا تھا۔ ''سعدون کا ارادہ گھر فروخت کرنے کا ہے۔'' اس سے اچھے پراپرٹی ڈیلرز کا پوچھ رہا تھا لیکن ناصر نے اجازت نہیں دی تھی۔

''مجھے تمہارا وہ کزن حماد زہر لگتا ہے، ہر وقت وہاں ہی منڈلا رہا ہوتا ہے۔ شاید تمہارا دیدار کرنے آتا ہے۔'' اور وہ خاموشی سے خالہ سے مل کر واپس گھر آ گئی تھی۔ اور پھر ایسا ہی ہوا تھا جیسے خالہ ثریا نے بتایا تھا۔ سعدون نے گھر فروخت کر دیا تھا اور اس کے حصے کی رقم اسے دے دی تھی۔ اس کے جانے سے پہلے وہ اسے ملنے آئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ جو سامان وہ لینا چاہے لے جائے..... اس نے اماں کا ایک دوپٹا اور اپنی کتابیں اور اپنی کہانیوں والے ڈائجسٹ اور ادبی

پرچے لے لیے تھے۔

''یہ کیا کوڑا کرکٹ اٹھالائی ہو؟''

''کتابیں اور رسالے ہیں جن میں میری کہانیاں ہیں۔''

''اوہ..... ہاں..... تم نے بتایا تو تھا..... میں بھی تو دیکھوں کہ میری رائٹر بیوی کیسی، کیسی کہانیاں لکھتی تھی۔'' اس نے ایک ڈائجسٹ اٹھایا۔

''یہ، ایسی محبتیں..... تجربہ کار لگتی ہو..... سچ بتانا مجھ سے پہلے کتنی محبتیں کر چکی ہو۔'' چند صفحات پڑھ کر اس نے ڈائجسٹ پھینک دیا تھا اور یوں اسے ایک اور موضوع مل گیا تھا..... اذیت دینے کے لیے..... وہ لفظوں کے تیر ہی نہیں چلاتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی اسی طرح چلتے تھے۔ خود تو چند گھنٹوں بعد معافی تلافی کر کے نارمل ہو جاتا لیکن وہ ہفتوں جسم اور روح کے زخموں پر مرہم رکھتی رہتی تھی۔ سعدون کے جانے کے بعد ثریا خالہ ایک روز ملنے آئی تھیں۔

''تمہاری اماں نے مرنے سے پہلے تمہارے لیے کچھ دیا تھا۔ وہ امانت دینے آئی ہوں.....''

اماں کی چوڑیاں اور دوسرا زیور جو اُن کے استعمال میں رہتا تھا انگوٹھی، لاکٹ وغیرہ..... اس کی آنکھیں برسنے لگی تھیں اماں ٹاپس، انگوٹھی اور چار چوڑیاں ہمیشہ پہنے رکھتی تھیں۔ ابا کے بعد انہوں نے چوڑیاں اتار کر رکھ دی تھیں لیکن ٹاپس اور انگوٹھی نہیں۔

''ایشو تم خوش ہو ناں ناصر کے ساتھ۔''

ناصر ان کے ساتھ سلام دعا کر کے کمرے میں چلا گیا تو انہوں نے پوچھا وہ خاموش سر جھکائے آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔

''پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے تم خوش نہیں ہو..... تمہاری اماں کے سامنے کبھی اس لیے نہیں پوچھا کہ تمہارے حوالے سے وہ دکھی ہو کر نہ جائے ہمیشہ اسے یقین دلایا کہ تم خوش ہو..... پر خود کو نہیں دلا سکی۔ کچھ ہے جو تم چھپا رہی ہو..... مجھے بتاؤ..... ماں کی جگہ ہوں، کہنے سے دل کا بوجھ کم ہوگا۔''

''کیا کہوں خالہ.....'' آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ ''مجھے بھی اماں کا خیال تھا ورنہ شاید.....''

اس نے اپنے بیڈ روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ اور خالہ ثریا سمجھ گئی تھیں شاید کہ انہوں نے موضوع بدل دیا اور جانے سے پہلے ناصر کو تاکید کی وہ کبھی کبھار ایشال کو ان سے ملانے لے آیا کرے کہ وہ ماں کی جگہ ہیں۔ ناصر نے ان سے تو وعدہ کر لیا لیکن ان کے جاتے ہی سختی سے منع کر دیا۔

''ہرگز نہیں، تم کبھی خالہ ثریا کی طرف نہیں جاؤ گی۔ میں نے کہا تھا ناں کہ وہ شخص حماد... مجھے اس پر اعتبار نہیں ہے۔''

''خدا کا خوف کریں ناصر، حماد بھائی مجھ سے اٹھارہ سال بڑے ہیں..... بچوں والے ہیں۔''

''تم نہیں جانتیں ان جیسے مردوں کو، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوں تو بھی ان کی نیت خراب ہو جاتی ہے لڑکی دیکھ کر.....''

اور وہ کبھی خالہ ثریا سے ملنے نہ جا سکی..... حالانکہ اس روز کتنا دل چاہا تھا اس کا کہ خالہ ثریا کے سامنے دل کھول کر رکھ دے اور چیخ، چیخ کر رو لے اپنی اس ناقدری پر اور اس غلطی پر جو اس سے سرزد ہوئی تھی۔ معمولی ہی سہی پر تھی تو غلطی ناں..... اور اسے اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا تھا ساری عمر کہ اس کے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا..... اور پھر اگر وہ واپس جاتی بھی تو کہاں..... سو اس کی زندگی سارا دن صبح سے شام تک ایک چار دیواری میں ایک کمرے سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ کسی کولیگ کسی دوست سے نہیں مل سکتی تھی کہ ناصر جبار کے خیال میں شادی کے بعد عورت کی پہلی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی پہلی دوستیاں، تعلق، رشتے سب ختم.....

''پرانے تعلق اب بھول جاؤ.....'' اس نے اس روز کہا تھا جب خالہ ثریا نے فون پر اسے حماد کی بیٹی کی منگنی کی دعوت دی تھی۔

''تمہارا تعلق اب مجھ سے اور صرف مجھ سے وابستہ رشتوں سے ہے۔''

لیکن وہ تو اپنے سے وابستہ رشتوں سے بھی اسے ملانا پسند نہیں کرتا تھا۔ حنا کی شادی پر بھی وہ اپنے والدین کے بے حد اصرار پر صرف دو دن کے لیے لے کر گیا تھا۔ وہ کہانیاں نہیں لکھ سکتی تھی کہ ناصر جبار کے خیال میں ایسی کہانیاں لکھنا بے حیائی ہے۔

وہ کوئی کتاب یا ڈائجسٹ یا کوئی ادبی میگزین بھی نہیں پڑھ سکتی تھی کہ یہ سب محض فضولیات ہیں، وہ کسی کو فون نہیں کر سکتی تھی کہ اکثر اس کا سیل فون وہ اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ اس کی کال اور میسجز چیک کرتا...... آخر ایک روز اس نے اسے توڑ کر پھینک دیا۔

"تمہیں اس کی ضرورت ہی کیا ہے...... بھائی، بھابی تو پوچھتے نہیں اور کون سا سگا ہے جس کا فون آنا ہے۔" تو زندگی اس کے لیے بے حد مشکل تھی اور وہ یہ مشکل زندگی گزار رہی تھی۔

کبھی، کبھی وہ بہت مہربان ہوتا تو اسے لمبی ڈرائیو پر لے جاتا...... کہیں سے آئس کریم کھلا دیتا یا کبھی کھانے پر لے جاتا لیکن اب وہ خوش نہ ہو پاتی تھی۔ زندگی اور خوشی جیسے اس کے اندر مر گئی تھی۔ اور یہ دن اس کے لیے اور بھی مشکل ہو جاتا۔

"دنیا جہان کی عورتیں باہر جا کر خوش ہوتی ہیں لیکن تم...... تمہاری اس سڑی ہوئی شکل میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ کیا روگ لگایا ہوا ہے دل کو...... دنیا جہان کی ہر نعمت تمہارے قدموں میں ڈھیر کر رکھی ہے۔ پھر بھی...... کیا کمی ہے تمہیں...... کس چیز کی......" وہ کیا کہتی کس چیز کی کمی ہے۔ کون سا روگ اسے کھاتا جا رہا ہے۔ وہ چپ رہتی اور صبیح اماں صالحہ اس کے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے تاسف سے اسے دیکھتیں...... جانے انہیں الہام ہوتا تھا۔

"خوش رہا کریں بی بی جی...... اور خوش نہیں بھی ہیں تو خوش نظر آیا کریں......"

اور وہ کوشش کرتی تو تھی خوش نظر آنے کی پھر بھی اندر کے دکھ کہیں نہ کہیں سے جھلک پڑتے تھے...... کبھی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں اور کبھی چہرہ گھنے بالوں میں چھپ جاتا۔

اس روز وہ بڑے دل سے تیار ہوئی تھی کہ بہت عرصے بعد ناصر اسے کسی فنکشن میں لے جا رہا تھا۔ اس کے کسی دوست کے بھائی کا ولیمہ تھا...... عموماً اس طرح کے فنکشن میں وہ اکیلا ہی جاتا تھا کہ اسے گیدرنگ میں ایشال کو لے جانا پسند نہیں تھا۔

"کہنے کو تو مردوں، عورتوں کے بیٹھنے کا الگ، الگ انتظام ہوتا ہے لیکن بدنیت مرد کسی نہ کسی بہانے عورتوں کے حصے میں گھسے ہی ہوتے ہیں۔"

لیکن آج نہ جانے کس خیال کے تحت اس نے اسے تیار ہونے کے لیے کہہ دیا تھا۔ صرف تیار ہونے کے لیے نہیں بلکہ اچھی طرح تیار ہونے کے لیے...... سو وہ اچھی طرح تیار ہوئی تھی۔

"گڈ......!" اس نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"آج لگ رہی ہو ناں ناصر جبار کی بیوی ورنہ تو مائی لگتی ہو......" وہ خاموش ہی رہی تھی اب ناصر جبار کی کوئی بات اسے خوش نہیں کرتی تھی۔ پھر ہال تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دوست آصف اور ان کی بیگم مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ آصف سے سلام دعا کرنے کے بعد وہ مسز آصف سے مخاطب ہوا تھا۔

"لیجیے بھابی، آپ کے حکم کے مطابق ہماری بیگم حاضر ہیں۔"

"ماشاء اللہ......!"

بیگم آصف نے بہت محبت سے گلے لگایا اور ناصر کا شکریہ ادا کیا تو وہ مسکراتا ہوا مردوں والے حصے میں چلا گیا۔ اس نے یوں اطمینان بھری سانس لی تھی جیسے کچھ دیر کے لیے ہی سہی وہ آزاد ہو گئی ہو...... وہ خاموشی سے ایک کونے والی ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئی تھی اور دلچسپی سے سب کو ہنستے مسکراتے دیکھنے لگی تھی۔ وہ وہاں کسی کو نہیں جانتی تھی پھر بھی بور نہیں ہو رہی تھی...... کتنے عرصے بعد وہ اتنے سارے لوگوں کے درمیان بیٹھی تھی اور اس کے ساتھ ناصر نہیں تھا۔ وہ اس تھوڑے سے وقت کو بہت زیادہ انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ زندگی کی

ترجیحات بدل گئی تھیں۔ کبھی وہ گیدرنگ سے گھبراتی تھی، اماں کے اصرار کے باوجود بھی وہ کسی شادی بیاہ کے فنکشن میں جاتے ہوئے کتراتی تھی..... اماں ناراض ہوتی تھیں۔

''ایسے ہی تو شادیوں میں شریک ہونے سے رشتے ناتے ہوتے ہیں۔'' لیکن وہ ہنس دیتی تھی۔

''مجھ سے نہیں جایا جاتا اتنا وقت ضائع ہوتا ہے، اتنی دیر میں تو میں کوئی اچھی کتاب پڑھ لوں..... کوئی کہانی لکھ لوں، لیکن آج وہ سوچ رہی تھی کہ اگر کبھی کبھار ناصر اسے ایسے فنکشنز میں لے آیا کرے تو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی وہ کھل کر سانس تو لے سکے گی۔

''کیا سوچ رہی ہیں ایشال؟'' مسز آصف مہمانوں کو ریسیو کرنے کے بعد اس کے پاس آئی تھیں۔

''کچھ نہیں۔'' وہ چونک کر مسکرائی۔

''آپ بور تو نہیں ہوئیں.....''

''نہیں..... حالانکہ کوئی جان پہچان والا نہیں ہے پھر بھی انجوائے کر رہی ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

''جان پہچان تو آنے جانے سے ہوتی ہے اور آپ کہیں آتی جاتی ہی نہیں..... اب تو میں نے ناصر بھائی سے صاف، صاف کہہ دیا تھا کہ اگر بیگم کے بغیر آئے تو اندر ہال میں گھسنے نہیں دیا جائے گا۔'' مسز آصف خاصی باتونی اور خوش اخلاق تھیں۔

''سب دوستوں نے ہی شادی کی دعوت دینا چاہی لیکن محترم نے انکار کر دیا۔ ویسے آپ خود تنہائی پسند ہیں یا ناصر بھائی ہی آپ کو کہیں لے کر نہیں.....''

کسی خاتون نے انہیں آ کر سلام کیا تو وہ اس سے ملنے لگیں..... ان کی بات ادھوری ہی رہ گئی اور اس نے شکر ادا کیا کہ وہ جواب دینے کی اذیت سے بچ گئی ہے۔ لیکن بچنا کہاں، خاتون کو ساتھ والی ٹیبل پر بٹھا کر وہ پھر اس کے سامنے آ بیٹھی تھیں۔

''آپ کو پتا ہی ہوگا ناصر بھائی نے اپنی چھ سات سال پرانی منگنی صرف اس لیے توڑ دی تھی کہ انہیں اپنی منگیتر کی دوسرے کزنوں کے ساتھ بے تکلفی پسند نہیں تھی۔ حالانکہ منگنی ان کی پسند سے ہی ہوئی تھی..... پھر بھی..... دراصل تھوڑے شکی مزاج سے ہیں آپ کے ساتھ تو ٹھیک ہیں ناں.....؟''

وہی خواتین کی متجسس فطرت.....

''جی..... جی.....'' اس کے حلق میں ایک ساتھ بہت سے آنسوؤں نے پھندا ڈال دیا۔

''ارے وہ میری خالہ ساس آئی ہیں..... میں ابھی ان سے مل کر آتی ہوں، انہیں تو ذرا سا نظر انداز کر دیں تو ناراض ہو جاتی ہیں۔'' وہ ہنستی ہوئی اٹھ کر چلی گئی تھیں اور وہ دلہن کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جو بہت خوب صورت لگ رہی تھی..... دولہا نے جھک کر اس سے کچھ کہا تھا اور پھر مسکراتا ہوا اسٹیج سے اتر گیا۔ دلہن کے لبوں پر شرمگیں سی مسکراہٹ تھی۔

''اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔'' اس نے دل ہی دل میں اس انجان لڑکی کو دعا دی تھی۔ کھانا لگا تو کچھ دیر بعد ہی ناصر کا بلاوا آ گیا تھا۔

''ناصر بھائی پارکنگ میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں..... کھانا کھا کر ادھر ہی آ جایئے گا۔'' مسز آصف نے اسے پیغام دیا تو اس نے سر ہلا دیا..... کھانا کھاتے ہی وہ مسز آصف کو خدا حافظ کہہ کر اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے وہ ہال سے نکل کر پارکنگ کی طرف جا رہی تھی کہ اسے اپنے دائیں طرف سے پُرجوش سی آواز سنائی دی۔

''میم..... میم پلیز.....'' اس نے ذرا سا رخ موڑ کر دائیں طرف دیکھا۔ وہ ثنا تھی۔

''ثنا، آپ یہاں کیسے؟'' وہ خوش ہو گئی تھی۔

''جی، دلہن میری کزن ہے۔''

''اچھا..... اور کیسی ہیں آپ؟''

''بالکل ٹھیک اور آپ کیسی ہیں میم؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' وہ مدھم سا مسکرائی۔

''آپ کہاں بیٹھی تھیں میم..... مجھے نظر ہی نہیں آئیں۔'' اسے افسوس ہو رہا تھا۔

''زیادہ دیر بات کرتے..... میں آپ کو بہت یاد کرتی ہوں..... ایک بار میں کالج گئی تھی پتا چلا آپ نے شادی کے بعد جاب چھوڑ دی ہے۔ ارے میں نے آپ کا تعارف تو کروایا ہی نہیں..... یہ میرے ہسبینڈ

ہیں جواد احمد اور جواد آپ کو تو میں نے ابھی بتایا تھا ناں کہ یہ میری بیسٹ ٹیچر ایشال زہرا ہیں۔'' وہ اپنے ساتھ کھڑے ہینڈسم سے لڑکے کا تعارف کروا رہی تھی۔ لڑکا بہت اشتیاق سے اسے دیکھتا ہوا مسکرایا۔

''ثنا نے آپ کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ صرف ثنا ہی نہیں، میں بھی آپ کی تحریروں کا عاشق ہوں، ثنا کے ساتھ شادی سے پہلے ہی میں آپ کی تمام تحریریں پڑھ چکا تھا۔ لیکن آج کل آپ کی تو کوئی تحریر نظر نہیں آ رہی کیوں.....؟''

''بس یونہی گھریلو مصروفیت۔'' دل میں کہیں دکھ کی ایک لہر سے اٹھی تھی۔

''آپ کے ہسبینڈ بھی تو آئے ہوں گے، ملوائیں ناں ان سے کیسے ہیں وہ..... مونا میم نے بتایا تھا وہ بہت گڈ لکنگ ہیں، بالکل آپ کی کہانیوں کے ہیرو کی طرح..... سچ بتائیں اسفند یار جیسے ہیں یا علی حیدر جیسے..... یا پھر وہ ہارون شاہ جیسے ہوں گے بالکل آپ کی طرح دھیمے، دھیمے لہجے میں بات کرنے والے..... سب کا خیال رکھنے والے ہے ناں.....؟'' وہ آنکھوں میں شوق کا جہان چھپائے بہت اشتیاق سے پوچھ رہی تھی..... دکھوں سے نا آشنا خوابوں جیسی زندگی گزارنے والی ثنا کو کیا پتا کہ زندگی بعض اوقات کہانیوں جیسی نہیں ہوتی..... ایک ساتھ بہت سارے آنسو اس کے اندر آ گرے۔ وہ نہ تو اسفند یار تھا نہ علی حیدر نہ ہارون شاہ نہ فیصل لاشاری..... وہ تو صبا خان کے گہن لگے چاند کا عامر سلطان تھا۔ شکی مزاج، سائیکی مریض..... اس کی چھوٹی سی غلطی کی بڑی سزا..... کاش اس نے اس سے فون پر باتیں نہ کی ہوتیں۔

''بتائیں ناں میم.....؟'' ثنا اب بھی اسی اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں وہ.....'' اس نے نظریں اٹھائیں اور اپنی طرف آتے ہوئے ناصر جبار کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

''مائی ہسبینڈ.....!''

''اپنی تحریروں کے دیوانوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لکھیے گا۔'' محبت، خلوص اور احترام سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواد احمد نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تیزی سے ناصر کی طرف بڑھی۔

''واؤ..... بالکل عینا کے شہر یار کی طرح..... شاندار پرسنیلٹی..... ہیں ناں جواد.....!'' اس کی آنکھوں میں پسندیدگی بھی ستائش تھی۔

''کچھ پراؤڈ سے لگ رہے ہیں۔'' جواد کہہ رہا تھا۔

''اتنی شاندار پرسنیلٹی پر اتنا غرور تو بنتا ہے ناں.....'' وہ دونوں ان کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ اور وہ ناصر کی آنکھوں سے نکلتے شعلوں سے راکھ ہوئی جاتی تھی اور اس کے لبوں سے نکلتے لفظ انگاروں کی طرح دل پر گرتے تھے۔

''تو پرانے یاروں سے ملاقاتیں ہو رہی تھیں۔''

''میری اسٹوڈنٹ تھی اور اس کا شوہر.....'' مدت ہوئی اس نے کبھی بات کرنا اور وضاحتیں دینا چھوڑ دیا تھا۔

''اچھا.....!'' اس کا اچھا بڑا معنی خیز تھا..... اور وہ جانتی تھی کہ گھر تک پہنچتے، پہنچتے وہ اپنے ترکش سے نہ جانے کتنے تیر نکال کر اس کے دل میں اتار دے گا۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے سختی سے دباتے ہوئے اس نے گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ثنا دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

''میم آپ کو بہت مبارک ہو، جواد کی اور میری بھی... یہی رائے ہے کہ آپ کے ہسبینڈ بالکل عینا کے شہر یار کی طرح ہیں..... ہیں ناں.....'' اور اس کا جی چاہا وہ چیخ، چیخ کر کہے۔

''نہیں ثنا..... نہیں..... وہ نہ تو شہر یار ہے، عینا کا شہر یار، نہ سمل مصطفیٰ کا خلدون عباسی اور نہ..... وہ تو..... ہاں وہ تو۔''

دوسری طرف سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ناصر جبار نے ایک قہر آلود نظر اس پر ڈالی تو وہ تیزی سے دروازہ کھول کر سیٹ پر گر گئی۔

''وہ تو..... نہیں وہ تو.....'' اس کے لب ہل رہے تھے اور حلق سے گھٹی، گھٹی سسکیاں نکل رہی تھیں۔

رحم.....صفت الٰہی

تمام حمد وثنا اللہ رب العزت کے لیے جو ہمارا مالک ہمارا خالق اور رازق ہے۔ جس کے ذکر سے قلب کو سکون ملتا ہے۔ تمام تعریف اس رب کی جو بے نیاز ہے، رب العالمین ہے جس کے عرش کو فرشتے تسبیح کرتے ہوئے اٹھائے رکھتے ہیں۔ جس کے حضور ہر گناہ گار... کافر و مشرک توبہ استغفار کرتا ہے۔ صبح شام کائنات کی ہر شے اس کی تعریف و تسبیح میں مصروف ہے۔

اے میرے رب! ہمیں دنیا میں اور قیامت میں رسوا اور ذلیل نہ ہونے دینا، گمراہوں میں شمار نہ ہونے دینا کہ یہ لوگ آخرت میں خسارے میں ہوں گے۔ کامیاب وہ ہوگا جو اللہ وحدہ لاشریک لہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی شریعت پر ایمان لایا ہوگا۔ قرآن کریم جو اس رب کا عظیم کلام ہے اس پر عمل کیا ہوگا اور اس معبود، رسول اور کتاب کو قبر تک مضبوطی سے تھام کر عمل پیرا رہا ہوگا..... کہ یہ ہی راہِ نجات اور جنت کا راستہ ہے۔

درود وسلام ہو پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی آل پر اور ان کے اصحاب پر۔

آج ہمارا موضوع رحم ہے۔ رحم کے لغوی معنی کرم، مہربانی، ترس اور ہمدردی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کردہ مخلوق کی بہتری اور خوشحالی کے لیے کچھ حدود مقرر فرمائی ہیں، ان حدود میں رہ کر شریعت کے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی، اخلاق کہلاتی ہے اور اخلاق میں تمام اچھے اخلاق آجاتے ہیں۔ انسان کے اچھا ہونے کے لیے اخلاق کا اچھا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اچھائی اور نیکی اخلاق ہی سے پہچانی جاتی ہے۔

رحم و شفقت..... اخلاقِ حسنہ کا لازمی حصہ ہے، اللہ تعالیٰ رحمان ہے اس لیے وہ اپنے بندوں سے بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کے بندے آپس میں رحم کریں۔ مخلوق کے ساتھ مہربانی کرنا اور شفقت سے پیش آنا اور چھوٹوں پر رحم کرنا اخلاقی لحاظ سے بہت عمدہ عادت ہے۔ دنیا اور آخرت میں رحم کا بے پناہ اجر ہے۔ رحم اور شفقت کی بہت سی صورتیں ہیں، عام انسانوں پر ترس کھانا، کسی غریب یا کمزور ضرورت مند پر شفقت کی نظر کرنا، بچوں پر رحم کرنا ان کے ساتھ شفقت سے پیش آنا پھر جانوروں پر بھی رحم کرنا ہے..... رحم کرنے سے مسلمانوں میں ہمدردی، محبت کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں..... اور اسلام تو سب سے زیادہ انسانیت پر زور دیتا ہے۔ اسلام نے جس رحم دلی کا درس دیا ہے، وہ صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس رحم کے دائرے میں ہر انسان شامل ہے۔ رحم اللہ رب العزت کی بہت بڑی صفت ہے، وہ پسند کرتا ہے کہ اس کا عکس اس کے بندوں میں بھی نظر آئے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بہت زیادہ رحم دل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رحم کرنے کی بہت تاکید فرمائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”رحم کرنے والوں پر رحمن بھی رحم فرماتا ہے، لہٰذا تم زمین والوں پر رحم کرو تاکہ آسمان والا تم پر رحم فرمائے۔“ یہ بھی فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرمائے گا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔“

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے اور نیک باتوں کا حکم نہ دے اور بری باتوں سے نہ روکے۔''

روایت ہے کہ ایک عورت مانگنے آئی جس کے ساتھ اس کی بیٹیاں تھیں..... دینے والے کے پاس ایک کھجور کے سوا کچھ نہیں تھا تو اسے وہی دے دی..... اس نے وہ دونوں بیٹیوں کو تقسیم کر کے دے دی۔ اور خود اس میں سے نہ کھایا اور چلی گئی..... تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے آپؐ کو یہ بتایا تو فرمایا..... ''جوان لڑکیوں کے ذریعے آزمایا گیا اور وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ اس کے لیے جہنم سے آڑ ہوں گی۔'' حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوا۔ ''کیا آپ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں جبکہ ہم تو بوسہ نہیں دیتے۔'' آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''میرے کیا اختیار میں ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل سے شفقت نکال دی ہے۔''

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی نوجوان کسی بوڑھے کی اس کی عمر کے باعث عزت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک ایسا شخص مقرر فرما دیتا ہے جو بڑھاپے میں اس کی عزت کرے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں کسی نے ایک پرندہ تحفتاً بھیجا جسے آپؒ نے قبول فرمالیا۔ مدت تک وہ پرندہ آپ کے پاس ایک پنجرے میں بند رہا..... ایک روز حضرت جنید بغدادیؒ نے پنجرے کی کھڑکی کھول کر اسے اڑا دیا۔ لوگوں نے دریافت کیا آپؒ نے یکا یک اسے کیوں کھول دیا..... آپؒ نے فرمایا..... آج اس پرندے نے مجھ سے کہا۔ ''اے جنیدؒ تم تو اپنے دوست احباب کی باتوں سے لطف اٹھاؤ اور مجھے بے مونس و غمخوار ایک پنجرے میں یوں بند رکھو۔'' بس جب آپؒ نے اس کے یہ درد انگیز کلمات سنے تو اسے آزاد کر دیا..... اور جب پرندہ اڑا تو اس نے کہا..... ''اے جنیدؒ! جانور جب تک ذکر الٰہی میں مصروف رہتے ہیں کبھی کسی کے جال میں نہیں پھنستے لیکن جونہی وہ ذکر الٰہی سے غافل ہوتے ہیں تو فوراً قید میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ ہی ذکر الٰہی سے غافل ہوا اور اس کی سزا میں برسوں قید رہا..... افسوس ان لوگوں کی قید کا زمانہ کتنا طویل ہوگا جو مدتوں اور برسوں ذکر الٰہی سے غافل رہتے ہیں۔ اے جنید..... میں آپ کے سامنے وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی ذکر الٰہی سے غافل نہیں ہوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پرندہ اڑ گیا..... اس کے بعد کبھی، کبھی وہ پرندہ حضرت جنیدؒ کے پاس آتا، آپ کے دسترخوان پر بیٹھ کر اپنی چونچ سے کچھ کھاتا اور چلا جاتا تھا۔ جب حضرت جنید بغدادیؒ کا انتقال ہوا تو آپؒ کے ساتھ وہ پرندہ زمین پر تڑپ کر گرا اور مر گیا۔ لوگوں نے یہ عجیب بات دیکھی تو پھر اس پرندے کو بھی آپ کے ساتھ ہی دفن کر دیا۔ کچھ عرصے بعد آپ کے ایک مرید نے خواب میں حضرت کو دیکھا تو دریافت کیا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا۔ آپؒ نے فرمایا۔ ''میرے رب نے مجھے بخش دیا اور مجھ پر رحم فرمایا۔ اور کہا کہ تو نے ایک پرندے پر اس کے ذکر الٰہی کے کرنے کی وجہ سے رحم کیا آج ہم تجھ پر رحم فرماتے ہیں۔'' سبحان اللہ.....

☆☆☆

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ ''دنیا میں آنا آسان ہے مگر یہاں سے بری الذمہ ہو کر جانا بہت مشکل ہے۔''

''جو شخص اپنے بھائی سے ظاہر میں دوستی کا دم بھرے اور باطن میں دشمنی کا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برستی ہے اور اس کے اندھے اور بہرے ہونے کا خوف ہے۔''

اسلام میں دوسروں پر رحم اور ہمدردی کرنا بہت افضل تصور کیا جاتا ہے کیونکہ معاشرے میں ہماری زندگی قدم، قدم پر ایک دوسرے کی محتاج ہے۔ عام زندگی کا ایک اصول ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کا مددگار بن کر رہے۔ اگر کسی کو دکھ یا تکلیف ہو تو اس کی تیمار داری کی جائے اگر کوئی بھوکا ہے تو اسے کھانا کھلایا جائے اگر کوئی مالی لحاظ سے پریشان ہے تو اس کی مالی امداد کی

جائے..... ایک دوسرے کے ساتھ رحم، نرمی اور ہمدردی کا معاملہ کیا جائے یہی اسلام کا بنیادی مقصد ہے۔

ہمدردی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ" اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں، باپ کے ساتھ سلوک و احسان کرو اور رشتے داروں سے یتیموں سے اور مسکینوں سے اور رشتے دار ہمسایوں اور غیر رشتے دار ہمسایوں اور ارد گرد بیٹھنے والوں مسافروں اور غلاموں کے ساتھ۔" (یعنی احسان اور ہمدردی کرو.....) (سورۂ نسا)

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ" اور مومنوں کے لیے اپنے بازو جھکائے رہیں۔" (سورۂ فجر)

مومنوں کے لیے اپنے بازو جھکاتے رہیں سے مراد ان کے لیے نرمی اور محبت کا رویہ اپنائیں۔ یعنی جب پرندہ اپنے بچوں کو اپنے سایۂ شفقت میں لیتا ہے تو ان کو اپنے بازوؤں یعنی پروں میں لے لیتا ہے۔ نرمی محبت، پیار کا رویہ اپنانے کے مفہوم میں کہا گیا ہے..... یہ حکم بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہے لیکن حضور کی اتباع میں ہر ایک کو چاہیے کہ وہ دوسروں سے رحم اور ہمدردی کا معاملہ کرے۔

اگر تخلیق کائنات کا مقصد دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ انسان تو دوسرے انسان کی ہمدردی کے لیے پیدا کیا گیا ہے کیونکہ جس انسان کے دل میں بنی نوع انسان کی ہمدردی نہیں ایک دوسرے کے لیے رحم کا جذبہ نہیں تو وہ پتھر سے بدتر ہے۔ جیسا کہ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بعض پتھر ایسے ہیں کہ ان سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں جن سے دوسروں کو فائدہ پہنچتا رہتا ہے تو انسان کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے کو نفع پہنچا سکے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔" ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور جو اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری فرماتا ہے اور جو کوئی کسی مسلمان کی تکلیف دور کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کی تکلیفوں میں سے ایک اس کی تکلیف دور فرمائے گا..... اور جو کوئی کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔"

☆☆☆

حضرت بایزید بسطامیؒ ایک مرتبہ قبرستان سے تشریف لا رہے تھے کہ ایک نوجوان بربط بجا رہا تھا۔ آپؒ نے اسے دیکھ کر لاحول پڑھی تو اس نوجوان نے بربط آپ کے سر پر اس زور سے مارا کہ آپ کا سر پھٹ گیا اور اس کا بربط ٹوٹ گیا..... لیکن آپ نے گھر واپس آ کر اس نوجوان کے بربط ٹوٹنے کی ہمدردی کے پیشِ نظر بربط کی قیمت اور کچھ حلوا اس نوجوان کو بھیجا اور پیغام دیا کہ اس رقم سے دوسرا بربط خرید لو اور حلوا کھاؤ تاکہ ٹوٹے ہوئے بربط کا غم دور ہو جائے۔ آپؒ کی اس ہمدردی کے جواب میں وہ نوجوان آپ کی خدمت میں آیا اور آپؒ سے معذرت کی اور ہمیشہ کے لیے وہ اور اس کا ایک ساتھی دونوں تائب ہو گئے۔

ایک بار حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے کچھ لوگوں نے عرض کی کہ فلاں شخص آپ کی غیبت کر رہا تھا تو آپؒ نے بطور تحفہ اس کو تازہ کھجوریں بھیجتے ہوئے پیغام دیا کہ "سنا ہے کہ تم نے اپنی نیکیاں میرے نامۂ اعمال میں درج کروا دی ہیں، میں اس کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کر سکتا۔"

حضرت عبداللہ خفیفؒ سے ملنے دو صوفی دور دراز ملک سے آئے جب آپؒ کی خانقاہ میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت بادشاہ کے دربار گئے ہوئے ہیں۔ ان دونوں نے سوچا کہ یہ کیسے ولی ہیں جو بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں؟ پھر وہ خانقاہ سے نکل کر شہر میں گھومنے لگے قریب ہی درزی کی دکان دیکھی تو انہوں نے سوچا کہ ان کا خرقہ پھٹ رہا ہے اسے سی لیں..... چنانچہ درزی کی دکان پر جا کر اس سے سوئی لی اور اپنا خرقہ سینے لگے۔ اتفاقاً درزی کی قینچی کھو گئی۔ درزی نے سوچا کہ یقیناً ان دونوں نے میری قینچی چرائی ہے چنانچہ وہ ان دونوں کو پکڑ کر دربار میں لے گیا..... وہاں پہنچ کر اس نے شکایت کی یہ دونوں چور ہیں، حضرت عبداللہ خفیفؒ وہاں تشریف فرما تھے۔ آپؒ نے ان دونوں کو دیکھا اور بادشاہ سے ہمدردانہ انداز میں کہا یہ دونوں تو صوفی منش ہیں ان کا یہ کام ہرگز

نہیں ہوسکتا آپ انہیں چھوڑ دیں..... بادشاہ نے ان کے کہنے پر ان دونوں کو چھوڑ دیا۔

پھر حضرت عبد اللہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت ہمدردانہ انداز میں کہا کہ ''بھائی تمہاری بدگمانی درست نہ تھی۔ میں ایسے ہی کاموں کے لیے یہاں آتا ہوں۔'' یہ بات سن کر دونوں شرمندہ ہوئے اور پھر آپؒ کے مرید ہوگئے۔

☆☆☆

مسلمانوں پر مسلمانوں کے تین حقوق ہیں، اگر کسی کو نفع نہ پہنچا سکے تو پھر اسے نقصان بھی نہ پہنچائے..... اگر کسی کو اچھا نہ کہے تو پھر برا بھی نہ کہے..... اگر کسی کو خوش نہ کر سکے تو غمزدہ بھی نہ کرے۔

حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ میں کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ایک نوجوان کو دیکھا جو ایک بکری کی رسی پکڑے ہوئے تھا اور بکری اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ آپؒ نے یہ دیکھا تو کہا کہ یہ رسی کی برکت ہے ورنہ یہ بھاگ جاتی..... نوجوان نے آپ کی بات سنی تو بکری کی رسی کھول دی اور دائیں بائیں چلنا شروع کر دیا۔ وہ جدھر کا رخ کرتا بکری بدستور اس کے پیچھے، پیچھے جاتی۔ شیخ نے تعجب کا اظہار کیا تو نوجوان نے کہا..... ''اے بزرگ.....! رسی اسے میرے پیچھے نہیں لائی بلکہ میری ہمدردی، خیر خواہی کا پھندا اس کے گلے میں پڑا ہوا ہے جو اس کو کہیں بھاگنے نہیں دیتا، آپ کو معلوم نہیں کہ یہ روزانہ میرے ہاتھ سے جو اور سبز چارہ کھاتی ہے۔''

''اے نیک آدمی.....! بروں پر مہربانی کر..... کتا جب تیری روٹی کھاتا ہے تو تیری حفاظت کرتا ہے۔''

ایک شخص نے بیابان میں ایک پیاسے کتے کو دیکھا غریب جانور پیاس سے مر رہا تھا۔ اس نیک دل انسان سے اس کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اس نے اپنی پگڑی کھولی اور ٹوپی سر سے اتاری پگڑی کو رسی اور ٹوپی کو ڈول بنا کر کنویں سے پانی نکالا اور نحیف و نزار کتے کو پانی پلایا تو اس غریب کی جان میں جان آئی۔ اللہ رب العزت نے اس نیکی کے عوض اس شخص کے تمام گناہ معاف فرما دیے۔

جس اللہ نے کتے کے ساتھ کی گئی نیکی کو ضائع نہیں کیا تو وہ عظیم رب ایک انسان کے ساتھ بھلائی کرنے کو بھلا کیسے ضائع کرے گا..... مہربانی کر جس پر بھی تیرے ہاتھ سے ہو سکے..... اللہ نے نیکی کا دروازہ کسی پر بھی بند نہیں کیا ہے۔

☆☆☆

ایک دفعہ ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے ہاتھ میں کسی پرندے کے بچے تھے وہ چیں، چیں کر رہے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا۔ ''یہ بچے کیسے ہیں؟'' صحابی نے عرض کی۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک جھاڑی کے قریب سے گزرا تو ان بچوں کی آواز آ رہی تھی میں ان کو نکال لایا۔ ان کی ماں نے دیکھا تو بے تاب ہو کر سر پر چکر کاٹنے لگی..... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''فوراً جاؤ اور ان بچوں کو وہیں رکھ آؤ جہاں سے لائے ہو۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانوروں کے ساتھ بھی اس قدر رحم و ہمدردی فرمایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے وہاں ایک اونٹ بھوک سے بلبلا رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اس کے مالک کو بلا کر فرمایا..... ''اس جانور کے بارے میں تم خدا سے نہیں ڈرتے.....؟''

ایک بار صحابہ کرام نے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا..... یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا جانوروں پر رحم کرنے سے ثواب ملتا ہے؟ فرمایا۔ ''ہر ذی روح پر رحم کرنے سے اجر ملتا ہے۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ رہیں۔''

اور جانوروں پر رحم اس طرح سے ہے کہ ان کی بھوک، پیاس کا خیال رکھا جائے اور ان کی طاقت کے مطابق ان سے کام لیا جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے ایک بوڑھے ذمی کو در بدر بھیک مانگتے دیکھا تو فرمایا۔ ہم نے تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا، جوانی میں تجھ سے جزیہ لیتے رہے بڑھاپے میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ آپ نے اسی وقت بیت المال سے اس کا روزینہ مقرر فرمایا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ''اگر دریائے فرات کے کنارے ایک سالہ بھیڑ کا بچہ بھی مر جائے تو قیامت کے دن اس کے لیے جواب دینا پڑے گا۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''میری امت کے لوگ جنت میں نماز، روزوں کی کثرت کی بدولت نہیں بلکہ اس لیے جنت میں جائیں گے کہ ان کے دل مسلمانوں کے بغض سے پاک، سخاوت اور مسلمانوں پر رحم کرنے کی بدولت داخل ہوں گے۔''

ایک دفعہ حضرت ابو مسعود انصاریؓ اپنے غلام کو پیٹ رہے تھے اتفاق سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس موقع پر تشریف لائے..... آپ نے رنجیدہ ہو کر فرمایا۔

''ابو مسعود.....! اس غلام پر تمہیں جس قدر اختیار ہے، اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ اختیار ہے۔''

حضرت ابو مسعودؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد سن کر تھرا اٹھے اور عرض کیا..... ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اس غلام کو اللہ کی راہ میں آزاد کرتا ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تم کو چھو لیتی۔''

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ''جو کسی پر رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا جو کسی کو نہیں بخشتا اس کو نہیں بخشا جاتا۔''

''تم پر مسلمانوں کے چار حقوق ہیں، اپنے محسن کی امداد کرو، گناہ گار کے لیے مغفرت طلب کرو، مریض کی عیادت کرو، توبہ کرنے والے کو دوست بناؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا..... ''اے میرے خالق! تو نے مجھے کس وجہ سے صفی بنایا؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''مخلوق پر تیرے رحم کی بدولت.....''

حضرت ابو الدرداؓ بچوں سے چڑیاں خرید کر انہیں آزاد کرتے ہوئے فرماتے۔ ''جاؤ آزادی کی زندگی بسر کرو.....''

فرمان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ..... ''رحمت، شفقت اور محبت میں دنیا بھر کے مسلمان ایک جان دو قالب ہیں۔ جسم کا کوئی عضو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو سارا جسم اس درد اور تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''

بنی اسرائیل پر ایک زمانے میں سخت قحط پڑا..... ایک عابد ریت کے ٹیلے پر سے گزرا تو اس کے دل میں شدت سے رحم کے جذبات ابھرے اور یہ خیال آیا کاش یہ ٹیلہ آٹے کا ہوتا تو میں بنی اسرائیل کا پیٹ اس سے بھرتا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی طرف وحی بھیجی..... کہ ''میرے اس بندے کو کہہ دو کہ تجھے اس ٹیلے کے برابر بنی اسرائیل کو آٹا کھلانے سے جس قدر ثواب ملتا ہم نے تمہاری اس نیت کے عوض اتنا ثواب عطا کیا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانا کھانے سے پہلے میل دو میل چکر لگا کر مہمانوں کو تلاش کرتے جو ان کے ساتھ مل کر کھانا کھائے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ایک دن رو پڑے۔ آپؓ سے رونے کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا۔ ''ایک ہفتہ ہو گیا میرے ہاں کوئی مہمان نہیں آیا۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھ سے خوش نہیں ہے۔''

فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے ''جو کسی بھوکے کو فی سبیل اللہ کھانا کھلاتا ہے اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے اور جو شخص بھوکے سے کھانا روک لے قیامت کے دن اللہ اس سے اپنا فضل روک لے گا..... اور اسے عذاب دے گا۔''

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے آخری رسول خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا..... ''ایک بے درد اور بے رحم عورت اس لیے جہنم میں گرائی گئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ کے بھوکا مار ڈالا نہ تو اسے خود کچھ کھانے کو دیا اور نہ اسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا کر اپنی غذا حاصل کر لیتی۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ خود مہربان ہے..... (نرمی اور مہربانی کرنا اس کی ذاتی صفت ہے) نرمی اور مہربانی اس کو محبوب ہے یعنی اس کو یہ بات پسند ہے کہ اس کے بندے بھی آپس میں نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کریں..... نرمی اختیار کرنے پر وہ اتنا دیتا ہے کہ جتنا کہ درشتی اور سختی پر نہیں دیتا۔"

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا..... "کیا میں تم کو ایسے شخص کی خبر نہ دوں جو دوزخ کے لیے حرام ہے اور دوزخ کی آگ اس پر حرام ہے۔ دوزخ کی آگ حرام ہے پر اس شخص پر جو مزاج کا تیز نہ ہو..... نرم ہو، لوگوں سے قریب ہونے والا ہو، نرم خو ہو....."

نرمی، شفقت اور ہمدردی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے درویش حضرات چھوٹوں پر شفقت اور ہمدردی کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کی یہ عادت تھی کہ وہ روزے کی حالت میں کھیت کاٹتے تھے مگر ساتھیوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی اپنے بھائی سے کہے کہ مجھے مال میں سے کچھ دو اور وہ کہے کہ تمہیں کتنی رقم کی ضرورت ہے؟ تو سمجھ لو کہ اس نے بھائی چارے کا حق ادا نہیں کیا۔

آداب صوفیا کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ اپنے روحانی بھائیوں کے لیے غائبانہ استغفار کرتے ہیں۔

☆☆☆

نرمی سے پیش آنا ایک دوسرے کے ساتھ رحم والا معاملہ کرنا عمدہ صفت ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ کسی گھر کے مکینوں سے محبت رکھتا ہے تو ان میں نرمی پیدا کر دیتا ہے۔"

"اللہ مہربان ہے نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر اتنا دیتا ہے کہ جتنا سختی پر نہیں دیتا۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک شوخ اونٹ پر سفر کر رہی تھی اور اسے دائیں، بائیں پھرا رہی تھی۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا..... "اے عائشہ.....! نرمی اختیار کرو اس لیے کہ یہ ایسی صفت ہے کہ جس چیز میں برتو اسے زینت دے اور جس میں نہ ہو اسے عیب دار کرے۔"

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ کتنا عمدہ ہے وہ ایمان جسے نرمی سے سنوارا گیا ہو۔ شریعت نے نرمی کی بے حد تعریف کی ہے۔

حضرت ابوحمزہ کوفیؒ فرماتے ہیں کہ اپنے خدمت گزاروں سے تم نرمی کے ذریعے جتنا کام لے سکتے ہو سختی سے اتنا کام نہیں لے سکتے۔

نیک کاموں کو اس طرح کیا جائے کہ ان میں حسن اور رعنائی پیدا ہو جائے۔ دوسروں کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنا، اچھا سلوک کرنا، رحم و شفقت کا معاملہ کرنا اور نرمی اختیار کرنا یہ ایسا وصف ہے کہ جس سے اللہ بہت خوش ہوتا ہے۔

اور معاشرے میں محبت و اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اسلام کا حسن ہی یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا حد درجہ خیال رکھے۔

اسی لیے رحم کرنے کو بہت زیادہ پسند کیا گیا ہے۔ اور پھر یہ تو ہمارے رب کی عظیم صفت ہے وہ رحمان ہے، رحیم ہے، اپنے بندوں پر بے تحاشا رحم فرماتا ہے..... تو اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو بھی نرم بنا دے۔ ہمیں بھی ہر ایک کے ساتھ محبت، رحم و شفقت کا معاملہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین الٰہی آمین

حرفِ آخر

اپنے رحیم و کریم رب کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اس مضمون کی تیاری میں دانستہ یا نادانستہ کوئی غلطی کوئی کمی یا کوتاہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات یا فرمودات کے خلاف ہو گئی ہو..... تو اے میرے پاک پروردگار مجھے معاف کر دے کہ تو بہت معاف کرنے والا عظیم الشان رب ہے۔ میں نے جن قابلِ احترام ہستیوں کی کتب سے مضامین منتخب کیے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے..... آمین.....

وہ آئے بزم میں.....

نزہت اصغر

معروف ادیبہ، پاکیزہ کی پر خلوص دوست

دردانہ نوشین خان

سے دلچسپ ملاقات

پیارے قارئین..... السلام علیکم..... پہلے تو سالِ نو کی مبارک باد وصول کیجیے۔ سال کے پہلے ہی شمارے میں ہم ایک بے حد ٹیلنٹڈ اور مشاق لکھاری سے آپ کی ملاقات کروا رہے ہیں کہ جن کے ادبی لہجے میں ثقیل اصطلاحات سے آراستہ خوب صورت و شیریں زبان اردو کے ساتھ، ساتھ سرائیکی رنگ بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ دردانہ نوشین خان، مختلف النوع مضامین لیے پختہ طرزِ تحریر کی مالک ادیبہ ہیں۔ اگر ہم انہیں ''دُردانا'' کہیں تو بے جا

نہ ہوگا کہ یہ قاری کی نفسیات کو کھنگالتی ہیں، ابھارتی ہیں اور معتدل و مناسب انداز میں کہانی کو لے کر چلتی ہیں کہ جس سے تشنگیِ ذوق سیراب تو ضرور ہوتی ہے مگر مزید پڑھنے کی طلب بڑھتی جاتی ہے۔ یہ کسی بھی لکھاری کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے کہ اس کی تحریروں کا ایک کے بعد ایک انتظار رہے۔ کہنے کو تو بہت کچھ ہے مگر باتیں ہماری مہمان خود بتائیں گی تو لیجیے پیاری دردانہ نوشین سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧..... آج ہماری بزم کی رونق آپ کے آنے سے دوبالا ہو گئی۔ کافی عرصے سے ہماری بھی خواہش تھی اور آپ کا ناول ''صفہ'' آنے کے بعد تو قارئین بھی چاہتے تھے کہ آپ سے بھرپور گفتگو ہو..... تو آپ تیار ہیں ناں ڈیئر!

دردانہ نوشین خان ✧..... یہ میرے لیے اعزاز اور مسرت کی بات ہے، میں پاکیزہ اور اپنے قارئین سے محبت کرتی ہوں۔ (نوازش)

پاکیزہ ✧..... آپ کا نام اگرچہ کسی تعارف کا محتاج نہیں مگر پھر بھی ہم سوال، ضرور کریں گے کہ آپ نے ادب کی کس، کس صنف میں طبع آزمائی کی؟

دردانہ نوشین خان ✧..... اب تو کہا جا سکتا ہے عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں..... میں نے نثر کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ افسانہ، ناولٹ، ناول، تجزیہ، تنقید، کالم، آرٹیکل مگر دل افسانے میں لگا۔ نثری اور آزاد نظمیں بھی لکھیں۔ غزل نہیں لکھی۔ شاعری شوق سے پڑھتی ہوں۔

پاکیزہ ✧..... گویا شاعری پڑھنے سے زیادہ شغف رہا، شعر کہنے سے نہیں؟

دردانہ نوشین ✧..... جی بالکل، شاعری پڑھنے سے شغف رہتا ہے مگر اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اشعار بہت کم یاد رہتے ہیں۔ (اوہو، اِدھر بھی کچھ ایسا ہی ہے)

پاکیزہ ✧..... یہ ڈائجسٹی ادب کو سوتیلے پن کا شکار کیوں ہونا پڑا؟

دردانہ نوشین ✧..... ڈائجسٹی ادب پر کیا بیتی؟ کیوں بیتی؟ لمبی بحث ہے کچھ قصور اِدھر بھی ہیں کچھ زیادتی اُدھر سے ہوئی۔ ڈائجسٹی ادب کے ساتھ یہ ہوا کہ اس نے کہانی پن اختیار کیا۔ اسلوب کی طرف توجہ نہیں دی۔ اردو زبان کو اس سے ترویج نہ ملی، کہانی میں مکالمے کی کثرت شامل رہی۔ کردار نگاری کی کمی رہی۔ ہم ذہن پر دباؤ بھی ڈالیں تو ہمیں کوئی ایسی مثال نہیں ملے گی کہ ڈائجسٹ کا دیا ہوا کوئی کردار سنڈریلا، چچا چھکن، ظاہر دار بیگ، قیومی، راجہ گدھ وغیرہ کی طرح ضرب المثل بنا ہو۔ البتہ کہانی کی سنسنی خیزی، تغیر و تبدل اسے مقبول عام کر گیا اس لیے اسے پاپولر ادب کہا جاتا ہے، آج ایک ڈائجسٹ کی سرکولیشن لاکھوں میں ہوتی ہے ادبی رسالہ سیکڑوں میں ہوتا ہے۔ کلاسیکل ادب بھی اس سچائی سے انکار نہیں کر سکتا کہ ڈائجسٹ نرسری مہیا کرتا ہے۔ اس کی نرسری کے نخلِ ناتواں ہی پھل پھول کر ڈراما، شاعری، صحافت، افسانہ نگاری، ناول نویسی کے تناور شجر بنتے ہیں۔

کتنے ایسے نامور لکھاری ہیں جن کی پرورش

دردانہ نوشین خان کا خوب صورت آشیانہ

ڈائجسٹ میں ہوئی۔ کتنے ایسے ہیں جو بیک وقت دونوں میں خود کو موجود رکھتے ہیں اور منواتے ہیں۔ اپنی شناخت اور معیار کو منواتے ہیں..... میں یہاں ایک اور اہم بات کا اضافہ کروں گی۔ موجودہ دور کہ جسے کتاب کی آخری صدی کہا جارہا ہے میں کتب بینی زوال پزیر ہے۔ کتاب کو خرید کر پڑھنا واضح طور پر نابود ہورہا ہے، ڈائجسٹ اور ادب کی یہ سرد جنگ بند ہوجانی چاہیے..... جو کچھ بھی پڑھا جارہا ہے وہ غنیمت ہے، کم از کم پیغام، امید، تہذیب، اصلاح، تفریح اور کتھارسس کے لیے کوئی پلیٹ فارم تو میسر ہے۔ نوجوان نسل مطالعے سے کہیں تو وابستہ ہے۔ البتہ اس صورتِ حال میں ڈائجسٹ پر بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تحریروں کے چناؤ میں خاص محتاط ہو کیونکہ reader ship اس کے پاس زیادہ ہے۔ (جی بالکل درست کہا)

پاکیزہ ✧..... چلیں یہ دلچسپ حقائق ہیں مگر آج تو شہرت انہی رائٹرز کی ہے یعنی پاپولر ادب تو اب بخوشی دیکھا بھی جارہا ہے (چینلز کے ذریعے) آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟

دردانہ نوشین ❖..... جی ہاں..... یہ مزے کی بات ہے کیونکہ تقریباً 80 فیصد ٹی وی ڈراما رائٹر، ڈائجسٹ رائٹرز ہیں اور ان میں سے بھی بڑی تعداد خواتین کی ہے۔ میں نے ایک ادبی شخصیت سے اسی پس منظر میں کہا کہ اس وقت ہماری نوجوان نسل کا تھنک ٹینک عملاً تو ڈائجسٹ رائٹر بن چکا ہے۔ ان کا جواب بھی کچھ ایسا غلط نہ تھا بولے کہ موجودہ ڈراما سوچنے کے لیے دے کیا رہا ہے؟ محض گنتی کے چند ڈرامے سال بھر میں ایسے آتے ہیں جن کو بامقصد یا مثبت تربیت کا حامل کہا جاسکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ڈرامے کے ناظرین زیادہ تر خواتین ہوتی ہیں۔ آبادی بھی تو 52 فیصد خواتین کی ہے۔ (جی بالکل) بہر حال ڈراما رائٹر کو فارمولا کہانی کے دہراؤ سے بچنا چاہیے۔ کمرشل چاٹ مسالا پلاٹ کی تکرار بند ہو۔ خواہ مخواہ طویل اور کثیر اقساط کا ڈراما ..... لسی میں زیادہ پانی ڈال کر لسی میں برکت رہتی ہے نہ ذائقہ..... زندگی کی نئی جہتوں کو سامنے لایا جائے۔

پاکیزہ ✧..... یقیناً ہماری لکھاری بہنیں پہلے کلاسیکل ادب کا اور اساتذہ کی کاوشوں کا مطالعہ کرتی ہوں گی تبھی تو سوچ اور تحریر میں نکھار آتا ہے۔ آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟

دردانہ نوشین ❖..... نزہت ڈیئر..... میں تو کہوں گی مطالعہ، مطالعہ اور مطالعہ..... اچھی کتب کا مطالعہ بہت ضروری ہے، یہ دماغ کی بند کھڑکیاں کھولتا ہے، یہ نئی دنیاؤں سے باخبر کرتا ہے، اظہار کے مہذب انداز سکھاتا ہے، ماضی اور تاریخ سے آگاہ کرتا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ اور علم میں اضافہ کرتا ہے۔ کم از کم اردو ادب کے مشاہیر کو ضرور پڑھا جائے۔ کسی سے کچھ سیکھنے کو ملتا ہے تو کسی سے کچھ..... میں یہاں کس، کس کا نام لوں، کس کو بھول جاؤں..... قدیم ادبا آفتاب تھے تو عصرِ حاضر کے مہتاب ہیں، میرا تو بہنوں کو مشورہ ہے اپنی زندگی کا اصول بنالیجیے..... ایک کتاب تکیے کے ساتھ رہے، ایک مکمل پڑھ لی جائے تو دوسری رکھ لی جائے۔ دن بھر کے جھگڑے، شکوے، گلے بھول جائیں گے، نیند بھی اچھی آئے گی۔ کتابوں کی فہرستیں میں مہیا کرسکتی ہوں اگر ضرورت ہو، میرے گھر کے بالائی حصے میں ایک بڑا کمرا کتب خانہ ہے، جس میں لگ بھگ آٹھ ہزار کتب ہیں، اسلامی، ادبی، رسائل وغیرہ الماریوں، شوکیسوں کے علاوہ میزوں پر ڈھیر لگے ہیں، (ماشاءاللہ، پھر تو سب کو استفادہ کرنا چاہیے)

پاکیزہ ✧..... روزمرہ کی کہانیوں اور ایک ادبی مرقع میں کیا فرق ہوتا ہے؟

دردانہ نوشین ❖..... آپ نے ایک پُرمغز سوال کیا ہے..... جہاں تک روزمرہ کہانی کا تعلق ہے وہ تو ایک سیدھی سی چیز ہے۔ کہانی دکھ سکھ، خوشی غم کا مجموعہ ہے۔ ہر زندگی ایک کہانی ہے لیکن ہر زندگی ایک افسانہ نہیں ہے۔ افسانہ پیدائش سے لے کر موت تک کی مکمل تصویر نہیں ہوتا۔ اس کا واضح انجام ہونا بھی ضروری نہیں۔ یہ زندگی کی جھلک دکھاتا ہے، بچوں کی کہانیاں، لوک کہانیاں، عوامی کہانیاں (fables) یہ افسانے نہیں ہیں، داستان بھی الگ صنفِ سخن ہے۔ افسانہ صرف اسٹوری نہیں ہوتا اس

کراچی آمد میں دردانہ نوشین خان کے اعزاز میں دی گئی تقریب میں (دائیں سے یاسمین رشید، رضوانہ پرنس، شگفتہ شفیق، دردانہ نوشین، شائستہ اعجاز، افسر سلطانہ، عذرا رسول، ناہید فاطمہ اور نزہت اصغر)

میں افسانہ نگار خود شامل ہوتا ہے۔ قلم کار کی ذہنی پرتیں تہ در تہ کھلتی ہیں، کوئی ایک احساس، واقعہ، منظر ایسا ہوتا ہے جس کو بنیاد بنا کر اجاگر کیا جاتا ہے۔ اس کو افسانہ کہتے ہیں، کہانی بھی متاثر کرتی ہے مگر کاٹ نہیں رکھتی۔ افسانہ کاٹ رکھتا ہے۔ ادبی مرقع بھی وہی ہے جو چونکا دے۔ حیرت میں ڈال دے۔ سوچنے پر مجبور کرے، فیصلہ قاری پر چھوڑ دے۔ (یہ بات تو بالکل درست کہی)

پاکیزہ ✧..... بے شک عالمگیریت ہی تو کسی کے کارنامے کو زندہ رکھتی ہے مگر یہ خداداد صلاحیت اور ہنر ہوتا ہے، اختیار تو نہیں کیا جاسکتا ناں؟

دردانہ نوشین ✧..... میں اس حقیقت سے اتفاق کرتی ہوں کہ لکھنا خداداد صلاحیت ہے، یہ فطری شوق ہے، یوں تو کوشش کر کے بھی لکھا جاسکتا ہے مگر ایک بار یا چند بار..... ہمیشہ نہیں۔ منصوبہ بندی سے لکھنا دماغ پر بوجھ ڈالتا ہے۔ اس میں اثر کم ہوتا ہے۔ اس کا فارمیٹ بناوٹی ہوتا ہے، لکھنے والا تھک جاتا ہے ایک، ایک سطر گھسیٹ کر کام پورا کیا جاتا ہے۔ جس ادیب کو لکھنے پڑھنے میں لطف آتا ہو، جو قدرتی طور پر مائل ہو وہ چند دن کاغذ قلم کے بغیر رہے تو مرجھا جاتا ہے۔ میں نے اس موضوع پر ایک افسانہ ''رائٹنگ ٹیبل'' لکھا تھا جو میرے افسانوی مجموعے ''ریگ ماہی'' میں شامل ہے، اس افسانے کا محور ایک لکھنے پڑھنے کا شوقین نوجوان اپنی بینائی اس طرح کھو دیتا ہے کہ وہ دیگر امورِ حیات ادا کرسکتا ہے مگر لکھ پڑھ نہیں سکتا اور اس اذیت سے اس کے دل پر کیا گزرتی ہے..... محمد حامد سراج مرحوم ابھی حال ہی میں 13 نومبر 2019ء کو ان کا انتقال ہوا ہے (اللہ مغفرت کرے) کہتے تھے جس دن یہ ہاتھ قلم پکڑنے کے قابل نہ رہا اس دن میری موت ہوگی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ کینسر کے سبب ان کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ آگئی تو تیسرے دن انتقال کر گئے۔ عام لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا کہ ہم ادیب مجذوب بلکہ دنیا کے لحاظ سے نیم پاگل ہوتے ہیں۔ ہمیں لفظوں سے عشق ہوتا ہے۔ لفظ خوشبو بھی دیتے ہیں اور آنچ بھی۔ لفظ روتے بھی ہیں مسکراتے بھی ہیں، لفظ مرہم بھی ہیں، زخم بھی ہیں، کسی ورق پر ایک نظر ڈال کر پتا چل جاتا ہے کہ اس ورق کے الفاظ کا سنگار سجاؤ، توازن، معیار کس درجے کا ہے۔ لکھنا صرف الفاظ کا محتاج نہیں ہوتا..... لکھنے

کے لیے حساسیت چاہیے۔ اپنے درد پر تو سب ہی دکھی ہوتے ہیں۔ دوسروں کے درد میں تڑپنا حساسیت ہوتی ہے۔ (اور اسی احساس کو سطح قرطاس پر اتارنا ہی تو اصل کارِ ادیب ہے کہ ہر ایک کو وہ اپنی کہانی لگے۔)

پاکیزہ ✧..... اچھا ہمارے قارئین کے لیے ماہنامہ پاکیزہ سے ناتا جوڑنے کی روداد اپنے الفاظ میں بیان کریں؟

دردانہ نوشین ❖..... میں لگ بھگ بیس سال سے ایک مشہور ڈائجسٹ میں لکھ رہی تھی۔ اپنی عمر کا ایک حصہ اور اپنی سوچ کا ایک دریا ان کو دے چکی تھی۔ میرے..... بے شمار افسانے وہاں سال کا بہترین افسانہ قرار پائے تھے۔ اڑھائی سال تک میرا ایک سلسلے وار ناول بھی چھپا تھا جس کو ریکارڈ توڑ پسند کیا گیا تھا۔ مگر ہوا یوں کہ جب صفہ ناول کا خیال، ارادہ میرے ذہن میں تیار ہوا تو میں نے ان کی مدیرہ سے اس کو سلسلے وار شائع کرنے کی بات کرنا چاہی میرا خیال تھا کہ وہ خوشی سے اچھل پڑیں گی مگر انہوں نے یہ کہلوایا کہ میں ان کے اعزازی ایڈیٹر سے بات کرلوں اور مزے کی بات یہ کہ اس نوجوان (اعزازی ایڈیٹر) نے خود مجھے کہا کہ آپ کا مقام بہت بلند ہے کہاں آپ کا قلم کہاں یہ رویہ..... بس عاقل کو اشارہ کافی ہوا۔ میں اعلانیہ کہتی ہوں پاکیزہ نے مجھے عزت اور محبت دی۔ عذرا رسول یقیناً سب کی دوست ہیں۔ سب میں، میں بھی تو ہوں..... پاکیزہ میں شروع میں کچھ افسانے لکھے ناولٹ بھی لکھا۔ میں ایک عورت ہوں..... پھر یہ ناول صفہ لکھا۔ ان شاء اللہ پاکیزہ سے تعلق جاری رہے گا۔ (جی بالکل، ہمارا یہ قلمی اور قلبی تعلق پھلتا پھولتا رہے گا ان شاء اللہ.....)

پاکیزہ ✧..... آپ کو کب احساس ہوا کہ آپ کچھ اچھا لکھ سکتی ہیں..... کسی استاد نے بتایا یا گھر والوں نے؟

دردانہ نوشین ❖..... مجھے یہ احساس تو بہت پہلے ہو چکا تھا کہ میں لکھ سکتی ہوں..... اچھا یا برا..... اس کا فیصلہ تو قارئین کرتے رہے۔ الحمد للہ پڑھنے والوں نے سراہا۔ میرا لکھنا میری ماں کی شادی سے پہلے کی دعا کا ثمر ہے۔ میری امی نے اپنی الھڑ عمر میں ترکی سے آئی ہوئی ادبی خاتون خالدہ ادیب خانم کے جلسے میں ان کی عزت اور مقبولیت دیکھ کر معصوم سی دعا مانگی تھی کہ میں تو زیادہ نہیں پڑھ پائی۔ (والدہ مڈل پاس تھیں) مجھے ایک ایسی بیٹی دینا جو ادیبہ بنے۔ جب والدہ حیات تھیں تو عشا کی نماز کے بعد اپنے بستر میں بیٹھ کر عینک لگا کر کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتی رہتیں۔ جب میری تحریر والا رسالہ ان کے ہاتھ میں ہوتا تو مجھے من ہی من میں بے قراری لگی رہتی امی کو کیسا لگ رہا ہوگا۔ جب وہ عینک اتار کر عینک کیس میں رکھتے ہوئے مسکرا کر کہتیں، رات کے اتنے بج گئے پتا ہی نہیں چلا یہ تو تم نے ہو بہو زندگی کا نقشہ کھینچ دیا۔ تو میرا سیروں خون بڑھ جاتا۔ لوگو..... خوشی کسی لمبی چوڑی فتح کا نام نہیں..... خوشی حوصلہ دیے جانے، کامیاب ہو جانے، کسی کام کا کسی کو پسند آجانے..... کچھ کر گزرنے کا اہل ہونے کی سنہری چمک ہے۔ (جیسے آپ نے اتنی جامع، پُراثر اور حقیقت سے پُر گفتگو سے ہمیں خوش کر دیا.....)

پاکیزہ ✧..... اب تک کی آپ کی تحریریں کتابی شکل میں یقیناً آچکی ہیں، کچھ تفصیلات سے آگاہ کریں گی؟

دردانہ نوشین ❖..... میری سات عدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

پہلا زینہ افسانوی مجموعہ 2004ء
اندر جال ناول 2007ء
ریت میں ناؤ افسانوی مجموعہ 2010ء
پھولوں کی رفوگری نظموں کا مجموعہ 2012ء
ریگ ماہی افسانوی مجموعہ 2015ء
ریت کے بت ناولٹ کا مجموعہ 2017ء
صفہ ناول 2019ء

افسانوی مجموعہ نمبر 4 زیرِ طباعت ہے۔ تنقیدی تجزیاتی مضامین کا مجموعہ بھی تیار ہے۔ (اللہ کرے زورِ قلم اور خیالات کا سیلِ رواں اور زیادہ ہو، آمین)

پاکیزہ ✧..... اس طویل قلمی سفر کے دوران کیا، کیا مشکلات، رکاوٹیں اور بندشیں سامنے آئیں؟

دردانہ نوشین ❖..... قلمی سفر میں رکاوٹوں کی دو صورتیں رہیں۔

1 ۔جاب اور بچوں کی مصروفیات یعنی گھریلو مصروفیات۔اوردوسرا رویے.....

میں جاب کرتی رہی۔اپنے اسکول (ہائر سیکنڈری) تک جانے میں ڈیڑھ گھنٹا یا ایک گھنٹے کا سفر کیا۔بچے تب چھوٹے تھے۔پہلے امی حیات تھیں۔بچے ان کی زیرِ نگرانی ملازمہ رکھ کر چھوڑتی۔پھر امی کا انتقال ہوگیا..... بہت تنہا پڑ گئی۔بہت حساس تھی بہت زیادہ روئی ہوں میں.....مگر لکھنا جیسے تیسے جاری رہا۔لکھنا کمائی کے لیے نہیں تھا.... شہرت کے لیے نہیں تھا۔یہ چیزیں تو میسر ہی نہ تھیں مگر اندر کا شوق.....اضطراب، چین نہ لینے دیتا۔دوسری رکاوٹ لوگوں کے رویے خصوصاً اہلِ ادب کے رویے رہے۔سینئرز نظر انداز کرتے ہیں، حوصلہ شکنی کرتے ہیں، ڈائجسٹ رائٹر کو کڑی دھوپ کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر میرٹ خود کو منوالیتا ہے۔حتمی فتح صلاحیت کی ہوتی ہے،(یہ بات تو ہے)میں افسانے لکھتے، لکھتے شاعری کی طرف نکلی۔ میرے اندر دکھتے مناظر اور درد بھری صداؤں کا شور تھا جو میں اپنے ارد گرد دیکھتی اور سنتی.....حساسیت نے چنگاریوں کو بھانبھڑ میں بدلا۔دفورِ خیال افسانے میں سمٹ نہ پاتا تھا۔میں نے نظمیں لکھنا شروع کردیں۔باریک بین نقاد نظروں نے بھانپ لیا میں کم از کم خیال و موضوع کی حد تک شاعری کی پرانی بساط لپیٹ دینے والوں کی سرخیل ہوسکتی تھی۔مجھے شاعری کی ناپ تول کی مار ماری گئی۔میں عروضِ اصول سے مبرّا ہوں مگر لاشعوری طور پر سمٹ گئی۔چنانچہ کہنا یہ ہے کہ حوصلہ افزائی ٹانک کا کام دیتی ہے۔یہ آگے بڑھنے کی طاقت کا سپلیمنٹ ہے۔ شاباش کی خوشی صرف لڑکپن کی حد تک نہیں ہوتی۔شاباش کی خوشی تو داہنے ہاتھ کے اعمال نامے تک ہے اس کی اہمیت کا ابھی ادراک ہی نہیں ہوا۔(ہم م م م.....)

پاکیزہ ✧.....آپ نے اپنے بچوں میں بھی یہ میراث دی یا نہیں؟

دردانہ نوشین خان ❖.....ویسے تو میرے چاروں بچے کم و بیش کتاب بین ہیں مگر کتاب بینی میں میرا بیٹا بہنوں پر سبقت رکھتا ہے۔میرے کتب خانے میں ہزاروں کتابیں اس کی منتخب کردہ ہیں.....وہ اسلامک وژن رکھتا ہے ادب سے بھی شغف رکھتا ہے۔چاروں بچوں (تین بیٹیاں ایک بیٹا) نے بچپن میں ابنِ صفی کو شوق سے پڑھا ہے ابنِ صفی کا مکمل کلیکشن ہے۔اس مطالعے نے انہیں جملے کا شعور، نثر کا مزہ، اردو میں روانی عطا کی۔دریہ دیباج (بیٹی نمبر 1) منطقی مبحث کا شعور رکھتی ہے۔نکتہ رساد نکتہ بین ہے۔منجھلی بیٹی نے آئی آر میں ایم فل کیا تو عالمی سیاست اس کا موضوع رہتا ہے۔چھوٹی دھنک مریم جسے سب چینی کہتے ہیں اعلیٰ درجے کی انگلش نظمیں لکھتی ہے۔ چنانچہ ادبی میراث کہہ لیں یا لکھنے پڑھنے کی خو، تو یہ سب میں کسی، کسی حد تک ہے۔(ماشاءاللہ)

پاکیزہ ✧.....اچھا اپنی فیملی کا مختصر تعارف بھی کروادیں؟

دردانہ نوشین ❖.....میں بھی یہی سوچ رہی تھی کہ فیملی کا تعارف ہوجائے تاکہ بچوں کے حوالے سے قارئین کو سمجھنے میں آسانی ہو۔میری فیملی میرے شوہر ارشد حفیظ مخدوم اور چار بچوں پر مشتمل ہے۔بچے اب چھوٹے نہیں رہے، تین کی شادی ہوچکی۔ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں، جن میں ایک چھوٹی بیٹی زیرِ تعلیم (میڈیکل تھرڈ ائیر) ہے دانیال، لاہور میں جاب کے سبب رہائش پزیر ہے۔دریہ شادی شدہ ہے۔کراچی میں رہتی ہے، پاکیزہ کے دفتر بھی آئی تھی۔دیپ کعبہ رشنا جسے رشنا کہتے ہیں شادی ہو کے دبئی رہتی ہے۔میری تین بہنیں ہیں بھائی نہیں تھا۔ایک بہن کا گھر پڑوس میں ہے۔(اللہ سب کو صحت و سلامتی سے رکھے، آمین!)

پاکیزہ ✧.....آج بھی آپ مطالعے کو وقت دیتی ہیں یا بس صرف لکھتی ہیں؟

دردانہ نوشین خان ❖.....مطالعے سے محبت ختم نہیں ہوسکتی، جب تک آنکھوں میں دم ہے مطالعہ ہے۔

پاکیزہ ✧..... پاکیزہ میں آپ کا حالیہ ختم ہونے والا ناول ''صفہ'' ایک لاجواب تحریر ثابت ہوا بلکہ ہمارے اکثر قارئین نے تو پوچھا ہے کہ کیا یہ اصلی کردار ہے یا تھا؟

دردانہ نوشین ❖.....میں نے برسوں روحانیت، جسم و نفس سے ماورا زندگی، ترکِ ترغیبات، اصل موت و

حیات کے بارے میں سوچا۔ بہت سے لوگ سوچتے ہوں گے..... کبھی کچھ نوٹ کرلیا کبھی اظہارِ خیال کا پیرایہ دے دیا۔ جب میرے والدین، پہلے ابا جی پھر امی کا انتقال ہوا تو ایک گمبھیر اداسی باطن میں جم گئی۔ گزشتہ کئی برسوں سے میں سوچنے لگی یہ جو میں اتنا بہت سا الگ سے feel کرتی ہوں۔ اس کو زیرِ قلم لانا چاہیے۔ لکھنے کا حق شاید تب ادا ہو جب حاصلِ حیات خیالات کو سمیٹوں۔ کسی ترتیب میں اہلِ شوق تک پہنچاؤں۔ جہاں تک صفہ کے کردار کا تعلق ہے وہ من وعن کہیں موجود نہیں ہے۔ مگر ایسی کرداری صفات والی ایک خاتون سے ملاقات ہوئی تھی۔ (جی ہاں کئی قارئین جن میں کراچی کی منیرہ مقصود بھی ہیں انہوں نے خاص طور پر اس سوال کے لیے کہا تھا۔)

پاکیزہ ✧..... آپ نے یقیناً ''صفہ'' بہت محنت، تحقیق اور جذبے سے لکھا۔ اس کو لکھنے کے دوران کوئی غیر معمولی صورتِ حال بھی سامنے آئی تھی؟

دردانہ نوشین ❖..... غیر معمولی صورتِ حال ضرور رہی مگر قلب کی کیفیت سے متعلق رہی..... اکثر لوگ ظاہری کرامات سے متاثر ہوتے ہیں اس حد تک کہ صاحبِ کرامت کی پوجا کرنے لگتے ہیں۔ کرامت یہ سمجھی جاتی ہے کہ ہوا میں اڑ کے دکھایا۔ زیرِ زمین خزانے نکال لائے وغیرہ، وغیرہ..... مگر حقیقی کرامت یہ ہے کہ قلب میں تغیر پیدا ہو..... اپنے بھی اور دوسرے کے بھی..... یہ تغیر سادہ سی بات نہیں ہے، کسی کو قائل کرنا، راست پر آمادہ کرنا، سچ تسلیم کرانا کٹھن ہوتا ہے۔ بہت کٹھن ہوتا ہے..... یہ کٹھنائی مجھ پر آسان ہوئی..... یا میرے قاری پہ..... تو یہی غیر معمولی صورتِ حال ہے، ہم ان گنت کہانیاں ناول پڑھتے ہیں مگر وہ ہمیں بدلتی نہیں ہیں بلکہ ان کا یہ دائرۂ کار ہی نہیں ہوتا..... خود میں نے جو ماضی میں لکھا اس سب کا یہ دائرۂ کار نہ تھا یا کم، کم تھا۔

پاکیزہ ✧..... آپ کی کوئی بھی تحریر ہو، ایک خاص پیغام بہت ٹھوس دلائل وحقائق کے ساتھ ہوتا ہے جو آپ کی حد درجہ خود اعتمادی کو ظاہر کرتا ہے یہ صفت یقیناً قدرتی ہوگی یا لاشعوری طور پر کسی شخصیت کا سحر بھی ہے؟

دردانہ نوشین ❖..... شخصیت کا اثر تو نہیں کہہ سکتے البتہ میں نے آپ کے سوال پر غور کیا تو مجھے ایک موہوم سا جواب ملا..... واقعہ کچھ یوں ہے کہ لڑکپن میں ابا جی ہمیں پڑھاتے تھے (عموماً انگریزی) تو جب کوئی نصابی اسٹوری مکمل ہوتی (وہ پہلے سے کہہ دیتے کہ moral پر ہاتھ کر چھپالو.....) تو سوال کرتے what have you gained from it,(not learnt) ہم خود سے سوچ کر بتاتے پھر اسے moral سے explain کیا جاتا۔ اس طرح مطالعے کے بعد عادت سی بن گئی حتیٰ کہ میں جب رسائل پڑھتی تو اسی سوال کا جواب تلاش کرتی۔ پھر یہ بھی پتا چلا کہ تحریریں منفی بھی سکھاتی ہیں۔ مثبت سکھانے یا مثبت راہ دکھانے والی تحریر ہی پائدار ہوتی ہے۔ چنانچہ عمومی طور پر میرے افسانوں میں کوئی میسج..... چھوٹی سی مثبت سوچ..... لاشعوری طور پر ہوتی ہے۔ (یہی سوچ آپ کے بے حد کام آتی ہے)

پاکیزہ ✧..... ایک قلم کار اپنے کس جذبے کی تسکین کرتا ہے کہ وہ جب تصوف پر قلم اٹھاتا ہے جو کہ بہت ہی مشکل موضوع ہے؟

دردانہ نوشین ❖..... اس میں کوئی شک نہیں کہ تصوف مشکل موضوع ہے۔ اس پر خطبہ، لیکچر، مقالہ، مضمون تو لکھا جاسکتا ہے وہ بھی ادق ہوگا اس کو صرف متعلقہ موضوع سے تعلقِ خاص رکھنے والے ہی پڑھیں گے۔ کیونکہ وہ عام آدمی کے لیے لکھا نہیں جاتا۔ تصوف کو عام آدمی تک convey کرنا یا اسے کہانی بنا کر پیش کرنا الجھے ریشم کو سلجھانا ہے۔ ہمارے ہاں مزار پر منت مانتے جوڑے کو تصوف کی تصویر سمجھا جاتا ہے۔ اور ڈھول کی تھاپ پر چکر کھانے کو تعبیر..... ہماری کہانیوں اور ڈراموں میں عشقِ مجازی سے حقیقی کا سفر مسلسل چل رہا ہے، گویا یہ واحد زینہ ہے جو اوپر تک لے جاتا ہے..... اوپر تک کے سفر میں صدمہ، چوٹ، دھچکا اور ماحول یا تربیت کار بھی معاون ہوتا ہے..... راستے بہت سے ہیں ایک منزل تک..... اور رہی یہ بات کہ کس جذبے کی تسکین ہوتی ہے..... ایک بڑی تلاش حتمی سچ..... دنیاوی خواہشات کی

تکمیل کا بھی عدم تکمیل ہونا کیوں ہے؟ حاصل لاحاصل ہے..... وصال دکھ ہے، فراق دکھ ہے.....

کوچ کردہ دستہ، دستہ آشنایان عندلیباں
باغ خالی باغچہ خالی شاخہ خالی لانہ خالی

پاکیزہ ✧..... آپ نے ''صفہ'' میں کمال مہارت دکھائی اور نہایت باریک بینی سے اختلافات سے بچ بچا کر تحریر کو عقلی اور کبھی جذباتی بنیادوں پر بھی چلایا جو قاری کے دل میں ٹھک کر کے لگی۔ کیا آپ کو اس کی اتنی پسندیدگی اور مقبولیت کا اندازہ تھا؟

دردانہ نوشین ✧..... الحمد للہ..... صفہ نے غیر متوقع مقبولیت پائی۔ اتنی پزیرائی کی امید کم تھی۔ یہ کمرشل پلاٹ پر لکھی گئی گلیمرس کہانی نہیں تھی۔ اس میں دلچسپری کا چاٹ مسالا نہ تھا۔ پھر بھی اس کے مقبول ہونے کا مطلب ہے، یہ مٹی ذرا نم ہو تو واقعی زرخیز ہے۔ (میں نے مصرعے کی نثر کی ہے) ہماری باذوق بہنوں اور خصوصاً نوجوان نسل میں بھی مصفاحیات کی لپک ہے، ایک خط پاکیزہ کی محفل میں آیا تھا غالباً کسی یونیورسٹی کی طالبات نے لکھا تھا ''یہ ناول ان کے تھیسس میں مددگار ہے۔ مجھے ان بچیوں کے نام یاد نہیں آرہے..... اور وہ پاکیزہ کی اسلامک تحریروں میں دلچسپی لیتی ہیں..... ناامید نہ ہوں ہم میں سے ہر دور میں اچھے اور اچھائی پسند لوگ رہے ہیں۔ (اسی اچھائی پر تو دنیا قائم ہے)

پاکیزہ ✧..... آپ کے نزدیک آپ کی بہترین تخلیقی کاوش کیا ہے؟ مطلب اولاد تو ہے ہی، تحریر کی بات کر رہی ہوں؟ حسین مسکراہٹ)

دردانہ نوشین ✧..... اپنی تخلیقات میں سے پسندیدہ ترین کا انتخاب اتنا ہی مشکل ہے جتنا اولاد میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینا..... تاہم..... میں کہہ سکتی ہوں کہ افسانوی مجموعہ ریت میں ناؤ بہترین کاوش تھی۔ اس کا پیش لفظ چنگاریوں کی بارات خاصے کی تحریر تھی۔ کتاب کے علاوہ بھی متعدد رسالوں میں چھپی، وہ میرے بچپن، لڑکپن کی حسین یادیں تھیں..... دوسرے نمبر پر افسانوی مجموعہ ریگِ ماہی کو لے لیجیے تو اس میں بلڈ کینسر جیسا افسانہ ہے، جسے عاصم بٹ صاحب نے بہترین افسانے نامی

انتخاب میں شامل کیا۔ اور اب صفہ کے آنے کے بعد مجھے سب سے زیادہ اس پر مسرت و افتخار ہے۔ (ماشاءاللہ)

پاکیزہ ✧..... کچھ اپنی دیگر مصروفیات کے بارے میں بھی بتائیں؟

دردانہ نوشین ✧..... مجھے باغبانی اور گھر کی صفائی سیٹنگ کا شوق ہے، میں کچن میں لمبا وقت گزاروں تو دل بور ہو جاتا ہے، کھانے پکا لیتی ہوں دعوتیں بھی پکائی ہیں مگر یہ میری دنیا نہیں..... البتہ پودوں کی کانٹ چھانٹ ان میں اضافے کا سوچنا، ترکیبیں بنانا، سبزے میں وقت گزارنا روحانی تقویت دیتا ہے۔ پرندوں کو سننا، کسی موسیقی سے زیادہ پُرسکون ہے..... سلائی، کڑھائی میں، میں زیرو..... ہوں۔ اس کی وجہ بھی شروعات سے میری حوصلہ شکنی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ شکر خورے کو شکر دیتا ہے، ہر دور میں اچھی درزن مل گئی جو چادروں کی ترپائی سے لے کر مرمت اور سلائی سب کر دیتی ہے۔ (واہ ہمیں بھی بتانا بھئی)

پاکیزہ ✧..... اپنے قرب و جوار میں بکھری

زندگیوں سے کس حد تک کہانی کشید کرتی ہیں؟

دردانہ نوشین ..... ❖ ..... قرب و جوار ہی ہمارا مشاہدہ ہے، ان میں ست رنگی کہانیاں ہوتی ہیں، مظلوم بھی ظالم بن سکتے ہیں، معصوم بھی شاطر ہو سکتے ہیں، انسان اتنا سیدھا نہیں اس کو صرف ایک رنگ میں نہ دیکھا جائے..... بندہ سراپا بدی یا نیکی نہیں ہوتا زیادہ نہیں تو دو تین کہانیاں یومیہ مہیا کر دیتا ہے، باقی لکھنے والے کی ہنر مندی ہے۔ بقول شاعر.....

ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ میں باندھوں

میرے بے شمار افسانوں کے کردار زندہ کردار ہیں، اصل میں کہانی تو ردو بدل کر لی جاتی ہے یعنی سو فیصد سچ معاشرے سے نہیں لیا جاتا۔ کردار اگر معاشرے سے اٹھایا جائے تو رنگ آمیزی کم ہوتی ہے۔

پاکیزہ ❖ ..... آپ کی گھریلو مصروفیات، مطالعے اور تحریر پر اثر انداز ہوتی ہیں یا آپ بہترین منتظم کی حیثیت سے اپنے وقت کی درجہ بندی کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں؟

دردانہ نوشین ..... ❖ ..... بھئی یہ کہنا تو جھوٹ ہوگا کہ گھریلو مصروفیات عورت کے لکھنے پڑھنے پر اثر انداز نہیں ہوتیں..... روز مرہ مصروفیات کسی کے ہاں آمد و رفت، خاندانی محلہ جاتی دکھ، سکھ، سو طرح کی ذمے داریاں ہوتی ہیں..... اپنی ہی اولادیں (ماشاءاللہ) اکٹھی ہو جائیں تو لکھنا پڑھنا معطل ہو جاتا ہے۔ یہ سب عورت کا معطل ہوتا ہے مرد کا لکھنا پڑھنا، کسی بھی عمر میں ان سرگرمیوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ بات چل نکلی ہے تو جلے دل کے پھپھولے پھوڑ لوں۔ کہا جاتا ہے کہ فیض، غالب، اقبال کے پائے کی کوئی شاعرات نہ ہوئیں۔ یہی تقابل نثر نگاری میں ہوتا ہے۔ یہ ظالمانہ تقابل کرنے سے پہلے ہماری معاشرت اور روایات کو مدِ نظر رکھا جائے۔ اول تو عورت قلم کے میدان میں مرد کی نسبت تاخیر سے داخل ہوئی پھر اس پر قدغن بہت رہی..... چھوٹی سی مثال لیجیے شاعر کو شام تک کسی مشاعرے میں جانا ہو تو دن بھر غزلیں لکھتا۔ چھانٹتا، گنگناتا، تیار ہوتا رہتا ہے۔ شاعرہ اس اثنا میں دن بھر کے کاموں کے علاوہ شام کی غیر حاضری کے پیشِ نظر اضافی پیشگی فرائض سرانجام دے رہی ہوتی ہے۔ ایک طرح سے اپنے اس غیر ضروری شغل ''شاعری'' پر نادم، سب افرادِ خانہ کو راضی کر کے نکلنے میں کوشاں ہوتی ہے۔ گھر سے نکلنے تک اس کی ہدایات، مصروفیات ختم نہیں ہوتیں۔ اب کیا خاک وہ اپنے کلام کو بار، بار تراشے۔ دوسرا پہلو اس امر کا یہ ہے کہ زندگی کا بیشتر حصہ چار دیواری میں سر کرنے کے سبب ادیبہ، شاعرہ کا مشاہدہ اور آئی کیو لیول محدود ہوتا ہے۔ مرد کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ یورپ جائے..... تنہا سڑکوں پر پھرنا، آوارگی بہت سا مشاہدہ کرا دیتی ہے۔ چھپر ہوٹل، چھابے، ڈھابے، عوامی مقامات بہت وژن مہیا کرتے ہیں۔ میں اپنے لکھنے کے اوقات کار کی بات کروں..... جب تک جاب کرتی تھی تو فری پیریڈ میں لائبریری میں بیٹھ کر لکھا کرتی۔ جاب چھوڑی تو صبح کا وقت ہاتھ لگا اب میں عموماً دن کے پہلے حصے میں لکھتی اور رات کو پڑھتی ہوں۔

پاکیزہ ❖ ..... زندگی ایک امتحان ہے، جہدِ مسلسل ہے یا پھر وقت گزاری ہے؟

دردانہ نوشین ..... ❖ ..... زندگی ایک امتحان ہے اور امتحان کے لیے جہدِ مسلسل کرنا پڑتی ہے زندگی کا ہر فیز امتحانیہ ہے، جوانی ہرگز ضائع کرنے کا وقت نہیں..... نیک اعمال کے لیے بڑھاپے کا انتظار حماقت اور جہل ہے۔ ہم ہر گزرتے لمحے میں امتحانی سوال کے جوابات تیار کر رہے ہیں۔ سوال مل چکے ہیں اور سب جانتے ہیں۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ❖ ..... اچھا کچھ اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے بارے میں بھی بتائیں مثلاً پسندیدہ لباس، موسم، تفریحی مقام، رشتہ، ذائقہ، پھول، رنگ، ڈش، مشروب، کوئی یادگار جملہ، کسی بزرگ کی نصیحت، کوئی شعر، شخصیت، کتاب، لمحہ وغیرہ۔

دردانہ نوشین ..... ❖ ..... یہ تو مزے دار سوال ہے بلکہ سوالات کا مرکب ہے..... میرا پسندیدہ لباس تو شلوار قمیص ہی ہے، قمیص کو ڈھیلا ڈھالا ہونا چاہیے جیسے کہ آج

کل فیشن میں ہیں۔ پسندیدہ کھانا؟ وہ کھانا جو کوئی دوسرا خصوصاً میری بیٹیاں دریہ، رشنا یا رانیہ بنا کر سامنے پیش کردیں۔ مجھے شوربے والا سالن پسند ہے، کباب، دال ماش اور دودھ سے تیار کردہ کوئی بھی میٹھا..... وہی بھی میرا آل ٹائم فیورٹ ہے۔ دریہ (جسے ہم بنٹی کہتے ہیں) کوکنگ کے انعامات جیت چکی ہے وہ یونیک اور لمبے چوڑے تردد والے کھانے بنالیتی ہے۔ موسم؟ موسم تو سب کا من بھاتا سرماہی ہوتا ہے، سرما ایک اداس حسن ہے لیکن بہار یا معتدل موسم مکمل حسن ہے، جنت کا موسم بہاریہ ہوگا۔ میرا پسندیدہ ذائقہ نمکین ہے، نمک ذائقوں کا بادشاہ ہے۔ مشروب ایک مہذب سروِنگ ہے مجھے فریش لائم، فروٹ کاک ٹیل، اورنج جوس، چاکلیٹ اور کھجور کا شیک اور گرم مشروب میں کشمیری چائے..... سادہ چائے، گرین ٹی سب اچھے لگتے ہیں۔ سب سے خالص رشتہ ماں اور اولاد کا ہے، دوستی بھی پیارا رشتہ ہے مگر اس دنیا میں نایاب ہے۔ محبت، اصلیت، بے تکلفی کی pure دوستی مجھے نہیں ملی دوسروں کے بارے میں یہی کہہ سکتی ہوں دعویٰ کرنا عموماً قبل از وقت ہوتا ہے۔ اشعار بہت سے ایسے ہیں جو اچھے لگے، دل پہ لگے مگر یاد نہیں رہتے۔ امجد اسلام امجد کے یہ اشعار زندگی کا آئینہ ہیں۔

ہے یہ بھی سچ کہ ترے سامنے مجھے برسوں
کوئی رفیق کوئی کام بھی نہ یاد آیا
جھوٹ یہ بھی نہیں ہے تجھے جو دیکھا کل
تو کتنی دیر ترا نام بھی نہ یاد آیا

پسندیدہ کتابیں: کئی چاند تھے سر آسمان (شمس الرحمٰن فاروقی) دروازہ کھلتا ہے (ابدال بیلا) آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (ابدال بیلا) الکیمسٹ (پائلو کویلھو) مابین (ضیا حسین ضیا) کاجل کوٹھا (بابا محمد یحییٰ خان) دشت سوس (جمیلہ ہاشمی) لہو رنگ فلسطین (سلمیٰ اعوان) اداس نسلیں (عبداللہ حسین) باگھ (عبداللہ حسین) قربتِ مرگ میں محبت (مستنصر حسین تارڑ) اور..... بہت کبھی نہ بھولنے والا فقرہ

کچھ انگریزی lines ہیں۔ لمبی نظم کا ایک حصہ ہے۔

I want to go back to those days
the only broken were my toys
good bye only meant till tomorrow

اس سے بھی دل پر بھاری پتھر رکھنے والا ایک فقرہ یاد آرہا ہے۔

"ہٹ ڑی بھیڑی اے موت اے
میکوں کالے وال تاں ہنڈاون ڈے"

ترجمہ: اے موت پرے ہو..... مجھے میری جوانی تو جی لینے دے)۔ برسوں پہلے قاسم سیال کا ایک کالم پڑھا تھا، موت سے آخری مکالمہ۔

میرا پسندیدہ رنگ، پیلا، (بسنتی) اور بلیک ہے۔ پرپل بھی ہے، ہر مہکتے پھول کی مہک پسند ہے۔ مکمل شخصیت کوئی نہیں ملتی۔ مکمل ہستی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

پاکیزہ ✧..... کیا کوئی ایسا موضوع ہے جس پر آج تک قلم نہیں اٹھایا مگر لکھنا ضرور چاہتی ہیں؟

دردانہ نوشین ..... ❖ ..... ایسے لگتا ہے کچھ اہم ہے جو لکھا جانا چاہیے مگر وہ دھند کے پار ہے۔

پاکیزہ ✧..... ماہنامہ پاکیزہ کے بارے میں آپ کی قیمتی رائے، کوئی مشورہ، تجویز، تنقید؟

دردانہ نوشین ❖..... پاکیزہ ایک پاکیزہ رسالہ ہے، اسلامی طرزِ حیات اس پر بادل کی طرح عکس رکھتا، چھوٹے، چھوٹے مفید اذکار، اوراد اور حمد و ثنا کے ساتھ بہنوں کی محفل، بزم پاکیزہ، پاکیزہ ڈائری، یہ الفاظ و القاب بھلے لگتے ہیں..... پاکیزہ بہنوں کی محفل گھر آنگن سی لگتی ہے۔ مشورہ یہ ہے کہ سلسلے وار ناول ایک وقت میں ایک ہو..... اس کے علاوہ اس طرز کی تحریریں شامل کی جائیں جس سے لکھنے کی خواہشمند مگر ناتجربہ کار بہنوں کو موقع ملے..... لکھنے کی تربیت اور مشق ہو، اس سلسلے کو کوئی دیدہ زیب سا نام دیا جاسکتا ہے۔ بہنیں اپنے قریبی مشاہدے کا احوال

لکھیں.....روزمرہ کا کالج یا نوکری پر جانا، چھوٹی خوشیاں، موسموں کے قابلِ غور لمحات، بدحواسیاں، انتظار یا آمد مہمان کچھ بھی.....نثر اچھی ہو اردو درست ہو تو ہر تحریر دلچسپ ہو جاتی ہے۔(اچھی تجاویز ہیں)

پاکیزہ ✧.....اپنی چھوٹی بہنوں، بچیوں کے لیے کوئی نصیحت؟

دردانہ نوشین ❖.....میری نصیحت ہے، میری چاہت ہے کہ زندگی کو سادہ کر لیجیے.....کم پر راضی رہنا سیکھیے ،نوجوانی کی عمر محنت کی عمر ہے، یقین مانیے یہ حافظہ، یہ چستی مستعدی نہ تھکنا، انہماک بس دو تین عشروں کا ہے پھر رفتہ، رفتہ کم ہوگا پھر معدوم ہو جائے گا۔محنت دنیاوی کامیابیوں کے لیے ضرور ہو مگر نماز اور وضو بھی رسان و وجدان سے ادا ہوں، یہ بھی محنت ہے۔قرآن پاک لڑکپن میں پڑھ چکنے کے بعد امی کے پاس رکھوا کر مبرا نہ ہو جائیں۔قرآن پاک کو صرف پنج سورۂ کی صورت میں چند سورتوں پر محدود نہ کیجیے، خدا کی قسم قرآن ایک ایسی کتاب ہے، اسے 80 سال کی عمر تک روز پڑھیں تو روز تازہ لگتا ہے۔اللہ کا بندے سے براہ راست کلام ہے۔اس کے علاوہ خوش رہا کریں۔ناکام یعنی فیل ہو جانا، سہیلی بچھڑ جانا، ان جیسی باتوں کو ڈپریشن نہ بنایا کریں۔ڈپریشن ہر بیماری کی جڑ ہے، ان چھوٹی موٹی آزمائشوں کی ابدی حیات (آخرت) میں زیرو ویلیو بھی نہیں۔

پاکیزہ ✧.....نوآموز رائٹرز کو کوئی گُر کی بات بتائیں؟

دردانہ نوشین ..... ❖.....نوآموز رائٹرز کے لیے گر کی بات ہے، مطالعہ اور صرف مطالعہ، لکھنے میں جلدی نہ کریں۔مطالعے سے سوچ کو پختہ کریں..... انداز بیان کو باسلیقہ کریں۔اگر وہ صحیح معنوں میں بڑی رائٹر بننا چاہتی ہیں۔

پاکیزہ ✧.....ہماری بزم کی بابت کیا کہیں گی؟ کیسا لگا یہاں آنا؟

دردانہ نوشین ❖.....آپ لوگ بہت پیارے لوگ ہیں، ماشاء اللہ اسٹاف کا ماحول دوستانہ ہے، اللہ تعالیٰ معراج رسول صاحب مرحوم کے اس ادارے کو سلامت رکھے، پھلتا پھولتا اور ترقی کرتا رہے، آمین! عذرا رسول، نزہت اصغر، آمنہ حماد، پرویز بلگرامی و دیگر تمام کے لیے سلامتی کی دعا ہے۔عذرا رسول کا اخلاقِ حسنہ قابلِ تعریف ہے اور ہاں رائٹرز سے رابطہ اسی طرح رکھا کیجیے.....دوری صرف دلوں کی دوری ہوتی ہے ورنہ کوئی بھی دور نہیں ہے۔بہت شکریہ.....(بہت پیاری بات)

پاکیزہ! بہت شکریہ دردانہ نوشین! اتنی دلنشیں گفتگو، تجربات کا نچوڑ اور دل کش نصیحتیں، باتیں یقیناً ہم سب کی رہنمائی کریں گی۔اتنا وقت دینے کے لیے ادارہ پاکیزہ کی جانب سے شکر کے سدا بہار پھول قبول کیجیے۔

☆☆☆

جی تو باذوق بہنوں.....اب اپنی رائے سے آگاہ ضرور کیجیے گا کہ کیسی لگی ملاقات.....ہمیں تو بہت لطف آیا اور یقین کریں اب تک کے انٹرویوز کے مقابلے میں دردانہ سے بات چیت بہت جداگانہ لگی، یہ آپ بہنوں نے بھی محسوس کیا ہوگا۔اس میں احوالِ دل کے ساتھ، ساتھ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرنے والا احوال بھی پوشیدہ ہے۔بہر حال اسی طرح ہم اپنی ایک سے ایک قلم کار بہنوں سے دلچسپ اور پُر مغز گفتگو آپ کے لیے لاتے رہیں گے اور یوں آپ کے ادبی ذوق کی تسکین ہوتی رہے گی ان شاء اللہ.....اب اجازت کہ وقت نے کہا.....ابھی آگے اور بھی کچھ کام باقی ہیں.....بس یہ چھوٹی سی بات یاد رکھیں.....اپنا، اپنے پیاروں کا بہت خیال رکھیں اور دوسروں کے دکھ تکلیف اور خوشیوں میں خلوص دل سے شریک ہو کر ان کے لیے تقویت و تسلی کا باعث بنیں۔نا کہ دل آزاری کا.....اللہ پاک ہم سب پر اپنی نظر کرم رکھے.....

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

کمیٹی کا نفع و نقصان اور دورانیہ

شائستہ زریں

بلاشبہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور کمیٹی ڈالنا یا جمع کرنا بھی اسی کا تسلسل ہے۔ یقیناً گھریلو بجٹ متوازن رکھنے کے لیے بچت اور بچت کے تحفظ کی خواہش نے یہ راہ سجھائی ہوگی جو کمیٹی کی بنیاد پڑی۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے ہنرمند اور گھڑ خواتین کمیٹی جسے عرفِ عام میں بیسی بھی کہا جاتا ہے ڈال کر اپنی خواہشات اور ضروریات کی تکمیل کر رہی ہیں.... زیادہ تر متوسط طبقے کی خواتین ہی کمیٹی ڈالتی ہیں۔ لیکن کاروباری حلقے میں بھی کمیٹی کا رواج زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ان میں بعض کمیٹیاں سود کے طرز کی ہوتی ہیں جو لاٹری کہلاتی ہیں اور یہ قانونِ شریعت کے منافی ہیں دیگر امور کی طرح کمیٹی کے فوائد کے ساتھ، ساتھ نقصانات بھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ کمیٹی ڈالنے والے جو اس کے طفیل برسابرس سے اپنے ضروری اور بڑے اخراجات سے بہ آسانی نمٹ لیتے ہیں وہ شاداں و فرحاں کمیٹی کی افادیت پر روشنی ڈالتے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں تلخ تجربات سے گزرنے والے کمیٹی کے نقصانات کے پیشِ نظر اس سے بیزار اور نالاں بھی دکھائی دیتے ہیں اور ایک دفعہ کے بعد توبہ مان لیتے ہیں۔ ایک بڑا مسئلہ کمیٹی کی ماہانہ رقم اور معینہ مدت کا بھی ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو بڑی ضرورت کے لیے کمیٹی ڈالنی ہوتی ہے وہ بڑی رقم اور طویل عرصے کی کمیٹی پر متفق ہوتے ہیں لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی بھی ہے جو کم دورانیے کی کمیٹی کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ ان ہی متضاد رویّوں کے پیشِ نظر ہم نے چند خواتین و حضرات سے رابطہ کر کے معلوم کیا کہ.....

سوال ۱: کیا آپ کمیٹی ڈالتے / ڈالتی ہیں؟ اس کا کیا فائدہ اور کیا نقصان ہے؟

سوال ۲: موجودہ معاشرتی و معاشی صورتِ حال کے پیشِ نظر کمیٹی کا دورانیہ کتنی مدت پر محیط ہونا چاہیے؟

پروین کاظمی
(براڈکاسٹر)

ا: اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ کیا فائدہ بیسی ڈالنے کا؟ جتنے پیسے ہم دیتے ہیں اتنے ہی تو پیسے ہمیں واپس ملتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ یہ کمیٹی جو ہوتی ہے یہ کوئی لاٹری تھوڑی ہوتی ہے یہ تو ہمارے پیسے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جن کا ہاتھ کھلا ہوتا ہے یا جو زیادہ پیسے خرچ کرتے ہیں تو اس سے یہ فرق پڑتا ہے کہ تھوڑے سے پیسے جمع ہو جاتے ہیں۔ میں نے خود بھی بہت بیسیاں ڈالی ہیں اور بہت سے فوائد حاصل کیے۔ خاص طور پر عام مڈل کلاس گھرانوں میں تو کوئی بھی ایک دم سے گھر کی کوئی بڑی چیز نہیں خرید سکتا تو سوچتے ہیں کہ فوری ضرورت ہے تو قسطوں پر لے لیں قسطوں میں بڑھا کر دینے پڑتے ہیں سود بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ دو ایسے واقعات ہوئے۔ میری ایک کولیگ نے کہا کہ مجھے فوری طور پر پیسے چاہئیں، میری بھانجی کی شادی ہے سونے کی کوئی چیز دینی ہے اور

سونا بہت مہنگا ہے۔ میں بیسی ڈال ہی رہی تھی تو میں نے ان سے کہا کہ اگلے مہینے سے میں بیسی ڈال رہی ہوں تم ایسا کرنا کہ پہلی تم لے لینا میں تم کو دے دوں گی۔ اگر ماہانہ پانچ ہزار کی کمیٹی ہے دس مہینے کی تو پچاس ہزار تم کو مل جائیں گے۔ یہ طریقہ ان کو بہت پسند آیا وہ بہت خوش بھی ہوئیں۔ اسی طرح میری ایک دوست نے کہا مجھے ایل ای ڈی لینا ہے اپنے کمرے کے لیے، تم اپنے شوہر سے معلوم کرنا قسطوں پر لیں تو ماہانہ کتنی قسط دینی ہوگی ان کو بھی میں نے بیسی کا مشورہ دیا اور کہا میں آپ کو دوسری یا تیسری بیسی دے دوں گی۔ آپ اس سے اپنا ایل ای ڈی لے لیجیے گا قسطوں کے جھنجٹ سے بچ جائیں گی۔ دونوں نے بیسی ڈال کر اپنا مسئلہ حل کیا۔ بعض لوگ بچت کے لیے ڈالتے ہیں وہ آخر میں لینا چاہتے ہیں۔ کسی کے ہاں شادی ہو تو وہ آگے پیچھے دو بیسیاں نکلوا لیتے ہیں۔ یہ اس کے فائدے ہیں۔ خواتین اس رقم سے بچیوں کے جہیز کے لیے، سونا یا کوئی بڑی چیز لے لیتی ہیں۔ کوئی فلیٹ یا پلاٹ بک کروایا تو اس کی بڑی قسطیں دے دیں۔ بیسی ایسی چیز ہے جو ڈالنے والے سے ہر صورت میں لی جائے گی اور دینی بھی ہوگی۔ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم اپنے گھر میں جمع کر لیں گے تو یہ تو بہت ہی مشکل ہے۔ جیسے ہی کوئی ضرورت آتی ہے تو وہ نکال لیتے ہیں۔ قابلِ بھروسا لوگوں کے پاس بیسی ڈالنی چاہیے اور قابلِ بھروسا لوگوں ہی کو ممبر بنانا چاہیے۔ بعض لوگ درمیان سے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں یا اپنی کمیٹی لینے کے بعد بقیہ رقم دینے میں گڑبڑ کرتے ہیں تو نقصان ہوتا ہے۔

۲: میں خود اس بات کی بہت زیادہ قائل ہوں کہ دورانیہ بہت مختصر ہونا چاہیے دس مہینے کافی ہیں۔ کیونکہ شروع میں جب لے لیتے ہیں تو دیتے، دیتے کھلنے لگتی ہے۔ دس مہینے تو ہنسی خوشی گزر جاتے ہیں۔

شازیہ انوار

(ایڈیٹر اور سینئر منیجر ہم نیٹ ورک لمیٹڈ)

۱: میں کمیٹی ڈالتی ہوں اور وہ بھی کافی تسلسل کے ساتھ۔ ایک وقت تھا جب کوئی مجھے کمیٹی ڈالنے کے لیے

کہتا تو میں یہ کہہ کر ٹال دیتی تھی کہ پیسے جمع کرنے کے لیے بینک ہیں شاید اس وقت مجھے ایسا لگتا تھا کہ یہ فیئر معاملہ نہیں ہوتا لیکن سچ یہ ہے کہ بینک میں رکھے ہوئے پیسے خرچ ہونے میں کسی بھی قسم کا تامل نہیں کرتے۔ یہ پیسے مہینے کے اختتام تک کہاں اڑن چھو ہو جاتے تھے مجھے پتا ہی نہیں چلتا لیکن ایسا اس وقت تک تو ٹھیک تھا جب تک میں پیسے صرف خرچ کرنے کی غرض سے کماتی تھی، کل کے لیے بچا کر رکھنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی تصور.... بہرکیف شادی ہوئی، بیٹا ہوا تو احساس ہوا کہ کل کے لیے بھی کچھ بچانا چاہیے لیکن ہماری چادر تو چھیدوں سے بھری ہوئی ہے جس میں پیسے رکتے ہی نہیں۔ کافی عرصے تک صرف سوچ میں پیسے بچائے۔ پھر ایک دن آفس کی چند گولیگز کے ساتھ مل کر فیصلہ کیا کہ کمیٹی ڈالی جائے۔ اس وقت میں نے سب سے آخری نمبر اس سوچ کے تحت لیا کہ بعد کے پیسے بھرنے مشکل کی بات ہوگی۔ بہرکیف جب چند ماہ کے بعد اکٹھے کچھ پیسے ہاتھ آئے یہ سوچ بھی ساتھ ہی در آئی کہ اس طریقے سے بغیر کسی پریشانی کے پیسے بچائے جا سکتے ہیں۔ اس دن کے بعد سے آج تک میرے پاس جو بھی بچت ہے وہ اسی طریقے سے ممکن ہو سکی ہے.... کمیٹی ڈالنے کا بظاہر فائدہ تو یہی ہے کہ کچھ پیسے جمع ہو جاتے ہیں اور ضرورت کے وقت کام آ جاتے ہیں لیکن نقصان بھی ہے، اگر کوئی غلط ممبر شامل ہو جائے تو کمیٹی ڈالنے والے کے لیے کئی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں اور سب کا نقصان ہوتا ہے، اصل میں کمیٹی ڈالنے کا سلسلہ اعتماد کی عمارت پر کھڑا ہوا ہوتا ہے ہزاروں روپے کا کیش سامنے والے کے ہاتھوں میں پکڑا دینا آسان بات نہیں ہے اسی لیے جو کمیٹی کی ذمے داری لیتا ہے وہ ممبران کے انتخاب میں بہت احتیاط سے

کام لیتا ہے۔ اگر کوئی اپنی کمیٹی وصول کرلے اور باقی پیسوں کی ادائیگی نہ کرے تو کمیٹی جمع کرنے کے ذمے دار کے لیے مشکلات پیدا ہوجاتی ہیں۔

۲: دراصل کمیٹی کا دورانیہ اس کی مجموعی رقم پر انحصار کرتا ہے، کم دورانیے والی کمیٹی میں کم پیسے ملتے ہیں جبکہ زیادہ دورانیے والی میں زیادہ۔ تاہم مجھے ذاتی طور پر زیادہ پیسوں اور کم دورانیے والی پسند ہے۔ جلد ختم ہو جاتی ہے اور ایک معقول رقم یکمشت ہاتھ میں آجاتی ہے۔

میمونہ شمیل

(پروگرام منیجر، ریڈیو پاکستان، کراچی)

ا: جی میں اکثر اوقات کمیٹی ڈالتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بچت کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ ویسے تو کمیٹی میں آپ ہی کی جمع کی ہوئی رقم ہوتی ہے لیکن جب اصل میں رقم ایک ساتھ ملتی ہے تو ہم کچھ ایسے کام کر لیتے ہیں جن میں زیادہ رقم درکار ہوتی ہے اور جو فوری نوعیت کے ہوں۔ جہاں تک نقصان کی بات ہے تو کمیٹی جس مقصد کے لیے ڈالی جائے کوشش کرنی چاہیے کہ اس کام کو جلدی کرلیا جائے یا اگر بچت کا مقصد بھی ہے تو ان پیسوں کو کسی طرح محفوظ کرلیا جائے ورنہ اکثر محنت اور انتظار سے ڈالی گئی کمیٹی کے پیسے اِدھر اُدھر کی ضرورتوں میں خرچ ہوجاتے ہیں۔ سچ کہوں تو میرے ساتھ اکثر ایسا ہوجاتا ہے۔

۲: کمیٹی کا دورانیہ مختصر ہونا چاہیے۔ کیونکہ مالی حالات یکساں نہیں رہتے۔ ضروریاتِ زندگی میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ کبھی معمول کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں اس لیے کمیٹی مختصر ہو تو ایسے حالات میں جلد کمیٹی کی ذمے داری سے فراغت مل جاتی ہے۔ اکثر لمبی کمیٹیاں جاری رکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر دس ماہ سے ایک سال والا دورانیہ پسند ہے۔

بذل الرحمٰن توصیف

(سینئر جنرل منیجر پروجیکٹ ٹیکنالوجی لنکس)

ا: جی ہاں میں کمیٹی ڈالتا ہوں کیونکہ یہ رقم کسی بھی بڑی چیز کی خریداری یا کسی بھی مخصوص بڑے کام میں استعمال کی جاسکتی ہے۔ فائدہ یہ ہے کہ بچت ہو جاتی ہے۔ نقصان کچھ بھی نہیں۔

۲: بہت طویل نہیں ہونی چاہیے۔ ایک سال کا عرصہ مناسب ہے۔

شکیل الدین

(پروگرام رپورٹر۔ ریڈیو پاکستان کراچی)

ا: کمیٹی ڈالنا اب مجبوری ہوگئی ہے اور ضرورت بھی، اسی لیے کمیٹی ڈالی جاتی ہے۔ مہنگائی کے دور میں چار پیسے اس کے ذریعے جمع کرنا بڑی کامیابی ہے اور پھر فائدہ یہ کہ جمع شدہ رقم کو دیکھ، دیکھ کر خوش ہوتے رہیں کہ بڑا تیر مارلیا۔ بہرحال فائدے تو ہیں۔ نقصان تو کوئی نظر نہیں آتا بس کھرے اور اعتبار کے لوگوں کو ممبر بنالیں تو کیسا نقصان؟

۲: موجودہ مہنگائی کے دور میں رقم بڑی ہو اور دورانیہ کم تو مارے خوشی کے پھولے نہ سمائیں

گے۔لیکن رقم بڑی ہوتو دورانیہ بھی بڑا برداشت کرنا پڑے گا۔معاشرتی صورتِ حال میں تو سب ہی یہ چاہیں گے کہ کم مدت کی کمیٹی ہوتا کہ دوبارہ شروع کیا جائے اور نیا کام نمٹایا جائے۔کیونکہ ہر شخص مہنگائی سے پریشان ہے اور چاہتا ہے کہ کمیٹی ڈالی بھی جائے اور دورانیہ بھی کم۔اس وقت جو معاشی صورتِ حال ہے لوگ کمیٹی ڈالنا چھوڑ دیں گے کیونکہ کیا کھائیں اور کیا بچائیں؟ کمیٹی کا دورانیہ رقم پر منحصر ہے کہ آپ کو کتنی بڑی رقم ملے گی؟ بعض دفعہ بڑی کمیٹی کے لیے لمبا عرصہ لگ جاتا ہے اور کبھی رقم کم ہوتی ہے تو وقت بھی کم ہوتا ہے۔دو سال سے ڈھائی سال تک کی کمیٹی ٹھیک ہے جلد ختم ہو جائے تو نئے سرے سے شروع کر دیں۔

ناعمہ شاھد

(معلمہ)

ا:جی ڈالتی ہوں۔بڑا فائدہ ہے کہ یکمشت بڑی رقم مل جاتی ہے جو بڑے کام آجاتی ہے۔نقصان یہ ہے کہ ماہانہ تنخواہ کم لگتی ہے۔رونا آتا ہے اتنی کم تنخواہ ہے میری۔

۲: کمیٹی مختصر ہونی چاہیے؟ کم از کم دس ماہ اور زیادہ سے زیادہ دو سال کی۔

راشدہ نسیم

(بیوٹیشن)

ا:جی ہاں میں اپنے پاس کمیٹی ڈالتی ہوں۔شادی بیاہ، بچوں کی تعلیم ہو یا گاڑی لینی ہو یا گھر بنوانا ہو تو سود سے پاک اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔فائدے تو بہت ہیں نقصان کوئی نہیں۔بس ممبر بااعتبار ہوں۔

۲:طویل نہیں ہونی چاہیے۔کم سے کم دس ماہ اور زیادہ سے زیادہ بیس ماہ کی ڈالنی چاہیے۔

سپنا

(گھریلو کام کاج کی ملازمہ)

ا: میں ہر مہینے پانچ ہزار کی بیسی ڈالتی ہوں اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ میرے بچوں کی شادی کا خرچہ نکل آتا ہے۔پانچ سال کی بیسی ڈالی۔اس سے ایک بیٹی کی ذمے داری میرے کاندھے سے نکل گئی۔عزت کے ساتھ اپنا فرض پورا کر لیتی ہوں۔ نقصان یہ ہوتا ہے کہ اتنی محنت کے بعد کماتی ہوں تو ہر مہینے گھر چلانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

۲: پانچ سال یا کم سے کم چار سال کی ہونی چاہیے تاکہ زیادہ پیسے ملیں اور بڑا کام ہو جائے تو بیسی ڈالنے کا فائدہ بھی ہو۔

یوسف عباس رضوی

(پرائیویٹ جاب)

ا:جی ہاں میں ڈالتا ہوں کمیٹی۔تنخواہیں کم ہوتی ہیں تو کمیٹی ڈالنے سے یکمشت رقم مل جاتی ہے۔بچوں کے نئے تعلیمی سال میں کام آتی ہے۔ اور مختلف تقریبات میں لین دین کے لیے کمیٹی بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے۔کم آمدنی والوں کے لیے تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔مگر درمیان سے اس کے ممبر چھوڑ کر چلے جائیں تو نقصان ہوتا ہے۔

۲: مختصر ہونی چاہیے۔ایک سال کافی ہے وقت پر مل جاتی ہے۔ضروری سالانہ اخراجات بہ آسانی نکل جاتے ہیں۔طویل ہوتی ہے تو مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے۔زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال اور کم سے کم ایک سال کی مدت۔

انس منیر
(سینئر کریٹیو ڈیزائنر)

ا: کمیٹی میں باقاعدگی سے ڈالتا ہوں۔ اور جب تک ماہانہ مقررہ آمدنی چل رہی ہے اس کا نقصان میری نظر میں کچھ نہیں۔ اگلے سال کی پوری منصوبہ بندی کر کے اگر اس حساب سے کمیٹی ڈالی جائے تو بہت سے خرچے جن میں رمضان اور عید کی تیاریاں عیدِ قرباں پر قربانی کا مقصد بغیر اضافی بوجھ کے بہ آسانی حل ہو جاتا ہے۔

۲: موجودہ مہنگائی اور ڈوبتی ہوئی معیشت کے دور میں کمیٹی کا دورانیہ کم سے کم آٹھ مہینے اور زیادہ سے زیادہ دو سال ہونا چاہیے۔

شہرینہ
(گھریلو ملازمہ)

ا: گھروں میں کام کر کے جو تنخواہ ملتی ہے اس میں سے ہر ماہ بیسی ڈالتی ہوں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ارجنٹ کام پڑ جائے تو بیسی کام میں آجاتی ہے، ورنہ میں ملنے والی رقم الگ کر کے رکھ دیتی ہوں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتی اور دوسری بیسی ڈال دیتی ہوں جب وہ نکل آتی ہے تو دونوں بیسیوں کے پیسے ملا کر امی میرے جہیز کے لیے کوئی بھی چیز لے لیتی ہیں۔ نقصان یہ ہوتا ہے کہ روز کے خرچے میں کمی آجاتی ہے۔ کوئی چیز پسند آجائے تو خرید نہیں سکتے جب جی چاہا پسند کی چیز کھا پی نہیں سکتے۔

۲: جتنے آپ کے پاس پیسے ہوں اس حساب سے ڈالنی چاہیے۔ ایک سے دو ہزار تک کی بیسی ڈالنی چاہیے اور ایک یا دو سال تک کی ہو۔

☆☆☆

معزز قارئین!

سروے کے شرکا کی آرا پڑھ کر یہی خیال آرہا ہے کہ کمیٹی کیا ہے؟ بچت کا سنہری اصول۔ اور سب سے بڑھ کر اس میں شرعی طور پر بھی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ مہنگائی کے اس بحران بالخصوص روزمرہ کی کھانے پینے کی اشیا کی حیرت ناک بلکہ شرمناک حد تک اچانک بڑھتی ہوئی قیمتوں نے عوام کی نیندیں اڑا دی ہیں۔ شادی خوشی کا دوسرا نام ہے لیکن اس کے ہوشربا اخراجات والدین کو خوشی سے بڑھ کر خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ تعلیم اور صحت کے ادارے بھی من مانے دام وصول کرتے ہیں۔ ایسے میں کمیٹی کا وجود غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ بے شک ہر ماہ محدود آمدنی میں سے مخصوص رقم نکالنا آسان بات نہیں لیکن بہت سی دشواریوں اور بڑے مسائل پر قابو پانے کے لیے یکمشت رقم کا حصول انتیس کے چاند کی سی مسرت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اور اگر سال بھر کے دورانیے سے بڑے سالانہ اخراجات کے لیے بڑی رقم ایک ساتھ مل جاتی ہے تو اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے؟ شرط یہ ہے کہ کمیٹی ڈالنے والے اور جن کے پاس کمیٹی ڈلتی ہے وہ ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کریں ورنہ ان کی جانب سے ہونے والی کوتاہی اور غفلت کمیٹی کی افادیت ختم کر کے اس کو ضرر رساں بنا دیتی ہے۔

ہماری کوشش ہوتی ہے سالِ نو نومبر میں ہم آپ کو سروے رپورٹ کی صورت میں ایسا مؤثر تحفہ دیں جو آپ کے لیے سودمند ہو۔ سو ہم نے بچت کی ایک راہ آپ کو سجھا دی۔

اب جس کے جی میں آئے وہ پائے روشنی

ادارۂ پاکیزہ اور ہماری جانب سے آپ کو نیا عیسوی سال مبارک ہو۔ دلی آرزو اور دعا یہی ہے کہ

اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں
مل کر ایک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں
خزاں کی اجاڑ شامیں نہ آئیں اگلے برس
اس بہار رت کو زنجیر کرتے ہیں

☆☆☆